

دولت عثمانیہ

جلد دوم

ڈاکٹر محمد عزیز

دارالمصنفین، شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ (الہند)

بِسلسلہ تاریخ اسلام

دَوْلَتِ عثمانیہ

سلطنت عثمانیہ کے عروج و زوال کی تاریخ اور جمہوریہ ترکیہ کے کارناموں کی تفصیل

جلد دوم

از- محمود ثانی ۱۲۲۳ھ (۱۸۰۸ء) تا جنگ عظیم ۱۳۳۸ھ (۱۹۹۱ء)

از

ڈاکٹر محمد عزیز

دارالمصنفین، شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، یو۔ پی (الہند)

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

جملہ حقوق بحق دارالمصنفین محفوظ

سلسلہ دارالمصنفین : ۶۵

۲۰۰۹-۲۰۱۰

جزی - ۲

نام کتاب : دولت عثمانیہ دوم

مصنف : محمد عزیز

صفحات : ۴۱۶

طباعت : جدید معیاری ایڈیشن ۲۰۰۹ء

ناشر : دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ (یو۔ پی)

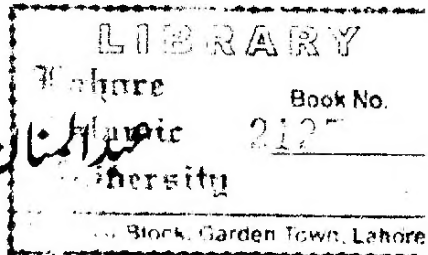
مطبع : معارف پریس شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ (یو۔ پی)

قیمت : ۲۰۰ روپے

ISBN: 978-93-80104-32-4

باہتمام

عبد المنان ہلالی



بسم اللہ الرحمن الرحیم

دیباچہ

مجھے افسوس ہے کہ دولت عثمانیہ کی دوسری جلد کی اشاعت میں بہت تاخیر ہوئی، مسودہ کئی سال قبل لکھا جا چکا تھا مگر پریس میں بھیجنے سے پہلے جب نظر ثانی شروع کی تو بہت کچھ ترمیم و اضافہ کی ضرورت معلوم ہوئی اور تقریباً پوری کتاب از سر نو لکھنی پڑی، علاوہ بریں درس و تدریس کی مشغولیت اور بعض دیگر اسباب سے بھی کام کی رفتار بہت سست رہی اور کبھی کبھی مہینوں مسودہ دیکھنے کی نوبت نہیں آئی۔

نظر ثانی کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ اس جلد کی ضخامت بہت بڑھ گئی اور جمہوریہ کا حصہ جو پہلے اس میں شامل تھا اور جس میں جدید ترکی کے حالات تفصیل کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں الگ کر دینا پڑا، چونکہ قیام جمہوریہ سے آل عثمان کی تاریخ کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے، اس لیے مناسب بھی یہی ہے کہ اس کی ایک جلد علاحدہ ہو۔

محمد عزیز میر (رفیق دارالمصنفین)

مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

۳۰ اپریل ۱۹۴۳ء

فہرست مضامین دولت عثمانیہ جلد دوم

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۱۵	ارماٹولی اور کلیفٹ		دیباچہ
۱۶	حکومت میں یونانیوں کا اقتدار		محمود ثانی
۱۷	عام یونانیوں کی حالت	۱-۶۴	۱۲۳۳ھ تا ۱۲۵۵ھ
۱۹	تعلیم اور تحریک آزادی		۱۸۰۸ء تا ۱۸۳۹ء
۲۱	انقلاب فرانس کا اثر	۱	ینی چری کی بغاوت
۲۲	ہتیر یا	۲	زار اور نپولین کا خفیہ معاہدہ
۲۳	روس کی سازشیں	۴	انگلستان سے صلح
۲۵	برأت	۴	روس سے جنگ
۲۶	علی پاشا	۵	صلح نامہ بخارست
۲۹	مولڈویا کی بغاوت	۶	سرویہ کی خود مختاری
۳۰	انتقام	۷	میلوش حکمران سرویہ
۳۱	ہتیر یا سے بطریق اور زار کی مخالفت	۷	سلطنت عام کی کمزوری
۳۲	بغاوت مولڈویا کا استیصال	۹	افریقہ مقبوضات
۳۲	موریا میں ترکوں کا قتل عام	۹	محمد علی
۳۳	باب عالی کی طرف سے جوابی کارروائی	۱۱	حجاز کی مہم
۳۴	گرگوریوس کی پھانسی	۱۱	وہابی بغاوت کا انسداد
۳۴	ایک غلط فہمی کا ازالہ	۱۲	محمد علی کی بغاوت
۳۵	یونانیوں کا قتل	۱۳	بغاوت یونان
۳۶	یونانی سفائیاں	۱۴	یونانیوں کی بحری قوت

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۶۴	محمود کی وفات	۳۹	باغیوں کے ساتھ مغرب کی ہمدردی
۶۴	محمود کی عظمت	۴۰	برطانیہ کی معاندانہ روش
	سلطان عبدالحمید خاں	۴۱	مصر کی مدد
۶۸-۹۵	۱۲۵۵ھ تا ۱۲۷۷ھ	۴۳	موریا کی تسخیر
	۱۸۳۹ء تا ۱۸۶۱ء	۴۳	ہی چری کا استیصال
۶۹	محمد علی سے صلح	۴۵	محمود کے کارنامے
۷۰	خط شریف گلخانہ	۴۶	دولِ عظمیٰ کی دشمنی
۷۶	دستور عثمانی ۱۸۵۶ء	۴۸	معادہ آق کرمان
۸۰	دیگر اصلاحات	۴۹	مسکئی اتحاد
۸۱	فوجی اصلاحات	۵۰	واقعہ نوارینو
۸۱	اصلاحات کا اثر	۵۲	نوارینو کی شکست کا اثر
۸۳	سلطنت عثمانیہ کی تقسیم کی تجویز	۵۳	جنگ روس
۸۴	جنگ کریمیا کے اسباب	۵۵	ایک شدید غلطی اور شدید تر غلط فہمی
۸۵	اعلانِ جنگ	۵۶	طلسمِ قوت
۸۶	انگلستان اور فرانس کی حمایت	۵۸	صلح نامہ اور نہ
۸۷	سپاسٹوپول کی فتح	۶۰	ہجومِ مصائب
۸۷	سقوطِ قارس	۶۰	محمد علی کی بغاوت
۸۷	صلح کی گفتگو	۶۲	روس کی مدد
۸۸	صلح نامہ پیرس	۶۳	معادہ کوتاہیہ
۸۹	ضمنی معاہدے	۶۳	معادہ خونخوار اسکندریہ
۸۹	صلح نامہ پیرس پر ایک نظر	۶۳	محمد علی سے دوبارہ جنگ

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۱۱۳	اندراسی نوٹ	۹۱	مختلف شورشیں کریٹ
۱۱۴	جرمن اور فرانسیسی قنصلوں کا قتل	۹۲	جدہ پر گولہ باری
۱۱۵	بغاوت بلخاریا	۹۲	فتنہ لبنان
۱۱۷	حقیقت حال	۹۵	سلطان کی وفات
۱۲۲	یادداشت برلن	۹۵	اس عہد کی خصوصیت
۱۲۳	دولت علیہ کی مشکلات	۹۷-۱۲۴	سلطان عبدالعزیز
۱۲۴	سلطان کا عزل		۱۲۷۷ھ تا ۱۲۹۳ھ
۱۲۶-۱۳۰	سلطان مراد خامس	۹۸	۱۸۶۱ء تا ۱۸۷۶ء
	۱۲۹۳ھ - ۱۸۷۶ء		مالی اصلاحات کی کوشش
۱۲۷	وفات عبدالعزیز	۱۰۰	سیاسی فتنے، رومانی
۱۲۷	پکستان حسن کا واقعہ	۱۰۱	سرویہ کا استقلال
۱۲۸	معزولی کا سوال	۱۰۱	کریٹ کی بغاوت
۱۳۰	مراد کا عزل	۱۰۲	معاهدہ پیرس کی خلاف ورزی
۱۳۱-۲۳۶	سلطان عبدالحمید خاں ثانی	۱۰۳	بلخاریہ کا قومی کلیسا
	۱۲۹۳ھ تا ۱۳۲۷ھ	۱۰۴	باب عالی میں روس کا اثر
	۱۸۷۶ء تا ۱۹۰۹ء	۱۰۶	جمہیہ سلافیہ
۱۳۲	صدارت مدحت پاشا	۱۰۷	مدحت پاشا کی اسکیم
۱۳۳	دستور اساسی کا اعلان	۱۰۸	سلطان کی فضول خرچی
۱۳۴	ایک بدگمانی	۱۰۹	مدحت پاشا کی صدارت
۱۳۷	قطنطنیہ کی کانفرنس	۱۱۱	مالی ابتری
۱۴۰	مجلس عالیہ کا فیصلہ	۱۱۱	بغاوت ہرزگووینا

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۱۸۲	ملکی قرضہ کا بار	۱۴۰	روس سے جنگ
۱۸۲	نہر سوز کے حصوں کی فروخت	۱۴۲	پلوٹا
۱۸۳	نہر سوز کی اہمیت	۱۴۴	مضبطہ اور نہ
۱۸۴	مصر میں فرانسیسی اور برطانوی اقتدار	۱۴۵	معاهدہ سان اسٹیفانو
۱۸۵	توفیق پاشا	۱۴۶	اس معاہدہ کی مخالفت
۱۸۶	دستوری حکومت کا اعلان	۱۴۷	روس اور برطانیہ کا خفیہ معاہدہ
۱۸۷	انگلستان اور فرانس کا طرز عمل	۱۴۹	برلن کانگریس
۱۸۸	درویش پاشا	۱۴۹	عہد نامہ برلن
۱۸۹	اسکندریہ کا بلوہ	۱۵۲	مونٹی نیگرو کی نزاع
۱۸۹	حقیقت حال	۱۵۳	یونان کا قضیہ
۱۹۱	اسکندریہ کی گولہ باری	۱۵۳	مشرقی رومیلیا اور بلغاریا کا اتحاد
۱۹۲	جنگ آزادی	۱۵۵	سرویا اور بلغاریا کی جنگ
۱۹۵	خدیو کی وطن دشمنی	۱۵۶	اتحاد بلغاریا کی تکمیل
۱۹۶	قومی حکومت	۱۵۷	دولہ یورپ کی مداخلت
۱۹۶	کفر دوار	۱۵۸	کریٹ
۱۹۷	اسماعیلیہ	۱۶۳	جنگ یونان
۱۹۸	پروفیسر پامر کی کی خفیہ مہم	۱۶۳	یونان سے کریٹ کا الحاق
۲۰۱	خدیو کی غداری	۱۶۵	مسئلہ آرمینیا
۲۰۲	وطنی فوج کی بد قسمتی	۱۷۶	تونس
۲۰۲	معرکہ قضا صین	۱۸۱	مصر
۲۰۳	تل الکبیر	۱۸۱	ترقی و اصلاحات

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۲۳۱	سالونیکا کمیٹی	۲۰۵	مصر پر انگریزوں کا قبضہ
۲۳۲	تحقیقاتی کمیشن	۲۰۶	جرمنی کا فوجی اور اقتصادی اثر
۲۳۲	انقلاب میں عجلت	۲۰۷	بغداد ریلوے
۲۳۳	اعلان انقلاب	۲۰۸	بغداد ریلوے کی اہمیت
۲۳۴	الطاف خسرو اٹھ کا فریب	۲۰۹	اتحادیہ
۲۳۶	مناسٹر پر قبضہ	۲۰۹	اندرونی اور بیرونی سازشیں
۲۳۷	یلدیز کی سرانسیگی	۲۱۱	مقدونیا کی بد امنی
۲۳۷	دستوری حکومت کا اعلان	۲۱۲	مرزنگ پروگرام
۲۳۹	خط ہمایوں یکم اگست ۱۹۰۸ء	۲۱۳	مقدونیا کی تقسیم کے منصوبے
۲۴۰	ایک اعتراض	۲۱۵	عبدالحمید کا استبداد
۲۴۱	نئی وزارت	۲۱۷	فوج کی تعلیم
۲۴۳	انجمن اتحاد پر یورپ کا پہلا وار	۲۱۷	نظام جاسوسی
۲۴۳	انجمن کا سیاسی پروگرام	۲۲۰	عوام کی بیزاری
۲۴۴	پارلیمنٹ کا افتتاح	۲۲۲	عام بیزاری
۲۴۴	جوابی انقلاب	۲۲۳	انجمن اتحاد و ترقی
۲۴۶	بغاوت کا استیصال	۲۲۴	غیر اسلامی انجمنوں سے مفاہمت
۲۴۶	سلطان کی معزولی	۲۲۶	پیرس کی انقلابی کانگریس
۲۴۸-۲۷۵	نوجوان ترک	۲۲۶	مقدونیا کا انتخاب
	۲۹۳ ۷ ۳۲۸	۲۲۹	انجمن کی احتیاطی تدبیر
	اندرونی مخالفتیں، عیسائی	۲۳۰	عورتوں کی خدمات
۲۴۹	غیر ترک مسلمان	۲۳۰	خفیہ جلسے اور مخفی ممبروں کا داخلہ

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۲۶۸	سقوطِ اورنہ	۲۵۰	ترک
۲۶۹	سقوطِ طری	۲۵۰	بیرونی دشمن
۲۷۰	صلح نامہ لندن ۳۰ مئی ۱۹۱۳ء	۲۵۰	روس اور آسٹریا کی اسکیم
۲۷۰	اتحاد میں افتراق	۲۵۱	بلغاریا
۲۷۳	آغاز جنگ جون ۱۹۱۳ء	۲۵۲	بوسنیا و ہرزیگووینا
۲۷۳	جنگ تقسیم	۲۵۲	طرابلس
۲۷۴	فتحِ اورنہ	۲۵۴	جنگ طرابلس
۲۷۴	عارضی صلح	۲۵۵	انور پے
۲۷۴	صلح نامہ بخارست	۲۵۷	صلح نامہ لوزان
۲۷۵	جنگ کے نتائج	۲۵۸	بلغاری ریاستوں کا اتحاد
۲۷۹-۲۸۱	جنگ عظیم	۲۵۹	روس کی سازشیں
	۳۲۹ تا ۳۵۵	۲۶۱	البانیا کی بغاوت
۲۸۰	جنگ عظیم کی شرکت	۲۶۱	ترکی کی اندرونی حالت
۲۸۴	دردانیال کی مہم	۲۶۳	جنگ بلقان
۲۸۵	معرکہ گیلی پولی	۲۶۴	عثمانی شکست کے اسباب
۲۸۸	ایشیائے کوچک	۲۶۵	یورپ کا پاسِ عہد
۲۸۹	عراق	۲۶۵	عارضی صلح
۲۹۰	عرب کی بغاوت	۲۶۶	صلح کانفرنس لندن
۲۹۱	مصر	۲۶۶	انقلاب وزارت
۲۹۱	بالشویک انقلاب مارچ ۱۹۱۷ء	۲۶۷	استقلالِ البانیا
۲۹۱	شام و فلسطین	۲۶۸	اعادہ جنگ

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۳۱۸	نی چری	۲۹۲	صلح نامہ مدرس
۳۲۰	باب عالی کے سپاہی	۲۹۳	خفیہ معاہدے
۳۲۱	جاگیری سپاہی	۲۹۵	اندرونی حالت
۳۲۲	قبو دان پاشا	۲۹۸	صلح کانفرنس کی بے پروائی
۳۲۳	ادارہ اسامیہ	۲۹۹	عدالیہ پرائی کی قبضہ
۳۲۴	تعلیمی نظام	۲۹۹	سمرنا پر یونانی قبضہ
۳۲۵	مفتی	۳۰۰	سمرن کا قتل عام
۳۲۶	نظام عدالت	۳۰۱	وطني تحریک
۳۲۷	قاضی	۳۰۲-۳۳	نظام حکومت
۳۲۷	صدر اعظم کی عدالت	۳۸۹ - ۳۵۶	
۳۲۸	ماتیں	۳۰۵	ادارہ حکومت
۳۲۹	انقلابی تبدیلیاں	۳۰۶	داخلہ کا طریقہ
۳۳۱	ممالک محروسہ	۳۰۷	ادارہ حکومت کا تعلیمی نظام
۳۳۲-۳۳۳	تعلیم	۳۱۰	بنیادی اصول
	۳۰۹ - ۳۹۰	۳۱۱	ارکان ادارہ کے حقوق
۳۳۴	دیہی دور	۳۱۲	سلطان
۳۳۷	دور تنظیمات	۳۱۶	قانون وراثت
۳۳۸	ابتدائی تعلیم	۳۱۶	دیوان
۳۳۹	ثانوی تعلیم	۳۱۷	وزراء
۳۴۰	اعلیٰ تعلیم	۳۱۷	دفتر دار اور نشانی
۳۴۶	چند خاص باتیں	۳۱۷	نیلر بے

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۳۷۹-۳۸۱	عثمانی ترک (۲)	۳۳۷	بعض باتوں کی کمی
	معاشرت، اخلاق و عادات ۳۶۸ - ۳۴۱	۳۳۷	نوجوان ترکوں کی تعلیمی اصلاحات
۳۸۰ ۳۸۶ ۳۸۸ ۳۸۹ ۳۹۲ ۳۹۶ ۳۹۸ ۳۹۸ ۴۰۱	معاشرت کی سادگی حمام قبوہ خانے شہری زندگی کی ایک خصوصیت حرم کی زندگی عورتوں کی بیرونی تفریحیں تعدد از دواج غلام اور کنیریں اخلاق و عادات	۳۵۱-۳۷۶	عثمانی ترک (۱)
			ادبی، تمدنی اور سیاسی تحریکیں ۳۴۰ - ۳۴۰
		۳۵۳	قدیم ادب
		۳۵۵	فطرت پسندانہ شاعری
		۳۵۵	عہد تنظیمات
		۳۵۵	شناسی
		۳۵۷	نامق کمال
		۳۶۱	عبدالحق حامد
۴۰۱	اخلاق و عادات	۳۶۲	ضیاء پاشا
		۳۶۲	ادبیات جدیدہ
		۳۶۶	حیات و کائنات کا ایک نیا تصور
		۳۶۹	پرنس کی سرگرمی
		۳۷۰	رسم الخط کا مسئلہ
		۳۷۱	تحریک اتحاد عثمانی
		۳۷۲	تحریک اتحاد اسلامی
		۳۷۶	تحریک اتحاد تورانی
		---	---
		---	---

—

—

—

—

—

—

8

.

بسم اللہ الرحمن الرحیم

محمود ثانی

۱۲۲۳ھ تا ۱۲۵۵ھ مطابق ۱۸۰۸ء تا ۱۸۳۹ء

بنی چری کی بغاوت: محمود کو تخت پر بٹھانے کے بعد مصطفیٰ پاشا بیرقدار نے صدارت عظمیٰ کے اختیارات اپنے ہاتھ میں لیے اور سب سے پہلے ان غداروں کو سزائیں دیں جنہوں نے سیم کو تخت سے اتارنے میں نمایاں حصہ لیا تھا، چنانچہ موسیٰ پاشا اور اس کے ساتھی قتل کر دئے گئے، اس کے بعد بیرقدار نے ایک نئی فوج یورپ کے فوجی نظام کے مطابق تیار کرنی شروع کی، بنی چری نے بظاہر کوئی مخالفت نہیں کی، لیکن حقیقتاً وہ صرف موقع کا انتظار کر رہے تھے، چنانچہ تھوڑے ہی دنوں کے بعد جب بیرقدار نے ان کی وفاداری پر اعتماد کر کے اپنی البانی اور بوسنی فوجوں کو قسطنطنیہ سے رخصت کر دیا اور صرف چار ہزار سپاہی رکھ چھوڑے تو بنی چری نے انتقام کے لیے تلواریں نکالیں اور البانی فوجوں کی روئنگی کے دوسرے ہی دن رات کے وقت انہوں نے صدر اعظم کے محل پر حملہ کر کے اس میں آگ لگا دی، بیرقدار نے بھاگ کر ایک سنگی برج میں پناہ لی جو اس وقت بارود خانہ تھا، وہاں اس نے بڑی جفا بازی سے باغیوں کا مقابلہ کیا لیکن کسی طرح میگزین میں آگ

لگ گئی اور بیرقدار جل کر ہلاک ہو گیا، اس کے بعد دو روز تک نئی چری اور نظام جدید کی فوجوں میں نہایت خون خوار جنگ برپا رہی، موخر الذکر کی مدد کے لیے قاضی پاشا جو بیرقدار کا دوست تھا، آٹھ ہزار سپاہیوں کے ساتھ مقوٹری سے آگیا، قبودان پاشا سعید علی نے بھی قاضی پاشا کا ساتھ دیا اور ایک جنگی جہاز سے نئی چری کی بارکوں پر گولے برسائے لیکن بالآخر تو بچپوں کے مل جانے سے جو شروع میں اس لڑائی سے بالکل الگ تھے نئی چری کی قوت بہت بڑھ گئی اور انھوں نے نظامی فوجوں کو مار کر بھگا دیا، وہ فاتحانہ جوش کے ساتھ سابق سلطان مصطفیٰ کو تخت پر بٹھانے کے لیے محل کی طرف بڑھے لیکن اس درمیان میں مصطفیٰ قتل کیا جا چکا تھا اور چوں کہ محمود کے سوا خاندان عثمانی کا کوئی دوسرا فرد سلطنت کا وارث نہ رہ گیا تھا، اس لیے مجبوراً انھیں محمود ہی کو اپنا سلطان تسلیم کرنا پڑا، تاہم انھوں نے محمود سے اپنے کل مطالبات منظور کرائے، ایک فرمان کے ذریعہ تمام جدید اصلاحات منسوخ کر دی گئیں اور قدیم نظام اپنی تمام برائیوں کے ساتھ از سر نو قائم ہو گیا، تین چار سال تک سلطنت کا انتظام دراصل نئی چری کے ہاتھوں میں رہا، صدر اعظم اور دوسرے وزراء کا عزل و نصب بھی انہی کی مرضی پر تھا، محمود اپنی بے بسی پر خون کے گھونٹ پی رہا تھا اور انتقام کے لیے صرف وقت کا منتظر تھا۔

زار اور پولین کا خفیہ معاہدہ: روس سے جنگ کا جو سلسلہ ۱۲۲۱ھ (۱۸۰۶ء) میں شروع ہوا تھا اور اس درمیان میں دوسرا کے لیے منقطع ہو گیا تھا صلح نامہ ٹلسیٹ (جون ۱۸۰۷ء) میں پولین اور زار الکزانڈر کے درمیان یہ بھی طے پایا تھا کہ روس اور سلطنت عثمانیہ کی جنگ ختم کر دی جائے اور روسی فوجیں مولڈویا اور ولاچیا سے ہٹائی جائیں لیکن جب تک فریقین میں شرائط صلح مستقل طور پر طے نہ ہو جائیں ترک ان صوبوں میں داخل نہ ہوں، چنانچہ اگست ۱۸۰۷ء میں معاہدہ سلوبوسیا (Slobosia) کے رو سے جنگ روک دی گئی اور تقریباً دو سال تک کوئی لڑائی نہیں ہوئی مگر روس نے معاہدہ کی خلاف ورزی کی اور اپنی فوجیں مولڈویا اور ولاچیا سے نہیں ہٹائیں، برخلاف اس کے الکزانڈر نے

نیپولین سے ایک خفیہ معاہدہ کر کے ان صوبوں کو اپنی سلطنت میں شامل کرنے کی کوشش کی دولت علیہ اس وقت فرانس کی حلیف تھی مگر نیپولین نے اسپین کو حاصل کرنے کی غرض سے سلطنت عثمانیہ کو روس کے رحم و کرم پر چھوڑ دینے میں تامل نہ کیا، اس مسئلہ پر الکز نڈر اور نیپولین میں زبانی گفتگو ہوئی اور صبح نامہ نلسیٹ میں ایک خفیہ دفعہ کا اضافہ کیا گیا کہ اگر باب عالی فرانس اور روس کی سفارشات کو قبول نہ کرے تو روسیہ اور قسطنطنیہ کے علاوہ اس کے تمام یورپین صوبے لے لیے جائیں اور یہ بھی طے پایا کہ صلح نامہ مذکور کی کھلی ہوئی دفعات میں مولڈ یویا اور ولاچیا کے تخیلہ سے متعلق جو دفعہ ہے عملاً اس کا کوئی لحاظ نہ کیا جائے، اتنا ہی نہیں بلکہ اس کے بعد نیپولین نے اپنے سفیروں کے ذریعہ اور پھر خود الکز نڈر سے گفتگو کر کے اس کے سامنے سلطنت عثمانیہ کی تقسیم کی تجویزیں پیش کیں، دو تجویزیں زیر بحث تھیں، پہلی یہ تھی کہ روس کو مولڈ یویا، ولاچیا اور بلغاریہ دے دیا جائے، فرانس، البانیا، یونان اور کینیڈیا پر قبضہ کر لے اور بوسنیا اور سرویا کے صوبے آسٹریا کے حوالہ کر دئے جائیں، دوسری تجویز یہ تھی کہ آسٹریا کو نہ صرف بوسنیا اور سرویا بلکہ مقدونیا بھی دے دیا جائے، البتہ سالونیکا کا شہر اور بندرگاہ مستثنیٰ کر دی جائے، فرانس کو البانیا، یونان اور کینیڈیا کے علاوہ تمام یونانی مجمع الجزائر، قبرص، شام اور مصر بھی دے دیئے جائیں روس، مولڈ یویا، ولاچیا، بلغاریہ، تھریس اور ان ایشیائی صوبوں کو جو باسفورس کے قریب واقع تھے، اپنی سلطنت میں شامل کر لے (۱) لیکن جیسا کہ کریسی نے لکھا ہے ”قومی رہبرنی کی اس عظیم اشان اسکیم“ میں قسطنطنیہ روس کے حصہ میں جا رہا تھا اور اس پر نیپولین کسی طرح راضی نہ ہوا، دوسری طرف الکز نڈر بھی قسطنطنیہ سے دست کش ہونے پر مطلق تیار نہ تھا، اس نقطہ پر پہنچ کر یہ ساری اسکیم درہم برہم ہو گئی، لارڈ ایلر سلع اس اسکیم پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے ”اس میں شبہ نہیں کہ نیپولین اپنے نئے حلیف ترکوں کو چھوڑ دینے اور ان کی سلطنت کے حصے بخرے کرنے کے لیے ان کے قدیم دشمن سے مل جانے پر راضی تھا،

تاریخ میں غداروں کی اس سے بڑی مثال نہیں مل سکتی۔“ (۱)

انگلستان سے صلح: ان تجویزوں کی ناکامی کے باوجود مولڈ یویا اور ولایچا پروسی فوجوں کا قبضہ بدستور قائم رہا، آسٹریا کے لیے یہ صورت حال نہایت تشویش ناک تھی، اسے روس اور فرانس کی سازش اور ان کے خفیہ منصوبوں کا شبہ ہو گیا تھا، یہ دیکھ کر کہ انگلستان ہی ایک ایسی طاقت ہے جو دولت عثمانیہ سے متحد ہو کر فرانس اور روس کے منصوبوں کو ناکام رکھ سکتی ہے اور اس طرح آسٹریا کے سر سے وہ خطرہ دور ہو سکتا ہے جو مولڈ یویا اور ولایچا پر روس کے قبضہ سے قائم تھا، اس نے دولت علیہ اور انگلستان کے درمیان صلح کرانے کی کوشش کی، چنانچہ اسی کی وساطت سے جنوری ۱۸۰۹ء میں صلح نامہ درانیال کا تعلق ہو گیا۔

روس سے جنگ: روس کے رویہ سے ترکوں میں سخت برہمی پھیلی ہوئی تھی، چنانچہ جب ان کی خواہش کے مطابق باب عالی نے جنگ کا اعلان کیا تو سلطنت کے ہر حصہ سے بکثرت رضا کار محاذ پر جانے کے لیے جمع ہونے لگے لیکن فوج کا نظام اس قدر خراب تھا کہ ان پر جوش رضا کاروں کی خدمت سے زیادہ فائدہ نہ اٹھایا جاسکا، ۱۸۰۹ء میں روسی جنرل بگریشن (Bagration) نے دریائے ڈنیوب کو عبور کر کے متعدد تترکی قلعوں پر قبضہ کر لیا، دوسرے سال سلسٹر یا کے اہم قلعہ پر بھی روسیوں کا قبضہ ہو گیا، اس کے بعد انھوں نے روستخچ پر حملہ کیا، لیکن وہاں انھیں شدید نقصان کے ساتھ پسپا ہونا پڑا مگر اسی سال انھوں نے صدر اعظم کی فوج کو شکست دے کر روستخچ پر دوبارہ حملہ کیا، اب کی بار وہ کامیاب رہے اور روستخچ کے علاوہ سبسٹو اور بعض دوسرے قلعوں پر بھی ان کا قبضہ ہو گیا، سبسٹو کے بعد انھوں نے شولہ پر قبضہ کرنے کی کوشش کی جو کہ بنقان کو عبور کرنے کے لیے ضروری تھا لیکن اس میں وہ کامیاب نہ ہو سکے۔

اس درمیان میں الکزنڈر اور نیپولین کے تعلقات کشیدہ ہو گئے تھے، ۱۸۱۱ء میں

الکزنڈر کو نیولین کی طرف سے اس حد تک خطرہ لاحق ہوا کہ اس نے سلطنت عثمانیہ کے خلاف روسی فوجوں کے جراحانہ اقدام کو بالکل روک دیا اور اپنے جنرلوں کو حکم دیا کہ صرف مدافعانہ جنگ جاری رکھیں، ترک بڑی بہادری سے لڑتے ہوئے آگے بڑھتے گئے، یہاں تک کہ انھوں نے دریائے ڈینیوب کو عبور کر لیا مگر اپنے افسروں کی نااہلی کی وجہ سے انھیں آخر میں شکست ہوئی، یہ وہ وقت تھا جب الکزنڈر کو برلنہ نیولین کے حملہ کا اندیشہ تھا اور وہ اپنی تمام قوتیں اس کے مقابلہ کے لیے محفوظ رکھنا چاہتا تھا، اس لیے فتح یاب ہونے کے باوجود اس نے باب عالی سے صلح کی گفتگو شروع کر دی مگر چونکہ وہ سر آبیہا کے علاوہ مولڈویا اور ولاچیا کے لینے پر بھی مصر تھا اور محمود نے یہ مطالبہ سختی سے مسترد کر دیا، اس لیے صلح کی کوشش ابتدا میں ناکام رہی، اس اثنا میں نیولین کے حملہ کا خطرہ بڑھتا ہی جاتا تھا اور الکزنڈر کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ جس قدر جلد ممکن ہو ترکوں سے صلح کر کے اس کے مقابلہ کے لیے تیار ہو جائے، چنانچہ صلح کی گفتگو پھر شروع ہوئی اور آخر کار ۱۶ جمادی الاولیٰ ۱۲۲۷ھ مطابق ۲۸ مئی ۱۸۱۲ء کو صلح نامہ بخارسٹ پر دولت عثمانیہ اور روس کے وکلا کے دستخط ہو گئے۔

صلح نامہ بخارسٹ: اس صلح نامہ کے رو سے دریائے پرتھ دونوں سلطنتوں کے درمیان حد فاصل قرار پایا، ولاچیا کا پورا صوبہ اور مولڈویا کا بڑا حصہ جو دریائے پرتھ کے مغرب میں واقع تھا، دولت عثمانیہ کو واپس کر دیا گیا، سر آبیہا اور مولڈویا کے ایک جزیرہ پر روس کا قبضہ باقی رہا، صلح نامہ کی ایک دفعہ سرویا سے متعلق بھی تھی، سلطان نے اہل سرویا کی گذشتہ باغیانہ شورشوں کو معاف کر دیا اور ملک کے داخلی معاملات کا انتظام انہی کے ہاتھوں میں دے دیا، خراج کی رقم بھی کم کر دی گئی اور اس کی وصولی ٹھیکہ داروں کے ہاتھ سے نکال کر شاہی خزانہ کے عہدہ داروں کے سپرد کر دی گئی، سرویا پر سلطان کی فرماں روائی باقی رکھی گئی اور یہ طے پایا کہ بلغراد اور دوسرے قلعوں میں ترکی دستے پھر متعین کر دیے جائیں۔

سرویہ کی خود مختاری: لیکن سرویا اس فیصلہ سے مطمئن نہ ہوا اور تھوڑے ہی دنوں کے بعد اس نے پھر بغاوت شروع کر دی، قلعوں پر سروی فوجوں کا قبضہ تھا، باب عالی نے معاہدہ کے بموجب ان کے تخلیہ کا مطالبہ کیا، اہل سرویا نے اس کے جواب میں حکومت خود اختیاری کی تفویض چاہی، ہر فریق اپنے مطالبہ کی تعمیل کو مقدم قرار دیتا تھا، نو:ت یہاں تک پہنچی کہ ۱۸۱۳ء میں سلطان نے سرویا کے قلعوں پر قبضہ کرنے کے لیے ایک فوج روانہ کی، قرہ جارج نے پھر علم بغاوت بند کیا لیکن اب کی بار وہ بہت جلد ہمت ہار گیا اور اپنا تمام زور جو ابرہہ دفن کر کے سرویا سے بھاگ گیا اور آسٹریا کی سلطنت میں پناہ لی، ترکوں نے سرویا کے اکثر حصوں پر قبضہ کر لیا، امید تھی کہ پورے صوبہ پر ان کا تسلط ہو جائے گا لیکن قرہ جارج کے فرار ہونے کے بعد میلوش اور نیوویچ (Milosch Obrenowitch) نامی ایک دوسرا قومی سردار سامنے آ گیا جس نے ۱۸۱۵ء میں اہل وطن کو منظم کر کے نہایت بہادری کے ساتھ ترکوں کا مقابلہ کیا اور چند ہی مہینوں میں ترکی دستوں کو شکست دے کر سرویا کے تمام علاقوں سے نکال دیا، صرف قلعوں پر ترکوں کا قبضہ باقی رہ گیا، دوسرے سال سلطان نے ایک اور فوج روانہ کی لیکن یہ سرحد ہی تک پہنچ کر رک گئی اور صلح کی گفتگو شروع ہو گئی، جس کا سلسلہ کئی سال تک جاری رہا، واقعہ یہ تھا کہ باب عالی اس وقت زیادہ فوجیں سرویا میں بھیجنے کے لیے تیار نہ تھا، نیولین کی فتوحات کا خاتمہ وائزلو کی شکست اور اس کی گرفتاری پر ہو چکا تھا اور یورپ کی بڑی بڑی سلطنتیں ویانا میں ایک کانگریس منعقد کر کے یورپ کا نقشہ از سر نو مرتب کر رہی تھیں، اس کانگریس میں دولت عثمانیہ شریک نہیں کی گئی لیکن سرویا کا ایک وفد جو مدد کی درخواست لے کر گیا تھا باریاب کیا گیا، روس، آسٹریا اور پرشیا کے فرماں رواؤں کا اتحاد مقدس باب عالی کی تشویش کا باعث تھا، کیوں کہ روس کو حملہ کرنے کے لیے صرف بہانہ کی ضرورت تھی اور سرویا کی حمایت دولت عثمانیہ کو نقصان پہنچانے کا ایک اچھا ذریعہ تھی، ان حالات میں محمود نے مناسب سمجھا کہ جنگ جاری رکھنے کے بجائے سرویا والوں سے صلح کر لی جائے،

صلح نامہ میں اہل سرویا کو عام معافی دی گئی، محاصل کی وصولی انہی کے سپرد کر دی گئی، بارہ سرداروں کا ایک دیوان قائم کر کے ہر سردار کے انتخاب کا حق اس کے ضلع کے باشندوں کو دیا گیا، ملکی، مذہبی اور عدالتی خود اختیاری تسلیم کر لی گئی اور اہل سرویا کو ہتھیار رکھنے کی اجازت اور اپنا ایک امیر منتخب کرنے کا حق عطا کیا گیا، سرویا پر سلطان کی فرماں روائی اب بھی قائم رکھی گئی، گو یہ فرماں روائی سالانہ خراج اور بغیر ادنیٰ چند دوسرے قلعوں پر قبضہ رکھنے تک محدود تھی۔

میلوش حکمران سرویا: قرہ جارج نے ترکوں کو شکست کی خبر سن کر پھر وطن کا رخ کیا، ۱۸۱۷ء میں وہ خفیہ طور پر سرویا کی سرحد میں داخل ہوا مگر وہاں اب میلوش کی حکومت تھی، قرہ جارج کی واپسی سے میلوش کو تشویش پیدا ہوئی کیوں کہ پہلی جنگ آزادی میں اس کی شجاعت اور جفا فروشانہ خدمات نے اہل سرویا کے دلوں پر اس کی محبت اور احترام کے جوفلوش بٹھادے تھے، وہ دوسری جنگ میں اس کے فرار ہو جانے کے بعد بھی بالکل محو نہیں ہوئے تھے، میلوش نے اپنی سرداری کو خطرہ میں دیکھ کر قرہ جارج کو فریب سے قتل کر دیا اور اپنی وفاداری کے ثبوت میں اس کا سر کاٹ کر باب عالی میں بھیج دیا، اسے اب کسی حریف کا خوف نہ تھا، نومبر ۱۸۱۷ء میں تمام ضلعوں کے سرداروں اور مذہبی پیشواؤں نے اسے سرویا کا حکمران (Prince) منتخب کر کے ملک کی حکومت اس کے خاندان کے لیے سلا بعد نسل مستقل کر دی، شروع میں سلطان نے یہ لقب تسلیم نہیں کیا لیکن معاہدہ اور نہ کے بعد ۱۸۳۰ء میں اس نے حکمران کا لقب میلوش اور اس کے جانشینوں کے لیے باضابطہ طور پر منظور کر لیا۔

سلطنت کی عام کمزوری: سرویا کی بغاوت باب عالی کے ضعف کی تنہا مثال نہ تھی سلطنت کے ہر حصہ میں مرکزی حکومت کی کمزوری نمایاں تھی، پاشاؤں کی خود سری روز بروز بڑھتی جاتی تھی، اپیس میں علی پاشا والی یا نینا تقریباً خود مختار بن بیٹھا تھا اور اب وہ یونان، تھسلی اور جزائر ایونیئن کو اپنی حکومت میں شامل کرنے کا حوصلہ کر رہا تھا، اسی

طرح و دین، عکا اور بغداد کے پاشاؤں نے بھی چھوٹی چھوٹی خود مختار حکومتیں قائم کر لی تھیں، عرب میں وہابیوں نے تقریباً مکمل آزادی حاصل کر لی تھی اور حرمین شریفین پر بھی قبضہ کر لیا تھا، مصر میں محمد علی پاشا اپنے استقلال کی کوششوں میں مصروف تھا، ولاچیا، مولڈویا اور یونان کے صوبے بھی بغاوت کے لیے بالکل تیار تھے، سلطنت کا کوئی حصہ قابل اطمینان حالت میں نہ تھا، نئی چری جن کی شجاعت اور وفاداری پر دولت عثمانیہ کی قوت کا مدار تھا اور جنہوں نے اول تین صدیوں میں سلطنت کے حدود ایشیا، یورپ اور افریقہ کے وسیع رقبوں تک پہنچائے تھے اب خود اپنی حکومت کے لیے ایک مستقل اور زبردست خطرہ بن کر رہ گئے تھے، روس سے جوڑائیاں ہوئیں یا سرکش پاشاؤں کے مقابلہ میں جو ہمیں پیش آئیں ان میں اس بات کا اندازہ اچھی طرح ہو گیا تھا کہ نئی چری میں وہ پہلی سی قوت باقی نہیں رہی، جہاں تک فوجی نظم و ضبط کا تعلق تھا انیسویں صدی کے شروع میں وہ اس سے تقریباً خالی ہو چکے تھے، انہوں نے ان فوجی اصلاحات کے قبول کرنے سے جو یورپ میں جاری کی گئی تھیں اور جن کی وجہ سے یورپین فوجوں کی برتری کا ثبوت ہر جنگ میں ملتا جاتا تھا قطعاً انکار کر دیا تھا، وہ ہر اصلاح کے مخالف تھے، خواہ فوجی ہو یا ملکی، سلطنت کے مختلف حصوں میں شورش برپا رکھنا ان کا مرغوب مشغلہ تھا، دشمن کے مقابلہ میں تو ان کے قدم جمتے نہ تھے لیکن بغاوت اور سرکشی کے ذریعہ اپنی قوت کے مظاہرہ سے وہ کبھی نہ چوکتے، سلطان پر دباؤ ڈال کر جس شخص کو چاہتے وزارت کے عہدہ پر مامور کرتے اور جس وزیر سے ناخوش ہوتے اسے معزول کر کے قتل کر دیتے، قسطنطنیہ کے باشندے ان کے خوف سے لرزاں رہتے تھے، صوبوں میں وہ ہر باغی پاشا کی رشوت قبول کرنے پر تیار ہو جاتے، ان کی سرکشی کا تجربہ محمود سے قبل بھی متعدد سلاطین کو ہو چکا تھا اور انہوں نے سلطنت کے امن و امان کے لیے نئی چری کے استیصال کی ضرورت بہت پہلے محسوس کر لی تھی لیکن یہ کام اتنا مشکل تھا کہ اس کے لیے محمود جی جیسے صاحب عزم کی ضرورت تھی، تاہم اسے بھی اٹھارہ سال تک ان کی شورشیں انتہائی ضبط و تحمل کے ساتھ

برداشت کرنی پڑیں۔

افریقی مقبوضات: یوں تو سلطنت کے ہر حصہ میں کمزوری کی علامتیں ظاہر تھیں لیکن اس کا سب سے زیادہ اثر افریقی مقبوضات میں نمایاں تھا، جب سے دولت عثمانیہ کی بحری قوت میں ضعف شروع ہوا، الجزائر، تونس اور طرابلس کے صوبے رفتہ رفتہ خود مختار ہوتے گئے اور انیسویں صدی کے شروع میں انھوں نے قریب قریب مکمل آزادی حاصل کر لی، دولت عثمانیہ سے ان کا تعلق اس حد تک منقطع ہو چکا تھا کہ یورپین حکومتیں ان کے بحری ڈاکوؤں کو جب موقع ملتا گرفتار کر لیتیں اور ان کے اس فعل سے باب عالی کو کوئی شکایت نہ ہوتی، افریقہ کے عثمانی مقبوضات میں سب سے زیادہ اہم صوبہ مصر تھا، لیکن وہاں بھی دولت علیہ کا اقتدار بہت کم رہ گیا تھا، عرصہ سے مصر کی اصلی حکومت مملوکوں کے ہاتھ میں تھی، باب عالی کی طرف سے جو پاشا وہاں کا والی مقرر کر کے بھیجا جاتا تھا، اس کا کام صرف یہ رہ گیا تھا کہ خراج کی معینہ رقم وصول کر کے پابندی کے ساتھ قسطنطنیہ بھیجتا رہے، مملوک اپنی منظم فوجی قوت کے زور سے سارے ملک پر چھائے ہوئے تھے، ۱۷۹۸ء میں نپوین نے انھیں شکست دے کر مصر پر قبضہ کر لیا تھا مگر تھوڑے ہی عرصہ کے بعد فرانسیسی فوج مصر سے نکل جانے پر مجبور ہوئی اور ۱۸۰۲ء میں صلح نامہ امیان کے رو سے یہ صوبہ دولت علیہ کو واپس کر دیا گیا، واپسی کے بعد بھی مصر پر باب عالی کی حکومت صرف نام کے لیے تھی، اصلی اقتدار مملوکوں کا تھا جن کی قوت نپولین کے حملہ سے کمزور تو ضرور ہو گئی تھی مگر فنا نہیں ہوئی تھی، ۱۸۰۵ء میں سلطان نے محمد علی کو مصر کا پاشا مقرر کر کے بھیجا، محمد علی کے تقرر سے مصر کی تاریخ کا ایک نیا دور شروع ہوا۔

محمد علی: محمد علی ۱۷۶۵ء میں کوالا نامی ایک قصبہ میں پیدا ہوا جو مقدونیا اور تھریس کی سرحد پر واقع تھا، اس کا باپ ایک چھوٹا سا زمیندار تھا، بچپن ہی میں وہ یتیم ہو گیا، اس نے پڑھنا لکھنا کچھ نہ سیکھا، وہ اپنے ایک عزیز کے دیوان میں جو رشتہ میں اس کا چچا ہوتا تھا ملازم ہو گیا، یہ شخص باب عالی کی طرف سے کوالا کا حاکم تھا، ابتدا میں محمد علی نے تمباکو کی

تجارت شروع کی جو مہدو دنیا کی بہت زرخیز تجارت تھی، لیکن جب ۱۷۹۸ء میں نیپولین نے مصر پر حملہ کیا تو باب عالی کے حکم سے محمد علی کے چچانے تین سوالبانی سپاہیوں کا ایک دستہ مصر روانہ کیا اور اپنے لڑکے علی آغا کو اس دستہ کا افسر مقرر کر کے محمد علی کو بحیثیت اس کے مشیر کے ساتھ کر دیا، اپنی دماغی قابلیت کی وجہ سے محمد علی بہت جلد اس دستہ کا حقیقی افسر بن گیا، گو بظاہر فوج کی کمان علی آغا کے ہاتھ میں تھی اس کے بعد چند معرکوں میں جو فرانسیسی فوج سے مصر میں پیش آئے محمد علی نے اپنی قابلیت کے جوہر دکھائے، جس کے صلہ میں قبو دان پاشا نے جو ترکی فوج کا سپہ سالار بھی تھا ۱۸۰۱ء میں اسے ترقی دے کر مصر کے نئے والی خسرو پاشا سے نہایت پر زور الفاظ میں اس کی سفارش کی، محمد علی ذہانت اور قابلیت میں خسرو پاشا سے بڑھا ہوا تھا، چنانچہ تھوڑی ہی مدت میں اس نے باب عالی پر اپنی قابیلیت کا سہ کچھ ایسا بٹھایا اور ایسی تدبیریں کیں کہ ۱۸۰۵ء میں خسرو پاشا واپس بلا لیا گیا اور اس کی جگہ خود محمد علی مصر کا حاکم مقرر کر دیا گیا، ۱۸۰۷ء میں اس نے ایک انگریزی فوج کو ہراندہ پر قابض ہو گئی تھی شکست دے کر بھگادیا، اس کے بعد اس کا اقتدار تیزی سے ساتھ بڑھتا گیا، یہاں تک کہ پینتیس سال کی عمر میں وہ مصر کا سب سے زیادہ طاقتور آدمی بن گیا، یہ دیکھ کر مملوکوں نے اس کی مخالفت شروع کی، محمد علی ان کی قوت سے افسوس تھا اور جانتا تھا کہ جب تک وہ فنا نہ ہو جائیں گے مصر پر پوری حرج تسلط قائم نہ ہو سکے گا، چنانچہ اس نے حملہ کر کے انھیں کئی بار شکست دی اور ان کی قوت کو بہت کچھ نقصان پہنچایا، لیکن مملوکوں کا زور اب بھی کسی قدر باقی تھا، اب محمد علی نے فریب سے کام لیا اور ۵ صفر ۱۲۲۶ھ (یکم مارچ ۱۸۱۱ء) کو ان کے تقریباً پانچ سو بڑے بڑے سرداروں کو قہرہ کے قلعہ میں مدعو کیا اور یہ خواہش ظاہر کی کہ فریقین باہم صلح کر کے وہابیوں سے استیصال کے لیے متحدہ طور پر ایک مہم مجاز کو روانہ کریں، مملوک اس فریب میں آ گئے اور ان کے تمام سردار صلح کی گفتگو اور مجاز کی مہم پر غور کرنے کے لیے محمد علی کی پر تکلف دعوت میں شریک ہوئے، کھانے کے بعد محمد علی نے قلعہ کے دروازے بند کروائے اور پھر اپنے

الہانی سپاہیوں کو اشارہ کیا، انھوں نے دیکھتے دیکھتے تمام مملوک سرداروں کو اپنی گولیوں کا نشانہ بنالیا، صرف ایک سردار اس قتل عام سے بچ کر نکل گیا، وہ قلعہ کی تیس فٹ بلند دیوار سے گھوڑا کودا کر بھاگا، باقی سب ہلاک ہو گئے، اس کے بعد تمام ملک میں مملوک کا قتل عام شروع ہو گیا اور ان کی پوری آبادی تقریباً نیست و نابود ہو گئی۔

حجاز کی مہم: محمد علی اب پورے مصر کا مالک تھا، ملک میں امن و امان قائم کرنے کے بعد اس نے اپنے بیٹے طوسن پاشا کی سرکردگی میں وہابیوں کے خلاف حجاز کو فوجیں روانہ کیں، طوسن پاشا نے وہابیوں کو شکست دے کر مدینہ منورہ کو ان کے قبضہ سے چھڑا لیا مگر مکہ معظمہ پر اب بھی انہی کا تسلط تھا اور انھوں نے حوسن پاشا کو طائف میں محصور کر دیا، یہ معنوم کر کے محمد علی پاشا خود مصر سے روانہ ہوا اور شعبان ۱۲۲۸ھ (اگست ۱۸۱۲ء) میں مکہ معظمہ پہنچ کر شریف غالب کو گرفتار کر لیا اور اسے مصر بھیج دیا اور اس کی جگہ یحییٰ بن سرور کو شریف مکہ مقرر کیا، مکہ معظمہ کے قبضہ سے نکل جانے سے وہابیوں کی قوت کو سخت صدمہ پہنچا، ۱۹ ربیع الآخر ۱۲۲۹ھ (۱۷ اپریل ۱۸۱۳ء) کو ان کے امیر سعود کا انتقال ہو گیا، اس کے بعد حجاز میں امن و امان ہو گیا اور وہاں بکثرت فریضہ حج ادا کرنے کے لیے آئے، محمد علی پاشا بھی حج سے فارغ ہو کر ۱۵ ربیع الثانی ۱۲۳۰ھ کو مصر پہنچ گیا۔

وہابی بغاوت کا انسداد: امیر سعود کے انتقال کے بعد اس کے فرزند اور جانشین عبداللہ بن سعود نے طوسن پاشا سے صلح کی گفتگوں اور اپنے پیادہ تخت شہرہ ریہ کو اس کے حوالہ کر دینا منظور کیا لیکن جب طوسن پاشا نے اس کی اطلاع محمد علی کو دی تو اس نے مصر سے یہ جواب بھیجا کہ ابن سعود کا قطعاً طغیان کی ایک لازمی شرط ہے اور اگر وہ اسے منظور نہ کرے گا تو ایک تازہ فوج اس کے مقابلہ میں روانہ کی جائے گی، اس اثنا میں یہ سن کر مصری فوج محمد علی پاشا سے باغ ہو گئی ہے۔ طوسن پاشا حجاز سے روانہ ہو گیا اور یقیناً ۱۲۳۰ھ (نومبر ۱۸۱۹ء) میں قاہرہ پہنچ گیا۔

قاہرہ میں امن قائم ہونے کے بعد محمد علی پاشا نے وہابیوں پر حملہ کرنے کے

لیے از سر نو تیاری شروع کر دی اور اپنے بڑے لڑکے ابراہیم پاشا کی سرکردگی میں ایک فوج روانہ کی، ابراہیم پاشا مدینہ منورہ کی زیارت کے بعد بلا نجد کی طرف روانہ ہوا اور رس اور بعض دوسرے شہروں پر قبضہ کرتا ہوا ۲۹ جمادی الاولیٰ ۱۲۳۳ھ مطابق ۶ اپریل ۱۸۱۸ء کو شہر درعیہ کے سامنے پہنچا، جس میں عبداللہ بن سعود اپنے زبردست لشکر کے ساتھ مقیم تھا اور اس شہر کا محاصرہ کر لیا، سات ماہ کے محاصرہ کی شدت سے عاجز آ کر عبداللہ بن سعود نے ابراہیم پاشا سے صلح کی درخواست کی اور شرائط صلح طے کرنے کے لیے خود ابراہیم پاشا کے خیمہ میں آیا، ابراہیم پاشا نے اس کی بڑی تعظیم و تکریم کی، آخر کار ان شرائط پر صلح قرار پائی کہ درعیہ ابراہیم پاشا کے حوالہ کر دیا جائے گا لیکن وہاں کے باشندوں کے جان و مال کی ہر طرح حفاظت کی جائے گی، کوبہ دری اور دوسرے جواہرات جن پر مدینہ منورہ کی فتح کے وقت وہابیوں نے قبضہ کر لیا تھا، واپس کر دئے جائیں گے اور عبداللہ بن سعود سلطان کی خواہش کے مطابق قسطنطنیہ بھیج دیا جائے گا، چنانچہ عبداللہ بن سعود مصر کے راستہ سے قسطنطنیہ روانہ ہو گیا، قسطنطنیہ پہنچنے کے بعد ۱۹ نومبر ۱۸۱۹ء کو وہ قتل کر دیا گیا۔

محمد علی کی بغاوت: اس کے بعد محمد علی نے سنار اور نیویا کے علاقے فتح کر کے مملکت مصر میں شامل کر لیے، اس نے یورپ کے جدید فوجی نظام کے مطابق ایک لاکھ سپاہیوں کی فوج تیار کی تھی، جس کی تنظیم و تربیت کے لیے اس نے فرانس کے ان آزمودہ کار فوجی افسروں کو بڑی بڑی تنخواہوں پر اپنے ہاں بلا لیا تھا جو پولین کی ماتحتی میں کام کر چکے تھے، اس نے فرانسیسی انجینیئروں کی مدد سے ایک زبردست بحری بیڑہ بھی تعمیر کرایا، گودی اور بندرگاہ بنوائی، توپخانے اور سلح خانے قائم کیے اور اسکندریہ سے قاہرہ تک ایک نہر تعمیر کرائی، حکومت اور انتظام کا ملکہ اسے فطرت کی طرف سے ملا تھا، وہ دشمنوں کے لیے نہایت سخت تھ مگر رعایا کے ساتھ اس کا سلوک ہمیشہ عدل و انصاف کا تھا، اس کی عدالت میں ہر مذہب اور فرقہ کے لوگوں کے ساتھ یکساں انصاف کیا جاتا تھا،

مصر والوں پر اس کے محصوروں کا بار گراں تھا اور اس کی فوج میں جبری بھرتی کے فوائمن بھی سخت تھے، تاہم اس کے عہد حکومت میں مکہ میں جس قدر امن و امان اور خوشحالی پھیلی اس سے پہلے مدت سے نہیں دیکھی گئی تھی، محمد علی نے نہ صرف مصر میں امن و امان قیام کیا، بلکہ ۱۸۲۵ء میں سلطان کی طلب پر اپنی فوجیں یونان میں بھیج کر وہاں کی زبردست بغاوت کا بھی استیصال کر دیا۔

بغاوت یونان: یونان کی بغاوت مختلف اسباب کا نتیجہ تھی، یہ اسباب مدت سے جمع ہو رہے تھے اور ان میں سے بعض خود دولت عثمانیہ کے پیدا کردہ تھے مثلاً ترکوں نے جب کوئی ملک فتح کیا تو وہاں کے باشندوں سے اپنی فرماں روائی تسلیم کرانے کے بعد صرف خراج لینے پر قناعت کی اور ان کے مذہب، ان کی زبان اور ان کے رسم و رواج سے کوئی تعرض نہیں کیا، انھوں نے مفتوحین کی عصبیت کبھی فضا نہیں کی، ان کا یہ طرز عمل تمام مفتوحہ قوموں کے ساتھ تھا مگر اس عموماً یونانیوں کے ساتھ انھوں نے خاص خصوصیت برتی، بقول سر چارلس ایلیٹ (Eliot) ”جنوبی مشرقی یورپ پر حکومت ترکوں کی تھی لیکن اس (انیسویں) صدی تک اس کے مذہب، تعلیم، تجارت اور مالیات کا انتظام یونانیوں کے ہاتھ میں تھا“ (۱) اتنا ہی نہیں بلکہ امور سلطنت کا انتظام بھی بہت کچھ یونانیوں ہی کے ہاتھ میں تھا، ترکوں نے یونان اور اس کے متعلقہ جزائر فتح کرنے کے بعد مقامی حکومت بڑی حد تک یونانیوں کو سپرد کر دی تھی، بحراؤڈریاٹک اور بحر ائجین کے یونانی جزائر میں یونانیوں کی خود اختیاری خاص طور پر نمایاں تھی، ان جزیروں میں بڑے بڑے تاجراور جہاز راں تھے، جنھوں نے بغاوت میں خصوصیت کے ساتھ حصہ لیا، شیویل اپنی کتاب ”جزیرہ نماے بلقان اور مشرق اوقی“ میں یونانیوں کی مقامی حکومت خود اختیاری کے متعلق بیان کرتا ہے کہ ”بحراؤڈریاٹک کے جزیروں میں یہ حیرت انگیز حدود تک پہنچ گئی تھی، اس خطہ میں ہر جزیرہ، اکثر کسی تحریری سند شاہی کی بنا پر اپنے معاملات کا انتظام خود کرتا تھا

اور سال میں ایک بار کے علاوہ جب خراج کی معبودہ رقم وصول کرنے کے لیے عثمانی عہدہ دار آتا تھا شاید ہی کبھی کوئی سرکاری عہدہ دار وہاں نظر آتا ہو، پھر تھسلی اور اپیرس کے پہاڑی علاقوں میں گاؤں کے باشندے نہ صرف اپنے ہاں کے ملکی انتظامات کے بلکہ تھے بلکہ انھیں ہتھیار رکھنے کا غیر معمولی حق بھی حاصل تھا، ان کے مسلح دستوں نے جوار مانولی (Armatoles) کے نام سے مشہور تھے، مفصلات کو ڈاکوؤں سے پاک رکھنے کی خدمت اپنے ذمہ لے رکھی تھی، یونانیوں میں حکومت خود اختیاری کی آخری مثال کے طور پر پیلوپونیسس (Peloponnesus) کی حالت پر غور کیجیے جو موجودہ زمانہ میں موریا کے نام سے زیادہ مشہور ہے، اس کی فراہمی میں آسانی پیدا کرنے کی غرض سے موریا کے پاشا نے ان کی ذمہ داری دولت مند عیسائی زمینداروں کی ایک جماعت پر عائد کر دی تھی جن کو پرائمیٹ (Primates) کہتے تھے اور یہ لوگ ضاموں اور دیہاتوں کے منتخب شدہ نمائندوں سے مدد لیتے تھے، یہ پرائمیٹ ترکوں کے گماشتہ ہونے کی حیثیت سے اگرچہ نادانستہ اور اکثر شاید دانستہ بھی اپنے غریب ہم مذہبوں پر مظالم کرتے رہتے تھے تاہم چونکہ وہ حکومت اور رعایا کے درمیان اہل موریا کی ایک نمائندہ جماعت تھے اس لیے موافق حالات میں ایک حقیقی مجلس شوری کی حیثیت اختیار کر سکتے تھے۔ ()

یونانیوں کی بحری قوت: جیسا کہ اوپر ذکر ہوا کہ بحرا یڈریا تک اور بحر ائجین کے جزیروں میں تاجروں اور ماہر جہازرانوں کی ایک کثیر تعداد نے قومی تحریک میں بہت نمایاں حصہ لیا، ترکی بحریہ میں جہازرانوں کا بڑا حصہ ابتدائی سے یونانیوں پر مشتمل تھا اور سلطنت عثمانیہ کی تجارت بھی بیشتر انہی کے ہاتھوں میں تھی، اٹھارہویں صدی میں دولت مدیہ اور روس کی جنگ میں یونانیوں کو اپنی تجارت کے فروغ دینے کا بہت موقع ملا، صلح نامہ کینر رچی (۱۷۷۴ء) کے ضمیمہ کے طور پر ۱۷۸۳ء میں روس اور دولت علیہ میں ایک تجارتی معاہدہ ہوا جس کے رو سے یونانی جہازوں کو مخصوص تجارتی رعایتیں اور روسی علم

استعمال کرنے کی اجازت حاصل ہو گئی، اس کے بعد جب نیپولین کے عہد میں فرانس اور انگلستان کی جنگ نے ترکی جہازوں کے سوا تمام جہازوں کی ناکہ بندی کر دی تو یونانیوں نے روسی علم چھوڑ کر ترکی علم استعمال کرنا شروع کر دیا، غرض اس زمانہ میں بھی جب یورپ کی تمام قومیں نیپولین کے اٹھائے ہوئے طوفان میں موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا تھیں یونانی اپنی تجارت کو برابر ترقی دیتے رہے اور انھوں نے نہ صرف بہت زیادہ دولت پیدا کر لی بلکہ جہاز رانی کے فن میں بھی ملکہ حاصل کر لیا، چونکہ شمالی افریقہ کے بحری قزاقوں سے انھیں خطرہ رہا کرتا تھا، اس لیے وہ اپنے تجارتی جہازوں کی حفاظت کے لیے کچھ توپیں بھی رکھنے لگے تھے، اس طرح آہستہ آہستہ انھوں نے ایک ایسا بیڑا تیار کر لیا تھا جو آئندہ جنگ میں کام آ سکتا تھا۔

ارماٹولی اور کلیفت: بحری قوت کے علاوہ یونانیوں میں بری طاقت بھی ایک حد تک پیدا ہو گئی تھی جس کا بڑا ذریعہ ارماٹولی (Armatoli) اور کلیفت (Klephs) تھے، بازنطینی قیصروں کے عہد میں دروں اور سزکوں کی حفاظت کے لیے تھسلی کے سرحدی علاقوں کے وحشی پہاڑی باشندے ایک قسم کی بے ضابطہ ردیف (Militis) میں بھرتی کیے جاتے تھے، ان کو ارماٹولی کہتے تھے، سلاطین عثمانیہ نے اس نظام کو نہ صرف جاری رکھا بلکہ اسے ترقی دی، پناناچہ خود باب عالی کی پالیسی کی وجہ سے یونان کے پہاڑی باشندے کئی پشتوں سے اسلحہ کے استعمال کے عادی تھے اور پہاڑی لڑائیوں میں ملکہ حاصل کر چکے تھے، ارماٹولی کے دستوں میں جن کی حیثیت نیشٹل گارڈ کی تھی، صرف یونانی باشندے بھرتی کیے جاتے تھے اور ان کے افسر بھی تمام تر یونانی ہی ہوتے تھے، ابتداءً ان کو کلیفت یعنی پہاڑی ڈاکوؤں سے ملک کی حفاظت کے لیے تھھیار رکھنے کی اجازت دی گئی تھی اور اکثر ڈاکوؤں ہی کے سروہ سے وہ بھرتی بھی کیے جاتے تھے لیکن جب اٹھارہویں صدی کے آخر میں باب عالی کو ان کی تعداد اور تنظیم کی طرف سے اندیشہ پیدا ہوا تو اس نے ان کے دستے کم کرنے شروع کیے، یہ دیکھ کر ارماٹولی باغی ہو گئے اور

اپنے سابق ساتھیوں یعنی کلیفٹ کی جماعت میں شریک ہونے لگے، کلیفٹ و قنوق اپنے پہاڑی دزدوں سے نکل کر قرب وجوار کے باشندوں پر چھاپے مارا کرتے تھے، ان کی تعداد بھی زیادہ تھی اور ہتھیار بھی ان کے پاس بہت وافر مقدار میں رہا کرتے تھے، وہ اپنی قوت سے کسی قومی تحریک کو بہت کچھ مدد پہنچا سکتے تھے، یونان کی جنگ آزادی میں اراٹولی اور کلیفٹ کی خدمات خاص طور پر نمایاں ہیں۔

حکومت میں یونانیوں کا اقتدار: یونانیوں کو سلطنت عثمانیہ کے ملکی معاملات میں بھی بڑا اقتدار حاصل تھا، قسطنطنیہ کا ایک حصہ قنار کے نام سے مشہور تھا، اس میں یونانی کلیسا کا بطریق اور اونچے درجہ کے پادری اور اسقف رہا کرتے تھے، بعد میں بڑے بڑے دولت مند یونانیوں نے آکر اسی حصہ میں بودوباش اختیار کر لی، یہ لوگ کلیسا کے صیغہ مال کے گماشتے بھی تھے اور باب عالی کی طرف سے بھی محصول جمع کرتے تھے، رفتہ رفتہ سترہویں صدی عیسوی میں فناریوں کا ایک جدید سیاسی طبقہ قائم ہو گیا اور سلطنت عثمانیہ کے دفتروں میں اکثر یونانی عہدہ دار اسی طبقہ کے لوگ ہونے لگے، تاہم احمد کوپرلی کے صدر اعظم ہونے سے پہلے عثمانی دفتروں میں جو یونانی کام کرتے تھے ان کے عہدے زیادہ بلند نہ تھے لیکن ۱۶۶۹ء میں کینڈیا کی فتح کے بعد احمد کوپرلی نے اپنے سکریٹری پناپوتی (Panayoti) کے لیے جو ایک ممتاز فناری یونانی تھا ترجمان باب عالی (Dragoman of the Porte) کا ایک جدید عہدہ قائم کیا جو ایک نہایت اہم سیاسی عہدہ بن گیا، پناپوتی کے بعد ایک دوسرا لائق یونانی اس عہدہ پر مقرر کیا گیا، رفتہ رفتہ یہ عہدہ وزارت امور خارجہ کا عہدہ بن گیا، جس پر یونانیوں ہی کا تقرر ہوتا رہا اور سلطنت عثمانیہ کے غیر ملکی معاملات زیادہ تر انہی کے ہاتھوں میں رہے، کچھ دنوں کے بعد عثمانی بحریہ کے لیے بھی ایک مترجم کا عہدہ قائم کیا گیا اور اسپر بھی ایک یونانی ہی مقرر کیا گیا، یہ مترجم عثمانی امیر البحر کے سکریٹری کا منصب رکھتا تھا اور چونکہ امیر البحر جزائر اٹیکنین کا گورنر بھی تھا اس لیے مترجم بحریہ (Dragoman of the Eleet) سے ان جزائر کی

یونانی آبادی کے تعلقات سرکاری طور پر قائم ہو گئے، اٹھارہویں صدی کے شروع میں مولڈ یو یا اور ولاچیا کی امارت بھی دوسرے بڑے بڑے عہدوں کی طرح یونانیوں کو دی گئی، یہ بڑے بڑے عہدہ دار اپنے ماتحت عہدوں پر اپنے ہی ہم وطن اور ہم قوم اشخاص کو مقرر کرنے لگے، یوں رفتہ رفتہ حکومت کے تمام شعبوں میں یونانیوں کا اقتدار روز بروز بڑھتا گیا۔

عام یونانیوں کی حالت: سلطنت عثمانیہ کی عام یونانی رعایا کی حالت بھی یورپ کی دوسری قوموں کے مقابلہ میں کہیں بہتر تھی، جارج فنلے اپنی مستند شہرہ آفاق تاریخ یونان میں لکھتا ہے:

”حکومت عثمانیہ کو بعض حیثیتوں سے یورپ میں سب سے زیادہ متبہد حکومت تھی، تاہم دوسرے اعتبارات سے سب سے زیادہ متحمل اور روادار بھی تھی، یہ جسم کو قید کرتی تھی لیکن دماغ کو آزاد چھوڑ دیتی تھی، اس کی عیسائی رعایا کے نیچے کے طبقے یورپ کے دوسرے حصوں کے مساوی طبقتوں کی بہ نسبت ذہنی حیثیت سے عموماً زیادہ ترقی یافتہ تھے، یونانی نہ تو صنعت و حرفت کے کارخانوں کے غلام تھے اور نہ زرعی غلام، ان کی مزدوری زیادہ آزاد بھی تھی اور زیادہ نفع بخش بھی اور انھیں شہری حقوق اتنے ہی زیادہ حاصل تھے جتنے خود فرانس میں اسی طبقہ کے لوگوں کو انقلاب سے قبل حاصل تھے۔“

”اٹھارہویں صدی کے آخر کے قریب عثمانی تسلط کا بار اس قدر ہلکا ہو گیا تھا کہ یونانی ایک ترقی کرنے والی قوم بن گئے تھے، ان میں ایک بڑی تعداد چھوٹے چھوٹے کاشتکار زمینداروں کی تھی، جنھیں اپنی حالت کے سدھارنے کے مواقع اکثر حاصل تھے، شہروں میں مزدوروں اور تاجروں کی جھانپش آبادی کو دولت مند تاجروں کی

جس عت سے جن کو اکثر غیر ملکی حکومتوں کی حمایت حاصل ہوتی مدد ملتی رہتی تھی، ساحلی علاقوں میں سیسیوں کی ایک بڑی تعداد آباد تھی، جس میں زیادہ تر یونانی اور تھوڑے سے لہانی شامل تھے، یونانیوں کو بڑی حد تک شخصی آزادی کے مواقع حاصل تھے، استحصال بالآخر کار ترک کسان اور تاجر پر اسی قدر تھا جس قدر یونانی کسان اور تاجر پر اور معشرتی مدارج کی ترقی میں یونانیوں کے مقابلہ میں ترکوں کے لیے سیاسی رکاوٹیں عموماً زیادہ تھیں۔ صوبوں کے بہت کم ترک باشندوں کو انتظام حکومت میں کبھی بھی اتنا دخل حاصل ہوا جتنا اہل فرار کو باقاعدہ اور مستقل طور پر حاصل تھا۔ دیہاتی علاقوں میں اسلامی آبادی کے مسلمان افسر شاہی لوگوں کو بے انصافی سے بچنے کی اتنی قدرت رکھتے تھے، جتنی یونانی جماعتوں کو حاصل تھی اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ انھیں یونانیوں سے کم حقوق و مراعات حاصل تھے۔“ (۱)

یورپین سیاحوں کا بیان ہے کہ یونانیوں کی مذہبی آزادی پر آئر لینڈ کے کیتھولک رشک کر سکتے تھے اور بلدی معاملات میں انھیں اس سے زیادہ اختیارات حاصل تھے جتنے فرانس کے باشندوں کو اپنے علاقوں میں اگرچہ بعض سیاحوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ یونانی بڑے مصائب میں مبتلا تھے اور انھیں اپنی جان و مال کی طرف سے ہمیشہ خطہ رہا کرتا تھا لیکن بعض دوسرے سیاحوں کا یہ بیان بھی قابل غور ہے کہ یورپ کی کسی قوم پر محصور کا بار اتنا بھاری نہ تھا جتنا یونانیوں پر اور نہ کسی قوم پر شخصی حیثیت سے اس قدر کم پابندیاں عائد تھیں، یونانی کلیسا کے پاس بڑی دوست تھی اور تمام ترکی میں اس کا سیاسی اقتدار بھی زیادہ تھا، یونانیوں کو مولد یو یا اورول چیا میں شاہانہ قوت حاصل تھی، یورپ میں

(۱) "تاریخ یونان" از جارج فینلی جلد ۵ ص ۷۹-۷۸، اسکر ڈ ۱۸۷۷ء

سلطنت عثمانیہ کے محاصل کا بڑا حصہ یونان کے پرائمٹ وصول کرتے تھے اور بہت سے اضلاع میں یونانی بدیوں (میونسپلیٹیوں) کو تقریباً غیر محدود اختیارات حاصل تھے (۱) روس، پولینڈ اور ہنگری کے عیسائی کاشکاروں کی بہ نسبت سلطنت عثمانیہ میں عیسائی کاشکاروں کو اپنی محنت کا پھل زیادہ ملتا تھا، یونانی شہری کو تقریر کی آزادی اس سے زیادہ حاصل تھی جتنی شہنشاہِ ہپوٹین اول کے عہد میں سلطنتِ فرانس کے شہریوں کو حاصل تھی اور اپنے قصبوں کے انتظامی معاملات میں انھیں تابی اختیار حاصل تھا جتنا فرانس کے باشندوں کو (۲) سلطنت عثمانیہ کے عیسائی باشندے 'رعایا' کا لفظ اپنے لیے تحقیر کا باعث سمجھتے تھے، دولتِ علیہ کے تمام عیسائی مورخوں نے بھی غلطی سے اس کو یک تحقیر لقب خیال کیا ہے، بہر حال ترکوں نے یونانیوں کے ساتھ یہاں تک رواداری برتی تھی کہ انھیں 'رعایا' کے بجائے 'معاون' کہتے تھے، فرانسیسی مورخ ولانژوں کیئر لکھتا ہے: 'انھوں (ترکوں) نے یونانیوں کا یہاں تک لحاظ رکھا تھا کہ انھیں 'رعایا' کے تحقیر نام کے بجائے 'معاون' کا لقب دیا تھا۔' (۳)

تعلیم اور تحریکِ آزادی: تعلیم میں بھی یونانی یورپ کی کسی قوم سے پیچھے نہ تھے بلکہ ان میں پڑھے لکھے آدمیوں کا تناسب غالباً یورپ کی دوسری عیسائی قوموں سے زیادہ تھا (۴) سلطان سلیم ثالث کے عہد سے یونانیوں میں تعلیم بہت ترقی کر گئی تھی اور تعلیم ان کی آزادی کا پیش خیمہ ثابت ہوئی، ان کے مدارسِ سعادت کے حصہ میں قائم ہو گئے تھے، علاوہ بریں دولت مند اشخاص اپنے لڑکوں کو یورپ کی یونیورسٹیوں میں بھی تعلیم حاصل کرنے کے لیے بھیجتے تھے، جہاں وہ قومی آزادی کے خیالات سے متاثر ہوتے تھے اور واپس ہونے کے بعد اپنے وطن میں ان خیالات کی اشاعت کرتے تھے، ہر یونانی جو لکھ پڑھ سکتا تھا وہ قدیم یونانی لٹریچر سے بھی کچھ نہ کچھ واقفیت ضرور رکھتا تھا اور

(۱) فنلے جلد ۶ ص ۷-۶ (۲) ایضاً ص ۱۷ (۳) تاریخ دولت عثمانیہ از واثق

(ترجمہ اردو) جلد اول ص ۴۰۴ (۴) فنلے جلد ۶ ص ۱۶

قدیم یونان کی عظمت کی یاد بخومی کے دور میں بھی اس کے سینہ کو سرمہ رکتی تھی، ایک شاعر اور ایک دیب کی کوششوں سے آزادی کی لہر پوری قوم میں دوڑ گئی، ریگاز (Rh gas) کی قومی نظموں نے اہل یونان کے جذبہ حریت کو مشتعل کر دیا، وہ ایک خفیہ سیاسی انجمن کا بانی بھی تھا اور ریاستہائے بلقان کی مختلف سیاسی انجمنوں سے خفیہ تعلقات رکھتا تھا، اپنی سازشوں کی بنا پر ۱۷۹۸ء میں وہ گرفتار کر کے قتل کر دیا گیا، کوریز (Koraes) کی خدمت ریگاز سے زیادہ وسیع اور پائدار تھیں، اس نے سیاسی کتابیں بھی لکھیں لیکن اس کا اہم کارنامہ وہ مقدمات ہیں جو اس نے یونانی ادبیات عالیہ (کلاسیکس) پر سلیس اور فصیح زبان میں لکھے ہیں، ان مقدمات سے اس نے سیاسی پروپگنڈے کا کام بھی لیا اور اس طرح یونان پرستی کی تحریک کو مدد پہنچائی اور ساتھ ہی ساتھ سنی اصلاح کی تحریک بھی شروع کی جسے یونانی زبان کی نشاۃ ثانیہ کہہ سکتے ہیں، موجودہ یونانی زبان اسی کی کوششوں کی مرہونِ منت ہے۔

ایلیسن فلیپس (Alison Phillips) لکھتا ہے:

”مراعات خصوصی (۱) سے پہلے بھی سلطان کی عیسائی رعایا اپنے مذہبی ارکان کے ادا کرنے، دولت جمع کرنے اور جس طرح چاہے تعلیم حاصل کرنے میں بالکل آزاد تھی، عیسائی کلیسا نیز حکومت کے اونچے درجہ تک ترقی کر سکتا تھا، ترجمان باب عالی یا کسی صوبہ کا گورنر ہو سکتا تھا، عثمانی حکومت میں کسانوں کا درجہ اٹھارہویں صدی میں یورپ کے اکثر حصوں سے کہیں بہتر تھا، زرعی غلامی جو تمام عیسائی یورپ میں تقریباً عالمگیر تھی، ترکی میں مفقود ہو چکی تھی اور ترکی مملکت کے بہت سے حصوں میں کاشت کاروں کو ایسی خوش حالی حاصل تھی کہ اس سے

(۱) مراعات خصوصی یا Capitulations وہ مراعات اور امتیازات تھے جو سلطنت عثمانیہ میں غیر ملکیوں کو حاصل تھے، ان کا ذکر تفصیل کے ساتھ آگے آئے گا۔

بعض ان قوموں کے کسان جو زیادہ مہذب سمجھی جاتی تھیں واقف بھی نہ تھے۔“ (۱)

مذکورہ بالا حالات کی موجودگی میں یونانیوں کا علم بغاوت بلند کرنا تعجب سے خالی نہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ یونانیوں کو جو مراعات سلطنت عثمانیہ میں حاصل تھیں وہی ان کی حوصلہ افزائی کا سبب بن گئیں، اس کے علاوہ دولت علیہ کی بڑھتی ہوئی کمزوری، اس کے اندرونی معاملات میں یورپین حکومتوں کی مداخلت، یونانیوں کے ساتھ روس کی سازشیں اور پھر انقلاب فرانس کی عام ہنگامہ خیزی ان سب نے مل کر یونانی قوم کو جسے خود سلاطین عثمانیہ کی پالیسی نے ریاست اندر ریاست (Imperium in imperis) کے اختیارات دے کر شروع ہی سے ایک حد تک حکومت خود اختیاری تفویض کر دی تھی مکمل آزادی کے لیے آگے بڑھایا اور بالآخر انگلستان، روس اور فرانس کی حمایت نے اسے کامیاب کیا۔

انقلاب فرانس کا اثر: یونان کی تحریک آزادی پر انقلاب فرانس کا بہت زیادہ اثر پڑا، اس وقت یورپ کا کوئی ملک ایسا نہ تھا جو فرانس کے عہد آفریں انقلاب سے متاثر نہ ہو، یونانیوں نے بھی اس انقلاب کا خیر مقدم کیا، ان پر پیرس کی ادبی انجمنوں کا اثر خصوصیت کے ساتھ پڑا، بقول فنلے انھوں نے دیکھا کہ تحریر و تقریر سے تلوار کا کام لیا جاسکتا ہے یعنی حکومت الٹ دی جاسکتی ہیں، یونانی چونکہ تحریر و تقریر میں ہمیشہ سے ماہر رہے ہیں اس لیے انھوں نے سلطنت عثمانیہ کا تختہ الٹ دینے کی غرض سے ادبی مجلسیں اور خفیہ انجمنیں قائم کرنی شروع کر دیں، ان میں سے دو انجمنیں خاص طور پر اہم تھیں، ایک فائلمیوز سوسائٹی (Philomuse Society) جو ۱۸۱۲ء میں ایتھنز میں قائم ہوئی اور دوسری فائلیک ہتیریا (Phillike Hetairia) جسے ۱۸۱۳ء میں تین یونانی تاجروں نے اوڈیپ

(۱) 'یونان کی جنگ آزادی' از ایلیسن فیس مطبوعہ لندن ۱۸۹۷ء ص ۸

میں قائم کیا، فائیکو میوز سوسائٹی ایک قسم کی ادبی انجمن تھی اور وہ اپنے سرمایہ سے یونانیوں کو تعلیم حاصل کرنے کے لیے یورپ کی یونیورسٹیوں میں بھیجتی تھی، چنانچہ جن لوگوں نے یونان کی جنگ آزادی میں نمایاں حصہ لیا، ان میں سے بہتروں نے اسی انجمن کی مالی مدد سے یورپ میں تعلیم حاصل کی تھی۔

ہتیریا: فائیکو ہتیریا ایک سیاسی انجمن تھی، جو خاص طور پر یونان میں انقلاب پیدا کرنے کی غرض سے قائم کی گئی تھی، فنلے کا بیان ہے کہ اس کے ابتدائی ارکان دیوالیے تاجر اور سازشی قسمت آزما تھے، انجمن کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ عثمانیوں کا جو اکندھے سے اتارنے کے بعد مشرق میں یونانی سلطنت از سر نو قائم کی جائے اور اس کے لیے تمام یونانیوں کو فوجی حیثیت سے منظم کیا جائے، اس مقصد کو حاصل کرنے کی غرض سے انجمن نے ہر جائز و ناجائز ذریعہ اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا، اس کے بعض منصوبے عجیب و غریب تھے مثلاً سلطنت عثمانیہ کو فنا کر دینے کے لیے اوڈیسا کے ارکان ہتیریا نے یہ تجویز کیا تھا کہ قسطنطنیہ میں آگ لگا دی جائے، سمراخ خانہ کو جلا دیا جائے، جنگی جہازوں کا بیڑا برباد کر دیا جائے، سلطان اور اس کے وزیروں کو قتل کر دیا جائے اور قسطنطنیہ کی پوری مسلمان آبادی تہ تیغ کر دی جائے، فنلے ان منصوبوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ یہ تجارت پیشہ مفسدہ پرداز خیال کرتے تھے کہ ایک سلاح خانہ میں آگ لگا کر اور ایک بادشاہ کو قتل کر کے وہ سلطنت کا تختہ الٹ سکتے ہیں، انھوں نے اس امکان کو نظر انداز کر دیا تھا کہ اس سے کروڑوں جنگجو مسلمانوں کی آتش غضب بجا طور پر بھڑک اٹھتی اور وہ خونیں انتقام کے جوش میں ترکی حکومت کو بچانے کے لیے قسطنطنیہ کی طرف دوڑ پڑتے اور اگر یہ سازش کرنے والے عثمانی نظام حکومت کی تمام خرابیوں کے اصلی سرچشمہ کو نیست و نابود کر چکے ہوتے تو مسلمانوں نے ایک جدید اور زیادہ طاقتور ترکی سلطنت کی بنیاد رکھ دی ہوتی (۱) ہتیریا کی کامیابی کی بڑی وجہ وہ خیالات تھے جو عام طور پر اس وقت

سلطنت عثمانیہ کے متعلق پھیلے ہوئے تھے، عموماً یہ سمجھا جاتا تھا کہ یہ سلطنت اپنی زندگی کی آخری منزلیں طے کر رہی ہے اور روس بہت جلد قسطنطنیہ پر قبضہ کرنے والا ہے، ہتیر یا اسی زمانہ میں قائم ہوئی جب یہ خیالات یونانیوں میں کثرت سے پھیلے ہوئے تھے، چنانچہ اس کے ممبروں کی تعداد تیزی کے ساتھ بڑھتی گئی اور تھوڑے ہی دنوں میں ہزاروں تک پہنچ گئی اور بہت سے دولت مند اور ذی اثر یونانی اس میں شامل ہو گئے، روس کے بہت سے فوجی افسر بھی اس کے ممبر ہو گئے تھے، ان کی شرکت کی وجہ سے عوام یہ سمجھتے تھے کہ آئندہ جنگ آزادی میں روس یونان کی مدد کرے گا، اسی بنا پر لوگ بکثرت اس انجمن کے ممبر بنتے گئے، میریٹ کا بیان ہے کہ ۱۸۲۰ء تک اس کے ممبروں کا شمار دو لاکھ تک پہنچ گیا تھا (۱) ہر طبقہ کے لوگ اس میں داخل ہوتے تھے، دلی خلوص اور جاں نثاری کے ساتھ یونان کی آزادی کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دینا رکنیت کی ایک لازمی شرط تھی، جو لوگ انجمن میں داخل ہوتے تھے ان کو یہ حلف دیا جاتا تھا: اپنے مذہب اور وطن کے لیے جنگ کرو، اپنے مذہب، اپنی قوم اور اپنے ملک کے دشمنوں سے نفرت کرو، انھیں سناؤ، انھیں بالکل نیست و نابود کر دو (۲) اس انجمن کا ایک اہم قانون یہ تھا کہ ہر ممبر کو اپنے لیے اسلحہ اور گولہ بارود خود فراہم کرنا پڑتا تھا، انجمن کے ایجنٹ جن کو مبلغ یا داعی (Apostles) کہتے تھے سلطنت عثمانیہ کے ہر حصہ میں یونانی کلیسا کے پیروؤں کے پس بھیجے جاتے تھے تاکہ ترکوں کے خلاف نفرت اور روس کے ساتھ عقیدت کے جذبات پھیل سکیں، ہتیر یا کی شخصیں اور اس کے نمائندے سلطنت عثمانیہ کے ہر یورپین صوبہ میں ایشیائے کوچک کے تمام بڑے بڑے شہروں میں اور ہر غیر مملکت میں جہاں یونانیوں کی کوئی تعداد آباد تھی پھیلے ہوئے تھے۔

روس کی سازشیں: جس چیز نے یونانیوں کی سب سے زیادہ حوصلہ افزائی کی، وہ روس کی سرپرستی تھی، گو یہ سرپرستی تمام تر روس کے ذاتی اغراض پر منحصر تھی اور وہ شروع سے

یونانیوں کو بطور آلہ کار کے استعمال کرنا چاہتا تھا، پیٹر اعظم کے وقت ہی سے روس کے مدبرین نے یونانیوں کے مذہبی تعصب کو زار کے ساتھ سیاسی تعقید پیدا کرنے کا ذریعہ بنانا شروع کر دیا تھا، دریاے پرتھ کے ساحل پر پیٹر کی حوصلہ شکن شکست نے کچھ دنوں کے لیے روس کے اثر کو بڑھنے سے روک دیا لیکن ملکہ اپنی اور کیتھرائن ثانیہ کے دوران حکومت میں روس کے ایجنٹ سلطنت عثمانیہ کے یورپین صوبوں میں نہایت سرگرمی کے ساتھ سازشوں کا جال پھیلاتے رہے اور یونانیوں کو دولت ملیہ کے خلاف بغاوت کرنے پر برابر آمادہ کرتے رہے، فنلے لکھتا ہے کہ ”روس کی سازشیں جنہوں نے اہل یونان پر بہت سے مصائب ڈھائے ہیں عملی طور پر ۱۷۶۳ء میں شروع ہو گئی تھیں، چاندر (Chandler) نے جو ۱۷۶۷ء میں یونان گیا تھا، لوگوں کو اکثر یہ گفتگو کرتے سنا کہ انھیں روس کی مدد سے جلد حکومت عثمانیہ سے نجات ملنے والی ہے“ (۱) روس کی مدد کی حقیقت کیا تھی، اس کے متعلق بھی فنلے کا بیان قابل غور ہے، وہ لکھتا ہے: ”بد قسمتی سے روس کے اثر نے یونانیوں کی توجہ مقامی اصلاحات سے ہٹا کر فتح کے منصوبوں کی طرف مبذول کر دی، حکومت روس یونانیوں کو ایسی حالت میں دیکھنا نہیں چاہتی تھی کہ وہ دوسروں کی مدد کے بغیر خود اپنی کوششوں سے آزادی حاصل کر سکیں، سلطان کی غیر مطمئن رعایا کی حیثیت سے وہ کیتھرائن کی پالیسی کے کارآمد آلے تھے لیکن مقامی حقوق و مراعات کے حاصل ہونے کی صورت میں جن سے انھیں (اہل) کیوس (Chios) کی طرح اپنی حالت کو بہتر بنانے کا موقع ملتا، وہ سلطان کی کارآمد رعایا بن جاتے اور آخر کار سلطنت عثمانیہ کے جائز وارث قرار دئے جاتے۔“ (۲)

۱۸۲۰ء میں جب عثمانی فوجیں علی پاشا والی یانینا سے جنگ میں مصروف ہوئیں تو یونانیوں کا لب و لہجہ دفعۃً بدل گیا اور روسی ایجنٹوں کی سرگرمیاں بھی بہت بڑھ گئیں، فنلے کا بیان ہے کہ ”عیسائیوں نے جو روش اختیار کی وہ اکثر اوقات باغیانہ تھی،

روسی ایجنٹ ان کی پشت پناہی کے لیے ہمیشہ تیار رہتے تھے، جن صوبوں میں یونانیوں کی تعداد زیادہ تھی وہاں عثمانی حکام کو بڑی دقتیں پیش آتی تھیں، روسیوں کے طرز عمل کی وجہ سے کسی پاشا کے لیے یونانیوں کی گستاخیوں کو روکنے کی غرض سے کوئی کارروائی کرنا بغیر اس کے کہ پہلے سے اس کے متعلق صریح احکام قسطنطنیہ سے حاصل کر لیے جائیں خطرہ سے خالی نہ تھا (۱)، بہتر یا کے ممبر زار روس الکزانڈر اول کا نام برابر استعمال کرتے تھے، جس کے متعلق یونانیوں کا یہ عام خیال تھا کہ وہ درپردہ اس انجمن کی مدد کر رہا ہے، تاہم چونکہ بہتر یا کی کارروائیاں بہت خفیہ ہوا کرتی تھیں اس لیے شروع میں باب عالی کو اس کا علم نہ ہوا جس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ حکومت عثمانیہ میں اس وقت تک جاسوسی کا نظام قائم نہیں ہوا تھا، چنانچہ جیسا کہ قبلے نے لکھا ہے ”نظام جاسوسی کی غیر موجودگی نے بہتر یا یونانیوں کی رائے میں سلطان کی حکومت کو وینس، سٹریا اور خود روس کی حکومت کے مقابلہ میں قابل ترجیح بنا دیا تھا“، بہر حال ۱۸۲۰ء کے دوران میں یونانیوں کے طرز عمل میں جو غیر معمولی فرق نمایاں ہوا اسے ترک نظر انداز نہ کر سکے اور سلطان اور وزراء سلطنت کو بار بار اس کی طرف متوجہ کیا گیا، روس کے ایجنٹ ایک طرف بہتر یا کی سازشوں کو پوشیدہ رکھنے کی کوشش کرتے تھے اور دوسری طرف اس کی سرگرمیوں کی حوصلہ افزائی میں بھی کوئی دقیقہ اٹھانہ رکھتے۔

برأت: یونانیوں کی اس بدلی ہوئی روش کا ایک خاص سبب تھا، کچھ دنوں سے سلطنت عثمانیہ میں ایک دستور برأت کا جاری ہو گیا تھا، جس کے رو سے سلطان کی رعایا کسی دوسری حکومت کی جس سے دولت علیہ کے دوستانہ تعلقات ہوں رعایا بن سکتی تھی، یونانیوں کی ایک بہت بڑی تعداد یہ رعایت حاصل کر کے مغربی حکومتوں کی رعایا بن گئی تھی، اس رعایت کی وجہ سے یہ لوگ اکثر سلطنت کے قوانین کی خلاف ورزی کرتے رہتے لیکن سزا سے محفوظ رہتے، ان کو ’برائیلی‘ کہتے تھے، یہ ترکی آبادی میں رہتے تھے اور

بہت سے بڑے بڑے محصولوں سے جن کو مسلمان بھی ادا کرتے تھے برسی تھے، یہ لوگ تجارت کرتے لیکن نہ تو ان محصولوں کو ادا کرتے اور نہ ان قوانین کی پابندی کرتے جو تجارت سے متعلق سلطنت عثمانیہ میں رائج تھے، یہاں تک کہ عثمانی پولیس انھیں گرفتار بھی نہیں کر سکتی تھی، کیوں کہ جس حکومت کی رعایا وہ بن گئے تھے اس کا فضل یا سفیران کی حمایت کرتا تھا، اسی طبقہ کے لوگ یونانی انقلاب کے سب سے زیادہ سرگرم کارکن تھے، اگر ان کی سازشیں کھل بھی جاتیں تو وہ اس حمایت کی وجہ سے سزا سے قطعاً طور پر محفوظ رہتے۔ (۱)

بہتر یا کے سردار اوائل ۱۸۲۰ء میں علم بغوت بلند کرنے کی تیاریاں کر رہے تھے کہ علی پاشا والی یانینا اور باب عالی میں جنگ چھڑ گئی اور بغاوت شروع کرنے کے لیے یہ موقع انھیں بہت مناسب ہاتھ آ گیا کیوں کہ بہترین عثمانی فوجیں اس وقت علی پاشا کے مقابلہ میں مصروف تھیں۔

علی پاشا: اس وقت تک باب عالی بہتر یا کی خفیہ کارروائیوں سے بے خبر تھا اور سلطان محمود سلطنت کے سرکش پاشاؤں کی سرکوبی کا تہیہ کر کے سب سے پہلے علی پاشا والی یانینا کو زیر کرنے کے لیے فوجیں روانہ کر رہا تھا، علی پاشا ۱۷۵۰ء میں البانیہ کے ایک چھوٹے سے گاؤں تپیلن (Tepelene) میں پیدا ہوا، جہاں اس کے اجداد کئی پشتوں سے سرداری کرتے آئے تھے، علی کے باپ نے ہمسایہ پہاڑی سرداروں سے لڑائی کرنے میں اپنے بیشتر موروثی مقبوضات کھودے تھے، بچپن ہی میں علی یتیم ہو گیا تھا مگر اس کی ماں نے خاندان کی سرداری کو قائم رکھا، ایک روز وہ ایک حریف قبیلہ کے ہاتھ میں گرفتار ہوئی تھی اور اس قبیلہ کے لوگوں نے اسے اور اس کی لڑکی کو ستایا تھا، اس نے علی کو جو ابھی بچہ ہی تھا قسم دی کہ بڑا ہو کر اس اہانت کا سخت انتقام لے، چنانچہ علی نے اس قسم کو پورا کیا اور اس قبیلہ سے نہایت ہولناک انتقام لیا، اپنی حیرت انگیز جرأت کی بنا پر وہ پندرہ سال کی

عمر میں ایک بڑی جماعت کا سردار بن گیا تھا، قرب و جوار کے علاقوں میں لوٹ مار کرنا اس کا مرغوب مشغلہ تھا، چند سال کے اندر اس نے اپنے خاندانی علاقوں کا بڑا حصہ دشمنوں سے واپس لے لیا اور البانیا میں اس کی شجاعت اور قابلیت کی شہرت روز بروز پھیلتی گئی، ۱۷۸۸ء میں جب دولت علیہ اور آسٹریا میں جنگ ہوئی تو علی نے عثمانی فوج میں گراں قدر خدمات انجام دیں جن کے صلہ میں وہ ٹریکالا (واقع تھسلی) کا پاشا بنا دیا گیا، اس کے بعد وہ اپیرس میں یاغینا کا پاشا بن بیٹھا، وہ نہایت ذہین اور طباع تھا اور اپنے مقصد کے حاصل کرنے میں بڑے سے بڑے فریب و مظاہم سے بھی باز نہ آتا، رفتہ رفتہ اس نے ہمسایہ پہاڑی علاقوں پر اپنا تسلط پوری طرح قائم کر لیا اور یاغینا کو پایہ تخت بنا کر ایک خود مختار فرمان روا کی طرح حکومت کرنے لگا، دشمنوں کے ساتھ اس کا سلوک انتہائی ظالمانہ تھا لیکن اپنی رعایا کے ساتھ وہ عدل و انصاف کا برتاؤ کرتا اور جوشہر اور علاقے اس کے زیر حکومت تھے وہاں ہر طرف امن و خوشحالی نمایاں تھی (۱) وہ علوم و فنون کا بڑا سرپرست تھا، اس کی مملکت میں متعدد کالج، اسکول اور کتب خانے قائم تھے اور اس کے عہد حکومت میں یاغینا یونانی قوم کا ادبی مرکز بن گیا تھا، چونکہ جنوبی البانیا کی ادبی زبان یونانی تھی اس لیے مسلمان اور عیسائی دونوں اسے پڑھتے تھے، مسلمان نظمیں اور نغمے، خطوط اور حساب کتاب یونانی زبان میں لکھتے تھے، جن کے بہت سے قلمی نسخے تیار کیے جاتے تھے لیکن مسلمانوں کی لکھی ہوئی نظموں و نغموں کا کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا ہے۔ (۲)

انقلاب فرانس کے بعد علی پاشا نے پولین اور یورپ کے دوسرے فرماں رواؤں سے مراسلت کا سلسلہ قائم کر رکھا تھا، جو اسے گواضا بطہ نہیں مگر عملاً ایک خود مختار حکمران تسلیم کرتے تھے، کہا جاتا ہے کہ علی پاشا اپنی حکومت میں پورے البانیا، تھسلی، یونان اور جزائر آئکین کو شامل کرنا چاہتا تھا، اس کا یہ منصوبہ پورا نہ ہو سکا لیکن ۱۸۱۹ء تک وہ اپنے

مقبوضات میں اضافہ کرتا چلا گیا، محمود کے لیے اس خود سر پاشا کی سرکشی عرصہ سے تشویش کا باعث تھی، اوائل ۱۸۲۰ء میں علی نے ایک ایسی حرکت کی جس سے محمود کو فوراً اس فتنہ کے استیصال کی جانب متوجہ ہونا پڑا، علی کا ایک دوست اسماعیل پاشو بے تھا، جس سے وہ کسی بات پر خفا ہو گیا اور آخر کار اس کی جان کا دشمن ہو گیا، اسماعیل پاشو بے یانینا سے بھاگ کر قسطنطنیہ چلا آیا اور سلطان کے دربار میں ملازم ہو گیا، علی نے اپنے دو آدمیوں کو اسماعیل پاشو بے کو قتل کرنے کے لیے قسطنطنیہ بھیجا، چنانچہ ان لوگوں نے ایک روز دن کے وقت جامع اباصوفیہ کے دروازہ پر اسماعیل پاشو بے پر حملہ کیا مگر وہ بچ گیا اور یہ دونوں گرفتار کر لیے گئے، انھوں نے صاف صاف بیان کیا کہ علی پاشا نے انھیں اس قاتلانہ مہم پر مامور کیا تھا، انھوں نے یہ بھی بیان کیا کہ علی پاشا نے اطمینان دلایا تھا کہ اگر وہ اپنی مہم میں کامیاب رہے تو دیوان کے معتمد ارکان انھیں سزا سے بچانے کے لیے تیار ملیں گے، یہ معلوم کر کے کہ علی پاشا رشوت کے ذریعہ سے دیوان میں بھی اس قدر اثر رکھتا ہے، محمود سخت برہم ہوا، حملہ آور تو فوراً قتل کر دئے گئے اور علی بغوت کا مجرم قرار دیا گیا، اسے چالیس روز کی مہلت دی گئی کہ باب عالی میں حاضر ہو کر معذرت پیش کرے لیکن یہ مدت گزر گئی اور علی نہ آیا، اس کے بعد وہ قانون کی حمایت سے محروم کر دیا گیا اور محمود نے اعلان کر دیا کہ جو شخص بھی اس کی سفارش کرے گا وہ فوراً قتل کر دیا جائے گا، اس نے اسماعیل پاشو بے کو یانینا کا پاشا مقرر کر کے علی پاشا کو گرفتار کرنے کے لیے روانہ کیا۔

علی پاشا، اسماعیل پاشو بے کا مقابلہ کامیابی سے کرتا رہا اور تقریباً دو سال تک قابو میں نہ آیا، آخر کار ۱۸۲۲ء کے شروع میں محمود نے مشہور عثمانی جنرل خورشید پاشا کو اس مہم پر روانہ کیا، خورشید پاشا کے پہنچتے ہی جنگ کا نقشہ بدل گیا اور چند ہی دنوں میں علی پاشا کو یانینا میں محصور ہو جانا پڑا، فردوری ۱۸۲۲ء میں خورشید پاشا نے اسے گرفتار کر لیا اور اس کا سر کاٹ کر سلطان کے پاس قسطنطنیہ بھیج دیا۔

علی پاشا کی بغاوت سے یونانیوں کو بڑی مدد ملی، باب عالی کی توجہ ہتیر یا کی

سازشوں کی طرف مبذول نہ ہونے پائی اور بغاوت یونان کے ابتدائی مہینوں میں عثمانی فوج کا برا حصہ اس کے بہترین جنرل خورشید پاشا کی سرکردگی میں یانینا کے محاصرہ میں مشغول رہا اور یہ فرصت یونانیوں کے لیے نہایت مفید ثابت ہوئی۔

مولد یویا کی بغاوت: یونان کی انقلابی جماعت کو باب عالی اور علی پاشا کی جنگ بہت غنیمت معلوم ہوئی اور انھوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھانے میں مطلق کوتاہی نہیں کی، فروری ۱۸۲۱ء میں پسیلانٹی (Hypsilanti) نامی ایک یونانی امیر نے جس کا باپ یکے بعد دیگرے مولد یویا اور ولاچیا کا حاکم رہ چکا تھا اور جو خود اس وقت ہتیر یا کا سردار اور روسی فوج کا ایک ممتاز افسر تھا ایک دستہ کے ساتھ مولد یویا میں داخل ہو کر علم بغاوت بلند کر دیا اور تمام یونانیوں کو سلطنت عثمانیہ کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کی دعوت دی، یونانیوں کو روس سے بہت کچھ توقعات تھیں، زار الکزنڈر کا وزیر خارجہ کاؤنٹ کاپوڈی آسٹریا (Capodi Istria) نسلا یونانی اور ہتیر یا کا ایک رکن تھا، پسیلانٹی کاؤنٹ مذکور کا ایڈی کا نگ تھا، اس بنا پر عام خیال یہ تھا کہ پسیلانٹی کی پشت پر روس کی حاکمت بھی ہے، چنانچہ اس نے مولد یویا میں داخل ہونے کے بعد وہاں کے باشندوں کے نام بغاوت کا جو دعوت نامہ شائع کیا اس میں یہ اعلان بھی کیا تھا کہ یہ تحریک ایک بڑی طاقت کی تائید اور حمایت سے شروع کی گئی ہے، چوں کہ روسی فوجیں مولد یویا میں آسانی کے ساتھ پہنچ سکتی تھیں، اس لیے وہی صوبہ بغاوت کی ابتدا کے لیے منتخب کیا گیا مگر یہ انتخاب غلط ثابت ہوا مولد یویا کے باشندے یونانیوں کے مظالم سے تنگ آ کر ان سے نفرت کرنے لگے تھے اور انھوں نے باغیوں کی مدد میں مطلق سرگرمی نہیں دکھائی، ایلین فلیس لکھتا ہے:

”رومی کسانوں کو فاری یونانیوں کی جماعت رہائی

دلانے والوں کے لباس میں محض مضحکہ خیز اور ایک دام فریب معلوم

ہوئی، اس وقت تک وہ یونانیوں کو صرف اپنے ہوسپودار (۱) اور اس

(۱) مولد یویا اور ولاچیا کے والی جن کو تقریباً شاہانہ اختیارات حاصل تھے ہوسپودار کہے جاتے تھے

کے ماتحت افسروں کے ذریعہ سے جانتے تھے، جو ظلم و تشدد کے ساتھ ان سے محصول وصول کرتے اور جن کی حکومت میں ان کی حالت ان کسانوں سے زیادہ مصیبت کی تھی جو براہ راست سلطان کے زیر حکومت تھے، روس کے نام سے بھی ان کے دلوں میں شکریہ کا جذبہ نہیں پیدا ہوا کیوں کہ ۱۸۰۸ء سے ۱۸۱۲ء تک جب مولدویا اور ولاچیا کی ریاستیں روس کے قبضہ میں رہیں، وہاں کے باشندے حملہ آوروں کے استحصال بالجبر سے مصیبت کی آخری حد تک پہنچ گئے تھے اور اپنے مکانوں اور کھیتوں کو زار کی ظالمانہ پالیسی کی وجہ سے تباہ و برباد ہوتا ہوا دیکھ چکے تھے۔“ (۱)

بغاوت کا آغاز گلاز (Galatz) یا سی اور بعض دوسرے مقامات پر ترکوں کے قتل عام سے کیا گیا، ہر طبقہ کے ترک، تاجر، سپاہی، جہاز راں سب دفعۃً رفرار کر کے نہایت بے دردی کے ساتھ قتل کر دئے گئے، گلاز کے مقامی باشندوں نے ان کارروائیوں میں کوئی حصہ نہیں لیا، یہ کام صرف ہتیر یا کے ممبروں نے انجام دیا، یا سی (پایہ تخت مولدویا) میں مسلمان سپاہیوں کی تعداد صرف پچاس تھی جو ہوسپووار کے دربار میں بطور گارڈ آف آنر کے مقیم تھے، جان اور مال کی حفاظت کے وعدہ پر پہلے ان سے ہتھیار رکھ دینے کو کہا گیا، جب انھوں نے ہتھیار رکھ دئے تو سب کو گرفتار کر کے قتل کر دیا گیا، انہی کے ساتھ تمام مسلمان تاجر بھی جو یا سی میں مقیم تھے قتل کر دئے گئے، پسیدائی ان کے قتل کے وقت خود موجود تھی، اسی طرح دوسرے مقامات پر بھی جہاں جہاں یونانیوں نے موقع پایا مسلمانوں کے قتل و غارت گری میں کوئی دقیقہ اٹھ نہ رکھا۔ (۲)

انتقام: گلاز اور یا سی کے قتل عام کی خبر بہت کچھ مبالغہ کے ساتھ تیزی سے ہر طرف

پھیل گئی اور مسلمانوں نے مدافعت کے لیے ہتھیار سنبھال لیے، فنلے لکھتا ہے:
 ”یہ صحیح طور پر کہا جاسکتا ہے کہ اس نازک موقع پر عثمانی تسلط
 کو سب سے زیادہ موثر مدیونانیوں کی سفاکی سے پہنچی نہ کہ سلطان محمود
 کی سرگرمی سے، اہل ہتیر یا کے مظالم نے ابتدا ہی سے انقلاب کے
 جنگ استیصال ہونے کا اعلان کر دیا تھا، مسمانوں نے خون آشام
 مسرت کے ساتھ اپنے دشمنوں کا یہ فیصلہ قبول کر لیا کیوں کہ ان کے
 نزدیک اس چیز نے ان کے مقصد کو انصاف اور خدا کے منشا کے مطابق
 بنادیا، انھوں نے اپنے بھائیوں کے خون کا انتقام لینے اور اپنی قوم
 اور اپنے مذہب کو خونخوار حملہ آوروں سے بچانے کے لیے ہتھیار
 سنبھال لیے۔“ (۱)

قسطنطنیہ میں جب ان واقعات کی اطلاع پہنچی تو مسلمانوں کو دفعۃً معلوم ہوا
 کہ عیسائیوں نے ان کے خلاف ایک زبردست سازش کا جال پھیلا رکھا ہے، انتقام کے
 جوش میں انھوں نے قسطنطنیہ کے سیکڑوں یونانیوں کو قتل کر ڈالا، سمرنا اور بعض دوسرے
 شہروں میں بھی بہت سے یونانی قتل کر دئے گئے۔

ہتیر یا سے بطریق اور زار کی مخالفت: پسیلانٹی نے بغاوت کا عم مذہب کے نام پر
 بلند کیا تھا اور زار روس کے نام سے فائدہ اٹھانے کی بھی پوری کوشش کی تھی لیکن گلازاور
 یاس کا قتل عام خود اس کی تحریک کے لیے موت کا پیغام ثابت ہوا، بطریق قسطنطنیہ نے
 ہتیر یا کے خلاف کفر کا فتویٰ شائع کیا اور پسیلانٹی اور اس کے ساتھیوں پر لعنت بھیجی،
 چنانچہ اب پسیلانٹی کی مہم کوئی مذہبی مہم نہ رہ گئی، اہل رومانیہ (مولدویا اور ولاچیا) نے بھی
 پسیلانٹی کی اسکیم کے خلاف جسے وہ یونانیوں کے حب جاہ کا نتیجہ قرار دیتے تھے، اب اپنی
 شدید نفرت کا اظہار شروع کیا، اس کے خدم و حشم کی بدکرداریوں اور اس کی فوجوں میں

نظم و ضبط کے فقدان نے اہل ولاچیا کو متنفر کر دیا تھا، اسی درمیان میں یہ خبر پہونچی کہ روس نے ہتیریا سے اپنی کامل بے تعلقی کا اعلان کر دیا ہے اور زار الکزنڈر نے پسیلانٹی کی روش پر صاف لفظوں میں نفیس کی ہے، اتحاد مقدس کے ارکان (روس، آسٹریا، پرتشا) نے لیباخ (Laybach) کی مجلس سے اپنا یہ فیصلہ شائع کیا کہ وہ ہر قسم کی انقلابی تحریکوں کے مخالف ہیں اور الکزنڈر نے اس کے ثبوت میں سلطان کے ساتھ صلح قائم رکھنے کا اعلان کیا اور اس بات پر رضامندی ظاہر کی کہ عثمانی فوجیں ولاچیا اور مولڈیویا میں داخل ہو کر ان شورشوں کو رفع کر دیں جو پسیلانٹی کے 'مجنونانہ منصوبہ' سے پیدا ہو گئی تھیں، اس کے ساتھ ہی اس نے پسیلانٹی کو روس کی ملازمت سے برخاست کر دیا اور اسے حکم دیا کہ فوراً ہتھیار رکھ دے (۱) لیکن پسیلانٹی اپنی روش پر قائم رہا اور بقول فلپس جھوٹ پر جھوٹ گڑھتارہا اس نے اپنے فوجی سرداروں سے بیان کیا کہ الکزنڈر نے انقلاب کی مذمت علانیہ اس وجہ سے کی ہے تاکہ یورپ میں امن و امان قائم رہے، حالانکہ نجی طور پر اس نے مجھے حکم دیا ہے کہ استقلال کے ساتھ اپنے کام میں لگا رہوں اور اس نے میری مدد کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ (۲)

بغاوت مولڈیویا کا استیصال: بہر حال زار کے اعلان سے مولڈیویا میں باغیوں کی قوت کو سخت صدمہ پہنچا اور عثمانی فوج نے نجارسٹ (پایہ تخت ولاچیا) پر قبضہ کر لیا، ۱۹ جون ۱۸۲۱ء کو ترکوں نے ڈراگشان کے مقام پر پسیلانٹی کے ساتھیوں کو زبردست شکست دے کر بغاوت مولڈیویا کا خاتمہ کر دیا، پسیلانٹی بھاگ کر ہنگری پہنچا اور وہاں ۱۸۲۷ء تک وہ مرنخ وزیر اعظم سلطنت آسٹریا کے حکم سے قید رہا، دوسرے سال وہ مر گیا، دراگشان کی جنگ کے چار روز بعد ترکوں نے مولڈیویا کے صدر مقام یاسی پر بھی قبضہ کر لیا۔

موریہ میں ترکوں کا قتل عام: لیکن مولڈیویا کی بغاوت کے فرو ہونے سے پہلے اس

کے شعلے موریا اور جزائر یونان میں بھڑک چکے تھے، موریا کے یونانی ترکوں کو صفحہ ہستی سے مٹا دینے کا عزم کر کے اٹھے تھے، وہ اپنے انقلابی گیت میں اس عزم کا اعلان یوں کرتے پھرتے تھے: ”ترک اب زندہ نہ رہنے پائیں گے، نہ موریا میں نہ دنیا کے کسی حصہ میں“، میریٹ لکھتا ہے کہ موریا میں تو یہ دھمکی تقریباً حرف بحرف پوری ہوئی، اپریل ۱۸۲۱ء میں مسلمانوں کا قتل عام شروع ہوا اور پچیس ہزار ترک تہ تیغ کر دئے گئے، صرف وہی بچ رہے جو بھاگ کر قلعہ بند شہروں میں پہنچ سکے، ایک ماہ کے اندر موریا میں عثمانی تسلط کا خاتمہ ہو گیا (۱)، عیسائی مورخین بھی اقرار کرتے ہیں کہ مسلمانوں کا استیصال پہلے سے سوچی ہوئی اسکیم کا نتیجہ تھا، اس قتل عام کا باعث عوام کے انتقامی جذبات یا کلیفٹ (پہاڑی ڈاکوؤں) کی طبعی خونخواری سے زیادہ ارکان ہتیر یا اور یونان کے اہل قلم اور خطیبوں کی کوششیں تھیں، جنہوں نے اپنا تمام زور قلم اور ساری خطابت ہر یونانی کے سینہ کو انتقام کے شدید ترین جذبات سے پر کرنے میں صرف کر دی تھی، ان کا قول تھا کہ ’انقلاب کو خون کا پتہ سدا دے کر صلح کو ناممکن بنا دینا چاہیے۔ (۲)

تین مہینے کے اندر ان قلعوں کے فوجی دستے بھی ہتھیار ڈال دینے پر مجبور ہو گئے جن میں اس قتل عام سے بچے بچائے لوگوں نے بھاگ کر پناہ لی تھی، ایورسلے کا بیان ہے کہ اکثر صورتوں میں ہتھیار اس شرط پر ڈالے گئے تھے کہ محصورین کی جانیں محفوظ رہیں گی لیکن اس کی پابندی کسی صورت میں بھی نہیں کی گئی، فوجی دستے، ترکی باشندے اور وہ لوگ جو مفصلات سے بھاگ کر وہاں جمع ہوئے تھے، سب کے سب سفاکانہ طور پر قتل کر دئے گئے۔“ (۳)

باب عالی کی طرف سے جوابی کارروائی: شروع میں ان واقعات کی خبر جب قسطنطنیہ پہنچی تو سلطان نے صدر اعظم کو حکم دیا کہ سرکاری عہدہ داروں میں سے چند راہ ورہ یونانیوں کو منتخب کر کے ان سے ان کے ہم وطنوں کے افعال کی ضمانت لے لی

جائے، اس سے مقصود یہ تھا کہ باغیوں کے دلوں میں دہشت بیٹھ جائے مگر موریا کے یونانیوں پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا، چنانچہ ان یونانی عہدہ داروں کے محکمے ضبط کر لیے گئے اور انھیں مسلمان مقتولین کے انتقام میں پھانسی دے دی گئی، ۱۶ اپریل ۱۸۲۱ء کو ترجمان باب عاں موروزی (Murusi) جو ایک ممتاز یونانی تھا اپنے سرکاری لباس میں قتل کیا گیا اور آئندہ ہفتہ میں متعدد مور یونانیوں کو پھانسی دی گئی۔

گریگوریوس کی پھانسی: ۲۲ اپریل ۱۸۲۱ء، 'ایسٹرن سٹڈے' کے روز یونانی کلیسائے بطریق اعظم گریگوریوس کو ارکان ہتیر یا کی باغیانہ اسکیم میں شریک ہونے کے جرم میں سلطان کے حکم سے پھانسی کی سزا دی گئی، پھانسی سے پہلے وہ باضابطہ طور پر اپنے عہدہ سے معزول کیا گیا اور کلیسا کی مجلس نے ایک دوسرے بطریق کو اس کی جگہ منتخب کر لیا، اس واقعہ سے قسطنطنیہ سے لے کر سینٹ پیٹرس برگ تک دہشت کی ایک لہر دوڑ گئی۔

گریگوریوس کی لاش تین روز تک دار پر لٹکتی رہی، اس کے بعد وہ یہودیوں کے سپرد کر دی گئی، جو اسے قسطنطنیہ کی سڑکوں پر گھسیٹتے ہوئے لے گئے اور سمندر میں پھینک آئے، بعض یونانیوں نے رات کے وقت اسے پانی سے نکال کر ایک جہاز پر اوڈیب پہنچا دیا، وہاں یہ مشہور کیا گیا کہ سمندر نے معجزہ کے طور پر اس شہید کی لاش کو اوپر ڈال دیا تھا اور روس کے ایک تجارتی جہاز نے جو ادھر سے گزر رہا تھا اسے اٹھالیا، بہر حال روسیوں نے پورے مذہبی رسوم اور فوجی شان کے ساتھ لاش کو دفن کیا۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ: مسیحی دنیا نے یہ سمجھا کہ گریگوریوس کی لاش کے ساتھ ایسا برتاؤ کرنے کا حکم یہودیوں کو اس لیے دیا گیا تھا کہ عیسائی مذہب کی مزید تذلیل کی جائے، حالانکہ یہ خیال غلط تھا، بقول فنسے یہ کارروائی اس وقت عثمانیوں کے قانون فوجداری کا ایک جز تھی اور اس کا نفاذ مسلمان اور عیسائی دونوں پر یکساں ہوتا تھا، گریگوریوس کے پھانسی دئے جانے کے ایک سال بعد ٹھیک یہی برتاؤ وینی چری کے ایک سردار حسن بیرقدار کی لاش کے ساتھ بھی کیا گیا، جس کا جرم یہ تھا کہ اس نے مسلمانوں کی ایک جماعت

لے کر بہت سے عیسائی خاندانوں کو لوٹا مارا تھا، سلطان کے حکم سے سپاہیوں کا ایک دستہ عیسائیوں کی حفاظت کے لیے مقرر کیا گیا تھا، حسن اسی دستہ کا مقابلہ کرتے ہوئے ۲۲ جون ۱۸۲۲ء کو گولی سے مارا گیا اور اس کی لاش بھی یہودیوں کو دے دی گئی جو اسے قسطنطنیہ کی سڑکوں پر گھسیٹے ہوئے لے گئے اور سمندر میں ڈال دیا۔ (۱)

یونانیوں کا قتل: مذکورہ بالا اشخاص کے علاوہ جن کو سلطان کے حکم سے موت کی سزا دی گئی، قسطنطنیہ میں سیکڑوں یونانی عام مسلمانوں کے ہاتھ سے قتل ہوئے، اس وقت ترکوں کے بعض بااثر طبقوں نے مصلحت س میں سمجھی کہ مذہبی تعصب کو برا بھونچنے کر کے قسطنطنیہ کے مسلمانوں کو عیسائیوں کے خلاف مشتعل کر دیں، بعض علما اورینی چری کو یہ شبہ تھا کہ محمود ان کے مراعات خصوصی میں تخفیف کرنی چاہتا ہے، چنانچہ انھوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اس کی مشکلات میں اضافہ کرنے کی کوشش کی، وہ علانیہ تمام مسلمانوں کو مقتولین موریہ کے انتقام کی دعوت دیتے تھے، ان کے پیدا کردہ ہنگاموں سے قسطنطنیہ میں تقریباً تین ہفتے طوائف الملوکی برپا رہی، اراذل و افغان عیسائیوں کے گھلوں میں لوٹ مار کرتے پھرتے تھے، ایک روز وہ بطریق کے مکان میں گھس گئے، اہب جان لے کر چھتوں کے راستہ سے بھاگے اور پڑوس کے ترکوں کے مکانات میں پڑہلی، فٹلے لکھتا ہے: ”مسلمانوں کی شرافت کا یہ واقعہ ضرور قہمبند کرنے کے قابل ہے کہ انھوں نے عیسائی پادریوں کو اپنے ہاں پوشیدہ رکھ کر عوام کے غیظ و غضب سے بچالیا،“ (۲) ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یونانیوں کی بغاوت کے ساتھ ساتھ مسلمانوں میں بھی بغاوت برپا ہوا چاہتی ہے، مسلمانوں کی بغاوت کو روکنے اورینی چری کو قابو میں رکھنے کی غرض سے محمود نے اس فوج کے تین سرداروں کو دیوان میں مستقل جگہوں پر مقرر کر دیا۔

سمرنا کا حال قسطنطنیہ سے بھی زیادہ خراب تھا، ایشیا کے کوچک کے متعدد گروہ جو مولد یویا کے باغیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے گھر سے روانہ ہوئے تھے، شمال کی طرف

کو تاج کرنے کی بجائے سمرنا میں داخل ہو گئے، جہاں عیسائیوں کی ایک بڑی تعداد آباد تھی اور جہاں بغیر لڑے بٹھڑے انھیں بہت کچھ مال غنیمت اور غلاموں کے حاصل ہونے کی امید تھی، چنانچہ شہر اور قرب و جوار کے دیہاتوں میں کئی روز تک قتل و غارت گری جاری رہی، اونچے طبقہ کے ترکوں نے عیسائیوں کے بچانے کی کوشش کی، اس کی سزا میں عام مسلمانوں نے خود ملاے سمرنا اور متعدد اعیان کو قتل کر دیا۔

یونانی سفاحیاں: مسلمانوں کا جوش انتقام یونانی سفاحیوں کا قدرتی نتیجہ تھا، دوران بغاوت میں یونانیوں نے وحشت و بربریت کی ایسی ہولناکیاں پیش کیں کہ ان کے اعتراف سے عیسائیوں کا قلم بھی گریز نہ کر سکا، شروع ہی میں یونانیوں نے ایک ترکی جہاز کو گرفتار کر لیا تھا جس پر سابق شیخ الاسلام اپنے تمام خاندان کے ساتھ حج کے لیے جا رہے تھے، قسطنطنیہ میں جب یونانیوں کے خلاف شورش برپا ہوئی تو موصوف نے ایک فرمان شایع کر کے مسلمانوں کو پرامن رہنے کی نصیحت کی تھی اور یونانیوں کے ساتھ زیادتی کرنے سے روکا تھا، ان کے اس رویہ سے مسلمان خود ان کے مخالف ہو گئے اور سلطان محمود کو اس مخالفت کی شدت سے مجبور ہو کر انھیں شیخ الاسلام کے منصب سے معزول کر دینا پڑا تھا، اس کے بعد وہ سفر حج کے لیے روانہ ہو گئے، لیکن ابھی جزائر آتھین تک پہنچے تھے کہ یونانیوں نے ان کے جہاز کو گرفتار کر لیا، انھوں نے سب سے پہلے شیخ الاسلام کی نظر کے سامنے ان کی لڑکیوں اور خاندان والوں کو ذبح کر کے سمندر میں پھینک دیا، اس کے بعد دوسرے ترک خاندان جو اس جہاز پر تھے قتل کیے گئے، آخر میں خود شیخ الاسلام کو سخت اذیتوں کے ساتھ قتل کیا، بقول مصطفیٰ کامل پاشا یہ جزا تھی اس نصیحت کی جو شیخ الاسلام موصوف نے مسلمانوں کو پرامن رہنے اور یونانیوں کے ساتھ زیادتی نہ کرنے کی تھی، فنلے لکھتا ہے: ”معذور و مجبور بوزھے مرد، اونچے طبقہ کی عورتیں خوبصورت لونڈی غلام اور کم سن بچے جہاز کے عرشہ پر گائے تیل کی طرح ذبح کر دیے گئے، اس ظالمانہ کارروائی کو ہلکا کرنے کی کوشش بعد کو یہ کہہ کر کی گئی کہ یہ ایک انتقامی فعل

تھا، یہ بیان غلط ہے جو لوگ ان مظالم کے مرتکب ہوئے، انھوں نے شیخ الاسلام کے قتل سے پہلے اپنے بطریق کی پھنسی کا حال نہیں سنا تھا، اصل یہ ہے کہ شروع ہی سے سمندر اور خشکی دونوں جگہ لڑائی کا مقصد ترکوں کو نیست و نابود کر دینا تھا۔ (۱)

انگریزی جنرل گارڈن (Gordon) یونانیوں کا پر جوش حامی، جو دوران بغاوت یونانیوں کے ساتھ ترکوں سے لڑا ہے، اپنی ”تاریخ انقلاب یونان“ میں لکھتا ہے: ”یونانیوں نے جو بھی قومی یا شخصی مظالم برداشت کیے ہوں ان کے انتقام کی درندگی کو حق بجانب ثابت کرنا ناممکن ہے۔“ (۲)

یونانیوں اور ترکوں کا پہلا باقاعدہ مقابلہ موریا کے پایہ تخت ٹریپولٹرا کے قریب والیٹی کے مقام پر ہوا جس میں ترکوں کو شکست ہوئی، اس کے بعد باغیوں نے نوارینو اور ٹریپولٹرا کا محاصرہ کر لیا، ۱۹ اگست ۱۸۳۱ء کو نوارینو کا فوجی دستہ فاقہ کشی سے عاجز آ کر ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہوا، ہتھیار اس شرط پر ڈالے گئے تھے کہ قلعہ کا تمام سامان، زرو جواہر اور سونے چاندی کے برتن یونانیوں کے حوالہ کر دئے جائیں گے اور اس کے معاوضہ میں ترکوں کو مصر یا تونس روانہ کر دیا جائے گا، اس معاہدہ کے مطابق جب ترکوں نے تمام سامان دے دیا تو یونانیوں نے نقض عہد کر کے ان کا قتل عام شروع کیا اور ایک گھنٹہ کے اندر تمام مرد، عورتوں اور بچوں کو قتل کر ڈالا، فرانزس (Phrantzes) نامی ایک یونانی پادری جس نے انقلاب یونان کی ایک مستند تاریخ لکھی ہے، اس موقع پر موجود تھا، اس نے نوارینو کے چشم دید حالات بیان کیے ہیں، وہ لکھتا ہے کہ عورتیں بندوق کی گولیوں اور تیغوں کے زخم سے مجروح ہو کر سمندر کی طرف بھاگتی تھیں اور انھیں عمداً گولیوں سے مارا جاتا تھا، مائیں شیرخوار بچوں کو سینوں سے لگائے ہوئے اپنی برنگی کو چھپانے کی غرض سے (ظالموں نے ان کے کپڑے بھی چھین لیے تھے) سمندر میں کود پڑتی تھیں لیکن جب وہ پانی میں چھپنے کی کوشش کرتیں تو یہ سنگ دل ریفیل بردار انھیں

گولیوں کا نشانہ بناتے، شیرخوار بچوں کو ماؤں کے سینوں سے چھین کر چٹانوں سے نکراتے اور ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے، تین چار سال کے بچے زندہ سمندر میں پھینک دئے جاتے تھے۔ (۱)

ٹرپولٹز کا محاصرہ چھ مہینے تک جاری رہا، پانی ختم ہو جانے سے بالآخر وہاں بھی ترکوں کو ہتھیار ڈال دینے پڑے، یونانی توپ خانہ کا ایک نوجوان فرانسیسی افسر کرنل ریبائیونانی فوجوں کے شہر میں داخل ہونے کے وقت وہاں موجود تھا، اس نے صاف گوئی کے ساتھ یونانی سپاہیوں کے وحشیانہ مظالم بیان کیے ہیں جو تین روز تک خود اس کی آنکھوں کے سامنے ہوتے رہے، وہ لکھتا ہے کہ عورتوں اور بچوں کو قتل کرنے سے پہلے عموماً شدید جسمانی اذیت پہنچائی جاتی تھی، اڑتالیس گھنٹے کے بعد یونانیوں نے (قتل عام سے بچے ہوئے) مرد، عورت، بوڑھے بچے خصوصاً عورتوں اور بچوں کو جمع کیا اور پہاڑ کی ایک گھاٹی میں لے جا کر ایک ایک کو قتل کر ڈالا۔ (۲)

اس واقعہ کے دو سال بعد خود فٹلے کا گذر اس مقام سے ہوا، وہ بیان کرتا ہے کہ میں نے بغیر دفن کی ہوئی ہڈیوں کے ڈھیر دیکھے، جو موسم سرما کی بارش اور گرمیوں کی دھوپ سے سفید ہو گئی تھیں، بہت سی ہڈیوں کے ناپ سے ظاہر ہوتا تھا کہ یہ بچوں کی ہڈیاں ہیں۔ (۳)

ایلیسن فلپس اہل یونان کی خدایوں اور سفاکیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے

لکھتا ہے:

”حقیقت یہ ہے کہ ہر جگہ اس بغاوت کی امتیازی صفت

خداری اور غیر محدود سفاکی تھی، ایک وحشی قوم کی زیادتیوں کا لحاظ کرنا

جس کے صدیوں کے دبے ہوئے شدید بغض و عناد کو بالآخر نکلنے کا موقع

ملا تھا، شاید روا ہو سکتا ہے لیکن کوئی شے اس بے دردانہ خداری کا عذر

برأت نہیں ہو سکتی، جو تقریباً ہر موقع پر قتل و خون سے پہلے برتی جاتی تھی اور چوں کہ یورپ نے ترکوں کے ظالمانہ انتقامات پر بڑی اذیت ملامت کی ہے، اس لیے تاریخ کے اصول انصاف کے رو سے ہمارے لیے ان جرائم کا چھپانا جائز نہیں جو ان انتقامات کے محرک ہوئے۔“ (۱)

باغیوں کے ساتھ مغرب کی ہمدردی: ۱۸۲۱ء سے ۱۸۲۳ء تک بغاوت کی شورش مسلسل قائم رہی، اس درمیان میں نہ صرف موریا بلکہ خلیج کورنٹھ کے شمال میں تحصیل کی سرحد تک تمام یونانی علاقے جن میں ایتھنز بھی شامل تھا عملاً خود مختار ہو گئے اور ایک قومی حکومت قائم کر لی گئی، یورپ نے اہل یونان کے ساتھ بڑی ہمدردی ظاہر کی، یونان کے علوم قدیمہ اور دین مسیحی کے نام پر ایک زبردست تحریک تمام یورپ میں پھیل گئی، جس کے خاص علمبردار انگلستان اور فرانس کے مشہور شاعر لارڈ بائرن (Byron) اور وکٹر ہیوگو (Victor Hugo) تھے۔

ان ممالک میں یونان کی مدد کے لیے متعدد انجمنیں قائم ہوئیں اور بہت سے والنٹیر وہاں روانہ ہو گئے، بائرن خود جنوری ۱۸۲۳ء میں یونان آ کر باغیوں کی فوج میں شامل ہوا لیکن تین ہی مہینے کے بعد اپریل میں وہ ملیس یا کاشکار ہو گیا، تاہم اس قلیل مدت میں اس پر یہ بات ظاہر ہو گئی تھی کہ یونانی سردار نفاق، سازش اور خود غرضی میں مبتلا ہیں اور جس بلند تخیل کو سامنے رکھ کر یہ جنگ شروع کی گئی ہے، اس کی حقیقت شراب سے زیادہ نہیں، ایسا ہی تجربہ دوسرے یونان پرستوں کو بھی ہوا، چنانچہ فرانسیسی والنٹیر وں کی ایک جماعت نے یونان پہنچ کر جو حالات پیش قدم خود مشاہدہ کیے ان سے متاثر ہو کر اس نے فرانسیسی امیر البحر سے درخواست کی کہ اسے فرانس واپس بھیج دیا جائے، مشہور فرانسیسی مصنف الفرید لمیتر نے اس درخواست کو اپنی کتاب میں جو استقلال یونان پر اس نے لکھی ہے نقل کیا ہے، ہم مصطفیٰ کامل پاشا کے حوالہ سے اس کے ایک حصہ کا ترجمہ ذیل میں

(۱) یونان کی جنگ آزادی ص ۷۷

درج کرتے ہیں۔

”ہمارے فرانس سے روانہ ہونے سے پہلے لوگ یونانیوں کی شجاعت اور بہادری کی تعریف کرتے تھے کہ وہ دلیری اور عظمت میں اپنے اسراف سے بڑھ کر ہیں لیکن ہم نے یہاں ایسے لوگوں کو پایا جو حجب مال میں جرائم کے مرتکب ہوتے ہیں اور بہت سے ایسے ہیں جو جہالت اور وحشت کی تاریکی میں پڑے ہوئے ہیں۔“ (۱)

کمانڈر بوجول بغاوت یونان کے ذکر میں ۲۲ دسمبر ۱۸۲۷ء کو لکھتا ہے:

”میں مشرق میں آیا اور میں یونانیوں کا بہت بڑا مددگار تھا اور تجربہ سے پہلے ان کے متعلق میرے حسن ظن میں کوئی تغیر واقع نہیں ہوا تھا لیکن تجربہ سے معلوم ہوا کہ وہ وطنیت، شجاعت اور اتحاد سے بالکل خالی ہیں، ان کے ہر رئیس کی خواہش یہ ہے کہ دولت مند ہو جائے، طوائف الملوکی بلاد یونان میں انتہا کو پہنچ گئی ہے اور بیشتر حکام جو ذلیل ترین لوگوں میں سے ہیں مسلح بحری ڈاکوؤں کی حیثیت سے مشہور ہیں، اگر دول (عظمیٰ) مداخلت نہ کرتیں تو یونانی اس سال سپر ڈال دیتے، یورپین اقوام کے منوں کرم ہو کر بھی یونانی ڈاکو خود

انہی قوموں کی تجارت پر حملے کرتے تھے۔ (۲)

برطانیہ کی معاندانہ روش: ان حالات کے باوجود مسیحی یورپ سے باغیوں کو برابر مدد پہنچتی رہی، دولت عثمانیہ کے ساتھ انگلستان کے تعلقات دوستانہ تھے، لیکن انگلستان نے بھی یونانیوں کی مدد اس طرح علانیہ شروع کی کہ بالآخر اوائل ۱۸۲۷ء میں دونوں حکومتوں کے تعلقات کشیدہ ہو گئے، سلطان کو یہ سن کر حیرت ہوئی کہ لندن کے لارڈ میئر (Lord Meyor) نے یونانیوں کی مدد کے لیے ایک بڑی رقم روانہ کی ہے اور لارڈ

بائرن اور کرنل اسٹین ہوپ (لارڈ بیرنگٹن) (Cornal Stanhope, Earl of Harrington) جو انگلستان کی شاہی فوج کا افسر تھا، کھلم کھلا یونانی فوج میں شامل ہو گئے ہیں، جزائر آئوین کے برطانوی افسروں نے باغی ارماتولی کو پناہ دی ہے اور انگریز ساہوکاروں نے باغیوں کے لیے روپیہ بھیجا ہے، سلطان نے ان باتوں کو حکومت برطانیہ کے معاندانہ ارادوں کی طرف منسوب کیا، چنانچہ ۹ اپریل ۱۸۲۳ء کو برطانوی سفیر لارڈ اسٹیننگٹون (Stingford) سے اس طرز عمل کے خلاف سخت احتجاج کیا گیا، رئیس آفندی (عثمانی وزیر خارجہ) نے سفیر مذکور سے کہا کہ یہ بات خلاف عقل ہے کہ کوئی حکومت خواہ وہ کسی شکل کی ہوتی طاقت نہیں رکھتی کہ اپنی رعایا کو ان کی من مانی لڑائیوں سے باز رکھ سکے یا غیر حکومتوں کے ساتھ جو معاہدے ہو چکے ہیں انھیں توڑنے پر ان کو سزا دے سکے، اگر ایسا ہی ہے تو پھر یورپ کا امن جسے قائم رکھنے کے لیے حکومت برطانیہ اس قدر فکر مندی ظاہر کر رہی ہے، غیر سرکاری افراد کی خواہشات پر منحصر ہو کر رہ جائے گا، کیوں کہ اس وقت ایک مملکت دوسری مملکت سے یہ کہہ سکے گی کہ ”میں آپ کی تخلص اور وفادار دوست ہوں لیکن میری استدعا ہے کہ آپ بس اسی سے مطمئن رہیں اور ناراض نہ ہوں، اگر میری رعایا میں سے کچھ لوگ آپ کی رعایا پر چڑھ دوڑیں اور ان کے گلے کاٹ ڈالیں“، فنلے لکھتا ہے کہ ”اس بے لاگ اور منصفانہ احتجاج میں آخر میں قطعی طور پر یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ برطانوی رعایا کو ترکی کے خلاف جنگ کرنے اور یونانیوں کی اسلحہ، روپیہ اور گولے بارود سے مدد کرنے سے روکا جائے“ (۱) لیکن بعد کے واقعات ظاہر کرتے ہیں کہ چند دنوں کے بعد حکومت برطانیہ نے اس نقاب کو بھی اٹھادیا اور یونانیوں کی حمایت میں علانیہ طور پر میدان میں آگئی۔

مصر کی مدد: چار سال کی کوششوں کے باوجود جب بغاوت کا استیصال نہ ہو سکا بلکہ باغیوں کی قوت روز بروز بڑھتی ہی گئی تو ۱۹۲۴ء میں سلطان نے محمد علی پاشا والی مصر کو مدد

کے لیے طلب کیا اور اس خدمت کے معاوضہ میں محمد علی کی خواہش پر شام، دمشق اور کریت کے علاقوں کو مصر کی پاشائی میں شامل کر دینے کا وعدہ کیا، چنانچہ مصری بیڑہ جس پر دس ہزار پیدل اور ایک ہزار سوار فوج تھی، محمد علی پاشا کے لڑکے ابراہیم پاشا کی سرکردگی میں ۲۵ جولائی ۱۸۲۳ء کو اسکندریہ سے روانہ ہوا اور یونان پہنچ کر موڈن میں لشکر انداز ہوا، مصری فوج کے ایک حصہ نے وہاں سے کوچ کر کے نوارینو کا محاصرہ کر لیا، یونانیوں کی بہترین فوج جو سات ہزار آدمیوں پر مشتمل تھی اس اہم قلعہ کو بچانے کے لیے بڑھی مگر ابراہیم پاشا کے سپاہیوں نے جن کی تعداد اس معرکہ میں صرف تین ہزار تھی حملہ کر کے انھیں بری طرح شکست دی، یونانی نہایت انتشار کی حالت میں بھاگ کھڑے ہوئے، ایورسلے لکھتا ہے کہ ”یہ جنگ اس بات کا ثبوت تھی کہ بہترین یونانی فوجیں بھی کسی لڑائی میں اور تربیت یافتہ مصریوں کا جم کر مقابلہ نہیں کر سکتی تھیں“ (۱) ۲۷ رمضان ۱۲۴۰ھ (۱۲ مئی ۱۸۲۵ء) کو ابراہیم فاتحانہ شان سے نوارینو میں داخل ہوا۔

قلعہ کا فوجی دستہ ہتھیار ڈال دینے پر مجبور ہو چکا تھا مگر یونانیوں کو یاد تھا کہ جب ترکوں نے نوارینو میں ہتھیار ڈالے تھے تو ان کے ساتھ معاہدہ کی پابندی کیوں کر گئی تھی، اسی سلوک کی توقع وہ اپنے لیے بھی کرتے تھے، غداري اور معاہدہ شکنی جن لوگوں کا قومی شعار تھا وہ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ انتقام کے موقع پر بھی کوئی فاتح غفودرگزر کی مثال پیش کر سکتا ہے اور مفتوحین کی جان کی حفاظت خود اپنے سپاہیوں کے ذریعہ کر سکتا ہے لیکن ابراہیم نے یہ کر دکھایا، معاہدہ کے مطابق اس نے پورے دستہ کو فرانسیسی اور آسٹروی جہازوں پر کارواں روانہ کر دیا، مسلمانوں کا ایک گروہ جنھیں نوارینو کے قتل عام کی یاد اب تک بے چین کیے ہوئے تھی انتقام کی فکر میں اکٹھا ہو گیا تھا مگر ابراہیم نے اس کی پیش بینی کر کے عیسائیوں کی حفاظت کی تدبیر پہلے سے کر دی تھی، سوار فوج کے ایک دستہ نے ترکوں کو قریب آنے سے روک رکھا اور نہتے یونانی عرب پیدل فوج

کی سنگینوں کے سایہ میں جہازوں تک پہنچائے گئے۔ (۱)

موریا کی تسخیر: نواریوں کی فتح کے بعد ابراہیم پاشا نے یکے بعد دیگرے موریا کے تمام اہم شہروں اور قلعوں پر قبضہ کر لیا، ۲۲ اپریل ۱۸۲۶ء کو مغربی یونان کا سب سے اہم قلعہ مسولوگنی فتح ہو گیا اور جون ۱۸۲۷ء میں لارڈ کوثرین (Cochrane) جنرل چرچ (Church) اور دوسرے انگریز افسروں کی پوری مدد کے باوجود آیتھنر کو بھی ہتھیار ڈال دینے پڑے اور کورنتھ پر بھی ترکوں کا قبضہ ہو گیا، اب سارے موریا میں عثمانی تسلط قائم تھا، یونان کی قومی حکومت کو جو دوران بغاوت میں قائم کر لی گئی تھی جزیرہ پوروس (Poros) میں منتقل ہو جانا پڑا، بحری جنگ میں بھی یونانیوں کو شکست ہوئی، ان شکستوں کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ یونانی سرداروں میں خود آپس ہی میں نفاق پیدا ہو گیا، جس نے ان کی رہی سہی قوت کو بالکل توڑ دیا، اس میں شبہ نہیں کہ اگر دول غظمی اس موقع پر مداخلت نہ کرتیں اور یونانیوں کی حمایت میں دولت علیہ سے خود ہی برسر پیکار نہ ہو جاتی تو بغاوت کا استیصال مکمل طور پر ہو جاتا اور یونان میں پھر ترکی حکومت قائم ہو جاتی۔

نئی چری کا استیصال: ابراہیم پاشا کی کامیابیوں نے سلطان کو یونان کی طرف سے ایک حد تک مطمئن کر کے سلطنت کی اندرونی خرابیوں کی جانب توجہ کرنے کا موقع دیا۔ عرصہ سے دولت عثمانیہ کے زوال کا اصلی باعث بنی چری فوجیں ہو رہی تھیں، وہ ہر اصلاح کی مخالفت کرتیں اور اپنی بدعنوانیوں کو قائم رکھنے کے لیے سلطان سیم جیسے مدبر اور بیدار مغز فرماں روا کے قتل سے بھی باز نہ آئیں، اصلاح پسند وزرا کی ایک خاصی تعداد ان کی سرکشی کا شکار ہو چکی تھی، خود محمود کو ان کے ہاتھوں جو تلخ گھونٹ پینے پڑے اس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے، نہ صرف یہ کہ سلطنت کے لیے وہ ایک مستقل فتنہ ہو کر رہ گئی تھیں بلکہ بیرونی دشمنوں کے مقابلہ میں بھی اب ان پر مطلق اعتبار نہیں کیا جاسکتا تھا، ۱۱-۱۸۱۰ء کی جنگ اور پھر بغاوت یونان کے دوران میں یہ پوری طرح ثابت ہو گیا تھا کہ ان کی

زبردست تنظیم اور غیر معمولی شجاعت اب باقی نہیں رہی اور عثمانی فتوحات جن فوجوں کی رہن منت تھیں وہ دشمن کے مقابلہ میں اب جم کر لڑ بھی نہیں سکتی تھیں، یونان میں مصری فوج کی کامیابی نے جو یورپ کے فوجی نظام کے مطابق مرتب اور مسیح کی گئی تھی نئی چری کی فرسودگی اور کمزوری کو اور بھی نمایاں کر دیا تھا، محمود کے علاوہ قسطنطنیہ کے عام باشندے، ارکان دیوان اور جماعتِ علما بھی دونوں کے فرق سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی، محمود نے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور نئی چری کو جو مدت سے مارا آستین بنے ہوئے تھے ہمیشہ کے لیے ختم کر دینے کا عزم کر لیا، اس کے لیے وہ پہلے ہی سے درپردہ تیاریاں کر رہا تھا، اس نے رفتہ رفتہ توپچیوں کی فوج بڑھالی تھی اور اس میں انہی اشخاص کو افسر مقرر کیا تھا جن کی وفاداری پر اعتماد کیا جاسکتا تھا، چنانچہ ۱۸۲۶ء میں جب نئی چری کے استیصال کا اس نے قطعی فیصلہ کیا اس کے توپچیوں کی تعداد چودہ ہزار تک پہنچ چکی تھی، اس فوج کا افسر ابراہیم سلطان محمود کا نہایت معتمد سردار تھا، محمود نے نئی چری کا آغا حسین نامی ایک افسر کو مقرر کیا تھا جو اس کے احکام کی تعمیل کے لیے ہمہ تن تیار تھا، اس نے علما کو بھی اپنا ہم خیال بنالیا تھا اور چند دنوں پیشتر مفتی اعظم کے عہدہ پر ایک ایسے شخص کو مقرر کیا تھا جو اس کا ہمنوا اور موید تھا۔

ان تیاریوں کے بعد محمود نے وزرا اور علما کی ایک مجلس منعقد کی جس میں یہ قرارداد منظور ہوئی کہ کفار پر غالب آنے کے لیے ضروری ہے کہ عثمانی فوجیں از سر نو باقاعدہ منظم کی جائیں، اس کے بعد تمام حاضرین مجلس کے دستخطوں سے ایک فتویٰ اس مضمون کا شائع کیا گیا کہ نئی چری کے ہر دستہ سے سپاہیوں کی ایک معین تعداد جدید فوجی قواعد سیکھنے کے لیے بھیجی جائے، اس فتوے سے نئی چری میں بڑی برہمی پھیلی اور انھوں نے ۱۵ جون ۱۸۲۶ء کو ات میدان میں جمع ہو کر اپنی شور بے کی دگلیں الٹ دیں جو گویا بغاوت کا اعلان تھا اور خاص خاص وزیروں کے قتل کا مطالبہ کرتی ہوئی قصر سلطانی کی طرف بڑھیں، محمود مقابلہ کے لیے تیار تھا، اس نے علم نبویؐ کو اپنے ہاتھ میں لے کر بلند کیا

اور تمام مسلمانوں کو بادشاہ وقت اور امیر المومنین کی حمایت کے لیے بلایا، اس علم کو دیکھ کر لوگ جوق جوق اس کے گرد جمع ہونے لگے، فوراً ہی توپچیوں کی فوج اور ایشیائی دستے بھی جو اسی وقت کے لیے سقوطی میں مقیم تھے موقع پر پہنچ گئے، جوں ہی چری سرکوں میں داخل ہو کر محل کی طرف بڑھے، ابراہیم نے توپچیوں کو گولہ باری کا حکم دیا، یہی چری گولوں کی تاب نہ لا سکے اور پسپا ہوئے اور ارات میدان میں اکٹھا ہو کر تھوڑی دیر تک اپنی بندوقوں سے بڑی بہادری کے ساتھ مقابلہ کرتے رہے لیکن گولوں کی بارش سے تنگ آ کر انھیں وہاں سے بھی ہٹنا پڑا اور اب انھوں نے اپنی بارکوں میں جا کر پناہ لی اور وہاں بہت جم کر مقابلہ کیا، محمود نے تمام توپیں بارکوں کے سامنے لگوا دیں اور مسلسل گولہ باری ہونے لگی، تھوڑی دیر میں تمام بارکیں جل کر برباد ہو گئیں اور یہی چری کا ایک ایک سپاہی ہلاک ہو گیا، قسطنطنیہ میں جتنی یہی چری اس طرح مارے گئے ان کی تعداد چار ہزار بتائی جاتی ہے، ان کے علاوہ ہزاروں جو سلطنت کے مختلف حصوں میں تھے چن چن کر قتل کر دیے گئے اور یہ پوری فوج بالکل ختم کر دی گئی یہاں تک کہ اس کا نام بھی سرکاری دفاتروں سے مٹا دیا گیا۔

محمود کے کارنامے: عنان حکومت کو ہاتھ میں لینے کے بعد محمود کو جن بیش از بیش مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ان کا ذکر اوپر ہو چکا ہے، اس کے حیرت انگیز عزم و استقلال نے ان تمام مشکلات کو اٹھارہ سال کی قلیل مدت میں دور کر دیا، سلطنت عثمانیہ کی بنیاد جو ۱۸۰۸ء میں متزلزل ہو گئی تھی، ۱۸۲۶ء میں پھر مستحکم نظر آنے لگی، ابتداء تقریباً ہر بڑے صوبہ میں شورش برپا تھی، محمود نے سب کو فرو کیا، سب سے بڑا سرکش والی یانین علی پاشا تھا وہ گرفتار کر کے قتل کیا گیا، عرب میں وہابیوں کا زور ہمیشہ کے لیے ٹوٹ گیا، مصر میں مملوک نیست و نابود کر دیے گئے، محمد علی پاشا کی طرف سے سرکشی کی کوئی علامت ابھی ظاہر نہیں ہوئی تھی، برخلاف اس کے اس کی بری اور بحری فوجیں ابراہیم پاشا کی سرکردگی میں یونان کو دولت علیہ کے لیے از سر نو فتح کر رہی تھیں، اس درمیان میں مولد یویا اور ولاچیا

کی بغاوتیں بھی فرو کی گئیں اور سرویا کے قلعوں پر بھی عثمانی فوجوں کا قبضہ ہو گیا، سب سے آخر محمود نے نئی چری کا استیصال کر کے سلطنت عثمانیہ کو اس کے سب سے بڑے اندرونی خطرہ سے ہمیشہ کے لیے نجات دلائی، یہ سب کچھ محمود نے تنہا اپنی خداداد قابلیت اور آہنی عزم کی قوت سے کیا۔

دول عظمیٰ کی دشمنی: نئی چری کو ختم کرنے کے بعد محمود نے اپنی نئی فوج کی تعداد جو یورپ کے فوجی نظام کے مطابق مرتب اور مسلح کی گئی تھی اور جس کا لباس بھی یورپین طرز کا تھا بڑا کر پینتالیس ہزار کر لی، تو بچپوں کی فوج اس کے علاوہ تھی، اس کا ارادہ تھا کہ فوج کی تعداد بتدریج ڈھائی لاکھ تک پہنچا دے لیکن دول عظمیٰ خصوصاً روس جو ہر موقع پر دولت عثمانیہ کی اصلاح اور ترقی کی راہ میں حائل ہو جاتی تھیں، محمود کی فوجی اصلاحات کا آغہ زد کچھ کر جو دیگر اصلاحات کا مقدمہ تھیں اس قدر خوف زدہ ہو گئیں کہ انھوں نے فوراً جنگ چھیڑ دی اور ان اصلاحات کو مکمل ہونے کا موقع نہ دیا، محمود کے عہد کے ایک نہایت مستند مورخ فان مولکی (Yon Moltke) کی رائے ہے کہ اگر نئی چری کے استیصال کے بعد ترکی کو امن و سکون کے دس سال میسر آ جاتے تو سلطان محمود کی فوجی اصلاحات اس مدت میں کچھ قوت حاصل کر لیتیں اور ایک قابل اعتماد فوج کی مدد سے سلطان اپنے ملک کے نظم و نسق میں ضروری اصلاحات جاری کر لیتا، سلطنت عثمانیہ کی مردہ شاخوں میں نئی روح پھونک دیتا اور اپنے پڑوسیوں کے لیے خوفناک بن جاتا، لیکن روس نے ان میں سے ایک بات بھی نہ ہونے دی اور سلطان کی فوجی اصلاحات کو شروع ہی میں ختم کر دیا (۱) مولکی کے بیان کی تصدیق سب سے زیادہ ان مراسلات سے ہوتی ہے جو ۲۹-۱۸۲۸ء کو جنگ میں روس کے بڑے بڑے مدبرین نے ایک دوسرے کو بھیجے تھے اور جن میں انھوں نے صاف طور پر ظاہر کر دیا تھا کہ محمود کی اصلاحات کو روکنے کے لیے ضروری ہے کہ روس فوراً جنگ چھیڑ دے، وہ اعتراف کرتے ہیں کہ دولت عثمانیہ نے محمود

کے زیرِ سیادت جتنی طاقت حاصل کر لی ہے اتنی طاقت مدت سے اسے حاصل نہ تھی اور اس دورِ اندیشی پر اپنے آپ کو مبارک باد دیتے ہیں کہ انھوں نے جدید ترکی فوجوں کو زیادہ قوت حاصل کرنے کا موقع نہ دیا بلکہ ابتدائی میں ان کا زور توڑنے کی تدبیر کر دی۔ (۱)

محمود کی فوجی اصلاحات کے پورے طور پر بار آور نہ ہونے کے دو خاص اسباب تھے، ایک تو روس کی وہ معاندانہ کوششیں جن کا اعتراف اس کے ذمہ دار ارکانِ حکومت نے صاف الفاظ میں کیا ہے، دوسرے حکومتِ برطانیہ کا یونانیوں کی حمایت میں دولتِ عہد سے برسرِ پیکار ہو جانے، روس اور سلطنتِ عثمانیہ کے تعلقاتِ قرونوں سے خراب تھے اور جب سے دولتِ علیہ کا زوال شروع ہوا روس نے کوئی موقع اس کی کمزوری سے فائدہ کا نہ چھوڑا، یونان کی بغاوتِ روس کے لیے ایک بہترین موقع تھی لیکن انقلابِ فرانس اور نپولین کی جنگوں کے بندویانا کی کانگریس نے یورپ میں از سر نو امن و امان قائم کرنے کی جو کوشش کی تھی اس کے لحاظ سے توقع نہ تھی کہ یونان کے باغیوں کو کسی یورپین حکومت سے علانیہ مدد مل سکے گی، ان کو سب سے زیادہ امید روس سے تھی مگر الکزانڈر اول یونانیوں سے پوری ہمدردی رکھنے کے باوجود نفسِ بغاوت کا سخت مخالف تھا اور یونان کے باغیوں کی مدد کر کے خود اپنی رعایا میں بغاوت کا حوصلہ پیدا کرنے کے لیے کسی طرح تیار نہ تھا، اسی بنا پر اس کی حیات تک یونانیوں کو روس سے کوئی مدد مل سکی لیکن ۲۴ دسمبر ۱۸۲۵ء کو الکزانڈر کا انتقال ہو گیا اور روس کے تخت پر اس کا بھائی نکولس (Nicholas) آیا جو تمام تر روس کے قومی جذبات کا مجسمہ تھا اور ترکوں کو یورپ سے نکال دینا اس کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد تھا، نکولس کا تخت نشین ہونا ہی دولتِ عثمانیہ سے جنگ چھڑ جانے کے لیے کافی تھا، روس کی اندرونی سیاست نے اس میں اور بھی جلدی کی، سینٹ پیٹرس برگ میں ایک جماعتِ نکولس کی تخت نشین کی مخالف تھی، یہاں تک کہ فوج بھی اس سے متاثر ہو گئی تھی اور اندیشہ تھا کہ عنقریب خانہ جنگی شروع ہو جائے گی،

دارالسلطنت کے مدبروں کے نزدیک خانہ جنگی کو رفع کرنے کی بہترین صورت یہی تھی کہ سلطنت عثمانیہ سے جنگ چھیڑ دی جائے (۱) لڑائی کے لیے بہانہ تلاش کرنا کچھ مشکل نہ تھا، سرویا، مولڈیویا و رولاچیا کے معاملات جو معرض التوا میں تھے ان کے متعلق گفتگو پھر شروع کر دی گئی اور روسی وزیروں نے ایسا لب و لہجہ اختیار کیا کہ اس سے ان کا اصلی مقصد صاف ظاہر ہوتا تھا، چنانچہ اگست ۱۸۲۶ء میں جب کہ نئی چری کے استیصال کو صرف دو مہینے گزرے تھے، روس کی طرف سے پرزور مطالبہ کیا گیا کہ ایشیا کے بعض قعے جو اس کے دعوے کے مطابق صلح نامہ بخارست میں اسے دئے جا چکے تھے فوراً حوالہ کر دئے جائیں، مولڈیویا اور رولاچیا کے باشندوں کو وہ تمام حقوق دئے جائیں جو بغاوت سے پہلے انھیں حاصل تھے اور اہل سرویا کے سیاسی حقوق کے تسلیم کرنے میں مزید تاخیر نہ کی جائے، ترکوں کو ان مطالبات پر طیش آیا مگر نئی چری کا خاتمہ ہو چکا تھا اور جدید فوج اس وقت تک اتنی تیار نہ تھی کہ روس کا مقابلہ کر سکے، اس لیے محمود کو مجبوراً دینا پڑا اور ۲۸ مئی ۱۸۲۲ء مطابق ۷ اکتوبر ۱۸۲۶ء کو معاہدہ آق کرمان پر دستخط ہو گئے۔

معاہدہ آق کرمان: اس معاہدہ میں صلح نامہ بخارست کی از سر نو تصدیق کی گئی اور یہ طے پایا کہ مولڈیویا اور رولاچیا کے باشندوں کو وہ تمام حقوق پھر دئے جائیں جو صلح نامہ مذکور نیز خط شریف ۱۸۰۲ء کے روسے انھیں مل چکے تھے، ان ولایتوں کے آئندہ امیروں (ہوسپودار) کا انتخاب وہیں کے رؤسا اپنی جماعت میں سے سات سال کے لیے کیا کریں، باب عالی کو حق نہ ہوگا کہ ان میں سے کسی امیر کو روس کی منظوری کے بغیر معزول کرے، مولڈیویا کے رؤسا کو جو ۱۸۲۱ء کی بغاوت میں شریک تھے اور پھر روس جا کر پناہ گزین ہوئے تھے وطن واپس آنے اور اپنی جائیداد اور املاک پر قابض ہونے کی اجازت دی جائے، سرویا کی آئندہ حکومت سے متعلق وہاں کے باشندے اپنے نمائندوں کے ذریعہ باب عالی سے معاملات طے کر لیں اور جو کچھ طے ہوا سے فوراً ایک خط شریف میں

شایع کر کے اس معاہدہ میں شامل کر دیا جائے، سرویا کو جو حقوق دئے جائیں ان میں مندرجہ ذیل امور کی تصریح خاص طور پر کر دی جائے: مذہبی آزادی، اپنے سرداروں کا آزاد انتخاب، حکومت خود اختیاری، جو علاقے سرویا سے علاحدہ کر لیے گئے تھے ان کا دوبارہ الحاق، متعدد محصولات کو ملا کر صرف ایک محصول کا نفاذ، تجارتی آزادی، شفا خانوں مدرسوں اور مطبوعات کا قیام اور یہ قانون کہ قلعوں کے فوجی دستوں کے علاوہ کسی مسلمان کو سرویا میں رہنے کی اجازت نہ دی جائے، معاہدہ کی دوسری دفعات بھی دولت علیہ کے خلاف ہی تھیں مثلاً شمالی افریقہ کے بحری قزاقوں سے روسی تاجروں کو جو نقصان پہنچے اس کی تلافی کا ذمہ دار باب عالی ہوگا اور اب تک جن حکومتوں کو بحر اسود میں جہاز رانی کا حق حاصل نہ تھا اگر آئندہ انھیں یہ حق دیا جائے تو باب عالی ذمہ دار ہوگا کہ اس اجازت سے روس کی تجارت کو کوئی نقصان نہ پہونچے گا۔

مسیحی اتحاد: محمود نے مذکورہ بالا شرائط کی سختی صرف اس خیال سے گوارا کر لی تھی کہ فی الحال جنگ سے مہلت مل جائے گی اور فوجی و ملکی اصلاحات جاری کی جاسکیں گی، جن کے لیے امن کی فرصت ضروری تھی لیکن یورپ کی مسیحی طاقتوں کے لیے دولت عثمانیہ پر حملہ کرنے کا اس سے بہتر موقع مشکل سے میسر آسکتا تھا، جب کہ ایک طرف بینی چری کا خاتمہ ہو چکا تھا اور دوسری طرف سلطنت کی بقیہ فوجیں یونانی بغاوت کے فرو کرنے میں مصروف تھیں روس تو قدیم دشمن تھا ان حکومتوں نے بھی اس موقع سے فائدہ اٹھانے میں تامل نہ کیا جو مدت سے دوستی کا دم بھر رہی تھیں، چنانچہ انگلستان اور فرانس نے یونان کی درپردہ ہمدردی سے نکل کر علانیہ حمایت شروع کر دی، ۶ جولائی ۱۸۲۷ء کو روس، انگلستان اور فرانس کے درمیان لندن میں ایک معاہدہ ہوا جس کا مقصد جنگ یونان کی خوں ریزی کو ختم کرنا اور ترکوں اور یونانیوں میں صلح کر دینا ظاہر کیا گیا، ارکان معاہدہ نے محاربین کے درمیان مصالحت کر دینے کے لیے اپنی خدمات پیش کیں اور صلح کی بنیادی شرط یہ قرار دی کہ یونان کو عملاً بالکل آزاد کر دیا جائے، سلطان کی فرماں روائی

صرف نام کے لیے باقی رہے اور اسے ایک معین رقم بطور سمانہ خراج کے ملتی رہے، جسے یونانی خود ہی جمع کر کے بھیج دیا کریں گے، ان شرائط پر گفتگو کرنے کے لیے یہ طے پایا کہ جنگ فوراً روک دی جائے اور اگر باب عالی دولِ عظمیٰ کی وساطت قبول کرنے سے انکار کرے تو یونان کو ایک آزاد حکومت تسلیم کر کے اس سے بین الاقوامی تعلقات قائم کر لیے جائیں، چنانچہ اس معاہدہ کے مطابق روس انگلستان اور فرانس کے سفیروں نے باب عالی سے جنگ روک دینے اور مذکورہ بالا شرائط پر صبح کر لینے کا مطالبہ پیش کیا، محمود نے اس مطالبہ کو فوراً مسترد کر دیا اور جواب دیا کہ غیر حکومتوں کو سلطنت عثمانیہ کے اندرونی معاملات میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں، خصوصاً جبکہ وہ ملک جسے عثمانی مقبوضات سے علاحدہ کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے، صدیوں سے دولت علیہ کے زیر حکومت رہ چکا ہے اور وہ جماعت جس کی پاسداری میں اتحادیوں نے بین الاقوامی قوانین کے تمام اصولوں کو بالائے طاق رکھ دیا ہے، ڈاکوؤں اور باغیوں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔

واقعہ نوارینو: دولِ شانشہ نے جب یہ دیکھا کہ ابراہیم پاشا کو موریا میں شاندار کامیابی حاصل ہو رہی ہے اور اس نے یونانیوں کو ہر موقع پر شکست دے کر بغاوت کا تقریباً خاتمہ کر دیا ہے تو انھوں نے یونان کی حمایت میں اپنے جنگی بیڑے بھیج کر امیر البحرینوں سے ذریعہ سے ابراہیم پاشا سے یہ مطالبہ کیا کہ وہ باغیوں کے خلاف اب کوئی کارروائی نہ کرے اور اپنے جہازوں اور فوج کو لے کر مصر واپس چلا جائے، ابراہیم پاشا نے جواب دیا کہ وہ اپنے والد یا باب عالی کے احکام کے بغیر ایب کرنے سے معذور ہے، ابتہ اس نے باب عالی کے احکام کے پہنچنے تک ناراضی صلح منظور کر لی لیکن یوروپین امیر البحرینوں نے اس معاہدہ کی پابندی نہیں کی اور برابر یونانیوں کی حوصلہ افزائی کرتے رہے، مہلت جنگ سے فائدہ اٹھا کر یونانی ان مقامات پر حملہ کرنے لگے جنہیں ابراہیم پاشا فتح کر چکا تھا، انگریز اور یوروپین افسر بھی یونانی فوجوں میں شامل تھے، ابراہیم پاشا نے ان کارروائیوں کے خلاف سخت احتجاج کیا مگر دولِ عظمیٰ کے امیر البحرینوں نے اس کی مطلق

پروا نہیں کی، برخلاف اس کے جب ابراہیم پاشا نے شہر پتراس (Patras) کو بچانے کے لیے جس پر یونانیوں نے حملہ کر دیا تھا، نوارینو کی بندرگاہ سے ٹھکن چاہا تو انگریز امیر البحر کوڈرنگٹن (Codrington) نے جو اتحادی بیڑوں کا سرعمر تھا معاہدہ صلح کا حوالہ دے کر اسے روک دیا۔

اتحادی بیڑا عثمانی بیڑے کی ناکہ بندی کرنے کے لیے خلیج نوارینو میں داخل ہو گیا تھا، کوڈرنگٹن کو یہ ہدایت تھی کہ ابراہیم پاشا تک کسی قسم کی مدد نہ پہنچنے دے گا اس کے لیے بالآخر توپ سے کام لینا پڑے، ابراہیم پاشا نے یہ دیکھ کر کہ دول متحدہ کی حوصلہ افزائی سے باغیوں کی شورش پھر بڑھ رہی ہے، موریا کے اندرونی علاقوں میں جا کر اس فتنہ کو روکنے کی کوشش کی، کوڈرنگٹن نے اس کی عدم موجودگی سے فائدہ اٹھا کر ۲۰ اکتوبر ۱۸۲۷ء کو دفعہ ترکی مصری جہازوں پر جو خلیج نوارینو میں لشکر انداز تھے حملہ کر دیا، حمد کی وجہ یہ بیان کی گئی کہ عثمانی بیڑے سے ایک گولی آ کر ایک انگریز کو لگی اور وہ مر گیا، اس ایک مسخ جان کے بدلہ میں تقریباً پورا عثمانی بیڑا برباد کر دیا گیا، جس میں ہزاروں مسلمان ہلاک ہو گئے، عثمانی بیڑے میں کشتیوں کی تعداد تو ضرور زیادہ تھی لیکن جنگی جہازوں کی تعداد اور مجموعی حیثیت سے اتحادی بیڑا اس سے بہت بہتر تھا (۱) چار گھنٹے تک شدید جنگ ہوتی رہی، ترکوں اور مصریوں نے نہایت شجاعت سے مقابلہ کیا مگر آخر میں چند کشتیوں کے علاوہ باقی سب جہاز برباد ہو گئے۔

اس واقعہ سے تمام یورپ متحیر ہو گیا اور بقول میریٹ انگلستان کی حکومت میں تو اس سے سراسیمگی پیدا ہو گئی، اس وقت تک دول متحدہ میں سے کسی نے بھی دولت عثمانیہ سے جنگ کا اعلان نہیں کیا تھا، اس لیے واقعہ نوارینو کی توجیہ سمجھ میں نہیں آتی تھی، چنانچہ ۲۹ جنوری ۱۸۲۸ء کو شاہ انگلستان نے اس واقعہ پر اپنے ”شدید غم“ کا اظہار کیا کہ ”ایک قدیم حلیف کی بحری فوجوں سے لڑائی ہو گئی“ (۲) اور قوی امید ظاہر کی کہ ”اس

حادثہ مشہورہ کے بعد پھر جنگ وجدل کی نوبت نہ آئے گی“ (۱) لیکن موسیو الفریڈ میر نے صحیح لکھا ہے کہ اتحادی بیڑے نے جو کچھ کیا وہ فرانس، روس اور انگلستان کی متفقہ رائے سے کیا۔ (۲)

نوارینو کی شکست کا اثر: نوارینو کا حادثہ دولت عثمانیہ کے حق میں نہایت مضرت ثابت ہوا، اس سے صرف اتنا ہی نہیں ہوا کہ ابراہیم پاشا کا بحری تعلق مصر سے منقطع ہو گیا بلکہ جنگ یونان کا بھی خاتمہ ہو گیا اور یونان کے باغی ایک خود مختار مملکت کے حاکم بن گئے، ابراہیم پاشا کو اپنی فوجیں لے کر مصر واپس چلا جانا پڑا، اس کے بعد فرانسیسی جنرل مین (Maison) اتحادیوں کی طرف سے موریا میں داخل ہوا اور اس نے بقیہ ترکی فوجوں کو بھی وہاں سے نکل جانے پر مجبور کر دیا، نوارینو کے واقعہ سے بحر اسود پر روس کا تسلط بھی قائم ہو گیا، جو آئندہ جنگ میں اس کے لیے بہت مفید ثابت ہوا کیوں کہ اس سے وارنا کی فتح آسان ہو گئی اور روسی فوجیں بلقان کو عبور کر کے قسطنطنیہ کے حملہ کے قصد سے آگے بڑھ سکیں۔

ان واقعات کے باوجود سلطان محمود نے معاہدہ لندن کے شرائط منظور کرنے سے قطعی انکار کر دیا، البتہ وزراء نے سلطنت کی کمزوری کو محسوس کر کے اس بات کی کوشش کی کہ جنگ کی نوبت نہ آئے، چنانچہ انھوں نے یونان سے متعلق کچھ تجویزیں اتحادیوں کے سامنے ان کی سفیروں کے ذریعہ سے پیش کرنی چاہیں، وہ تجویزیں یہ تھیں کہ باب عالی تمام باغیوں کو معاف کر دے گا، محصلوں اور خراج کی باقی ماندہ رقم سے دست بردار ہو جائے گا جو جائیدادیں ضبط کر لی گئی تھیں انھیں واپس کر دے گا، یونانیوں کے تمام سابق حقوق از سر نو عطا کر دے گا اور اس بات کی ضمانت دے گا کہ حکومت پہلے کی بہ نسبت زیادہ نرمی سے کی جائے گی مگر سفر معاہدہ لندن کے شرائط پر مصر رہے اور ان میں سے کسی تجویز کو منظور نہیں کیا (۳) ۸ دسمبر ۱۸۲۷ء کو وہ قسطنطنیہ سے روانہ ہو گئے، یہ ان

حکومتوں کی طرف سے تعلقات کے منقطع ہونے کا اعلان تھا، رئیس آفندی نے معاملات کو سلجھانے کی ایک بار اور کوشش کی مگر روسی سفیر نے اس کے مراسلہ کا کوئی جواب بھی نہیں دیا، حقیقت یہ تھی کہ زار نکولس جنگ کے لیے بالکل تیار تھا، وہ بسر آبیہ کے علاقہ میں نی فوہیں بھرتی کر رہا تھا اور بحر اسود کی بندرگاہوں میں فوجی سامان اور جہازوں کو اکٹھا کر رہا تھا کہ ضرورت کے وقت عثمانی مقبوضات پر بلا تاخیر حملہ کیا جاسکے، باب عالی اور روس کے درمیان بعض شکایتیں عرصہ سے چلی آرہی تھیں جن میں سے ہر ایک بجائے خود نکولس جیسے زار کے لیے جنگ کا حیلہ بن سکتی تھی مثلاً مولڈ یویا، ولاچیا اور سرویا کے معاملات ہر موقع پر روس کے کام آسکتے تھے، دوسری طرف باب عالی ایشیہ کے چند قلعوں کا دعویٰ کرتا تھا جن پر روس غاصبانہ قابض تھا، ان حالات سے محمود کو یقین ہو گیا تھا کہ نکولس جنگ کے لیے بالکل تیار ہے اور عنقریب حملہ کر دے گا، ہذا بجائے اس کے کہ وہ روس کے حملہ کا انتظار کرے ۲۰ دسمبر ۱۸۲۷ء کو اس سے خود ہی اعلان جنگ کر دیا۔

جنگ روس: مئی ۱۸۲۸ء میں زار نکولس خود میدان میں آیا اور دریائے پرتھ کو عبور کر کے پندرہ ہزار فوج کے ساتھ مولڈ یویا میں داخل ہو گیا، تقریباً اسی وقت روسی بیڑہ بھی درہ دانیال میں داخل ہوا۔

سلطنت عثمانیہ کے یورپین صوبوں میں ایک لاکھ روسی فوجیں روانہ کی گئی تھیں، ان کے علاوہ جنرل کاؤنٹ پاسکی ویش (Count Paskiwetsch) تیس ہزار سپاہیوں کے ساتھ ایشیائی صوبوں میں داخل ہوا اور سولہ ہزار کا ایک لشکر وقت ضرورت کے لیے الگ محفوظ رکھا، بحری قوت میں روس کی فوقیت مسلم تھی، چھوٹے جہازوں کے علاوہ بحر اسود میں اس کے سولہ بڑے بڑے جنگی جہاز لڑائی کے لیے تیار تھے، نیز بحر یونان میں اس کا وہ بیڑا بھی موجود تھا جس نے نوارینو میں ترکی بیڑے کو شکست دینے میں مدد کی تھی، اس جنگ میں شروع سے آخر تک روس کی بحری طاقت اس کے حق میں نہایت مفید ثابت ہوئی، برخلاف اس کے دولت علیہ کی بری اور بحری دونوں قوتیں روس

کے مقابلہ میں بہت کمزور تھیں، بری فوجوں کی تعداد جو نظام جدید کے مطابق مرتب کی گئی تھی صرف اڑتالیس ہزار تھی، ان میں زیادہ تر نوجوان تھے جو اس امید پر بھرتی کیے گئے تھے کہ فوجی اصلاحات کے خلاف ان کی بدظنی بڑی عمر کے ترکوں کی طرح شدید نہ ہوگی لیکن نا تجربہ کاری کے باوجود جو چیز ان نوجوانوں کو آزمودہ کار سپاہیوں پر فوقیت دیتی تھی وہ ان کی اطاعت شعاری تھی، میدان جنگ میں انھوں نے اپنی شجاعت سے روسیوں کے دانت کھٹے کر دئے، روسی سفیر متعینہ پیرس ۱۹ نومبر ۱۸۲۸ء کو لکھتا ہے: ایسی حالت میں جب کہ اصلاحات کی پوری تکمیل نہیں ہوئی اور وہ ابتدائی حالت میں ہیں، سلطان نے ہمارا باضابطہ اور شدت سے مقابلہ کیا ہے تو اس صورت میں ان کا مقابلہ کس قدر زبردست ہوتا جب کہ ان کو تکمیل کا موقع مل جاتا اور وہ پایہ کمال کو پہنچ جاتے“ (۱) ان جدید فوجوں کے علاوہ جاگیرداروں کی بے ضابطہ فوجیں بھی طلب کی گئی تھیں لیکن چونکہ یورپین صوبوں میں محمود کی اصلاحات کے خلاف عام بیزاری پھیلی ہوئی تھی اس لیے جاگیری فوجوں کا بڑا حصہ صرف ایشیائی صوبوں سے فراہم ہوسکا، یورپین صوبوں نے بہت کم مدد کی، چنانچہ بوسنیا نے جو ایک نہایت جنگجو صوبہ تھا اور اس میں زیادہ تر مسلمان آباد تھے کوئی فوج نہیں بھیجی، فوجی افسروں میں بھی بہتیرے اب تک نظام قدیم کے دلدادہ تھے اور بقول کرلیسی اصلاحات کی وجہ سے سلطان سے ان کی بیزاری تقریباً اتنی ہی شدید تھی جتنی روسی کفار کے خلاف ان کی نفرت۔

مئی ۱۸۲۸ء میں روسی فوجیں مولڈوینا اور ولاچیا پر قبضہ کرتی ہوئی آگے بڑھیں اور دریائے ڈینیوب کو عبور کر کے ۱۵ جون کو ابراہیل کا قلعہ فتح کر لیا، اس کے بعد انھوں نے شوملہ اور وارنا کا رخ کیا، شوملہ پر انھوں نے کئی حملے کیے مگر کامیابی نہیں ہوئی اور آخر میں شکست کھا کر پسپا ہونا پڑا، وارنا سے بھی انھیں اسی طرح پسپا ہونا پڑا لیکن یوسف پاشا کمانڈر وارنا کی غداری سے جو قلعہ کے تقریباً پورے دستہ کے ساتھ دشمن سے

جاہلا، یہ اہم قلعہ بآسانی فتح ہو گیا، اس کے بعد سلسلہ یا کا محاصرہ شروع ہوا مگر اس میں روسیوں کو ناکامی ہوئی اور اسی معرکہ پر یوروپین ٹرکی میں ۱۸۲۸ء کی جنگ کا خاتمہ ہو گیا، فان مونکی جو اس جنگ میں دولت علیہ کی طرف سے شریک تھا لکھتا ہے: ”اگر ہم ان زبردست قربانیوں کا لحاظ کریں جو ۱۸۲۸ء کی جنگ میں روس کو برداشت کرنا پڑی تو یہ بتانا مشکل ہوگا کہ فتح ان کی ہوئی یا ترکوں کی، پہلی جنگ کا فیصلہ دوسری جنگ کے نتیجہ پر منحصر رہا۔“ (۱)

ایشیا میں روسیوں کی کامیابی زیادہ نمایاں تھی، اناپا (Anapa) ہرٹ ونز (Hertwitz) اور بعض دوسرے قلعوں پر ان کا قبضہ ہو گیا، جس کی وجہ سے دوسرے سال ایشیائے کوچک کا داخلہ آسان ہو گیا لیکن اصلی مہم یورپ کی تھی اور اسی پر مغربی حکومتوں کی نگاہیں لگی ہوئی تھیں، چنانچہ جب ۱۸۲۹ء میں جنگ دوبارہ شروع ہوئی تو کولس نے سال گذشتہ سے بہتر اور زیادہ تعداد میں فوجیں روانہ کیں اور ان کا سپہ سالار مارشل ڈیپش (Diebits ck) کو مقرر کیا۔

ایک شدید غلطی اور شدید تر غلط فہمی: شوملہ کی عثمانی فوج نے ۱۷ مئی ۱۸۲۹ء کو جنگ چھیڑ کر پرادادی کو روسیوں کے قبضہ سے چھڑالینے کی کوشش کی، مقابلہ ابھی جاری ہی تھا کہ مارشل ڈیپش جس نے ۱۸ مئی کو سلسلہ یا کا محاصرہ شروع کر دیا تھا، اپنی فوج کا بڑا حصہ لے کر پرادادی کی طرف تیزی سے روانہ ہوا اور پرادادی اور شوملہ کے درمیان کو لیوشا (Kulewtsha) کے مقام پر ترکوں کو شکست دی، عثمانی سرعصر صدر اعظم رشید پاشا نے شکست خوردہ فوج کو دوبارہ شوملہ میں جمع کرنے کی کوشش کی مگر یہ خیال کر کے کہ ڈیپش اب شوملہ پر حملہ کرے گا، اس نے ان دستیوں کا بڑا حصہ طلب کر لیا جو کوہ بلقان کے دروں کی حفاظت کے لیے متعین کیے گئے تھے، یہ ایک نہایت شدید غلطی تھی جس کا خمیازہ دولت علیہ کو بہت جلد بھگتنا پڑا، اس وقت تک کوئی حملہ آور فوج ان

دروں کو عبور کرنے میں کامیاب نہیں ہوئی تھی لیکن رشید پاشا کی اس حیرت انگیز غلطی کی وجہ سے مارشل ڈپیش کے لیے یہ محال ممکن ہو گیا، ۲۶ جون کو سلسلہ یاکا محاصرہ ختم ہوا اور روسیوں نے اس مشہور قلعہ پر قبضہ کر لیا، ادھر سے فرغ ہو کر ڈپیش فوراً بلقان کی مہم پر روانہ ہو گیا، بحر اسود اور بحیرہ تکین میں روسی فوجوں کی مدد کے لیے جنگی بیڑے پہلے سے تیار تھے، ڈپیش نے دس ہزار کا ایک دستہ شوملہ میں صدر اعظم کی نقل و حرکت پر نظر رکھنے کے لیے چھوڑا اور صرف تیس ہزار سپاہیوں کو لے کر بلقان کے دروں کی طرف بڑھا، اسے علم تھا کہ قسطنطنیہ اور سلطنت عثمانیہ کے دوسرے بڑے شہروں میں محمود کی اصلاحات کے خلاف عام طور پر بیزاری پھیلی ہوئی ہے، جس سے رومیلیا اور البانیا کی فوجیں بھی متاثر ہیں، ان حالات سے اس کے حوصلے اور بھی بڑھے ہوئے تھے، ۱۱ جولائی کو نہایت خاموشی کے ساتھ روانہ ہو کر نوروز کی قلیل مدت میں اس نے کوہ بلقان کے دروں کو عبور کر لیا اور جنوبی وادی تک پہنچ گیا، دروں کی حفاظت کے لیے جو دستے متعین کیے گئے تھے، ان کی قوت رشید پاشا کی ناعاقبت اندیشی سے پہلے ہی کمزور ہو چکی تھی، اس لیے وہ ڈپیش کی فوج کو روک نہ سکے، روسی جب پہاڑوں کو طے کر کے وادی میں پہنچے تو ان کی تعداد پچیس اور طاعون سے بہت کچھ گھٹ چکی تھی، لیکن ترکوں کو اس کی خبر نہ تھی، وہ سمجھتے تھے کہ ڈپیش کے ساتھ کم سے کم ایک لاکھ آدمی ہوں گے، نیز انھیں یہ بھی خیال تھا کہ شوملہ سے روانہ ہونے کے قبل ڈپیش نے صدر اعظم کی فوج کو برباد کر دیا ہوگا، ورنہ اس کے لیے کوہ بلقان کا عبور کرنا کسی طرح ممکن نہ تھا، اس خیال سے ان کے ہاتھ پیر اور بھی پھول گئے، ڈپیش متعدد قلعوں کو فتح کرتا ہوا چلا گیا، یہاں تک کہ ۲۰ اگست ۱۸۲۹ء کو سلطنت عثمانیہ کے قدیم پایہ تخت اور نہ کے فوجی دستہ نے بھی صرف بیس ہزار روسی سپاہیوں کے سامنے ہتھیار ڈال دئے۔

طلمس قوت: ڈپیش نے اس مہم میں اس بات کا خاص لحاظ رکھا تھا کہ رومیلیا کی عثمانی رعایا کو روسی فوجوں کی غارت گری سے کوئی نقصان نہ پہنچنے پائے، یہ دانشمندی اس کے حق

میں نہایت مفید ثابت ہوئی، عیسائی آبادی نے اس کا پر جوش خیر مقدم کیا اور مسلمان بھی یہ دیکھ کر کہ جان و مال، ناموس و مذہب یا مقامی حکومت خود اختیاری کسی چیز سے تعرض نہیں کیا جاتا، ہتھیار ڈال دینے کے بعد بدستور اپنے مشاغل میں مصروف ہو گئے، اس تدبیر سے ڈپیش کی چھوٹی سی فوج قدم قدم پر لڑائیاں لڑنے سے بچ گئی، جن میں الجھ کر اسے بالآخر برباد ہو جانا پڑتا اور ڈپیش کی فوجی قوت کا طلسم کامیابی کے ساتھ ترکوں پر قائم رہا، وہ خوب جانتا تھا کہ اگر اور نہ سے آگے بڑھ کر قسطنطنیہ کی طرف کوچ کرے گا تو یہ فریب زیادہ دنوں تک قائم نہ رہ سکے گا اور چونکہ قسطنطنیہ کی حفاظت کے لیے محمود نے فوجیں فراہم کر لی تھیں اور مسلمانوں کا جوش غیرت سقوط اور نہ کے بعد انتہائی درجہ تک پہنچ چکا تھا، اس لیے قسطنطنیہ پر حملہ کرنے کا خیال ایک خواب سے زیادہ نہ تھا، علاوہ بریں رشید پاشا کی فوج شمولہ سے نکل کر پشت کی طرف سے حملہ کر سکتی تھی، دس ہزار کا جو دستہ ڈپیش نے پیچھے چھوڑ دیا تھا وہ صدر اعظم کو روکنے کے لیے کافی نہ تھا، دوسری طرف سکودرا کا پاشا مصطفیٰ جس نے اب تک خود سری کی وجہ سے جنگ میں شرکت نہیں کی تھی، اب تیس ہزار بہترین البانی فوج کے ساتھ دارالسلطنت کی حفاظت کے لیے مستعد تھا، ایسی صورت میں ڈپیش کی کامیابی کی طرف یہی ایک تدبیر تھی کہ جس طرح ممکن ہو اپنی فوجی قوت کا طلسم قائم رکھتے ہوئے صلح کی کوشش کرے، اس کی خوش قسمتی سے نہ صرف قسطنطنیہ کے باشندوں میں سراپیمگی پھیلی ہوئی تھی بلکہ عثمانی مدبرین اور یورپین سفرا بھی اس کی فوج کی اصلی حالت سے بے خبر تھے، وہ سمجھتے تھے کہ روسی فوج کی تعداد ساٹھ ہزار ہے، اسی درمیان میں نئی چری کے حامیوں نے بغاوت برپا کرنے کی کوشش کی لیکن محمود چونکہ پسے سے تیار تھا، اس لیے فوراً ہی یہ شورش رفع کر دی گئی اور تمام باغی قتل کر دیے گئے، تاہم قسطنطنیہ میں نئی شورشوں کا خطرہ اب بھی محسوس کیا جاتا تھا، ایسی حالت میں وزراء سلطنت اور یورپین سفیروں نے متفقہ طور پر محمود سے درخواست کی کہ دولت عثمانیہ کو تباہی سے بچانے کے لیے جس طرح ممکن ہو روس سے صلح کر لی جائے، مغربی

حکومتوں کے اس نیک مشورہ کا سبب تو ظاہر ہے، وہ کسی حال میں بھی قسطنطنیہ پر روس کا قبضہ گوارا نہیں کر سکتی تھیں، البتہ عثمانی وزراء کا اصرار نیک نیتی پر مبنی تھا، محمود یوں دب کر صلح کرنے کے لیے مطلق آمادہ نہ تھا، لیکن جب ہر چہا طرف سے سخت اصرار ہونے لگا تو مجبور ہو کر اس نے مارشل ڈیپش کے پاس عثمانی نمائندوں کو بھیجنا منظور کر لیا، ۱۵ رجب الاول ۱۲۳۵ھ مطابق ۱۲/اپریل ۱۸۲۹ء کو صلح نامہ اور نہ پرفریقین کے دستخط ہو گئے۔

صلح نامہ اور نہ: اس صلح نامہ کے روسے زار نے یورپین ترکی کے وہ تمام مقامات دولت عثمانیہ کو واپس کر دئے جن پر روسی فوجوں نے قبضہ کر لیا تھا، البتہ دریائے ڈینیوب کا دہانہ اور موڈیویا کا ایک حصہ جو ڈینیوب کے بائیں ساحل پر واقع تھا، سلطنت روس میں شامل کر لیا گیا، وسطی یورپ خصوصاً آسٹریا کی تجارت کے لیے اس علاقہ اور ڈینیوب کے دہانہ کا قبضہ نہایت اہم تھا، ایشیا میں آناپا اخلتریک اور چند دوسرے قلعوں اور علاقوں کے علاوہ بقیہ تمام فتوحات سے روس دست بردار ہو گیا، مولڈویا اور ولاچیا کے لیے یہ طے پایا کہ ان کے امیروں کا انتخاب آئندہ مدۃ العمر کے لیے ہوا کرے گا، کسی ترک افسر کو ان کے معاملات میں دخل دینے کا حق نہ ہوگا اور نہ ان ریاستوں میں کسی مسلمان کو بود و باش اختیار کرنے کی اجازت ہوگی، وہاں کے مسلمانوں کو اٹھارہ ماہ کی مہلت دی گئی کہ اپنی جائیدادیں فروخت کر ڈالیں، باب عالی کی فرماں روائی صرف نام کے لیے باقی رہ گئی اور اس کے لیے جو سالانہ خراج منظور ہوا، وہ بھی دو سال کے لیے معاف کر دیا گیا، ایسی ہی آزادی سر ویاکو بھی دی گئی اور یہ قرار پایا کہ معاہدہ آق کرمان کی ان تمام دفعات پر جن کا تعلق سرویہ سے ہے فوراً عمل درآمد شروع کر دیا جائے، بغراد اور اورسوا کے قلعوں کے علاوہ سرویا کے اور تمام قلعوں سے ترکی دستے ہٹا لیے جائیں اور کوئی ترک اس صوبہ کے کسی دوسرے حصہ میں نہ رہنے پائے، سلسٹر یا دولت علیہ کو واپس کر دیا گیا لیکن یہ طے پایا کہ ڈینیوب کے دوسرے قلعے ہمار کر دئے جائیں، یہ بھی طے پایا کہ بحر اسود، باسفورس اور دردنیاں کو روس کے تجارتی جہازوں کے لیے کھول دیا جائے، دوران جنگ میں روس

کی تجارت کو جو نقصان پہنچا ہے اس کی تلافی کے لیے ساڑھے سات سو پونڈ بطور تاوان ادا کیے جائیں اور اس کے علاوہ پچاس لاکھ پونڈ تاوان جنگ حکومت روس کو ادا کیے جائیں، اس رقم کی ادائیگی کے لیے دس سالانہ قسطیں مقرر کر دی گئیں اور روس کو یہ حق دیا گیا کہ جب تک پوری رقم ادا نہ ہو جائے وہ اپنے مقبوضات سے کلیہ دست بردار نہ ہو، چنانچہ یہ تصریح کر دی گئی کہ پہلی قسط کی ادائیگی کے بعد روسی فوجیں اور نہ کا تخیلہ کریں گی، دوسری قسط کے بعد کوہ بلقان سے واپس چلی جائیں گی، تیسری قسط کے بعد دریائے ڈینیوب کے اس پار چلی جائیں گی اور جب تک بقیہ قسطیں ادا نہ کی جائیں گی یعنی دسویں سال تک مولڈ یو یا اورولا چیا پر روس کا قبضہ باقی رہے گا۔

صلح نامہ کی دفعہ نمبر (۱۰) کے روسے باب عالی نے معاہدہ لندن مورخہ جولائی ۱۸۲۷ء نیز منضبطہ لندن مورخہ مارچ ۱۸۲۹ء کے شرائط جو انگلستان، فرانس اور روس کے درمیان طے ہوئے تھے منظور کر لیے، نتیجہ یہ ہوا کہ یونان ایک خود مختار مملکت قرار پایا، اس کی حد خلیج ارتا (Arta) اور خلیج وولو (Volo) کے درمیانی خط سے متعین کر دی گئی، اس خط کے شمال میں تھسلی اور البانیا کے صوبے دولت عثمانیہ کے سرحدی صوبے قرار پائے، جزائر آئوینین پر برطانیہ کا قبضہ قائم رہا، لیکن کریٹ اور وہ جزیرے جو قہرلیس اور ایشیا کی ساحل سے قریب تھے، دولت عیہ کی فرماں روائی میں رہنے دئے گئے۔

محمود کو اس صلح نامہ سے بے حد صدمہ ہوا، اس پر دستخط کرتے وقت اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور بہتوں شدید حزن و ملال کی حالت میں وہ محل میں پڑا رہا اور کہیں باہر نہیں نکلا، اس صدمہ کی شدت اس وقت اور بھی بے پایاں ہو گئی جب صلح نامہ کے تسممہ کے بعد اسے روسی فوج کی اصل قوت کا علم ہوا اور اس نے معلوم کیا کہ ڈپش کا پورا لشکر سترہ ہزار سے زیادہ نہ تھا، اگر روسی فوج کے متعلق غلط اطلاعات کی بنا پر وہ اپنے وزیروں کے اصرار سے مجبور نہ ہو گیا ہوتا اور چند دنوں اور صلح سے انکار کرتا رہتا تو ڈپش کی دھمکیوں کی ساری حقیقت جہت جلد کھل جاتی اور اس کی خستہ و پریشان حال فوج

کا کوئی سپاہی سلامتی کے ساتھ واپس نہ جاسکتا۔

ہجومِ مصائب: صلح نامہ اور نہ کے دوسرے ہی سال جولائی ۱۸۳۰ء میں دولت عثمانیہ کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر فرانس نے الجزائر پر قبضہ کر لیا، یہ صوبہ اگرچہ دولتِ علیہ سے عملاً آزاد ہو چکا تھا تاہم اس کی فرماں روائی اب بھی تسلیم کرتا تھا اور اس کے عامل کا تقرر باب عالی ہی کی طرف سے ہوا کرتا تھا لیکن چونکہ جنگِ روس میں عثمانی فوجوں کو بہت نقصان پہنچ چکا تھا اور صلح کے بعد سلطنت کے مختلف حصوں میں بغاوت کے آثار نمایاں ہو رہے تھے، اس لیے محمود کو یہ تلخ گھونٹ بھی مجبوراً پینا پڑا، عام طور پر لوگوں نے گذشتہ جنگ کی شکستوں کا سبب محمود کی فوجی اصلاحات کو قرار دینا شروع کیا اور یہ خیال اس کثرت سے پھیلتا گیا کہ ۱۸۳۰ء سے ۱۸۳۳ء تک سلطنت کے مختلف حصوں میں بغاوتیں برپا ہو گئیں، یورپین صوبوں میں زیادہ شدید بوسنیا اور البانیا کی بغاوتیں تھیں جن کے فرو کرنے میں صدر اعظم رشید پاشا کو بڑی دقتوں کا سامن کرنا پڑا اور شاہی خزانہ پر جو پھیدے ہی تقریباً خالی ہو چکا تھا اور بھی زیادہ بار پڑتا گیا، ایشیائی صوبوں کی شوشیں بھی کم تشویش ناک نہ تھیں مگر سب سے زیادہ خطرناک مصر کی حالت تھی جو عنقریب اعلانِ جنگ کرنے والا تھا، محمد علی پاشا کے حوصلے روز بروز ہتھ جارتے جارہے تھے، وہ صرف نام کے لیے باب عالی کا مطیع تھا، ورنہ حقیقتاً ایک خود مختار فرماں روا کی حیثیت اختیار کر چکا تھا، مصر میں اپنی حکومت کو پوری طرح مستحکم کر کے وہ تو اب خود سلطنت عثمانیہ کے تحت کا حوصلہ کر رہا تھا، نواریں نوکی شکست کے بعد اس نے اپنا جنگی بیڑہ از سر نو تعمیر کر لیا تھا، اس کے پاس ایک آموزہ کار اور اعلیٰ درجہ کی تربیت یافتہ فوج تھی جس کے افسر زیادہ تر فرانسیسی تھے اور اس فوج کا سپہ سالار خود اس کا لڑکا ابراہیم پاشا تھا جس کی فوجی قابلیت اور شجاعت کا سکہ جنگِ یونان میں بیٹھ چکا تھا۔

محمد علی کی بغاوت: یونان کی بغاوت فرو کرنے کے لیے جب محمود نے محمد علی پاشا کو طلب کیا تھا تو اس خدمت کے معاوضہ میں اسے مصر کے علاوہ شام، دمشق، طرابلس

(واقع ایشیا) اور کریٹ کاواں بھی بنادینے کا وعدہ کیا تھا لیکن چونکہ جنگ یونان کا نتیجہ دولت علیہ کے خلاف رہا اور ابراہیم پاشا موریا کا تخیلہ کر کے اپنی فوج کے ساتھ مصر واپس چلا گیا، اس لیے محمد علی نے جب ان چار ولایتوں کی درخواست کی تو محمود نے صرف کریٹ کا عطا کیا جانا منظور کیا، یہ بات محمد علی جیسے شخص کو سخت نگواری ہوئی، اس وقت تو وہ خاموش ہو گیا لیکن شام پر حملہ کرنے کے لیے موقع کا انتظار کرتا رہا، اتفاق سے ۱۸۳۱ء میں اسے ایک حیلہ ہاتھ آ گیا، کچھ مصریوں نے بھگ کر عکا میں پناہ لی تھی، محمد علی نے عبداللہ پاشا والی عکا کو لکھا کہ ان باغیوں کو حوالہ کر دو، اس نے انکار کیا، یہ عذر محمد علی کے لیے بہت کافی تھا فوراً ایک زبردست فوج، ابراہیم پاشا کی سرکردگی میں روانہ کی، ابراہیم پاشا نے شام میں داخل ہو کر سب سے پہلے عکا کا محاصرہ کر لیا، لیکن جب اس کی فتح میں دیر ہوئی تو کچھ فوج وہاں چھوڑ کر خود آگے بڑھ گیا اور یافا، غزہ اور بیت المقدس پر یکے بعد دیگرے قبضہ کر لیا، ۲۷ مئی ۱۸۳۲ء کو عکا بھی فتح ہو گیا اور ۱۵ جون کو ابراہیم نے دمشق پر بھی قبضہ کر لیا۔

ابراہیم پاشا کے حملہ کی خبر قسطنطنیہ پہنچی تو سلطان نے ایک فوج حسین پاشا کی قیادت میں روانہ کی لیکن ابراہیم ترکوں کے مقدمۃ الجیش کو شکست دے کر حلب میں داخل ہو گیا، ۲۹ جولائی کو بیلان کے مقام پر اس نے خود حسین پاشا کو سخت شکست دی، ایشیا کے کوچک کا راستہ اب کھلا ہوا تھا، محمود نے رشید پاشا کو تازہ فوج کے ساتھ روانہ کیا، ۲۹ اکتوبر ۱۸۳۲ء کو قونیہ میں مقابلہ ہوا جس میں رشید پاشا کو شکست ہوئی، اس کے بعد ابراہیم کو تباہی کی طرف بڑھا اور وہاں پہنچ کر بروصہ کا قصد کیا، جو دولت عثمانیہ کا پہلا پایہ تخت رہ چکا تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شام کی طرح ایشیا کے کوچک پر بھی بہت جلد اس کا تسلط قیام ہو جائے گا، ان فتوحات کے بعد آئندہ سال قسطنطنیہ پر حملہ کا خطرہ ایک بالکل قدرتی امر تھا۔

محمود نے اس خطرہ کو محسوس کر کے سب سے پہلے برطانیہ سے مدد کی خواہش

کی، لیکن اس نے صاف جواب دیا، روس اس موقع کا منتظر ہی تھا، چنانچہ دسمبر ۱۸۳۲ء میں نکولس نے جنرل موراویف (Mouravieff) کو خاص اس غرض سے قسطنطنیہ بھیجا کہ سلطان کے سامنے ابراہیم کی فتوحات کا خطرہ ظاہر کر کے قسطنطنیہ کی حفاظت کے لیے روس کی مدد پیش کرے لیکن باوجود اس خطرہ کے محمود کو روس کی مدد قبول کرنے میں تامل تھا، موراویف کو جب باب عالی میں ناکامی ہوئی تو وہ سیدھا اسکندریہ پہنچا تا کہ محمد علی پر دباؤ ڈال کر کم سے کم ابراہیم پاشا کو آگے بڑھنے سے روکے، زار کی اس تشویش کا سبب صرف یہ نہ تھا کہ قسطنطنیہ پر ابراہیم کا قبضہ ہو جائے گا بلکہ وہ متعدد معاہدے بھی معرض خطر میں تھے جو روس اور دولت علیہ کے درمیان ہو چکے تھے اور جن سے روس نے بہت سے حقوق حاصل کر لیے تھے، زار جو خرروم میں اپنے جہازوں کی آمد و رفت کے لیے آبنائے باسفورس اور درانیال کو کھلا رکھنا چاہتا تھا اس بات کے لیے کسی طرح تیار نہ تھا کہ آل عثمان کے کمزور فرماں رواؤں کے بجائے محمد علی کا طاقت ور خاندان قسطنطنیہ کے تحت پر قابض ہو جائے۔

روس کی مدد: اس درمیان میں محمود کو اندازہ ہو گیا تھا کہ روس سے مدد لینے کے سوا کوئی چارہ نہیں، چنانچہ اس نے نہ صرف ایک جنگی بیڑے کی خواہش کی بلکہ بری فوج بھی طلب کی، ۲۰ فروری ۱۸۳۳ء کو چار جنگی جہاز، چھ ہزار فوج لے کر باسفورس میں داخل ہوئے اور قسطنطنیہ کے سامنے لنگر انداز ہوئے، ان جہازوں کی آمد سے برطانیہ اور فرانس دونوں کو نہایت تشویش ہوئی اور انھوں نے سلطان پر دباؤ ڈالنا شروع کیا کہ روسی بیڑہ واپس کر دیا جائے، زار نے جواب دیا کہ جب تک ابراہیم اپنی فوج کے ساتھ کوہ طور کے اس پار لوٹ نہ جائے گا اس کے جہاز واپس نہ جائیں گے، ادھر محمد علی کو اصرار تھا کہ پورا شام، فلسطین کا ایک حصہ اور اطنے کی اہم بندرگاہ اور ضلع اس کے حوالہ کر دیا جائے، مارچ میں سلطان نے شام، حلب اور دمشق دے کر صلح کر لینی چاہی مگر محمد علی نے اپنے مطالبات میں کوئی تخفیف منظور نہیں کی۔

معاہدہ کوتاہیہ: مجبوراً محمود نے ایک دوسرا جنگی بیڑا اور بری فوج روس سے طلب کی، ۵ اپریل کو بارہ ہزار روسی فوج سقوطری کے قریب اتری، یہ دیکھ کر انگلستان اور فرانس کی پریشانی اور بھی زیادہ بڑھی کیوں کہ قسطنطنیہ میں روسی اقتدار کا قائم ہو جانا ان کے مصالح کے سراسر خلاف تھا، چنانچہ انھوں نے محمد علی اور محمود دونوں پر صلح کے لیے پھر دباؤ ڈالنا شروع کیا اور اب کی بار اپنی کوششوں میں کامیاب رہے، ۸ اپریل ۱۸۳۳ء کو باب عالی اور محمد علی پاشا کے درمیان کوتاہیہ میں ایک معاہدہ ہوا جس کے رو سے محمد علی کے تمام مطالبات منظور کر لیے گئے، ۲۰ مئی کو سلطان نے ایک فرمان کے ذریعہ مصر و کریٹ کے علاوہ بیت المقدس، طرابلس، حلب، دمشق اور اٹرنہ کی حکومتیں بھی محمد علی کو عطا کیں یعنی تقریباً وہ تمام علاقے اس کو دے دیے گئے جنھیں سلطان سلیم اول کی فتوحات نے سلطنت عثمانیہ میں شامل کیا تھا۔

معاہدہ خونکار اسکھ سی: قسطنطنیہ کی حفاظت کے لیے اب روسی فوجوں کی ضرورت نہ تھی، لیکن ان کی واپسی سے قبل باب عالی کو روس کے ساتھ ایک جارحانہ اور مدافعانہ معاہدہ کرنا پڑا جو معاہدہ خونکار اسکھ سی (۸ جولائی ۱۸۳۳ء) کے نام سے مشہور ہے، اس معاہدہ سے روس کو دولت علیہ کے اندرونی معاملات میں مداخلت کرنے کا ایک قانونی حیلہ ہاتھ آ گیا، اس کی ایک نہایت اہم خفیہ دفعہ یہ تھی کہ روس کے مطالبہ پر دردنیاں دوسرے ملکوں کے جنگی بیڑوں کے لیے بند کر دیا جائے گا، روس کے جنگی جہازوں کو باسفورس اور دردنیاں سے گزرنے کی عام اجازت دی گئی۔

محمد علی سے دوبارہ جنگ: معاہدہ کوتاہیہ کے بعد صرف چند سال تک محمد علی سے صلح رہی، ۱۸۳۹ء میں جنگ پھر شروع ہو گئی، محمود کے لیے شام اور فلسطین کے علاقوں میں محمد علی کے منصوبے تشویش کا باعث ہو رہے تھے، دوسری طرف محمد علی حکومت خود اختیاری سے کم پر قانع نہ تھا اور جولائی میں اسے دی گئی تھیں ان کا خود مختار فرماں روا بننا چاہتا تھا، دونوں اپنی جگہ غیر مطمئن تھے اور آئندہ جنگ کی تیاریاں کر رہے تھے۔

ابتدا محمد علی نے کی، ۱۸۳۸ء میں جب وہ اپنی تیزیاں مکمل کر چکا تو باب عالی میں سالانہ خراج بھیجنے سے انکار کر دیا، یہ گویا عملی خود مختاری کا اعلان تھا اس کے بعد حرم نبویؐ کی حفاظت کے لیے جو ترکی دستہ مقرر تھا، اسے برطرف کر کے اس نے اپنا عربی دستہ وہاں متعین کر دیا، یہ سلطان کی فرماں روائی سے آزاد ہونے کا دوسرا اعلان تھا، محمود نے اس کے پاس حکم بھیجا کہ ترکی دستہ حرم نبویؐ میں پھر متعین کر دیا جائے، خراج کا بقایا ادا کر دیا جائے اور ولایت مصر پر محض ایک والی کی حیثیت سے حکمرانی کی جائے لیکن محمد علی نے ان میں سے ہر حکم کی تعمیل سے انکار کیا، اس پر محمود نے ایک فوج حافظ پاشا کی قیادت میں شام پر حملہ کرنے کے لیے روانہ کی اور قیودان احمد فوضی پاشا کو جنگی بیڑے کے ساتھ اس کی مدد کے لیے مامور کیا، ۲۵ جون ۱۸۳۹ء کو نزیب کے مقام پر حافظ پاشا اور ابراہیم پاشا کا مقابلہ ہوا، عثمانی فوج کے پورے پورے دستے جن کے نندار افسر محمد علی سے رشوت لے چکے تھے جنگ کے درمیان ہی میں دشمن سے جا ملے، جو باقی رہ گئے تھے وہ زیادہ دیر تک مقابلہ نہ کر سکے اور منتشر ہو گئے، پورا تو پختانہ، تمام سامانِ رسد اور اسلحہ ابراہیم پاشا کے ہاتھ آیا۔

عثمانی بیڑے کی سرگذشت اس سے بھی زیادہ افسوسناک اور عبرت انگیز تھی، بجائے اس کے کہ احمد فوضی پاشا، شام پہنچ کر حافظ پاشا کی مدد کرتا وہ اپنے جہازوں کو لیے ہوئے سیدھا اسکندریہ چلا گیا اور وہاں ۱۳ جولائی کو پورا بیڑہ محمد علی کے حوالہ کر دیا، خداری کی ایسی حیرت انگیز مثال تاریخ میں شاید ہی مل سکے۔

محمود کی وفات: لیکن قبل اس کے کہ ان واقعات کی اطلاع اس تک پہنچے یکم جولائی ۱۸۳۹ء کو محمود اپنی زندگی کے آخری مرحلے سے فارغ ہو چکا تھا، موت کی دست گیری نے ان روح فرسا حادثات کے صدمہ سے بچ لیا۔

محمود کی عظمت: عنانِ حکومت کو ہاتھ میں لینے کے بعد سے زندگی کے آخری لمحہ تک محمود کو گونا گوں مشکلات و مصائب کا سامنا رہا، غیروں سے زیادہ اپنوں نے دشمنی کا

ثبوت دیا اور مخالفت کا کوئی دقیقہ اٹھانہ رکھا لیکن سلطنت کی خدمت و اصلاح کا فرض جو اس نے اپنے لیے مقرر کر لیا تھا اس کی انجام دہی سے تمام مصیبتوں و مخالفتوں کے باوجود وہ کسی وقت بھی غافل نہ رہا، اصلاحات کی جو اسکیم اس نے مرتب کی تھی اس پر لڑائیوں اور بغاوتوں کی کثرت سے اس کی حیات میں پوری طرح عمل درآمد نہ ہوسکا اور یہ کام اس کے فرزند و جانشین سلطان عبدالحمید خاں کے لیے ملتوی رہا، تاہم جن اصلاحات کو وہ جاری کر سکا وہ بھی اپنی اہمیت اور ہمہ گیری کے لحاظ سے ایسی ہیں کہ اس کے نام کو بقائے دوام کی سند دے چکی ہیں۔

محمود کا سب سے بڑا کارنامہ نئی چری کا استیصال ہے، جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے، نئی چری صرف فوجی اصلاحات کے مخالف نہ تھے بلکہ وہ ہر قسم کی اصلاحات کو بری نظر سے دیکھتے تھے، کیوں کہ موجودہ نظام کی بہتری ہی میں انھیں اپنا فائدہ دکھائی دیتا تھا، برخلاف اس کے محمود پر یہ حقیقت پوری طرح روشن ہو چکی تھی کہ جب تک حکومت کے ہر شعبہ میں بنیادی اصلاحات جاری نہ ہوں گی سلطنت عثمانیہ روز بروز تباہی و بربادی سے قریب ہوتی جائے گی، یہی یقین تھا جس نے اصلاحات کے جاری کرنے میں اسے اس قدر تشدد دیا تھا، جو شخص ان کی نکتہ چینی یا مخالفت کرتا اسے سخت سزا دی جاتی تھی، بکلتاشی درویش نئی چری کے شروع سے ہی تھے، نئی چری کی طرح یہ لوگ بھی اصلاحات کے مخالف تھے، ان کے استیصال کے بعد درویشوں نے اپنے مذہبی اثر سے قسطنطنیہ کے باشندوں کو ابھارنے کی کوشش کی، محمود نے اس فرقہ کو خلاف قانون قرار دے کر جلاوطن کر دیا اور ان کے تکیوں کو برباد کر ڈالا، بکلتاشیوں کے تین بڑے بڑے پیشوا شرعی فتویٰ کی بنا پر قتل کر دئے گئے۔

نئی چری کو ختم کرنے کے بعد محمود نے قدیم فوجی نظم کو منسوخ کر دیا، چنانچہ سپاہی، سلخ دار، علوفہ جی اور دوسری قدیم فوجیں ختم کر دی گئیں اور ان کی جگہ نئی فوجیں جو یورپ کے فوجی نظام کے مطابق مرتب اور مسلح کی گئی تھیں قائم کی گئیں، اس نے اسی

سلسلہ میں نظام جاگیری کو بھی منسوخ کر دیا، جس میں بہت زیادہ ابتری پھیلی ہوئی تھی، تیار اور زعامت کی جاگیریں یا تو ضبط کر لی گئیں یا صرف جاگیرداروں کی مدت حیات تک کے لیے چھوڑ دی گئیں اور زمینوں کی جو آمدنی اب تک جاگیرداروں کو ملا کرتی تھی وہ اب سرکاری خزانہ کو منتقل کر دی گئی، نظام جاگیری کی ابتری سے فائدہ اٹھا کر درہ بے تقریباً ہر صوبہ میں چھوٹے چھوٹے خود مختار فرماں روا بن بیٹھے، ان کی قوت کے توڑنے میں سخت دشواریاں پیش آئیں اور برسوں لگ گئے، اکثر بغاوتیں بھی ہوئیں لیکن محمود کے عزم میں کوئی فرق نہ آیا، بالآخر اسے کامیابی ہوئی، یہاں تک کہ پوری سلطنت میں جزیرہ قبرص ہی ایک ایسا مقام رہ گیا جہاں کے درہ بے اپنے سابق اختیارات کے ساتھ حکومت کرتے تھے۔

اب تک جو لوگ قتل یا جلاوطن کیے جاتے تھے، ان کی ساری املاک سلطنت کے حق میں ضبط کر لی جاتی تھی اور یہ سرکاری خزانہ کے لیے آمدنی کا ایک معقول ذریعہ تھا جو عدالت ان معاملات کے لیے قائم تھی، چونکہ اس میں بے عنوانیاں بہت ہونے لگی تھیں اس لیے محمود نے اسے بند کر دیا، اسی طرح اس نے پاشاؤں کے ہاتھ سے سزائے موت کے اختیارات بھی لے لیے جو انھیں اپنے علاقوں میں حاصل تھے اور جن کی بنا پر وہ ملزم کو برأت کا موقع دے بغیر جب چاہے قتل کرا دیتے تھے، اس نے ایک فرمان کے ذریعہ اعلان کر دیا کہ کوئی شخص خواہ وہ ترک ہو یا عیسائی مقدمہ کی باقاعدہ سماعت کے بغیر قتل نہ کیا جائے اور ہر ملزم کو اپیل کا حق دیا جائے کہ پہلے وہ قاضی عسکر کی عدالت میں اسے پیش کرے اور اگر وہاں بھی فیصلہ اس کے خلاف ہو تو خود سلطان کے حضور میں اپیل کرے۔

سلیمان اعظم کے وقت سے ایک دستور یہ ہو گیا تھا کہ سلاطین نے دیوان میں آنا ترک کر دیا تھا، جہاں کی ساری کارروائی صدر اعظم کی صدارت میں ہوا کرتی تھی، سلطنت عثمانیہ کے منجملہ دیگر اسباب زوال کے ایک سبب یہ بھی تھا، محمود نے اس دستور کو توڑا اور پابندی کے ساتھ دیوان میں آنا شروع کیا۔

اوقاف کے انتظام میں بڑی بے عنوانیاں ہو رہی تھیں، اس لیے محمود نے ان

جہندادوں کو سرکاری نگرانی میں لے لیا۔

فروری ۱۸۳۲ء میں ایک فرمان شائع کر کے محمود نے ان ٹیکسوں کو منسوخ کر دیا جو سرکاری حکام دورہ کے زمانہ میں صوبوں کے باشندوں پر مدت سے لگاتے آئے تھے، اسی فرمان میں ششماہی دو قسطوں کے علاوہ محاصل کی دوسری تمام وصولی خلاف قانون قرار دی گئی، جزیہ کی تشخیص اور وصولی میں بھی سرکاری عمال کی تعدیوں سے اکثر شکایتیں پیدا ہوتی رہتی تھیں، محمود نے قدیم طریقہ کو منسوخ کر کے یہ کام ایک مجلس کے سپرد کر دیا، جس کے ارکان قاضی، صوبہ کا گورنر اور اعیان یعنی ہر ضلع کے عیسائیوں کے بلدی سردار مقرر کیے گئے، مالیات میں اس نے اور بھی متعدد اصلاح جاری کیں، اس کی قطع و برید سے خود قصر سلطانی بھی نہ بچ سکا، چنانچہ محل کے تمام بے کار اور غیر مفید عہدہ دار برطرف کر دئے گئے۔

ان اہم اصلاحات کے علاوہ محمود نے لباس میں بھی بعض نمایاں اصلاحیں کیں مثلاً عمامہ کی بجائے ترکی ٹوپی پہننا، سلطنت کے ہر حصہ میں ضروری قرار دیا اور خود فرانسیسی لباس اختیار کر کے دوسروں کو بھی اس کی ترغیب دی، فوج کے لیے یوروپین لباس پہلے ہی جاری کیا جا چکا تھا۔

محمود کو تمام رعایا خصوصاً عیسائیوں کا بڑا خیال رہتا تھا، اہل حالت سے براہ راست آگاہی حاصل کرنے کے لیے اس نے سلطنت کے یورپی علاقوں کا دورہ کیا، ٹون کیئر لکھتا ہے:

”اس نے مطالبات کا خیر مقدم کیا، شکایات کو سنا، حق تلفی کی

دادری کی، سب شکووں کو دور کیا اور اپنے اس منشا کو اچھی طرح سے

ظاہر کر دیا کہ اس کی تمام رعایا میں بغیر امتیاز قوم و ملت انصاف کی

حکمرانی رہے گی۔ (۱)

سلطان عبدالمجید خان

۱۲۵۵ھ تا ۱۲۷۷ھ مطابق ۱۸۳۹ء تا ۱۸۶۱ء

محمود ثانی کی وفات پر اس کا بڑا لڑکا عبدالمجید خان سولہ سال کی عمر میں تخت نشین ہوا، دولت عثمانیہ کی حالت اس وقت بہت نازک تھی، نزیب کی فیصلہ کن شکست کے بعد جس سے ابراہیم پاشا کے لیے قسطنطنیہ کا راستہ صاف ہو گیا تھا، اطلاع آئی کہ امیر البحر احمد پاشا غنیم سے مل گیا اور ترکی بیڑہ کو اسکندریہ لے جا کر محمد علی کے سپرد کر دیا، یہ خبر اس قدر وحشت اثر تھی کہ نو عمر سلطان کے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور اس نے محمد علی سے صلح کی گفتگو شروع کر دی، محمد علی نے صلح کے لیے یہ شرط پیش کی کہ مصر، شام، طرابلس (واقع ایشیہ کوچک) اٹلنہ اور کریٹ کی پاشائیاں اسے سنبلا بعد نسل تفویض کر دی جائیں اور وعدہ کیا کہ اگر اس کا یہ مطالبہ منظور کر لیا گیا تو وہ ترکی بیڑہ کو سلطان کی خدمت میں واپس کر دے گا، دیوان ابھی اس مطالبہ پر غور ہی کر رہا تھا کہ انگلستان، فرانس، روس، آسٹریا اور پرشا کے سفیروں نے محمد علی کی بڑھتی ہوئی قوت کو اپنی حکومتوں کے مصالح کے خلاف دیکھ کر سلطان سے درخواست کی کہ ابھی کوئی جواب نہ دیا جائے، انھوں نے امید دلائی کہ دولِ عظمیٰ کے اثر سے یہ معاملہ سلطنت عثمانیہ کے مفاد کے مطابق طے کر دیا جائے گا، فرانس بظاہر اس تحریک میں شریک تھا لیکن در پردہ وہ محمد علی کا حامی تھا، چنانچہ جب ۱۵/جبرائی ۱۸۴۰ء کو دولت عثمانیہ انگلستان، روس، آسٹریا اور پرشا کے

نمائندوں نے لندن میں وہ شرائط طے کرنے چاہے جو محمد علی اور باب عالی کے درمیان صلح کی بنیاد قرار پانے والے تھے تو فرانس نے اس معاہدہ میں شرکت نہیں کی، بہر حال اتحادیوں نے محمد علی کو الٹی میٹم دیا کہ دس روز کے اندر سلطان کی اطاعت قبول کر کے اپنی فوجیں شام سے ہٹالے، جس کے معاوضہ میں مصر کی پاشائی اس کی نسل کے لیے اور شام کی پاشائی خود اس کی مدت حیات کے لیے مستقل کر دی جائے گی، ورنہ اگر مدت معینہ کے اندر اس نے یہ مطالبہ پورا نہ کیا تو شام کی پاشائی سے اسے دست بردار ہونا پڑے گا اور مصر کی پاشائی بھی صرف اس کی حیات کے لیے محدود کر دی جائے گی، الٹی میٹم میں یہ بھی لکھ دیا گیا تھا کہ اگر یہ مطالبہ منظور نہ کیا گیا یا اس کی تعمیل میں تاخیر ہوئی تو اتحادیوں کے بحری بیڑے فوراً مصر اور شام کی ناکہ بندی شروع کر دیں گے، محمد علی کو فرانس سے مدد کی توقع تھی، اس بنا پر اس نے شرائط صلح کو نا منظر رکھ دیا، چنانچہ انگریزی بیڑہ روس اور آسٹریا کے چند جنگی جہازوں کے ساتھ شام کی طرف بڑھا، ۲۹ اگست ۱۸۴۰ء کو بیروت گولہ باری کے بعد فتح ہو گیا اور عثمانی فوجوں نے جو انگریزی جہازوں پر آئی تھی، مصری دستہ کو وہاں سے نکال کر شہر پر قبضہ کر لیا، اس کے بعد انگریزی بیڑہ نے عکا پر گولہ باری شروع کی اور ۳ نومبر کو وہ بھی فتح ہو گیا پھر یکے بعد دیگرے شام کے دوسرے قلعے بھی محمد علی کے ہاتھ سے نکلے گئے اور عثمانی فوجوں نے انگریزوں نیز مقامی باشندوں کی مدد سے جو تھوڑے ہی دنوں میں مصری حکومت کی تختی سے گھبرا اٹھے تھے نومبر کے آخر تک پورے شام پر اپنا تسلط قائم کیا۔

محمد علی سے صلح: شام کی فتح کے بعد انگریزی بیڑہ اسکندریہ کی طرف بڑھا، محمد علی کو اس وقت تک اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ اتحادیوں کے مقابلہ کی طاقت نہیں رکھتا، چنانچہ اس نے امیر البحر نیپئر (Napier) سے صلح کی گفتگو شروع کر دی اور ترکی بیڑہ کو واپس کر دینے نیز کینڈیا (کریٹ) اور ان چند ایشیائی علاقوں سے جو ابھی تک اس کے قبضہ میں تھے، اپنی فوجیں ہٹا لیتے پر رضامندی ظاہر کی، صلح کی گفتگو میں اتحادیوں کے علاوہ فرانس بھی

شریک ہوا، بالآخر ۲۰ ستمبر ۱۸۴۱ء کو یہ طے پایا کہ صرف مصر کی پاشائی محمد علی اور اس کے ورثہ کے لیے مستقل کر دی جائے، بقیہ تمام علاقے اس کے قبضہ سے نکال لیے گئے، مصر کی سالانہ مدنی کا ایک ربع بطور خراج مقرر کیا گیا، جو اسے ہر سال باب عالی میں پیش کرنا تھا، بعد میں چار لاکھ پونڈ سالانہ کی رقم مقرر کر دی گئی، اس کے علاوہ باب عالی کی طلب پر چند بحری اور فوجی دستوں کی فراہمی بھی لازمی قرار دی گئی، اس معاہدہ کے رو سے اس پر یہ پابندی بھی عاید کر دی گئی کہ مصر میں اٹھارہ ہزار سے زیادہ فوج نہ رکھے۔

محمد علی پاشا اور باب عالی کے معاملات کے طے ہو جانے کے بعد اتحادیوں اور باب عالی کے درمیان ایک علاحدہ معاہدہ ہوا جس کے رو سے ترکی جہازوں کے علاوہ تمام دوسری حکومتوں کے جنگی جہازوں کا داخلہ دردنیاں اور آبنائے باسفورس میں ممنوع قرار دیا گیا، اس کے بعد بارہ سال تک دولت عثمانیہ کو کسی غیر ملکی طاقت سے جنگ پیش نہیں آئی اور امن و سکون کی اس فرصت میں سلطان کو ان اصلاحات کے جاری کرنے کا موقع ملا جن کی ابتدا سلطان محمود ثانی نے کر دی تھی، وفاق و قناعت سلطنت کے مختلف حصوں میں شورشیں برپا ہوتی رہیں، لیکن سر لشکر عمر پاشا نے ہر موقع پر انھیں جدد فرو کر دیا۔

خط شریف گلخانہ: سلطان محمود نے اپنی حکومت کے آخری سالوں میں اصلاحات کی ایک مکمل تجویز تیار کر لی تھی لیکن مسلسل جنگوں نے ان کے نفاذ کی مہلت نہ دی، تاہم اپنی وفات سے قبل اس نے وارث سلطنت شہزادہ عبدالحمید کو ان اصلاحات کی اہمیت اچھی طرح سمجھا دی تھی، چنانچہ عبدالحمید نے عنان حکومت ہاتھ میں لینے کے چار ہی ماہ بعد اپنے قصر گلخانہ سے سلطان محمود کے تیار کردہ فرمان کا اعلان کیا جو تاریخ میں خط شریف گلخانہ کے نام سے مشہور ہے اور اپنی نوعیت کے لحاظ سے سلطنت عثمانیہ کا اہم ترین دستور خیال کیا جاتا ہے، اس کا مختص ترجمہ درج ذیل ہے:

”یہ امر بخوبی معلوم ہے کہ حکومت عثمانیہ کے ابتدائی دور

میں قرآن مجید کے احکام اور سلطنت کے قوانین کا احترام ہمیشہ کیا جاتا تھا، جس کا نتیجہ یہ تھا کہ سلطنت کی طاقت و عظمت میں ترقی ہوتی گئی اور بلا استثناء اس کے تمام باشندوں میں بہت زیادہ خوش حالی اور فارغ البالی پھیل گئی۔

ڈیڑھ سو برس سے مسلسل حادثات اور مختلف اسباب سے شرع شریف اور قوانین سلطنت کی پابندی جاتی رہی ہے، نتیجہ یہ ہے کہ قوت اور خوش حال ضعف اور افلاس سے بدل گئی ہے کیوں کہ جو سلطنت اپنے قوانین کی پابندی ترک کر دیتی ہے اس کا سارا استحکام بھی رخصت ہو جاتا ہے۔

ہم ابتدا ہی سے ان امور پر غور کر رہے ہیں اور تخت نشینی کے روز سے آج تک فلاح عامہ، صوبوں کی اصلاح حال اور قومی بار کی تخفیف ہماری توجہ کا مرکز ہے، اگر ہم عثمانی صوبوں کے جغرافی حالات، زمین کی زرخیزی اور باشندوں کی موزونی طبع اور ذکاوت فہم کو پیش نظر رکھیں تو ہمیں یقین آجائے گا کہ موثر طریقوں کے دریافت اور استعمال کرنے پر امید ہے کہ خدا کی مدد سے خاطر خواہ نتیجہ چند ہی سالوں میں حاصل ہو جائے۔

لہذا اللہ تعالیٰ کی مدد اور نبی کریم ﷺ کی دعا پر پورا اعتماد کر کے ہم مناسب خیال کرتے ہیں کہ جدید قوانین کے ذریعہ سلطنت عثمانیہ کے صوبوں میں عمدہ نظم و نسق پیدا کرنے کی کوشش کریں، یہ قوانین خصوصیت کے ساتھ مندرجہ ذیل امور سے متعلق ہوں گے۔

(۱) رعایا کی جان، آبرو اور مال کے کامل تحفظ کی ضمانت۔

-(۲) محاصل کی وصولی کا ایک باقاعدہ نظام۔

(۳) فوج کی بھرتی اور اس کی مدت ملازمت کی تعیین کے لیے بھی ایسی ہی باقاعدہ نظام۔

محاصل کی تشخیص کا انتظام نہایت درجہ اہم ہے کیوں کہ سلطنت کو اپنے علاقوں کی حفاظت کرنے میں مختلف اخراجات برداشت کرنے پڑتے ہیں اور فوجوں نیز دوسری ملازمتوں کے لیے روپیہ کی ضرورت رہتی ہے جس کے حاصل کرنے کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ رعایا پر چندے لگائے جائیں۔

اگرچہ خدا کی عنایت سے ہماری رعایا کچھ عرصہ سے اجاروں کی مصیبت سے نجات پا چکی ہے جن کو اب تک غلطی سے آمدنی کا ایک ذریعہ سمجھا جاتا تھا، تاہم ایک مہلک دستور اب بھی جاری ہے جس کا نتیجہ تباہی اور بربادی کے سوا کچھ بھی نہیں یعنی وہ مراعات جو 'الترامات' کے نام سے مشہور ہیں۔

اس نظام کے تحت صوبہ کا ملکی اور مالی انتظام کسی ایک شخص کی مطلق العنانی کے سپرد کر دیا جاتا ہے جو بعض اوقات نہایت سخت گیر اور حریص ثابت ہوتا ہے کیوں کہ حاکم اگر نیک نہیں ہے تو وہ اپنے فائدے کے علاوہ کسی چیز کے پروا نہیں کرتا۔

لہذا ضروری ہے کہ آئندہ ملت عثمانیہ کے ہر فرد پر اتنا ہی محصول لگایا جائے جتنا اس کی حیثیت کے موافق ہو اور اس سے زیادہ کا مطالبہ اس سے نہ کیا جائے۔

یہ بھی ضروری ہے کہ بری اور بحری فوجوں کے اخراجات کی تعیین خاص قوانین کے ذریعہ کر دی جائے، اگرچہ ملک کی حفاظت کا خیال سب پر مقدم ہے اور تمام باشندوں کا فرض ہے کہ اس مقصد کے

لیے سپاہی فرما کر، تاہم ضروری ہے کہ وقت کی ضرورت کے لحاظ سے فوجی دستوں کے لیے جو ہر صبح مہیا کرے قوانین مقرر کر دئے جائیں، نیز فوجی سپاہیوں کی مدت ملازمت کم کر کے چار یا پانچ سال کر دی جائے، کیوں کہ ضلع کی آبادی کا لحاظ کیے بغیر کسی ضلع سے زیادہ اور کسی سے کم سپاہیوں کا بھرتی کرنا انصافی کے علاوہ ملک کی زراعت اور صنعت و حرفت کو ایک مہلک صدمہ پہنچاتا ہے، اسی طرح سپاہیوں کو تمام عمر فوجی خدمت میں رکھنے کے لیے ان کے اندر مایوسی پیدا ہو جاتی ہے اور ملک کی آبادی بھی کم ہونے لگتی ہے۔

مختصر یہ کہ ان مختلف قوانین کے بغیر جن کی ضرورت تسلیم کر لی گئی ہے، سلطنت میں نہ قوت رہ سکتی ہے نہ دولت، نہ خوش حالی نہ امن، برخلاف اس کے ان جدید قوانین کی موجودگی سے یہ تمام باتیں حاصل ہو سکتی ہیں۔

لہذا آئندہ ہر ملزم کے مقدمہ کی سماعت عدلیہ طور پر ہمارے شرعی قانون کے مطابق ہوا کرے گی اور جب تک باضابطہ فیصلہ نہ سنا دیا جائے کسی شخص کو اختیار نہ ہوگا کہ دوسرے کو خفیہ طور پر یا علانیہ زہر دے کر یا کسی دوسرے طریقے سے مار ڈالے۔

کسی کو اجازت نہ ہوگی کہ وہ دوسرے کی آبرو پر حملہ کرے خواہ وہ کوئی بھی ہو، ہر شخص اپنے ہر قسم کے مال و اسباب پر قابض رہے گا اور پوری آزادی کے ساتھ اسے فروخت یا منتقل کر سکے گا کسی کو اس میں مزاحمت کا حق نہ ہوگا، مثلاً کسی مجرم کے بے گناہ ورثہ اپنے قانونی حقوق سے محروم نہ کیے جائیں گے اور نہ اس مجرم کا مال و اسباب ضبط کیا جائے گا۔

یہ مراعات ہماری تمام رعایا کے لیے خواہ وہ کسی مذہب یا فرقہ سے تعلق رکھتی ہو یکساں طور پر جاری ہوں گی اور وہ بلا استثناء ان سے مستفید ہوگی۔

پس جیسا کہ ہماری مقدس شریعت کے قانون کا تقاضا ہے سلطنت کے تمام باشندوں کو ان کی جان، آبرو اور مال کی نسبت ہماری طرف سے کامل ضمانت عطا کی جاتی ہے۔

دوسرے امور کے لیے چوں کہ ضروری ہے کہ اہل الرائے کے اتفاق سے طے کیے جائیں، اس لیے ہماری مجلس عدل (Council of Justice) جس میں متعین دنوں میں ہمارے وزراء اور اعیان سلطنت بھی شریک ہوا کریں گے، جان و مال کی حفاظت اور محصل کی تشخیص کے متعلق بنیادی قوانین مرتب کرنے کی غرض سے منعقد ہوتی رہے گی، ان مجالس میں ہر شخص اپنے خیالات و آرا کا اظہار آزادی سے کرے گا۔

جو قوانین فوجی ملازمت سے متعلق ہوں گے ان پر مجلس حربی میں بحث ہوگی جس کا اجلاس ہر عسکر کے محل میں ہوا کرے گا جس وقت کوئی قانون طے کر لیا جائے گا وہ فوراً ہمارے سامنے پیش کیا جائے گا اور اس غرض سے کہ وہ ہمیشہ کے لیے قائم اور قہر نفاذ ہو جائے ہم اس کی منظوری اپنے دست خاص سے اس کے اوپر لکھ دیں گے۔

چونکہ ان قوانین کا مقصد تہمتا متر مذہب، حکومت، قوم اور سلطنت کا احیا ہے، اس لیے ہم عہد کرتے ہیں کہ کوئی بات ایسی نہ کریں گے جو ان کے مخالف ہو۔

اپنے اس عہد کی ضمانت کے طور پر ہمارا ارادہ ہے کہ اس

فرمان کو سلطنت کے تمام علما اور اعیان کی موجودگی میں اس ایوان میں رکھ دینے کے بعد جس میں نبی کریم ﷺ کے تبرکات رکھے ہوئے ہیں قادر مطلق کے نام پر خود بھی اس کی پابندی کا حلف لیں اور علما و اعیان کو بھی اس کا حلف دلوائیں۔

اس کے بعد علما یا اعیان میں سے کوئی شخص یا کوئی اور جو بھی ان قوانین کی خلاف ورزی کرے گا اسے بلا لحاظ اس کے رتبہ یا شہرت کے وہ سزا دی جائے گی جو جرم کے ثابت ہونے کی حالت میں مقرر ہے، اس کے لیے تعزیری قوانین کا ایک مجموعہ منضبط کیا جائے گا۔

چونکہ آج سے سلطنت کے تمام عہدہ داران کو معقول تنخواہیں دی جائیں گی اور جن لوگوں کی خدمات کا معاوضہ اس وقت کافی نہیں ملتا انھیں بھی ترقی دے دی جائے گی، اس لیے رشوت ستانی کے خلاف جس کی ممانعت قوانین الہی میں آئی ہے اور جو زوال سلطنت کے خاص اسباب میں سے ایک سبب ہے، سخت قانون نافذ کیا جائے گا۔

ان قوانین سے چونکہ قدیم دستوروں کی مکمل تجدید ہوتی ہے اور وہ بالکل بدل جاتے ہیں، اس لیے یہ فرمان سلطانی قسطنطنیہ اور ہماری سلطنت کے تمام شہروں میں شائع کر دیا جائے گا اور حلیف طاقتوں کے تمام سفیروں کو جو قسطنطنیہ میں مقیم ہیں اس کی نقلیں باضابطہ طور پر بھیج دی جائیں گی تاکہ وہ ان قوانین کی مراعات کے شاہد رہیں جو خدا کے فضل و کرم سے ہمیشہ قائم رہیں گی۔

خدا سے قدر ہم سب کو اپنے حفظ و امان میں رکھے جو لوگ ان قوانین کے خلاف کوئی بات کریں ان پر عذاب الہی نازل ہو اور وہ

برقہ کی خوشی سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو جائیں۔“ (۱)

دستور ثانی ۱۸۵۶ء: ۲۱ فروری ۱۸۵۶ء کو سلطان عبدالحمید نے حکومت عثمانیہ کے دوسرے اہم دستور کا اعلان کیا، اس کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

”تمام رعایا کی جان و مال اور عزت و آبرو کی ضمانت جو
”خط شریف گلخانہ“ میں کی گئی ہے اس کی توثیق کی جاتی ہے، اس باب
میں رعایا کے مراتب و مذاہب میں کسی قسم کا امتیاز جائز نہ ہوگا۔

ان تمام حقوق و مراعات کی جو نصاری اور سلطنت کے
دوسرے فرقوں کو دئے گئے ہیں از سر نو توثیق کی جاتی ہے، ان حقوق و
مراعات پر بلا تاخیر نظر ثانی کر کے زمانہ اور سوسائٹی کی ضروریات کے
مطابق انھیں ترقی دی جائے گی اور اس غرض سے بطریق کے
زیر صدارت ایک مجلس منعقد کی جائے گی، جو مذکورہ بالا اصلاحات پر
بحث کر کے اپنی رائے باب عالی میں پیش کرے گی، سلطان محمد فاتح اور
اس کے جانشینوں نے جو حقوق بطریق کو عطا کیے تھے ان میں اس
جدید حق کا اضافہ کیا جائے گا اور آئندہ بطریق کا انتخاب تمام عمر کے
لیے ہوا کرے گا۔

نصاری اور دوسرے فرقوں کے بطریقوں، اسقفوں اور
مذہبی عہدہ داروں کو باب عالی کے تجویز کردہ طریقہ کے مطابق
وفاداری کا حلف لینا پڑے گا۔

وہ تمام محصول اور چندے جو مختلف فرقوں کے پادری اپنی
جماعتوں سے وصول کیا کرتے تھے ممنوع قرار دئے جاتے ہیں، مقررہ
تنخواہیں بطریقوں، اسقفوں اور تمام چھوٹے بڑے مذہبی عہدہ داروں کو

ان کے مراتب اور خدمات کے لحاظ سے دی جائیں گی، پادریوں کی منقولہ یا غیر منقولہ جائداد سے کوئی تعرض نہیں کیا جائے گا۔

موجودہ کلیساؤں، مدرسوں، ہسپتالوں اور قبرستانوں کی مرمت کی عام اجازت ہے لیکن اگر کسی جدید کلیسا، مدرسہ، قبرستان یا ہسپتال کے تعمیر کرنے کی ضرورت ہوگی اور بطریق یا اس فرقہ کا مذہبی پیشوا اسے منظور کرے گا تو ہر جدید تعمیر کا نقشہ باب عالی میں پیش کیا جائے گا، اگر کوئی وجہ مانع نہ ہوگی تو سلطان نقشہ کو ملاحظہ فرما کر تعمیر کی منظوری خود صادر فرمائے گا۔

ہر فرقہ کو اپنے مذہبی فرائض کی ادائیگی کی پوری آزادی حاصل ہوگی۔

وہ تمام القاب و امتیازات جن سے رعایا کے بعض طبقے اعلیٰ اور بعض ادنیٰ شمار ہوتے ہیں ہمیشہ کے لیے شاہی دفتر سے خارج کیے جاتے ہیں، اسی طرح عہدہ داروں اور عام لوگوں کو بھی دل آزار اور اہانت آمیز کلمات کے استعمال سے سختی سے روکا جاتا ہے، اس حکم کی خلاف ورزی کرنے والے سزا کے مستوجب ہوں گے۔

چونکہ تمام مذاہب کو آزادی حاصل ہے، اس لیے کوئی شخص اپنے مذہب کی وجہ سے ستایا نہ جائے گا اور نہ کسی کو اپنا مذہب تبدیل کرنے پر مجبور کیا جائے گا۔

ملکی ورفوجی عہدے تمام رعایا کے لیے یکساں طور پر کھلے رہیں گے، تقرر صرف قواعد و ضوابط کے مطابق اور قابلیت کی بنا پر ہوگا۔ ہر فرقہ کو علوم و فنون کے مدارس قائم کرنے کی اجازت ہے، البتہ تصاب تعلیم اور اساتذہ کا انتخاب ایک مخلوط مجلس کے زیر نگرانی ہوگا

جو باب عالی کی طرف سے مقرر کی جائے گی۔

وہ تمام مقدمات جن کا تعلق تجارت یا فوجداری سے ہوگا اور جن میں فریقین مختلف فرقوں کے ہوں گے مخلوط عدالتوں میں پیش کیے جائیں گے اور ان کا اجلاس برسر عام ہوا کرے گا، صوبوں اور سنجھوں کے دیوانی کے مقدمات بھی مخلوط عدالتوں میں وکیل اور قاضی کی موجودگی میں پیش ہوں گے اور ان عدالتوں کا اجلاس بھی برسر عام ہوگا۔

جن مقدمات میں فریقین ایک ہی فرقہ کے ہوں گے یا جن مقدمات عدالت سے متعلق ہوں گے وہ فریقین کی خواہش کے مطابق یا ان کے بطریق کے سامنے پیش ہوں گے یا ان کی قومی مجلس کے۔

ایک ضابطہ تجارت و ضابطہ فوج داری نیز وہ تمام قواعد و ضوابط مخلوط عدالتوں سے متعلق ہیں حتی الامکان جلد از جلد شائع کر دئے جائیں گے اور سلطنت عثمانیہ میں جتنی زبانیں مستعمل ہیں ان سب میں ان کا ترجمہ کر دیا جائے گا۔

قید خانوں اور حوالاتوں کی اصلاح کی جائے گی اور معمولی جرائم کے مجرموں کے لیے نئے ضابطے مرتب کیے جائیں گے، علاوہ ان سزاؤں کے جو باب عالی کے ضابطہ پولیس کے رو سے مقرر ہوں گی اور تمام ایذائیں یک قلم منسوخ کی جاتی ہیں، اس حکم کی خلاف ورزی کرنے والوں کو سخت سزا دی جائے گی۔

چونکہ محصلوں کے عاید کرنے میں مسادات برتی جائے گی، اس لیے انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ مسلمانوں کی طرح عیسائی اور دوسرے فرقہ کے لوگ بھی فوج میں داخل ہوں لیکن انھیں فوجی خدمات کے معاوضہ میں نقد رقم پیش کرنے کی اجازت بھی حاصل رہے گی۔

مسلمانوں کے علاوہ دوسرے فرقوں کو بھی فوج میں بھرتی کرنے کے ضوابط مرتب کر کے جلد شائع کر دئے جائیں گے۔

صوبوں کی مجلسوں میں اصلاح کی جائے گی تاکہ انتخابات بہتر طریقہ پر ہو سکیں اور باشندوں کی آزاد اور صحیح رائے معلوم ہو سکے۔

چونکہ تجارتی معاملات اور غیر منقولہ جائیدادوں کے قوانین تمام رعایا کے لیے یکساں ہیں اس لیے باب عالی جب غیر حکومتوں سے کوئی ایسا معاملہ کرے گا جس کے رو سے غیر ملکی باشندوں کو سلطنت کے ان قوانین کو تسلیم کر کے اسی حساب سے محصول ادا کرنا ضروری ہوگا جس حساب سے ملکی باشندے ادا کرتے ہیں تو ایسی صورت میں غیر منقولہ جائیدادوں کی لکیت حاصل کرنے کا حق بھی غیر ملکی باشندوں کو عطا کیا جائے گا۔

ٹھیکہ داروں کی مداخلت سے عشر اور دوسرے محصولوں کے وصول کرنے کا جو طریقہ اب تک رائج تھا وہ موقوف کیا جاتا ہے، آئندہ جہاں تک ممکن ہوگا حکومت کے عہدہ دار براہ راست وصول کیا کریں گے۔

مقامی محصولوں کی تشخیص حتی الامکان اس طرح کی جائے گی کہ پیدوار اور تجارت کی ترقی کو نقصان نہ پہنچے۔

صوبوں میں محصول ان امور کے لیے عاید کیے جائیں گے جو سب کے لیے مفید ہوں مثلاً سڑکوں کی تعمیر جو اندرون ملک کے علاوہ سمندر کے ساحل تک چلی جائیں گی۔

ہر عہدہ دار کی تنخواہ متعین کر دی جائے گی۔

عیسائی اور دوسرے فرقوں کے معاملات کی نگرانی کے لیے

ایک ایک افسر مقرر ہوگا جو اپنے مشوروں سے اسٹیٹ کونسل کو مدد دے گا، یہ افسر صدر اعظم کی مجلس وزراء میں سے منتخب کیے جائیں گے اور ان کا تقرر ایک سال کے لیے ہوا کرے گا۔

اسٹیٹ کونسل کے ممبروں کو معمولی اور غیر معمولی اجلاسوں میں اپنی رائے آزادانہ طور پر ظاہر کرنے کی اجازت ہوگی اور ان پر اس کے خلاف کسی قسم کا دباؤ نہ ڈالا جائے گا۔

رشتہ ستانی کے قوانین بلا امتیاز تمام رعایا کے لیے یکساں طور پر نافذ ہوں گے، خواہ اس کے مجرم کسی طبقہ یا رتبہ کے اشخاص ہوں۔
باب عالی مالی اعتبار کے قایم کرنے میں حتی الامکان پوری کوشش کرے گا اور جن چیزوں سے اس اعتبار کو تقویت ہوتی ہے مثلاً بینک وغیرہ ان کو فروغ دے گا اور ان کے لیے ضروری سرمایہ فراہم کرے گا۔

باب عالی ملکی پیداوار کے نقل و حمل کے لیے سڑکیں اور نہریں تعمیر کرائے گا اور تمام رکاوٹوں کو دور کر کے زراعت کی ترقی میں آسانیاں بہم پہنچائے گا۔“ (۱)

دیگر اصلاحات: مذکورہ بالا اصلاحات کے علاوہ سلطان عبدالحمید نے بعض دوسری اہم اصلاحات بھی جاری کیں، ۱۸۴۶ء کے فرمان کے رو سے ایک مجلس تعلیم عامہ مقرر ہوئی ایک جدید یونیورسٹی کا قیام طے پایا، تعلیم کی نگرانی علماء کے ہاتھوں سے نکال کر مجلس تعلیم کے سپرد کر دی گئی اور جو مکاتب مسجدوں میں قایم تھے انھیں بھی اس مجلس کے زیر اہتمام ابتدائی مدارس بنادیا گیا، دوسری اہم اصلاح بردہ فروشی کے متعلق ہوئی چونکہ بردہ فروشی کا رواج تمام سلطنت میں عام طور پر تھا، اس لیے دفعتاً اس کو ممنوع قرار دینے میں

عام برہمی کا اندیشہ تھا مگر باب عالی نے ایسے قوانین نافذ کر دئے جن سے بردہ فروشی میں بیش از بیش مشکلات پیدا ہوتی گئیں، علاوہ بریس ۱۸۵۷ء میں سلطان نے ایک فرمان جاری کر کے اپنے حدود سلطنت میں دوسرے ملکوں سے غلاموں کا لانا بھی ممنوع قرار دے دیا، اس فرمان پر اگر سختی سے عمل درآمد شروع کر دیا جاتا تو نہ صرف بردہ فروشی کا استیصال ہو جاتا بلکہ غلاموں اور لونڈیوں کی تعداد بھی کم ہوتے ہوتے ایک روز سلطنت عثمانیہ سے بالکل مفقود ہو جاتی کیوں کہ ترکی میں یہ دستور عرصہ سے چلا آتا تھا کہ چند سال کی خدمت کے بعد غلاموں اور لونڈیوں کو آزاد کر دیتے تھے اور چوں کہ اب جنگ میں اسیروں کے حاصل ہونے کا امکان کم رہ گیا تھا اور دوسرے ملکوں سے خرید کر لانا خلاف قانون تھا، اس لیے غلامی کا سلسلہ جلد منقطع ہو جاتا۔

فوجی اصلاحات: سب سے زیادہ اہم فوجی اصلاحات تھیں، ”خط شریف گلخانہ“ کے اعلان کے بعد ہی فوج کی بھرتی کا باقاعدہ نظام قائم کر دیا گیا تھا لیکن نظام جدید کے مطابق فوج کی ترتیب ۱۸۴۳ء میں مکمل ہوئی جب رضا پاشا سر عسکر تھا، فوج دو حصوں میں تقسیم کی گئی، ایک نظام دوسری ردیف، نظام وہ فوج تھی جو میدان جنگ میں رہا کرتی تھی ردیف وہ تھی جو میدان جنگ کی معینہ مدت ختم کرنے کے بعد آئندہ ضرورتوں کے لیے مستعد رکھی جاتی تھی، ہر ضلع سے ایک مقررہ تعداد فوج کی لی جاتی تھی، جس میں بیس سال سے زیادہ عمر کے لوگ بھرتی کیے جاتے تھے، اس تعداد میں ایک حصہ رضا کاروں کا ہوتا تھا بقیہ حکومت کی طرف سے بھرتی ہوتے تھے، نظام فوج میدان جنگ میں پانچ سال رکھی جاتی تھی، اس کے بعد سپاہیوں کو وطن واپس آنے کی اجازت دے دی جاتی تھی لیکن انھیں واپسی کے بعد بھی سات سال تک اپنے ضلع کی ردیف میں شامل رہنا پڑتا تھا، کسی جنگ یا ضرورت ناگہانی کے موقع پر ردیف کو پھر طلب کیا جاسکتا تھا۔

اصلاحات کا اثر: سلطنت عثمانیہ کو ان تمام اصلاحات کی جس حد تک ضرورت تھی اس کا اندازہ ان بے عنوانیوں سے ہو سکتا ہے جو حکومت کے ہر شعبہ میں روز بروز بڑھتی جاتی

تھیں اور اختلال و بد نظمی پیدا کر کے سلطنت کی بنیادوں کو متزلزل کر رہی تھیں لیکن چونکہ ان اصلاحات سے غیر متدین اور ظالم عہدہ داروں کو نقصان پہنچتا تھا اور فوج کی سرکشی کا بھی سد باب ہو رہا تھا اس لیے ان کے خلاف مختلف صوبوں مثلاً البانیا، کردستان اور بوسنیا وغیرہ میں بغاوتیں برپا ہو گئیں، خوش قسمتی سے باب عالی کی خدمت کے لیے عمر پاشا کا سب سے بڑا نظیر جنرل موجود تھا جس کی غیر معمولی شجاعت اور دانش مندی نے نہ صرف ان بغاوتوں کا استیصال کیا بلکہ باغیوں کو اصلاحات کے قبول کرنے پر بھی راضی کر لیا، اس طرح محمد علی سے صلح کے بعد سے جنگ کریپیا کے شروع ہونے تک باب عالی کو بارہ سال کی مہلت اصلاحات کے جاری کرنے کے لیے مل گئی، اس مدت میں سلطنت کی تجارتی اور عام خوش حالی میں نمایاں طور پر روز افزوں ترقی ہوتی گئی، جس کے آثار سلطان محمود کی حکومت کے آخری سالوں میں ظاہر ہونے شروع ہو گئے تھے، چنانچہ ۱۸۵۳ء میں لارڈ پالمرسٹن (Palmerston) نے نہایت پر زور الفاظ میں اپنی اس رائے کا اظہار پارلیمنٹ میں کیا کہ جتنی ترقی و اصلاح سلطنت عثمانیہ نے گذشتہ سالوں میں کی ہے کسی دوسری حکومت نے نہیں کی۔ (۱)

دولت علیہ کی یہ ترقی روس کی نگاہوں میں کھٹک رہی تھی، لیکن سلطان عبدالعزیز کی دانش مندانہ روش نے کسی آویزش کا موقع نہ دیا، البتہ ۱۸۴۹ء میں جب روس اور آسٹریا کی متحدہ فوجوں نے ہنگری کی جنگ آزادی کا خاتمہ کر دیا اور ہنگری کے بہت سے فوجی سردار بھاگ کر ترکی میں پناہ گزیں ہوئے تو روس اور آسٹریا دونوں نے باب عالی کو الٹی میٹم دیا کہ ان سرداروں کو فوراً سلطنت عثمانیہ سے نکال دیا جائے ورنہ جنگ ناگزیر ہو جائے گی، یہ موقع بہت نازک تھا، باب عالی جنگ کے لیے تیار نہ تھا، اس کی فوجوں کی تنظیم نظام جدید کے مطابق ابھی مکمل نہیں ہوئی تھی، تاہم سلطان نے گوارا نہ کیا کہ ان سرداروں کو جنھوں نے اس کی سلطنت میں آکر پناہ لی تھی دشمنوں کے حوالہ کر دے، اس

نے روس اور آسٹریا کی دھمکیوں کے باوجود ان سرداروں کو حوالہ کرنے سے انکار کر دیا، نتیجہ یہ ہوا کہ روس اور آسٹریا نے باب عالی سے سفارتی تعلقات منقطع کر دئے اور کچھ دنوں تک ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جنگ بہت جلد شروع ہو جائے گی، لیکن انگلستان اپنے سفیر سراسٹرفورڈ کیننگ (Sir Stratford Canning) کے مشورہ کے مطابق جو قسطنطنیہ میں مقیم تھا اور اپنے اخلاق و فراست کی وجہ سے سلطان کے مزاج میں بہت کچھ دخل رکھتا تھا، یہ اعلان کیا کہ اگر سلطنت عثمانیہ پر حملہ کیا گیا تو انگلستان اس کی مدد کرے گا اور اس اعلان کے بعد نومبر ۱۸۴۹ء میں ایک برطانوی بیڑہ دولت علیہ کی حمایت کے لیے دردنیاں میں پہنچ بھی گیا، روس اور آسٹریا نے انگلستان کا یہ طرز عمل دیکھ کر جنگ چھیڑنا مناسب نہیں خیال کیا اور دونوں نے باب عالی سے سفارتی تعلقات جو کچھ دنوں کے لیے منقطع ہو گئے تھے پھر قائم کر لیے۔

سلطنت عثمانیہ کی تقسیم کی تجویز: اس واقعہ سے روس کو اندازہ ہو گیا تھا کہ دولت عثمانیہ کے خلاف کوئی قدم انگلستان کی حمایت کے بغیر کامیابی کے ساتھ اٹھایا نہیں جاسکتا، ہذا نکولس نے اب حکومت برطانیہ کو ملانے کی تدبیر شروع کی، اس سے قبل بھی ۱۸۴۴ء میں جب وہ انگلستان گیا تھا تو برطانوی وزیروں سے ترکی کے مستقبل کے متعلق گفتگو کی تھی، لیکن چونکہ اس گفتگو کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکلا اس لیے اس نے زیادہ موثر طریقہ پر کوشش شروع کیا اور اوائل ۱۸۵۳ء میں سر ہملٹن سیمر (Sir Hamilton Seymour) برطانوی سفیر مقیم سیٹ پٹرس برگ سے خود گفتگو کر کے انگلستان اور روس کے درمیان سلطنت عثمانیہ کی تقسیم کی ایک تجویز پیش کی، اس نے سیمر اور وزارت برطانیہ کو یقین دلانا چاہا کہ ”یورپ کا مرد بیوہ“ عنقریب دم توڑنے والا ہے، اس لیے مجھے اس کے کہ اس کی موت کا ناگہانی واقعہ اور اس کے ترکہ کی تقسیم بین الاقوامی آویزش کا سبب بنے مناسب ہے کہ اس مسئلہ کا تصفیہ پہلے ہی کر لیا جائے، مصر اور کریٹ چونکہ انگلستان کے لیے زیادہ موزوں تھے، اس لیے نکولس نے یہ دونوں صوبے اسی کے حصہ میں رکھے،

روس کے لیے مولڈویا، ولاچیا، سرویا اور بلغاریہ کا قبضہ زیادہ مناسب معلوم ہوا، چنانچہ نکولس نے سیمر سے کہا کہ ”مولڈویا اور ولاچیا کی ریاستیں حقیقتاً میرے زیر تحفظ ایک خود مختار مملکت ہیں، ان کی حیثیت بدستور قائم رہے گی، سرویا کو بھی ویسا ہی دستور حکومت دے دیا جائے، اسی طرح بلغاریا کو بھی“، سب سے زیادہ اہم قسطنطنیہ کا مسئلہ تھا، نکولس نے صاف الفاظ میں کہا کہ قسطنطنیہ پر نہ انگلستان کا قبضہ ہونے پائے گا نہ فرانس کا اور نہ کسی دوسری بڑی طاقت کا، خود روس کے متعلق بھی اس نے یہی فیصلہ کیا، البتہ اتنا کہ بغیر نہ رہ سکا کہ اگر ضرورت مجبور کرے گی تو چند دنوں قسطنطنیہ پر روسی فوجیں قابض رہیں گی، غرض اس تمام گفت و شنید کا خلاصہ یہ تھا کہ روس اور انگلستان مل کر سلطنت عثمانیہ پر جلد از جلد حملہ کر دیں اور اسے آپس میں بانٹ میں، لیکن حکومت برطانیہ نے زار کی یہ تجویز قبول کرنے سے انکار کر دیا، نکولس بہر حال حملہ کی پوری تیاریاں کر چکا تھا اور صرف موقع کا منتظر تھا۔

جنگ کریمیا کے اسباب: یہ موقع جلد ہاتھ آ گیا، فلسطین کے مقامات مقدسہ کا مسئلہ ۱۸۵۱ء میں پھر سامنے آ گیا تھا، فرانس اور روس لاطینی اور یونانی کلیسا کے عیسائیوں کی نمایندگی کر رہے تھے اور ہر ایک اپنے کو بیت المقدس اور دوسرے مقامات کے تحفظ کا مستحق قرار دیتا تھا، یہاں تک تو معاملہ زیادہ اہم نہ تھا لیکن ان مقامات کے تحفظ کے علاوہ فریقین نے اب ان تمام عیسائیوں کے تحفظ کا دعویٰ بھی پیش کیا جن کا تعلق لاطینی اور یونانی کلیساؤں سے تھا، اس دعویٰ کے قبول کرنے کے یہ معنی تھے کہ سلطان کو یورپ میں اپنی نصف سے زیادہ رعایا کی فرماں روائی کے حق سے دست بردار ہو جانا پڑتا، چنانچہ باب عالی نے فرانس اور روس کے اس حق کو تسلیم کرنے سے قطعاً انکار کر دیا، فرانس نے بالآخر یہ تسلیم کیا کہ اسے صرف انہی رومن کیتھولک فرانسیسیوں کے تحفظ کا حق حاصل ہے جو سلطنت عثمانیہ میں مقیم ہیں، لیکن روس اپنے دعویٰ پر قائم رہا اور شہزادہ مین شی کوف (Menschi Kolf) نے قسطنطنیہ پہنچ کر ان سب عیسائی رعایا کی حفاظت کا مطالبہ پیش

کیا جو کلیساے یونان کی پیرو اور سلطنت عثمانیہ میں آباد تھی، یہ مطالبہ اس سے قبل بھی روس کی طرف سے دوبار پیش کیا جا چکا تھا، لیکن باب عالی نے انتہائی مصیبتوں کے باوجود اسے کبھی منظور نہیں کیا، ایک بار روس نے اسے صلح نامہ کینارجی کی گفت و شنید کے درمیان پیش کیا تھا، جس سے زیادہ سخت شرائط پر دولت عثمانیہ نے اس سے قبل کوئی صلح نہیں کی تھی پھر دوسری بار یہی مطالبہ ۱۸۰۵ء میں سلطان سیم کے سامنے پیش کیا گیا اور سلطان کے انکار پر چند ہی دنوں بعد روسی جنرل میکلسن (Michelson) نے مولد یویا اور ولاچیا پر قبضہ کر لیا، یہ دونوں مواقع دولت علیہ کے لیے نہایت نازک تھے مگر اس نے روس کو صاف جواب دے دیا تھا، اس مسئلہ کے متعلق باب عالی اور روس کے درمیان جو معاہدات ہو چکے تھے ان کا خلاصہ صرف یہ تھا:

(۱) زائر، پادری اور مسافر مخصوص ادا کیے بغیر بیت المقدس اور دوسرے مقامات مقدسہ کی زیارت کر سکتے ہیں۔

(۲) سفارت کے موجودہ گرجا کے علاوہ قسطنطنیہ کے ایک خاص حصہ میں چند جدید گرجے تعمیر کیے جاسکتے ہیں، اسی قسم کی اجازت اس صلح نامہ میں بھی دی گئی تھی جو ۱۷۴۰ء میں فرانس سے ہوا تھا۔

(۳) شہنشاہ روس نہیں بلکہ باب عالی بدستور سابق سلطنت عثمانیہ میں مذہب عیسوی کا محافظ رہے گا، شہنشاہ روس کو صرف اس بات کا حق حاصل ہوگا کہ کلیساے یونان اور اس کے عہدہ داروں کی نسبت باب عالی میں معروضات پیش کرے اور ان معروضات پر توجہ کرنا باب عالی کے لیے صرف دوستی کی بنا پر ضروری ہوگا۔

اعلانِ جنگ: لیکن روس نے جو مطالبات اب پیش کیے وہ مذکورہ بالا معاہدوں سے بہت زیادہ تھے، سلطان عبدالجید نے انھیں منظور کرنے سے یکسر انکار کر دیا، اس پر روسی سفیر شہزادہ مینشی کوف فوراً قسطنطنیہ سے روانہ ہو گیا اور باب عالی اور روس کے سفارتی تعلقات منقطع کر دئے گئے، ۳ جولائی ۱۸۵۳ء کو روسی فوجیں دریائے پرتھ کو عبور کر کے

مولڈیویا اور ولاچیا پر قابض ہو گئیں، یکم اکتوبر کو باب عالی نے بھی اعلان جنگ کر دیا، ترکی فوج نے عمر پاشا کی قیادت میں دریائے ڈینیوب کو عبور کیا اور ۴ نومبر کو اولٹینیتزا (Oltenitza) و ۵ کروسانیتھ (Citate) کے معرکہ میں روسیوں کو شکست دی، ان معرکوں سے تمام یورپ کو ان اصلاحات کی کامیابی کا اندازہ ہو گیا جو دولت علیہ کے فوجی نظام میں جاری کی گئی تھیں۔

انگلستان اور فرانس کی حمایت: اسی درمیان میں ۲۲ اکتوبر کو انگلستان اور فرانس کے جنگی بیڑے باب عالی کی حمایت میں دردنیاں میں داخل ہوئے، صلح کی گفتگو بھی جاری تھی لیکن جب ۳۰ نومبر کو روسی بیڑے نے سبائو پول سے نکل کر دفعۃً ترکی بیڑے پر حملہ کر کے اسے غرق کر دیا جو ایشیائے کوچک کے ساحل پر سینوپ کی بندرگاہ میں لنگر انداز تھا تو انگلستان اور فرانس کو یقین ہو گیا کہ جنگ کے بغیر چارہ نہیں، چنانچہ اتحادی بیڑے فوراً بحر اسود میں پہنچ گئے اور ۲۸ مارچ ۱۸۵۴ء کو انگلستان اور فرانس نے روس کے خلاف اعلان جنگ کر دیا، ان حکومتوں نے اپنی فوجیں قسطنطنیہ بھیجیں، جہاں سے وہ واراناکور واندہ کر دی گئیں، تاکہ مولڈیویا اور ولاچیا سے روسی فوجوں کو نکلنے میں ترکوں کی مدد کریں۔

۱۸۵۴ء کے اوائل میں ایک روسی فوج نے دریائے ڈینیوب کو عبور کر کے سلسلہ یا کا محاصرہ کر لیا جو کہ بلقان اور قسطنطنیہ کے درمیان ایک نہایت اہم قلعہ تھا لیکن ترکوں نے موسیٰ پاشا کی سرکردگی میں بڑی شجاعت اور جاں بازی کے ساتھ مدافعت کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ روسیوں کو بہت کچھ جان و مال کا نقصان اٹھانے کے بعد آخر کار ۲۵ جون کو محاصرہ اٹھایا پڑا، اس شکست کے بعد روسی فوج ڈینیوب کو دوبارہ عبور کر کے واپس چلی گئی، ترکوں نے تعاقب کیا، محاذ جنگ اب مولڈیویا اور ولاچیا میں قائم ہونے والا تھا کہ حکومت آسٹریا درمیان میں آگئی، یہ دیکھ کر کہ ان ریاستوں میں روسیوں کا قیام آسٹریا کے لیے خطرہ سے خالی نہیں، اس نے صاف الفاظ میں روس کو متنبہ کر دیا کہ اگر مولڈیویا اور ولاچیا سے فوجیں ہٹانے لیں گی تو آسٹریا کو مجبوراً اتحادیوں کا ساتھ دینا

پڑے گا، زار دشمنوں کی تعداد میں اضافہ کرنے کے لیے تیار نہ تھا، اس نے بادل نا خواستہ اپنی فوجیں بنالیں اور وہ دریائے پرتھ کو عبور کر کے پھر سردروس میں واپس چلی آئیں، محاربین کی مفاہمت سے آسٹروی فوجوں کو چند دنوں ان ریاستوں پر قابض رہنے کی اجازت دی گئی۔

سباسٹوپول کی فتح: روس کی بری طاقت کی طرف سے دولت عثمانیہ کو اب کوئی خطرہ نہ تھا لیکن اس کی بحریک قوت پر ابھی تک کوئی زد نہیں پڑی تھی، سباسٹوپول کا زبردست بحری سلح خانہ دولت علیہ کے لیے ایک مستقل خطرہ تھا، اس خطرہ کو دور کرنے کے لیے کریمیا پر حملہ کرنا ضروری تھا، سباسٹوپول کریمیا کا نہایت مستحکم بندرگاہ تھا، اسے برباد کر دینے سے روس کی بحری طاقت پر ایک کاری ضرب پڑ سکتی تھی، اس لیے اتحادیوں نے اب سباسٹوپول کو اپنا مقصد بنایا، ان کی فوجیں یوپیوریا (Eupatoria) کے قریب ساحل پر اتر کر ۱۴ ستمبر ۱۸۵۴ء کو اس شہر پر قابض ہو گئیں، پھر ۲۰ ستمبر ۱۸۵۴ء کو جنگ لما (Alma) میں روسی فوج کو شکست دی، جس کے بعد سباسٹوپول کا راستہ کھل گیا، سباسٹوپول کا محاصرہ ایک سال تک قائم رہا اور ۸ ستمبر ۱۸۵۵ء کو اتحادیوں کی فتح پر ختم ہوا، اس طویل مدت میں فریقین نے شجاعت و جاں بازی کے خوب خوب جوہر دکھائے۔

سقوط قارص: ایشیا میں روسی فوجوں کو پے در پے متعدد فتوحات حاصل ہوئیں لیکن قارص پہنچ کر انھیں رک جانا پڑا اور محاصرہ کے سوا کوئی چارہ نظر نہ آیا، ترکوں نے بڑی بہادری کے ساتھ مدافعت کی اور ۲۹ ستمبر کو جنرل مورادیف کی فوج کو زبردست شکست دی، لیکن محاصرہ قائم رہا، چونکہ باہر سے مدد نہ پہنچ سکی اور سامانِ رسد بالکل ختم ہو چکا تھا اس لیے مجبور ہو کر محصورین کو ہتھیار ڈال دینے پڑے۔

صلح کی گفتگو: سباسٹوپول کا محاصرہ ابھی جاری ہی تھا کہ ۲ مارچ ۱۸۵۵ء کو زار نکولس کا انتقال ہو گیا اور اس کا لڑکا الکزنڈر ثانی تخت نشین ہوا، الکزنڈر نے بھی اگرچہ یہ اعلان

کیا تھا کہ وہ پیٹر اعظم، کیتھرائن اور نکولس کے نقش قدم پر چلے گا، تاہم سبائسٹوپول کی تسخیر اور اتحادیوں کے بڑھے ہوئے حوصلوں سے اس کو اندازہ ہو گیا کہ جنگ کو جاری رکھنے روس کے لیے کسی طرح مناسب نہیں، چنانچہ جب آسٹریا کی وساطت سے صلح کی گفتگو پھر شروع ہوئی اور شرائط صلح پر غور کرنے کے لیے ویانا میں ایک کانفرنس منعقد کی گئی تو روس کو بہت کچھ لیت و لعل کے بعد راضی ہونا ہی پڑا، صلح نامہ کی ترتیب کے لیے پیرس کا مقام منتخب ہوا، ۲۵ فروری ۱۸۵۶ء کو دولت عثمانیہ، فرانس، انگلستان، روس آسٹریا اور سارڈینیا کے نمائندے وہاں مجتمع ہوئے، سارڈینیا جنگ کے آخری دور میں اتحادیوں کا شریک ہو گیا تھا، آسٹریا ثالث بخیر کی حیثیت سے اس کانفرنس کی کارروائیوں میں شروع ہی سے پیش پیش تھا، آخر میں پرشا کو بھی شریک کر لیا گیا تھا، ایک ماہ کے بحث و مباحثہ کے بعد ۲۳ مارچ ۱۸۵۶ء کو صلح نامہ پیرس مرتب ہوا اور مذکورہ بالا اسات حکومتوں کے نمائندوں نے اس پر دستخط کر دئے۔

صلح نامہ پیرس: اس صلح نامہ کی خاص دفعات حسب ذیل تھیں:

- (۱) ان حکومتوں نے دولت عثمانیہ کو باضابطہ طور پر مجلس دولہ یورپ کا رکن بنالیا اور اس کی آزادی اور اس کے مقبوضات کی سالمیت کے لیے متحدہ طور پر ضمانت کی۔
- (۲) سلطان نے بلا امتیاز نسل و مذہب تمام رعایا کی اصلاح حال کا وعدہ کیا اور یورپین حکومتوں نے صراحت کے ساتھ اعلان کیا کہ سلطنت عثمانیہ کے اندرونی معاملات میں دخل دینے کا مجموعی یا انفرادی طور پر انھیں کوئی حق حاصل نہ ہوگا۔
- (۳) بحر اسود تمام قوموں کے تجارتی جہازوں کے لیے کھول دیا گیا، لیکن جنگی جہازوں کا داخلہ ممنوع قرار پایا، روس اور دولت علیہ کو اس کے ساحلوں پر اسلحہ خانہ قائم کرنے کی بھی ممانعت کر دی گئی۔

(۴) وہ تمام علاقے جو دوران جنگ میں فریقین نے فتح کر لیے تھے واپس کر دئے گئے، چنانچہ قارس دولت علیہ کے حوالہ کر دیا گیا اور کریمیا روس کے۔

(۵) ایک بین الاقوامی کمیشن کی نگرانی میں دریائے ڈینیوب بھی تمام قوموں کے جہازوں کے لیے کھول دیا گیا۔

(۶) جنوبی بسرابیا کا علاقہ جس پر روس نے قبضہ کر لیا تھا، مولڈوویا میں شامل کر دیا گیا، مولڈوویا اور ولاچیا کی ریاستوں پر باب عالی کی فرماں روائی بدستور قائم رکھی گئی، روس ان ریاستوں کی حمایت کے حق سے جس کا وہ بلا شرکت غیرے دعویدار تھا، دست بردار ہو گیا اور ان کے حقوق کا تحفظ مذکورہ بالا حکومتوں نے مجموعی طور پر اپنے ذمہ لے لیا، ان ریاستوں کو حکومت خود اختیاری کے حقوق عطا کیے گئے، انھیں مذہب، قانون سازی اور تجارت کی پوری آزادی اور ایک 'قومی مسلح فوج' رکھنے کی اجازت دی گئی۔

(۷) سر دیا کو بھی یہی حقوق دے گئے، البتہ 'قومی فوج' رکھنے کی اجازت اسے نہی، اس کے اندرونی معاملات میں باب عالی کی فوجی مداخلت دول یورپ کی اجازت کے بغیر ممنوع قرار دی گئی۔

ضمنی معاہدے: صلح نامہ پیرس کے مکملہ کے بعد اسی روز دو معاہدے اور مرتب ہوئے، ایک کے رو سے ۱۸۴۱ء کے معاہدہ کی تجدید کی گئی اور دردنیاں اور آبنائے باسفورس میں غیر حکومتوں کے جنگی جہازوں کا داخلہ بند کر دیا گیا، دوسرا صرف زار اور سلطان کے درمیان ہوا جس کی بنا پر ہر فریق کو چھ چھوٹے اسٹیمر اور چار بلنگی کشتیاں بحر اسود کی ساحلی ضروریات کے لیے رکھنے کی اجازت دی گئی، ۱۵ اپریل کو ایک عہد نامہ اور ہوا جس میں برطانیہ، آسٹریا اور فرانس نے مجموعی اور انفرادی طور پر دولت عثمانیہ کی آزادی اور سالمیت کو قائم رکھنے کی ضمانت لی اور عہد کیا کہ صلح نامہ پیرس کے کسی جزو کی خلاف ورزی جنگ کا سبب قرار دی جائے گی۔

صلح نامہ پیرس پر ایک نظر: صلح نامہ پیرس نے بظاہر روس کی ساری امیدوں پر پانی پھیر دیا ڈیڑھ سو برس سے اس کے پیش نظر تین خاص مقاصد تھے، جن کے حصول کے لیے وہ مسلسل کوشش کرتا آ رہا تھا: (۱) بحر اسود میں اپنی جنگی اور تجارتی برتری قائم کرنا

(۲) بحروم میں نکلنے کے لیے ایک آزاد اور محفوظ راستہ حاصل کرنا (۳) باب عالی سے اس امر کو تسلیم کرا لینا کہ روس کو دولت علیہ کی عیسائی رعایا کے سیاسی اور مذہبی حقوق کی نگہداشت کا حق حاصل ہے، وفاقاً و قافراً ماں روایان روس خصوصاً زارینہ کی تھرائن خود سلطنت عثمانیہ کی تقسیم اور قسطنطنیہ پر قبضہ کرنے کا خواب بھی دیکھتے آئے تھے، صلح نامہ پیرس نے نہ صرف اس خواب کو پریشان کر دیا بلکہ ان مذکورہ بالا منصوبوں کی راہ میں بھی سخت رکاوٹیں پیدا کر دیں جو پیٹر اعظم کے زمانہ سے الگز نڈر ثانی کے عہد تک حکومت روس کے اہم ترین مقاصد تھے۔

تاہم یہ رکاوٹیں زیادہ دنوں تک قائم نہ رہیں، ۱۸۷۰ء میں روس نے صلح نامہ پیرس کی خلاف ورزی کا اعلان کرتے ہوئے بحر اسود میں جنگی جہازوں کے ذریعہ اپنا تسلط پھر قیام کر لیا اور ۱۸۷۸ء میں بسرائیہ کا وہ علاقہ جو ۱۸۵۶ء میں اس سے لے کر مولڈویو یا میں شامل کر دیا گیا تھا واپس لے لیا، اس وقت دولِ عظمیٰ میں سے کسی نے بھی صلح نامہ پیرس کی پروا نہ کی، جس کے رو سے متفقہ طور پر انھوں نے سلطنت عثمانیہ کی سالمیت کی ضمانت کی تھی۔

صلح نامہ پیرس میں دولِ عظمیٰ نے دو باتوں پر خاص طور سے زور دیا تھا، ایک تو یہ کہ سلطنت عثمانیہ کی آزادی اور اس کے مقبوضات کی سالمیت کا تحفظ کیا جائے گا، دوسری یہ کہ اس کے اندرونی معاملات میں مطلق مداخلت نہ کی جائے گی لیکن بعد کے واقعات نے ظاہر کر دیا کہ یہی دو چیزیں تھیں جن کی خلاف ورزی صلح نامہ کے بعد سب سے پہلے کی گئی، بادی النظر میں یورپین حکومتوں کا روس کے جارحانہ اقدام کے خلاف متحدہ ہو جانا دولت عثمانیہ کی حمایت اور ہمدردی پر مبنی معلوم ہوتا ہے لیکن حقیقت یہ تھی کہ روس کی بڑھتی ہوئی قوت خود ان کے مفاد کے لیے خطرناک ثابت ہو رہی تھی اور اسے قابو میں رکھنا ضروری تھا، چنانچہ جنگ کا خاتمہ جب ان کے حسبِ دلخواہ ہو گیا تو وہ طلسم بھی ٹوٹنا شروع ہوا جس کا ڈھانچہ صلح نامہ پیرس کی نظر فریب دفعات پر کھڑا کیا گیا تھا، مولڈویو اور ولاچیا

کی ریاستوں میں اتحاد و استقلال کی تحریک پیدا کی گئی اور ۱۸۵۸ء میں دول یورپ کے زیر حمایت الکنڈر کوزا (Alexander Couza) ان متحدہ ریاستوں کا پہلا امیر منتخب ہوا، باب عالی نے نزاع کو ختم کر دینے کی غرض سے اس اتحاد و انتخاب کو تسلیم کر لیا، اس کے بعد کریٹ، سرویا، مونٹی نگرو، بوسنیا، ہرزیگووینا اور بلغاریا میں بغاوت کی شورشیں برپا ہوئیں، ان سب علاقوں کو ان حکومتوں میں سے جنہوں نے صلح نامہ پیرس پر دستخط کیے تھے کسی نہ کسی کی حمایت حاصل تھی، چنانچہ دولت علیہ کے مقبوضات کی حفاظت کا جو عہد کیا گیا تھا وہ ان شورشوں کے ذریعہ پورا کیا گیا، اس کے اندرونی معاملات میں مداخلت نہ کرنے کا وعدہ یوں وفا ہوا کہ ان بغاوتوں کے فرو کرنے کی غرض سے جب عثمانی فوجیں روانہ کی جانے لگیں تو یورپین حکومتوں نے انہیں روکنے کی کوشش کی، جیسا کہ فرانس، روس نے ۱۸۵۸ء میں اپنے جہاز مونٹی نگرو کے ساحل پر بھیجے تاکہ عثمانی فوجوں کو اس علاقہ میں داخل ہونے سے روکیں، دول عظمیٰ نے متفقہ طور پر سلطنت عثمانیہ کے استقلال و تحفظ کی ضمانت کی تھی لیکن استقلال و تحفظ ہی کا عذر پیش کر کے انہوں نے اس کے تقریباً تمام یورپین مقبوضات اس سے علاحدہ کر دئے، انہوں نے دولت عثمانیہ کو مجلس دول یورپ کا رکن بنا لیا تھا، لیکن رکنیت کے اس اعزاز سے دولت علیہ کو صرف یہ حاصل ہوا کہ اس کے اندرونی معاملات میں یورپین حکومتوں کی مداخلت روز بروز زیادہ ہوتی گئی اور اس کے لیے مصیبتوں کا ایک نیا سلسلہ شروع ہو گیا۔

مختلف شورشیں کریٹ: صلح نامہ پیرس کے بعد سلطان عبدالحمید کی وفات تک کسی غیر حکومت سے جنگ کی نوبت نہیں آئی لیکن سفرائے یورپ کی مداخلت کے باعث سلطنت کے مختلف حصوں میں شورشیں برپا ہوتی رہیں، چنانچہ ۱۸۵۸ء میں کریٹ کے یونانیوں نے علم بغاوت بلند کیا، یہ فتنہ وقتی طور پر رفع کر دیا گیا، لیکن ۱۸۶۶ء میں سلطان عبدالعزیز کے دور حکومت میں زیادہ قوت کے ساتھ پھر ابھر اور اب کی بار حکومت خود اختیاری کے حریص حقوق دے کر باغیوں کو راضی کرنا پڑا۔

جدہ پر گولہ باری: جولائی ۱۸۵۸ء میں جدہ کے عیسائیوں اور مسلمانوں میں جھگڑا ہوا چند مسلمانوں نے فرانسیسی قنصل اور اس کے اسٹاف پر حملہ کر دیا، جس میں قنصل اور اس کا سکرٹری مجروح ہوئے اور قنصل کی بیوی ماری گئی، فوراً ہی انگریزی اور فرانسیسی بیڑے قسطنطنیہ پہنچے، باب عالی نے اطمینان دلایا کہ مجرموں کو کافی سزا دی جائے گی لیکن چونکہ سزائیں کچھ تاخیر ہوئی اس لیے انگریزی بیڑے نے جدہ پہنچ کر نامق پاشا والی مکہ سے جو جدہ آگئے تھے اور انھوں نے مجرموں کو گرفتار کر لیا تھا، مطالبہ کیا کہ مجرموں کو فوراً پھانسی دے دی جائے ورنہ چوبیس گھنٹوں کے بعد گولہ باری شروع کر دی جائے گی، نامق پاشا کو باب عالی کے حکم کا انتظار تھا، اس لیے انھوں نے فوراً پھانسی دینے میں تامل کیا، اسپر انگریزی بیڑے نے گولہ باری شروع کر دی، اس اثنا میں اسماعیل پاشا عثمانی بیڑے کے ساتھ جدہ پہنچ گئے، انھوں نے گولہ باری بند کر کے مجرموں کی پھانسی کا حکم سنایا، اگر اسماعیل پاشا کا بیڑا وقت پر نہ پہنچ گیا ہوتا تو جدہ تباہ ہو جاتا اور برطانیہ سے باقاعدہ جنگ چھڑ جاتی۔

قتلہ لبنان: ۱۸۶۰ء میں شام میں ایک نیا فتنہ کھڑا ہوا جس کی وجہ سے یورپین حکومتوں کو مداخلت کا ایک اور موقع ہاتھ آیا، لبنان میں دروزی اور مارونی دونوں قتلے زیادہ اقتدار رکھتے تھے، دروزی مسلمان اور مارونی کیتھولک عیسائی تھے، شورش کی ابتدا مارونی کسانوں کی طرف سے ہوئی جو اپنے ہم مذہب جاگیرداروں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے تھے، چونکہ یہ بغاوت حقیقتاً نظام جاگیری کے خلاف تھی اس لیے دروزی شیوخ نے بھی شروع میں مارونی جاگیرداروں کا ساتھ دیا مگر چند دنوں کے بعد پادریوں کے بھڑکانے سے اس شورش نے مذہبی رنگ اختیار کر لیا اور نہایت تیزی سے شام کے اکثر حصوں میں پھیل گئی، خصوصاً لبنان میں اس کے شعلے ہر طرف بھڑک اٹھے، رونیوں نے حتی الامکان قتل و غارت کا کوئی دقیقہ اٹھانہ رکھا، لیکن چونکہ دروزی نسبتاً زیادہ طاقتور تھے اس لیے بالآخر غلبہ انہی کو حاصل ہوا اور انتقام کے جوش میں انھوں نے ہزاروں عیسائیوں کو قتل کر

کر ڈالا، اس میں شبہ نہیں کہ مقامی ترک دستوں نے دروزیوں کے روکنے میں سخت غفلت برتی ورنہ قتل و غارت کے وہ واقعات پیش نہ آتے جو بقول ایک عیسائی مورخ کے سلطنت عثمانیہ اور اسلام دونوں کے لیے باعث ننگ تھے، دمشق میں عیسائیوں کا قتل سب سے زیادہ ہوا، برطانوی قنصل کا بیان ہے کہ ساڑھے پانچ ہزار سے کم ہلاک نہیں ہوئے، اس موقع پر امیر عبدالقادر الجزائری (۱) نے عیسائیوں کو جو مدد کی اس کا اندازہ فرانسیسی مورخ ولاٹرون کیئر کے مندرجہ ذیل بیان سے ہوتا ہے:

”دمشق میں اگر عبدالقادر نہ ہوتا تو ایک عیسائی کی بھی صورت نہ دکھائی دیتی، یہ عرب بہادر جس نے سولہ سال تک فرانسیسیوں سے نہایت بے دردی سے جنگ کی تھی دمشق میں تنہائی کی زندگی بسر کر رہا تھا، آگ کے شعلے پہلی ہی دفعہ بھڑکے تھے اور درماندوں کی صدا پہلی ہی دفعہ بلند ہوئی تھی کہ اس نے بلا کسی پس و پیش کے عیسائیوں اور ان کے قاتلوں کے درمیان آپ کو ڈال دیا، ایک چھوٹی

(۱) ۱۸۳۰ء میں جب فرانس نے الجزائر پر قبضہ کیا تو امیر عبدالقادر مسلسل سترہ برس تک وطن کی آزادی کے لیے لڑتے رہے، انھوں نے متعدد معرکوں میں فرانسیسی فوج کو سخت شکست دی، ان کی جہاں بازی اور حیرت انگیز شجاعت کا اعتراف خود اہل فرانس نے کیا ہے، آخر کار جب ان کے سپاہیوں کی بڑی تعداد شہید ہو گئی اور غنیم کی فوج میں اضافہ ہوتا گیا تو انھوں نے یہ دیکھ کر کہ زیادہ مدافعت بے سود ہوگی اور حکومت فرانس کے اس وعدہ پر اعتماد کر کے کہ ان سے مطلق تعرض نہ کیا جائے گا بلکہ انھیں اجازت ہوگی کہ جہاں چاہیں چلے جائیں، ۲۳ دسمبر ۱۸۳۷ء کو ہتھیار ڈال دئے، لیکن نیپولین ثالث نے یہ وعدہ پورا نہ کیا، برخلاف اس کے انھیں قید کر دیا اور بارہ برس تک قید میں رکھا، بالآخر اس شرط پر کہ وہ الجزائر کو واپس نہ ہو جائیں گے، اس نے انھیں رہا کر دیا اور ایک لاکھ فرانک سالانہ وظیفہ ان کے لیے مقرر کر دیا، چنانچہ وہ ہجرت کر کے پہلے بروصہ گئے اور پھر وہاں سے دمشق آکر مقیم ہو گئے اور وہیں ۱۸۸۳ء میں ان کا انتقال ہوا۔

سی فوج کے ساتھ اس نے عیسائیوں کو عوام الناس سے چھڑایا اور اپنا محل انھیں رہنے کو دیا، جو ہزار سے آگے پناہ لینے لگے اور عیسائیوں کے سکونتی مقام پر عرب سواروں کی پہرہ بندی کر دی، اس شخص نے جو مسلمان اور اولاد پیغمبر اسلام تھا اور فرانس کا قدیم دشمن تھا، ایک سے زیادہ مرتبہ اپنی جان کو خطرہ میں ڈال کر ان خوں خوار ٹوٹیوں کو پسپا کیا جو اسلام اور ترکی کے لیے باعث ننگ تھیں، اس نے اسی پر اکتفا نہیں کی بلکہ ان بدقسمتوں پر پوشاک کے لیے بے دریغ روپیہ خرچ کیا جنھیں اس نے موت کے پنجے سے رہائی دی تھی، اس نے خود اپنی نگرانی میں عیسائی محافظین کو بیروت پہنچایا جہاں انھیں کسی قسم کا خطرہ نہ تھا، اس کا یہ ایثار، اس کی یہ شرافت اور اس کی یہ شریفانہ بہادری ایک لمحہ کے لیے بھی کم نہ ہوئی، اس کی زندگی کا یہ صفحہ ایسا شاندار ہے جس کے آگے ایک صدی کا کارنامہ بھی مدہم پڑ جاتا ہے۔“ (۱)

یہ واقعہ سن کر مسیحی یورپ کے ہر گوشہ سے صدائے احتجاج بلند ہونے لگی، فرانس کی تھوٹک مارونیوں کا خاص حامی تھا، اس نے ان کی مدد کے لیے ایک فوج شام میں بھیجی چاہی، اس اندیشہ سے کہ مبادا فرانس شام میں اپنا تسلط قائم کر لے پہلے تو برطانیہ اور دوسری حکومتوں نے یہ تجویز منظور نہ کی مگر آخر کار ۳۱ اگست ۱۸۲۰ء کو سارڈینا کے علاوہ ان تمام مغربی حکومتوں نے جنھوں نے صلح نامہ پیرس پر دستخط کیے تھے پیرس ہی میں یہ طے کیا کہ بارہ ہزار یورپین فوج شام میں امن قائم کرنے کی غرض سے روانہ کی جائے، چنانچہ فرانس نے فوراً اچھ ہزار فوج روانہ کی، لیکن اس فوج کے شام پہنچنے سے قبل فواد پاشا وزیر خارجہ، سلطان کے حکم سے وہاں پہنچ کر اس شورش کو رفع کر چکے تھے، ان کے حکم سے عثمانی فوج کے ایک سو گیارہ سپاہی گولی سے مارے گئے، ستاون بڑے بڑے دروزی

پھانسی پر لٹکائے گئے اور خود احمد پاشا والی دمشق کو قتل کی سزا دی گئی، اس کے بعد بیروت میں ایک بین الاقوامی کمیشن بیٹھا جس کے فیصلہ کے مطابق سیکڑوں دروزی جلاوطن کر کے طرابلس (افریقہ) بغداد اور دین بھیج دئے گئے، خورشید پاشا حاکم بیروت کو موت کی سزا تجویز ہوئی لیکن بعد میں ان کو معزول کر کے قسطنطنیہ بلا لیا گیا، عیسائیوں کے نقصانات کی تلافی کے لیے سات کروڑ پچاس لاکھ قرش (۱) کی رقم باب عالی کی طرف سے منظور ہوئی جو بہ اقساط ادا کر دی گئی، لبنان کی آئندہ حکومت کے متعلق کمیشن نے یہ فیصلہ کیا کہ اسے دولت عثمانیہ کے زیر سیادت خود مختار کر دیا جائے اور اس کے وان کا تقرر سلطان کی عیسائی رعایا میں سے باب عالی کی طرف سے ہوا کرے، ۵/ جون ۱۸۶۱ء کو فرانسیمی فوج شام سے روانہ ہوئی جس نے یہ فوج بھیجی گئی تھی، وہ فواد پاشا کے دمشق پہنچنے کے بعد ہی پوری ہو چکی تھی، اسے نو ماہ تک شام میں قیام کرنے کی ضرورت نہ تھی لیکن دوں عظمیٰ نے دولت عثمانیہ کی حمایت کا جو بیان صلح نامہ پیرس میں باندھا تھا اس کا تقاضا یہی تھا کہ اس کے ملکی انتظامات میں مداخلت کرنے کے لیے محض نیک مشوروں پر قناعت نہ کی جائے بلکہ حسب ضرورت فوجی مدد بھی پہنچائی جائے۔

سلطان کی وفات: ۱۷/ ارزی الحجہ ۱۲۷۷ھ مطابق ۲۵/ جون ۱۸۶۱ء کو سلطان عبدالحمید نے وفات پائی اور اس کا بھائی عبدالعزیز تخت نشین ہوا۔

اس عہد کی خصوصیت: عبدالحمید کا عہد حکومت دولت عثمانیہ کی تاریخ میں ایک ممتاز حیثیت رکھتا ہے، اس عہد میں ان اصلاحات پر عمل درآمد شروع ہوا جن کا خاکہ محمود ثانی نے تیار کیا تھا اور جو اس کی وفات کے بعد مرتب ہو کر تنظیمات کے نام سے مشہور ہوئیں، تنظیمات جدید ترکی کا سنگ بنیاد ہیں، یہ صحیح ہیں کہ عبدالحمید کے زمانہ میں وہ پوری طرح نافذ نہ ہو سکیں تاہم جیسا کہ خالدہ ادیب خانم نے لکھا ہے: ”ان کا جتنا حصہ ہزار ہا مشکلات کے باوجود عمل میں آیا گیا وہ بھی کچھ کم نہ تھا، ان پر چہ جتنے اعتراضات کیے (۱) قرش یا غرش ایک ترکی سکہ جو دینیس سے لے کر چھ پنس تک کا ہوتا ہے۔

جائیں مگر یہ ضرور تسلیم کرنا پڑے گا کہ ان سے ایک نہایت اہم نتیجہ برآمد ہوا یعنی جدید ترکی کی بنیاد قائم ہو گئی، انھوں نے ترکوں کی قوم کو اس قابل کر دیا کہ وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور ساری دنیا کی مخالفت کے باوجود مسمر شدہ سلطنت کی بنیادوں پر ایک نئی عمارت بنا کر رہے۔“ (۱)

عبدالحمید کے عہد کی ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی ہے کہ ترکوں میں پہلی مرتبہ اصلاحات کی جانب میلان ظاہر ہوا، محمود کے زمانہ میں جو کچھ اصلاحات ہوئی تھیں وہ حکومت نے کی تھیں، نہ صرف یہ کہ جمہور نے ان اصلاحات کو پسند نہیں کیا بلکہ ان کی مخالفت کی اور سلطنت کے مختلف حصوں میں بغاوتیں برپا ہو گئیں، برخلاف اس کے عبدالحمید نے جب تنظیمات کا اعلان کیا تو ترکوں کے ہر طبقہ نے مسرت ظاہر کی، ان کے اندر یہ تبدیلی عام درگاہوں سے زیادہ قومی ادب کے اثر سے پیدا ہوئی تھی، جس کا ذکر آئندہ صفحات میں آئے گا۔

سلطان عبدالعزیز

۱۲۷۷ھ تا ۱۲۹۳ھ مطابق ۱۸۶۱ء تا ۱۸۷۶ء

سلطان عبدالجید کی وفات پر اس کا بھائی عبدالعزیز تخت نشین ہوا، عنان حکومت کو ہاتھ میں لینے کے بعد سلطان عبدالعزیز نے ایک فرمان کے ذریعہ ان اصلاحات کی تکمیل کا وعدہ کیا جو محمود ثانی اور عبدالجید نے شروع کی تھیں، چنانچہ اس نے حکومت کے نظم و نسق میں مفید اصلاحات جاری کیں، نہریں اور سرزمینیں تعمیر کرائیں، زراعت اور معدنیات کو ترقی دی، ابتدائی اور ثانوی تعلیم کا ایک جدید نظام قائم کیا جو مذہبی نظام تعلیم سے آزاد تھا، یہ جدید مدارس ہر فرقہ کے طلبہ کے لیے یکساں طور پر کھلے ہوئے تھے، اس نے ایک عدالت عالیہ بھی قائم کی جس میں عیسائی اور مسلمان ججوں کی تعداد برابر تھی اور ۱۸۶۸ء میں حکومت کے انتظام کے لیے ایک کونسل آف اسٹیٹ (مجلسِ نظمیہ) قائم کی، اس مجلس کو قانون سازی اور انتظام دونوں کے اختیارات حاصل تھے اور اس کے ارکان میں عیسائی اور مسلمان دونوں شامل تھے، مدحت پاشا جو اپنے تدبیر، اپنی روشن خیالی اور اپنے مضبوط اخلاق کی وجہ سے ایک ممتاز حیثیت رکھتے تھے اس کے صدر مقرر ہوئے، ۱۸۶۰ء میں ایک 'ضابطہ فوجداری' (Penal Code) اور ۱۸۵۰ء میں 'ضابطہ تجارت' (Commercial Code) مرتب ہو چکا تھا، یہ دونوں فرانسیسی ضابطہ قوانین سے اخذ تھے، ۱۸۷۲ء میں ایک جدید 'ضابطہ دیوانی' مسمیٰ بہ 'مجلہ نافذ کیا گیا جس میں قانون

شریعت کو زمانہ حال کی ضروریات کے مطابق مدون کرنے کی کوشش کی گئی، سلطان عبدالعزیز کے عہد تک غیر ملکی باشندوں کو سلطنت عثمانیہ میں اراضیات پر مالکانہ قبضہ حاصل کرنے کا حق نہ تھا، ۱۸ جون ۱۸۶۷ء کو ایک قانون نافذ ہوا جس کی رو سے پہلی بار انھیں سلطنت کے ہر حصہ میں علاوہ حجاز کے یہ حق دیا گیا لیکن اس حق کے ساتھ یہ شرط بھی تھی کہ ان جائیدادوں کے متعلق ہر معاملہ میں انھیں سلطنت عثمانیہ کے ملکی قوانین کا پابند ہونا پڑے گا اور اپنے ملک کے قوانین سے دست بردار ہونا پڑے گا، سب سے زیادہ اہم مسئلہ جو ابتدا ہی میں عبدالعزیز کے ساتھ آیا مالیات کا تھا، سلطنت کے اخراجات آمدنی سے بہت زیادہ تھے اور قرضوں کا بار بڑھتا جا رہا تھا، عبدالعزیز نے سلطنت کے مصارف میں جو زیادہ تر بدانتظامی کا نتیجہ تھے حتی الامکان کمی کرنے کی کوشش کی اور اپنے ذاتی اخراجات میں بھی بہت کچھ تخفیف کردی لیکن بیرونی حکومتوں کا قرض اتنا زیادہ ہو گیا تھا کہ سلطنت کی آمدنی کا ایک بڑا حصہ سود میں چلا جاتا تھا اور میزانیہ کا توازن کسی طرح درست نہیں ہوتا تھا۔

مالی اصلاحات کی کوشش: بہرہ بین حکومتوں سے قرض لینے کا سلسلہ سلطان عبدالحمید ہی کے وقت سے شروع ہو گیا تھا، اس کی ابتدا یوں ہوئی کہ جب یونان نے آزادی حاصل کرنے کے لیے علم بغاوت بلند کیا اور عیسائی حکومتیں اس کی مدد کے لیے کھڑی ہوئی تو سلطنت عثمانیہ کو نئے سرے سے جنگی سامان اور جہازوں کی تعمیر کی ضرورت پیش آئی چونکہ خزانہ میں کافی روپیہ موجود نہ تھا، اس لیے سلطان محمود ثانی نے ہنڈیاں جاری کی اور ۱۸۳۰ء میں پہلی بار تیس ہزار کیسہ کی ہنڈیاں آٹھ فی صدی سالانہ سود پر آٹھ سال کے لیے جاری کی گئیں لیکن شام اور مصر کی جنگوں کی وجہ سے یہ قرض معینہ مدت میں ادا نہ ہو سکا اور اس کے بدلہ میں قرض خواہوں کو دوسری ہنڈیاں دے دی گئیں، جنگ کے مصارف اور سلطنت کے اخراجات اتنے بڑھے ہوئے تھے کہ یہ دوسری ہنڈیاں بھی ادا نہ ہو سکیں، جب سلطان عبدالحمید تخت پر آیا تو اس نے مالیات کو درست کرنے کی کوشش کی

لیکن جنگ کریمیا کے کثیر مصارف کے باعث وہ مالی اصلاحات میں کامیاب نہ ہو سکا اور نہ صرف یہ کہ ملکی ہنڈیاں کے ادا کرنے کی صورت پیدا نہ ہوئی بلکہ جنگی اخراجات کو پورا کرنے کے لیے اسے مجبوراً بعض یورپین حکومتوں سے قرض لینا پڑا، علاوہ بریس اندرون ملک میں بھی ہنڈیوں کا سلسلہ برابر جاری رہا، ملکی اور بیرونی قرضوں کا بار سلطنت پر زیادہ ہوتا جاتا تھا، یہاں تک کہ ۱۸۶۱ء میں سلطان عبدالعزیز تخت نشین ہوا اور اس نے فواد پاشا کو صدر اعظم مقرر کر کے جنوری ۱۸۶۲ء میں مالیہ اور میزانیہ (بجٹ) کا انتظام اس کے سپرد کیا، پھر اسی سال جون میں سلطان نے فواد پاشا کے نام ایک دوسرا فرمان جاری کیا کہ ہنڈیوں کے تمام قرضے ادا کر دئے جائیں، اس طرح کہ چالیس فی صدی رقم سونے چاندی کے سکوں میں ادا کر دی جائے اور بقیہ ساٹھ فی صدی کے لیے نئی ہنڈیاں دے دی جائیں، اس کے لیے باب عالی نے اسی لاکھ انگریزی پونڈ قرض لیے اور جب یہ رقم بھی کافی نہ ہوئی تو عثمانی بینک کے ذریعہ اسی لاکھ اور قرض لیے، چوں کہ ملکی اصلاحات کا کام جاری تھا اور اس کی وجہ سے خزانہ پر زیادہ بار پڑ رہا تھا، اس لیے اب ان بڑھتے ہوئے قرضوں کا سالانہ سود ادا کرنا بھی ناممکن ہو گیا، سلطان نے حکومت کے بر شعبہ میں تخفیف کا حکم جاری کیا، یہاں تک کہ اپنے ذاتی مصارف بھی بہت کم کر دئے، ان تدبیروں سے اتنی گنجائش ہوئی کہ مصطفیٰ فاضل پاشا ناظر مال سالانہ سود ادا کر سکا لیکن اس کے بعد ہی مالیات کے متعلق صدر اعظم فواد پاشا سے اختلاف رائے کی وجہ سے مصطفیٰ فاضل پاشا کو مستعفی ہو جانا پڑا اور اس کی جگہ کافی پاشا ناظر مال مقرر ہوا، کافی پاشا اور فواد پاشا نے تمام قرضوں کے لیے نئے تمسکات جاری کرنے کا فیصلہ کیا، سلطان نے اس قرارداد کے مطابق ایک فرمان جاری کیا اور چار کروڑ عثمانی گنی کے تمسکات جاری کیے گئے لیکن جب سود ادا کرنے کا وقت آیا تو خزانہ بالکل خالی تھا، اس لیے حکومت پھر مجبور ہوئی کہ نئے حصے عثمانی بینک کے ذریعہ سے پیرس اور لندن میں فروخت کرے، چنانچہ ۱۸۶۵ء میں عثمانی بینک نے بارہ فیصدی نفع پر لندن اور پیرس میں

حصے فروخت کرنا شروع کیے لیکن چونکہ حکومت کی ساکھ قہیم نہیں رہ گئی تھی، اس لیے بہت کم لوگوں نے حصے خریدے اور صرف اسی قدر رقم فراہم ہو سکی کہ اس سے ضروری سودا کر دیا گیا، اس ناکامی کو بعض اہل غرض نے فواد پاشا کی مالی بدانتظامی کے ثبوت میں سلطان کے سامنے پیش کیا، چنانچہ سلطان نے فواد پاشا کو معزول کر کے ۴ جون ۱۸۶۶ء کو محمد رشدی پاشا کو صدر اعظم مقرر کیا، رشدی پاشا نے دو بارہ کوشش کی کہ ایک بڑی رقم قرض لے کر تمام موجودہ قرضوں کو ادا کر دیں مگر کامیابی نہیں ہوئی، اس کے بعد رشدی پاشا نے عثمانی بنک سے یہ معاملہ کیا کہ بنک سلطنت کے بعض خاص قرضوں کا سود ہر تیسرے مہینہ ادا کرتا رہے اور اس کے معاوضہ میں سلطنت کی بعض متعین مدینیاں بنک کو ملتی رہیں، اس طرح سود رفتہ رفتہ ادا ہونے لگا اور سلطنت دیوالیہ ہونے سے بچ گئی، اس کے بعد بغیر نئے حصے کھولے ہوئے حکومت اپنی ضروریات کے لیے بنکوں سے قرض لینے لگی۔ (۱)

سیاسی فتنے، رومانیا: جب سلطنت کی مالی حالت رو بہ اصلاح ہونے لگی تو سیاسی فتنے اٹھ کھڑے ہوئے، ۱۸۶۷ء میں ولچیا اور مولڈوویا کی ولایتوں نے باضابطہ طور پر متحد ہو کر رومانیا کی ریاست قائم کر لی اور ۱۸۶۸ء میں جرمن شہزادہ چارلس کو اس نئی ریاست کا فرماں روا منتخب کیا، یہ کارروائی 'صلح نامہ پیرس' کے مخالف تھی، لارڈ ایورسلے لکھتا ہے کہ دولِ عظمیٰ کو اس بات کی فکر تھی کہ حتی الامکان باب عالی کو آویزش سے بچایا جائے، اس لیے ان کے سفیروں نے سلطان پر دباؤ ڈال کر شہزادہ چارلس کو اس نئی ریاست کا موروثی فرماں روا تسلیم کرایا (۲) دولِ عظمیٰ کی یہ خیر اندیشی کوئی نئی چیز نہ تھی، باب عالی کو اس کا تجربہ اس وقت سے ہوتا آیا تھا جب سے دولتِ علیہ کا زوال شروع ہوا، جوں جوں سلطنت کمزور ہوتی گئی یورپین سلطنتوں کی درمندی میں بھی اضافہ ہوتا گیا، رومانیا پر اگرچہ سلطان کی فرماں روا کی نام کے لیے باقی رہی تاہم عملاً وہ گویا آزاد ہو گیا، شہزادہ

چارلس چونکہ پرشا کے شاہی حکمران خاندان کا ایک فرد تھا اس لیے اس کا انتخاب رومانیہ کی آزادی کا بڑی حد تک ضامن تھا۔

سرویہ کا استقلال: سلطنت عثمانیہ سے متعلق دولِ عظمیٰ کی یہی خیر اندیشی سرویہ کے معاملہ میں بھی ظاہر ہوئی، صلح نامہ پیرس کے رو سے دولتِ علیہ کو بلغراد اور سرویہ کے تین دوسرے قلعوں میں فوجی دستے رکھنے کا حق حاصل تھا، سرویہ میں ترکوں کی گزشتہ حکومت کا اتنا ہی نشان اور باقی رہ گیا تھا لیکن دولِ عظمیٰ کی سرپرستی میں اہل سرویہ نے اس نشان کو بھی منادینے کا فیصلہ کر لیا اور بابِ عالی سے مطالبہ کیا کہ وہ اپنی فوجیں ان قلعوں سے نکال لے، بابِ عالی نے معاہدہ پیرس کی بنا پر انکار کیا اور سرویہ کو جنگ کی دھمکی دی، لیکن چونکہ اسی زمانہ میں جزیرہ کریٹ میں بغاوت برپا تھی اور بابِ عالی کی ساری توجہ اس کی طرف مبذول تھی اس لیے دولِ عظمیٰ کے سفیروں کا دوستانہ مشورہ قبول ہی کرنا پڑا اور مارچ ۱۸۶۷ء میں ترکی فوجیں بلغراد اور دوسرے سروی قلعوں سے واپس بلا لی گئیں، اب سرویہ کا استقلال مکمل ہو گیا اور اس کے امیر نے بادشاہ کا لقب اختیار کر لیا۔

کریٹ کی بغاوت: کریٹ کی بغاوت یونان کی ریشہ دوانیوں کا نتیجہ تھی، یونان اس جزیرہ کو اپنے میں شامل کر لینا چاہتا تھا اور اس غرض سے وہاں کے عیسائیوں کو جو زیادہ تر یونانی نسل کے تھے دولتِ عثمانیہ کے خلاف برابر ابھرتا رہتا تھا، جب بغاوت کی شورش زیادہ ہوئی تو اسماعیل پاشا، خدیو مصر نے بھی اپنی فوجیں دولتِ علیہ کی مدد کے لیے کریٹ میں بھیجیں اور مصری فوجوں نے ارکاویون کے معرکہ میں بڑی شجاعت دکھائی، اس درمیان میں بابِ عالی نے کریڈلی محمد پاشا کو اپنے نمائندے کے طور پر باغیوں سے گفتگو کرنے کے لیے کریٹ روانہ کیا، لیکن چونکہ محمد پاشا اس سے پہلے کریٹ کا اہل رہ چکا تھا اور لوگ اس سے بیزار تھے اس لیے گفتگو کامیاب نہیں رہی، ۱۸۶۷ء میں رستم پاشا صدارت سے الگ کیے گئے اور ان کی جگہ محمد امین عالی پاشا دوسری بار صدرِ اعظم مقرر ہوئے اور نوادہ پاشا سابق صدرِ اعظم وزیرِ خارجہ بنائے گئے، انھوں نے پہلا کام یہ کیا کہ کریڈلی

محمد پاشا کو کریٹ سے واپس بلا لیا اور ان کی جگہ عمر پاشا بطل کریمیا کو وہاں کا حاکم اور سر عسکر بنا کر بھیجا، عمر پاشا کو بغوت کے فرو کرنے میں بڑی حد تک کامیابی ہوئی، قریب تھا کہ وہ اس فتنہ کو پوری طرح دبا دیتے، لیکن عین اسی وقت دولِ عظمیٰ نے مداخلت کی اور عمر پاشا کو اپنا ہاتھ روک لینا پڑا، اکتوبر ۱۸۶۷ء میں باب عالی نے صدر اعظم عالی پاشا کو بھیجا کہ پنجم خود کریٹ کے حالات کا معائنہ کریں، عالی پاشا نے اہل جزیرہ کو حکومت کے عہدے اور منصب دے کر ان کی تسکین خاطر کی پوری کوشش کی لیکن باغیوں کا اصل مقصد یونان سے کریٹ کا الحاق تھا، اس لیے عالی پاشا کی کوششیں کامیاب نہ ہو سکیں، آخر کار ۱۸۶۹ء میں دولِ عظمیٰ کی تجویز سے ایک کانفرنس پیرس میں منعقد کی گئی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سلطان کی طرف سے ایک فرمان جاری کیا گیا جس کے رو سے کریٹ کو حکومت خود اختیاری کے بعض حقوق دے دئے گئے اور دوسرے کا خراج جو واجب الادا تھا معاف کر دیا گیا، نیز اہل جزیرہ فوجی خدمت سے بری کر دئے گئے (۱) اس طرح یہ بغاوت کچھ دنوں کے لیے فرو ہو گئی۔

معاهدہ پیرس کی خلاف ورزی: ۱۸۷۰ء میں باب عالی کو دولِ عظمیٰ کی دوستی کا ایک اور تجربہ ہوا، صبح نامہ پیرس (۱۸۵۶ء) کی ایک دفعہ کے رو سے بحر اسود میں روس اور ترکی کے جنگی جہازوں کا داخلہ ممنوع قرار دیا گیا تھا اور ان دونوں حکومتوں کو اس کے سہولوں پر بحری اسلحہ خانے قائم کرنے کی ممانعت کر دی گئی تھی، لیکن جب ۱۸۷۰ء میں فرانس اور جرمنی کی جنگ شروع ہوئی تو روس نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر یہ پابندی تو زدی نی چاہی اور ۳۱ اکتوبر ۱۸۷۰ء کو مذکورہ بالا دفعہ کی شکست کا اعلان کر دیا، جرمنی کے وزیر اعظم پرنس بسمارک نے اس جنگ میں روس کی غیر جانبداری سی قیمت پر حاصل کی تھی کہ ”معاهدہ پیرس“ کی اس خلاف ورزی میں جرمنی روس کی تائید کرے گا۔ (۲)

فرانس خود اپنی مصیبت میں مبتلا تھا، وہ روس کو برا بھینٹہ کرنے کے لیے کسی

طرح تیار نہ تھا، برطانیہ کی عنان حکومت مسٹر گلڈسٹن کے ہاتھ میں تھی جنہوں نے اپنی زندگی کا مقصد ہی یہ قرار دے رکھا تھا کہ ترکوں کو یورپ سے نکال کر سلطنت عثمانیہ کے ٹکڑے ٹکڑے کر دئے جائیں، چنانچہ برطانیہ نے بھی روس کے اس فعل کے خلاف مطلق احتجاج نہیں کیا اور روس نے بحر اسود پر اپنا تسلط پھر قائم کر لیا۔

بلغاریا کا قومی کلیسا: ۱۸۷۰ء میں ایک اور نہایت اہم واقعہ پیش آیا، جس نے مسند مشرقی کو آئندہ کے لیے زیادہ پیچیدہ بنا دیا، اس وقت تک مملکت یونان اور رومانیہ، سربوہ اور مونٹی نگرو (جبل اسود) کی سرحدوں کے باہر بلقان کی عیسائی آبادی بجائے نسل کے مذہب کے لحاظ سے منقسم تھی، جنوبی مشرقی یورپ کی تمام عیسائی رمایا جو سلطنت عثمانیہ کے زیر فرمان تھی خواہ کسی نسل و قوم سے تعلق رکھتی ہو یونانی کلیسا کے ماتحت تھی اور اسی وجہ سے یونانی سمجھی جاتی تھی (۱) چنانچہ ریاستہائے بلقان کی سلاوی قوموں مثلاً بلغاری اور ہوس کا شمار بھی یونانیوں ہی میں ہوتا تھا لیکن کچھ عرصہ سے اہل بلغاریا میں نسلی اور وطنی احساس ترقی کر رہا تھا اور اب وہ اپنا مستقل قومی کلیسا قائم کرنے کا عزم کر رہے تھے، یونانی کلیسا کے بطریق اعظم کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو اس نے اہل بلغاریا کو کچھ مخصوص مراعات دے کر راضی کرنے کی کوشش کی، لیکن ان کی برگشتگی یہاں تک بڑھ چکی تھی کہ وہ یونانی کلیسا کی وجہ سے ارتقو کس مذہب ہی کو ترک کرنے پر آمادہ نظر آتے تھے اور بجائے اس کے رومن کیتھولک مذہب قبول کرنے پر تیار تھے، چنانچہ انہوں نے اس کے متعلق پوپ سے گفتگوئی شروع کر دی (۲) لیکن اس موقع پر روس نے ان کی مدد کی اور وعدہ کیا کہ باب عالی پر اثر ڈال کر بلغاریا کے لیے ایک مستقل کلیسا قائم کرنے کی اجازت حاصل کر لے گا، جنرل اگنائیف (Ignatief) اس وقت باب عالی میں رومی سفیر تھا اور اس کا اثر نہ صرف وزیر اعلیٰ خود سلطان پر بھی بہت زیادہ تھا، اگنائیف نے اہل بلغاریا کی استہ عاجی سفاہش کے ساتھ پیش کی، اگنائیف کا مقصد یہ تھا کہ ایسا کرنے

(۱) کیمرج ماڈرن ہسٹری جلد ۱۳ ص ۳۸۱ (۲) حزیہ نامائے بلقان اور مشرقی ایشیول ص ۳۸۶

سے بلغاری قوم کا ایک مستقل وجود قائم ہو جائے گا جو آئندہ روس کے زیرِ سایہ رہے گی اور یونانیوں کے مقابلہ میں استعمال کی جاسکے گی، صدر اعظم فواد پاشا نے بھی اہل بلغاریہ کی وطنی اور نسلی تحریک کو ترقی دینی چاہی تھی تاکہ بلقان میں ایک مضبوط قوم یونانیوں کی حریف پیدا ہو جائے، چنانچہ ۱۰ مارچ ۱۸۷۰ء کو سلطان عبدالعزیز نے ایک فرمان صادر کر کے بلغاریہ کی جداگانہ ہستی کو تسلیم کیا اور اس کے لیے کلیسائے یونان سے آزاد ایک مستقل قومی کلیسا قائم کرنے کی اجازت دی، نہ صرف یہ کہ ولایت ذینوب کا پورا علاقہ بلغاریہ کلیسا کے ماتحت کر دیا گیا بلکہ اس فرمان میں یہ تصریح بھی کر دی گئی کہ اگر مقدونیا کے عیسائی حلقے بلغاریہ کلیسا میں داخل ہونا چاہیں تو ان حلقوں کی دولٹ آبادی کی خواہش معلوم ہونے پر یہ حق انھیں دے دیا جائے گا (۱) اس تاریخ سے بلقان میں ایک جدید قومیت کی بنیاد پڑ گئی، بلغاریہ قوم جو صدیوں سے سورہی تھی بیدار ہو کر اب ایک قوی حریف کی حیثیت سے یونانیوں کے مقابل آگئی۔

باب عالی میں روس کا اثر: تخت نشینی کے بعد سے دس سال تک عبدالعزیز کو فواد پاشا، عالی پاشا، رشدی پاشا اور مدحت پاشا جیسے محب وطن اور قابل مدبرین کی خدمات حاصل رہیں جن کے زیر اثر اس نے بہت سی اصلاحات جاری کیں، ان میں سے بعض کا ذکر اوپر آچکا ہے، اس نے عثمانی بیڑے کو یورپ کے زیرِ دست بیڑوں کا ہم پلہ بنا دیا اور فوج کی تنظیم اس طریقہ پر کی کہ آئندہ جنگ روس خصوصاً پلونا کے معرکہ میں ترکوں کی جاں بازی نے تمام دنیا سے خراج تحسین حاصل کیا، عدالتوں میں انصاف ہونے لگا، پریس کو حکومت پر تنقید کرنے کی آزادی ملی اور بحیثیت مجموعی سلطنت عثمانیہ محمود ثانی اور عبدالجبار کی تیار کی ہوئی شاہد امتیازی پگھڑن نظر آنے لگی، لیکن بد قسمتی سے ۱۸۷۰ء میں چند مہینوں کے اندر فواد پاشا اور عالی پاشا دونوں کا انتقال ہو گیا، یہ وزراء اپنی غیر معمولی قابلیت اور مقبولیت کی وجہ سے شروع ہی سے سلطان پر بہت زیادہ اثر رکھتے تھے اور حقیقتاً

سلطنت کا نظم و نسق انہی کے ہاتھوں میں تھا، ان کی وفات کے بعد عبدالعزیز دوسرے وزیروں کے اثر سے آزاد ہو گیا اور اب مطلق العنانی کا دور شروع ہوا، اس نے محمود ندیم پاشا کو صدر اعظم مقرر کیا جس کے زمانہ میں رشوت کا بازار پھر گرم ہوا، عہدے اور منصب فروخت ہونے لگے، حکومت کے ہر شعبہ میں بد نظمی پھیلنے لگی اور سلطنت کے مختلف صوبوں میں شورشیں برپا ہونا شروع ہوئیں۔

اس صورت حال سے روس نے پورا فائدہ اٹھایا، اس کا سفیر جنرل اگنائیف عالی پاشا کی وفات سے چند سال قبل قسطنطنیہ آ گیا تھا، ترک مورخ احمد صائب بک نے لکھا ہے کہ اگنائیف وہ شخص ہے جس نے مشرقِ ادنیٰ میں سیاستِ روس کی ترویج میں سب سے زیادہ حصہ لیا اور اس مقصد کے حاصل کرنے میں ذلیل سے ذلیل طریقہ اختیار کرنے سے بھی پرہیز نہیں کیا، جب تک زمامِ حکومت عالی پاشا کے ہاتھ میں تھی اسے کامیابی نہ ہو سکی، لیکن جب ۱۸۷۲ء میں عالی پاشا کا انتقال ہو گیا اور محمود ندیم پاشا صدر اعظم مقرر ہوا تو اگنائیف نے دیکھا کہ موقع سے فائدہ اٹھانے کا وقت آ گیا ہے، محمود نے اپنے کو بالکل اگنائیف کے ہاتھ میں دے دیا تھا اور حکومتِ روس اور سفیرِ روس کا تابع فرمان ہو گیا تھا، اس کی حکومتِ زار کی حکومت تھی نہ کہ سلطان کی، کسی وزیر نے ایسی خیانت کی مثال نہیں پیش کی، نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ حکومت کے عہدہ داروں کا عزل و تقرر بھی اگنائیف ہی کی رائے سے ہوا کرتا تھا (۱) حد یہ ہے کہ شیخ الاسلام حسن منہی آفندی بھی اگنائیف کے جادو سے محفوظ نہ تھا، چنانچہ اس نے ایک روز اگنائیف سے کہا کہ ”میری دو آنکھیں ہیں، ایک تو اور ایک میرا لڑکا حیدر“ (۲) مسٹر نائٹ اپنی مشہور کتاب ”بیداریِ ترکی“ (Awakening of Turkey) میں لکھتے ہیں کہ ”روسی ڈپلومیسی نے قسطنطنیہ میں غلبہ حاصل کر لیا تھا اور حسب دستور قدیم جماعتِ اصلاح کے خلاف سازش میں مصروف تھی اور سلطنتِ عثمانیہ کی بربادی کی تدبیریں کر رہی تھی۔“

(۱) واقعہ السلا ان عبدالعزیز از احمد صائب بک مطبوعہ مصر ۱۳۲۱ھ ص ۷-۱۰۵ (۲) ایضاً ص ۱۸۴

جمعیت سلاویہ: سلطنت عثمانیہ کو برباد کرنے کے لیے روس نے جو ذرائع اختیار کیے، ان میں جمعیت سلاویہ کی تشکیل ایک نہایت موثر ذریعہ تھی، 'پان سلاوزم' (Pan Slavism) یا اتحاد سلافی کا مقصد یہ تھا کہ تمام سلافی قوموں کو روس کے زیر سیادت منظم کر کے دولت عثمانیہ کے خلاف ابھارا جائے، چنانچہ اسی مقصد کو سامنے رکھ کر روس کے چند ارباب فکر نے ۱۸۴۰ء میں 'جمعیت سلاویہ' قائم کی، اس جمعیت نے سلافی قوموں کے اندر روسی ادبیات کی نشر و اشاعت شروع کی تاکہ ان قلوب روس کی جانب آسانی سے مائل ہو سکیں، اس نے بلغاریہ، سربو، بوسنیا، ہرزگووینا اور مونٹی نگر و دیل اسود کے باشندوں کو جو روس سے نسلی اور دینی تعلق رکھتے تھے، دولت علیہ کی حکومت سے آزاد کرانے کی کوشش کی، روسی ایجنٹ خفیہ اور علانیہ طور پر سلطنت عثمانیہ کے ان صوبوں میں جاتے تھے جو روس کے قریب تھے اور 'جمعیت سلاویہ' کے خرچ سے سلافی قوموں کے بچوں کو بلا روس میں بھیجتے تھے، جہاں جمعیت کی طرف سے ان کی تعلیم کے لیے مدرسے قائم کیے گئے تھے، یہ لڑکے وہاں سے تعلیم حاصل کر کے جب واپس ہوتے تو جمعیت کے مقاصد کی نشر و اشاعت کے لیے اپنے شہروں میں مدرسے قائم کرتے، جمعیت کے ارکان بلقان کے تمام شہروں میں پھیلے ہوئے تھے، یہ لوگ عیسائیوں کو خوشخبری سناتے کہ عنقریب وہ روس اور 'جمعیت سلاویہ' کی مدد سے ترکی کی حکومت سے نجات پا جائیں گے، وہ ان کی مالی مدد بھی کرتے اور خفیہ طور پر ان کے لیے فوجی سامان بہم پہنچاتے رہتے، رفتہ رفتہ ریاستہائے بلقان کے تمام عیسائی 'جمعیت سلاویہ' کے مطیع ہو گئے اور علم بغاوت بلند کرنے کے لیے اس کے اشارہ کا انتظار کرنے لگے، حکومت روس کے بڑے بڑے ارکان اس جمعیت میں شامل تھے اور ان میں سے ایک اس کا سب سے زیادہ قوی رکن تھا۔ (۱)

میریٹ لکھتا ہے: "جنگ کریمیا کے بعد سے 'اتحاد سلافی' کے جدید عقیدہ کے مبلغین جن میں زیادہ تر روسی تھے اپنی ہم مذہب اور ہم نسل قوموں میں مسلسل پروپیگنڈا

کرنے میں مشغول تھے، ۱۸۶۷ء میں اتحاد سلافی کی ایک عظیم الشان کانگریس ایک سائنٹفک انجمن کے پردہ میں ماسکو میں منعقد ہوئی، اس کانگریس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اتحاد سلافی کی ایک کمیٹی بنائی گئی جس کا صدر مقام ماسکو تھا اور ایک چھوٹی کمیٹی بخارست میں قائم کی گئی، کتابیں اور مختصر رسالے بلقان میں تقسیم کیے جاتے تھے، نوجوان سلافی کثرت سے روسی یونیورسٹیوں میں جانے لگے، جس طرح رومانیہ کے نوجوان پیرس جاتے تھے، سرویا، مونٹی نگرو، بوسنیا اور بلغاریا میں ہر طرف خفیہ سوسائٹیوں کا جال بچھا ہوا تھا، اس تحریک کو سرکاری مدد بھی حاصل تھی، عوام کے پروپگنڈے کی پشت پر اعلیٰ سیاسی قوتیں بھی کام کر رہی تھیں، جزیرہ نماے بلقان میں ہر روسی فضل اتحاد سلافی کا رکن تھا اور جنرل اگنائیف جو اس تحریک کا ایک پر جوش حامی تھا، قسطنطنیہ میں سفیر مقرر کیا گیا تھا۔“ (۱)

مدحت پاشا کی اسکیم: روس کی یہ سرگرمیاں باب عالی سے پوشیدہ نہ تھیں، مدحت پاشا نے ولایت ڈینیوب (بلغاریا) کی گورنری کے زمانہ (۱۸۶۵ء لغایت ۱۸۶۸ء) میں دیکھا تھا کہ روسی پروپگنڈے کی کامیابی کا بڑا ذریعہ یہ ہے کہ بلغاریا کے نوجوان طلبہ وڈیبا، خارکوف اور کیف کی یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے روس بھیجے جاتے ہیں اور وہاں سے اتحاد سلافی کے پر جوش مبلغ ہو کر وطن کو لوٹتے ہیں اور دولت عثمانیہ کے لیے نہایت خطرناک ثابت ہوتے ہیں، چنانچہ مدحت پاشا نے یہ فیصلہ کیا کہ بلغاریا کے خاص خاص شہروں میں ایسے مدرسے قائم کر دئے جائیں جہاں مسلمان اور عیسائی لڑکے یکجا تعلیم پاسکیں اور یہ تعلیم اعلیٰ درجہ کی اور عہد حاضر کے مطابق ہوتا کہ انھیں کہیں باہر جانے کی ضرورت باقی نہ رہے، اگر اس تجویز پر عمل کیا جاتا تو مسلمان اور عیسائی طلبہ کے درمیان دوستانہ روابط قائم ہو جاتے اور روسی پروپگنڈے کا اثر بہت کم ہو جاتا، مدحت پاشا نے بلغاریا کے لیے اصلاحات کی جو اسکیم باب عالی میں پیش کی اس میں مملوٹ تعلیم کی یہ تجویز بھی شامل تھی، جس وقت یہ اسکیم قسطنطنیہ پہنچی اگنائیف پہلا شخص تھا جس نے اس

کی اہمیت کا صحیح اندازہ کیا، اس نے دیکھا کہ یہ اسکیم جمعیۃ سلافیہ کے اغراض و مقاصد کے بالکل مخالف ہے، چنانچہ اس نے اسے درہم برہم کرنے کی پوری کوشش کی اور آخر کار کامیاب ہوا، دولت علیہ کے اندرونی معاملات میں یورپین سفیروں کی مداخلت کوئی نئی چیز نہ تھی، اگر تیف نے سلطان کو ذہن نشین کرانا شروع کیا کہ مدحت پاشا اپنے صوبہ میں جو اصلاحات جاری کرنا چاہتے ہیں، خصوصاً مقامی مجلسوں کا قیام، ان کی روح شخصی حکومت کے سراسر منافی ہے اور ان اصلاحات کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ آہستہ آہستہ وہ صوبہ سلطنت سے علاحدہ ہو جائے گا اور مصر کی طرح مکمل آزادی کا دعویٰ کرنے لگے گا، اتفاق یہ کہ ولایت ڈینوب کے سرکاری اخبار میں مرکزی مجلس کے ممبروں کے لیے طباعت کی غلطی سے ”مندوین“ (Deputies) کا لفظ چھپ گیا تھا، اگر تیف نے اس لفظ کو خاص اہمیت دے کر عبدالعزیز کے سامنے پیش کیا، عبدالعزیز پر اس کا اتنا اثر ہوا کہ اس نے منجملہ دیگر اصلاحات کے مدحت پاشا کی تعلیمی اسکیم کے منظور کرنے سے بھی انکار کر دیا، وجہ یہ ظاہر کی کہ ان اسکولوں کے اخراجات پورے نہ ہو سکیں گے، حالانکہ مدحت پاشا نے اپنی رپورٹ میں تصریح کر دی تھی کہ نصف اخراجات کا انتظام صوبہ کی سالانہ آمدنی سے ہو جائے گا اور نصف مقامی چندوں سے پورے کر لیے جائیں گے (۱) اس میں شبہ نہیں کہ اگر یہ مدر سے قائم کر دئے جاتے تو بلغاریا میں ”جمعیۃ سلافیہ“ کی سرگرمیوں کا بہت کچھ سدباب ہو جاتا لیکن سلطان پر اگر تیف کا جادو چل گیا اور ساری اسکیم درہم برہم ہو گئی۔

سلطان کی فضول خرچی: فواد پاشا اور عالی پاشا کے انتقال کے بعد جیسا کہ اوپر بیان ہوا اگر تیف کا اثر اور بھی بڑھ گیا، دوسری طرف عبدالعزیز بھی اپنے کو اب حقیقی معنوں میں ایک مطلق العنان فرماں روا محسوس کرنے لگا، سلطنت کی مالی حالت سے قطعاً بے پروا ہو کر اس نے فضول خرچی شروع کر دی جس سے ملکی قرضہ کا بار روز بروز بڑھتا چلا گیا، اسے تعمیرات کا بہت شوق تھا، چنانچہ سنگ مرمر کے بڑے بڑے عالی شان محل تیار ہونے

لگے، صدر اعظم محمود ندیم پاشا کو اپنا منصب برقرار رکھنے کی فکر تھی، وہ سلطان کی ہر خواہش کو آنکھ بند کر کے پورا کرتا رہا، ان فضول خرچیوں کا اثر دور دراز صوبوں پر بھی پڑنے لگا، قصر بیدیز کے مطالبات اتنے کثیر تھے کہ صوبوں کی معمولی آمدنی ان کے لیے کافی نہیں ہو سکتی تھی، مجبوراً چندے لگائے جانے لگے، رفاہ عام کے کام ملتوی کیے جانے لگے اور ان کے لیے جو رقیس جمع کی جاتی تھیں، وہ قسطنطنیہ بھیجی جانے لگیں، قصر سلطانی کے نااہل مقرر بان قسطنطنیہ سے صوبوں میں بھیجے جاتے اور والیوں کو حکم دیا جاتا کہ انھیں آمدنی کی جگہوں پر مقرر کیا جائے، نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت کے ہر شعبہ میں امتری پھیلنے لگی اور مختلف علاقوں میں ہنگامے برپا ہونا شروع ہوئے۔

مدحت پاشا کی صدارت: یہ حالت دیکھ کر سلطان نے محمود ندیم پاشا کو برخاست کر دیا اور اس کی جگہ ۱۸۷۳ء میں مدحت پاشا کو صدر اعظم مقرر کیا، مدحت پاشا نے سب سے پہلے مالیات کی درستی کی طرف توجہ کی، کاغذات کے معاینہ سے معلوم ہوا کہ ایک لاکھ ترکی پونڈ کا حساب درج نہیں ہے اور تحقیقات سے پتہ چلا کہ یہ رقم محمود ندیم پاشا نے وصول کی ہے، مدحت پاشا نے حکم دیا کہ اسے جلد سے جلد محمود ندیم سے واپس لیا جائے، محمود ندیم نے بیان کیا کہ گو یہ رقم اس کے نام سے برآمد کی گئی ہے لیکن دراصل قصر سلطانی میں بھیجی گئی ہے، والدہ سلطانہ اس کی پشت پناہ تھی، بہر حال مدحت پاشا کے اصرار سے وہ پہلے اور نہ اور پھر طرابزون جلاوطن کر کے بھیج دیا گیا لیکن کچھ دنوں کے بعد سلطان نے اسے قسطنطنیہ آنے کی اجازت دے دی، دار السلطنت میں اب دو جماعتیں صاف طور پر ایک دوسرے کی مخالف نظر آ رہی تھیں، ایک طرف مدحت پاشا تھے جنھیں قسطنطنیہ اور صوبوں کی رائے عامہ کی تائید نیز روشن خیال علما اور صوفیہ (مدارس دینیہ کے طلبہ) کی حمایت حاصل تھی، دوسری طرف وہ پورا گروہ تھا جو سلطنت کی بد نظمی سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا اور جسے محمود ندیم کی قیادت اور والدہ سلطانہ اور قصر بیدیز کی پشت پناہی حاصل تھی، محمود ندیم کا ایک اور زبردست حامی جنرل اگنائیو تھا جو اسے دوبارہ صدارت پر لائے

کے لیے ہر ممکن طریقہ سے سلطان پر اثر ڈال رہا تھا۔

اسی درمیان میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس سے مدحت پاشا کی صدارت عبدالعزیز کو گراں محسوس ہونے لگی، خدیو مصر اسماعیل پاشا وفاقاً قنطنطنیہ آیا کرتا تھا اور قصر سلطانی میں بڑی بڑی رقمیں اور بیش قیمت ہدایا پیش کر کے ہر مرتبہ سلطان سے حکومت خود اختیاری کے کچھ حقوق حاصل کر لیتا تھا، خدیو کی آمد قصر سلطانی اور اس کے تمام عہدہ داروں کے لیے آمدنی کا ایک مستقل ذریعہ بن گئی تھی، چنانچہ وہ مدحت پاشا کی صدارت کے زمانہ میں بھی آیا لیکن اب کی بار اسے مطلق کامیابی نہیں ہوئی اور اپنے ہدایا کے ساتھ بے نیل مرام اسے مصر واپس جانا پڑا، اس واقعہ سے جتنی مایوسی خدیو مصر کو ہوئی اتنی ہی قصر سلطانی کے ارکان کو بھی ہوئی اور خود سلطان بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

دوسرا واقعہ اس سے بھی زیادہ اہم تھا، مدحت پاشا کے صدارت پر آنے سے پہلے آسٹریا کے ایک شخص بیرن ہرش (Baran Hirsch) نے باب عالی سے ریل کی پٹریوں کے لگانے کا ٹھیکہ لیا تھا اور سلیپر کاٹنے کے سلسلہ میں ترکی کے ان جنگلوں پر جو دنیا کے بہترین جنگل سمجھے جاتے ہیں غیر محدود اختیارات حاصل کر لیے تھے، علاوہ بریس ہرش نے پٹریاں صرف میدانی علاقوں میں بچھائیں اور اجرت اس شرح سے طلب کی جو میدانوں اور پہاڑوں دونوں کے اوسط پر لگائی گئی تھی، اس ٹھیکہ میں ہرش کی کامیابی کا راز صرف رشوت تھی، اس نے بڑی بڑی رقمیں قصر سلطانی اور وزرا کی خدمت میں پیش کر کے ٹھیکہ کا تکملہ کر لیا تھا، مدحت پاشا نے جب زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لی اور انھیں اس معاملہ کا علم ہوا تو ان کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی، تحقیقات سے ان کو یہ بھی معلوم ہوا کہ خود سلطان کی ذات بھی رشوت سے بری نہیں ہے، چنانچہ وہ سلطان کی خدمت میں حاضر ہوئے، اسے سمجھایا کہ اس ٹھیکہ میں دولت علیہ کا کس قدر نقصان ہے اور اس بات پر زور دیا کہ جو رقمیں ہرش سے لی گئی ہیں ان کو واپس کر کے یہ معاملہ ختم کر دیا جائے، عبدالعزیز نے بادل ناخواستہ مدحت پاشا کا مشورہ قبول کر لیا، رقمیں واپس

کرا دیں لیکن اس کے بعد مدحت پاشا کو برخواست کر دیا۔ (۱)

مالی اتری: اس کے بعد مدحت پاشا سالونیکا کے گورنر بنا کر بھیجے گئے، لیکن تھوڑے ہی دنوں کے بعد وہ رخصت لے کر قسطنطنیہ چلے آئے اور یہاں کچھ دنوں وزیر عدل اور پھر صدر کونسل آف اسٹیٹ رہنے کے بعد مستعفی ہو کر خانہ نشین ہو گئے، اس درمیان میں سلطنت کی بد نظمی روز بروز بڑھتی جا رہی تھی، یکے بعد دیگرے کئی صدراعظم مقرر اور برخواست کیے گئے، ان میں سے کوئی چند مہینوں سے زیادہ نہ رہا، چنانچہ محمد رشدی پاشا، اسعد پاشا اور شروانی رشدی پاشا نے اپنی قلیل مدت صدارت میں حالات کی درستی کی انتہائی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکے، بالآخر سلطان نے محمد ندیم پاشا کو دوبارہ صدراعظم مقرر کیا، اس وقت ماسیات کا نظام اس درجہ خراب ہو چکا تھا کہ سلطنت عنقریب دیوالیہ ہوا چاہتی تھی، چنانچہ ۱۷ اکتوبر ۱۸۷۵ء کو باب عالی نے اپنے قرض خواہوں کو اطلاع دے دی کہ حکومت پورا سود ادا کرنے سے قاصر ہے، اس پر سارے یورپ میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا، یورپ کے ہر پایہ تخت اور ہر بڑے شہر میں جن ساہوکاروں نے بڑی بڑی شرح سود پر باب عالی کو قرضے دئے تھے جلے کیے اور ترکی حکومت اور ترکی قوم دونوں کے خلاف شدید بغیظ و غضب کا اظہار کیا، ان جلسوں نے دولت عثمانیہ کے خلاف سیاسی جوش کے بھڑک اٹھنے کے لیے زمین خوب تیار کر دی تھی۔

بغاوت ہرزگووینا: اس درمیان میں روس کی معاندانہ کوششیں برابر جاری تھیں، جمعیۃ سلافیہ کے ارکان بلقان کی عیسائی رعایا کو بھڑکانے میں سرگرم تھے، آسٹریا کی نگاہیں بوسنیا اور ہرزگووینا پر تکی ہوئی تھیں، وہ ان صوبوں میں بغاوت برپا کر کے خود ان پر قبضہ کر لینا چاہتا تھا، چنانچہ اس مقصد سے خفیہ طور پر وہ بوسنیا اور ہرزگووینا میں اسلحہ اور گولا بارود بھیج رہا تھا، سرویا اور مونٹی نگرو کے شورش پسند بھی ہرزگووینا میں جمع ہو رہے تھے، ان تیاریوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ جولائی ۱۸۷۵ء میں موشار (ہرزگووینا) کے کسانوں

نے دفعۂ نیکس ادا کرنے اور زمینداروں کے کھیتوں میں کام کرنے سے انکار کر دیا اور بغاوت کے لیے آمادہ ہو گئے، مقامی حکام بجائے اس کے کہ شورش کو فوراً ختم کر دیتے باب عالی کے احکام کا انتظار کرنے لگے، اس سے باغیوں کی ہمت اور بڑھ گئی اور چونکہ انھیں خارجی مدد کا یقین دلایا گیا تھا، اس لیے ان کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہوتا گیا، آخر کار مختار پاشا کی سرکردگی میں ایک فوج باب عالی کی طرف سے بھیجی گئی، جس نے بآسانی بغاوت کو فرو کر دیا لیکن یہ چیز روس اور آسٹریا کی پالیسی کے بالکل خلاف ہوئی، ان کا مقصد صرف بغاوت کے قایم رہنے سے پورا ہو سکتا تھا، چنانچہ انھوں نے باغیوں کو درپردہ پھرا بھارا اور ان کی طرف سے چند مطالبات اپنے سفیروں کے توسط سے باب عالی میں پیش کیے، صدر اعظم اسعد پاشا حسن نیت کے باوجود کمزور آدمی تھے، انھوں نے روسی اور آسٹروی سفیروں کی یہ خدمت قبول کر لی، وہ باغیوں اور باب عالی کے درمیان مصالحت کرادیں گے، جیسا کہ علی حیدر مدحت نے لکھا ہے، کوئی پالیسی اس سے زیادہ مہلک نہیں ہو سکتی تھی، اس سے باغیوں کی انتہائی حوصلہ افزائی ہوئی، انھوں نے سمجھ لیا کہ حکومت خود اس شورش کے فرو کرنے سے قاصر ہے، اس کارروائی سے باغیوں کی حیثیت حریف مقابل کی ہو گئی اور جو چیز پہلے تھوڑے سے کسانوں کی ایک معمولی سی شورش تھی وہ اب باقاعدہ بغاوت کے درجہ تک پہنچ گئی، جس کے لیڈر غیر ملکی قنصلوں اور سفیروں کے ذریعہ سے باب عالی سے مساویانہ طور پر معاملات کرنے لگے۔

بہر حال ۲ اکتوبر ۱۸۷۷ء کو سلطان کی طرف سے ایک ارادہ شایع ہوا جس میں فوری اور عام اصلاحات کا وعدہ کیا گیا لیکن باغیوں نے اس کی پروانہ کی، اس کے بعد ۱۲ دسمبر کو ایک شاہی فرمان صادر ہوا جس میں باغیوں کے سابق مطالبات منظور کر لیے گئے یعنی یہ کہ ٹیکسوں کی مقدار کم کر دی جائے گی اور بوسنیا اور ہرزیگووینا کے باشندوں کو خود اپنی پولیس قایم کرنے کی اجازت ہوگی، اس فرمان میں سلطان نے یہ بھی وعدہ کیا کہ مقامی انتخابی مجلس فوراً قایم کر دی جائیں گی جن میں عیسائی ممبروں کی جگہیں محفوظ

ہوں گی، لیکن روس اور آسٹریا کی پشت پناہی سے، غیوں کے حوصلے بڑھے ہوئے تھے، انھوں نے اس کے بعد بھی ہتھیار نہیں ڈالے، دولِ عظمیٰ کی مداخلت کے لیے یہ موقع بہت مناسب تھا، چنانچہ روس، آسٹریا اور جرمنی کے فرماں رواؤں نے باہم مشورہ کیا اور آسٹریا کے چانسلر کاؤنٹ اندراسی (Andrassy) نے بوداپسٹ سے وہ نوٹ جاری کیا جو اس کے نام سے مشہور ہے۔

اندراسی نوٹ: 'اندراسی نوٹ' میں یہ بتانے کے بعد کہ دولِ عظمیٰ بغاوت کے فرو کرنے اور یورپ میں امن قائم رکھنے کے لیے کس قدر بے چین ہیں اور بابِ عالی ان اصلاحات کے نافذ کرنے سے جو مدت سے واجب ہو چکی تھیں کہاں تک قاصر رہا ہے، اس بات پر زور دیا گیا تھا کہ سلطان پر دباؤ ڈال کر مندرجہ ذیل مطالبات پورے کرائے جائیں:

بوسنیا اور ہرزگووینا کے باشندوں کو پوری مذہبی آزادی عطا کی جائے اور مسلم اور غیر مسلم رعایا کے ساتھ یکساں سلوک کیا جائے، اجارہ داروں کے ذریعہ سے ٹیکس کی وصولی کا طریقہ بند کر دیا جائے اور آئندہ ٹیکس براہِ راست عمالِ حکومت کے ذریعہ وصول کیے جائیں، بوسنیا اور ہرزگووینا کے باشندوں سے جو ٹیکس لیے جائیں وہ انہی صوبوں کی مقامی ضروریات پر صرف ہوں، ایسے کسانوں کی تعداد میں اضافہ کیا جائے جو زمین کے مالک ہوں اور اس طرح دیہی آبادی کی حالت بہتر بنائی جائے، ایک کمیشن مقرر کیا جائے جس کے ارکان میں عیسائیوں اور مسلمانوں کی تعداد برابر ہو اور وہ اپنی نگرانی میں نہ صرف ان اصلاحات کو جاری کرائے جو دولِ عظمیٰ کی طرف سے پیش کی گئی ہیں بلکہ ان کو بھی جن کا وہ مدد سلطان نے ۲۱ اکتوبر اور ۱۲ دسمبر کے فرمان میں کیا ہے، آخر میں یہ دھمکی دی گئی تھی کہ اگر مذکورہ بالا مطالبات جلد اور موثر طریقہ پر پورے نہ کیے گئے تو دولِ عظمیٰ بغاوت کے روکنے کی کوشش سے بری الذمہ ہو جائیں گی۔

۳۰ جنوری ۱۸۷۶ء کو تمام دولِ عظمیٰ کی طرف سے 'اندراسی نوٹ' بابِ عالی

میں پیش کیا گیا، ۱۱ فروری کو سلطان نے اس کی تمام دفعات باستثنا ایک دفعہ کے جس میں ٹیکسوں کو صرف مقامی ضروریات میں صرف کرنے پر زور دیا گیا تھا منظور کر لیں لیکن اس کے بعد بھی باغیوں نے ہتھیار نہیں رکھے اور اس بات کو مطالبہ کرتے رہے کہ پہلے اصلاحات جاری کر دی جائیں، باب عالی کی طرف سے یہ جواب دیا گیا کہ بغاوت جب تک قائم ہے اصلاحات کی کسی اسیمبر کا نافذ کرنا ممکن نہیں، اس درمیان میں شورش برابر بڑھتی چلی گئی، بوسنیا بھی ہرزگووینا کے ساتھ شریک ہو گیا، دوسری طرف سربو، مونٹی نیگرو اور بلغاریا بھی علم بغاوت بلند کرنے کے لیے آمادہ نظر آتے تھے۔

جرمن اور فرانسیسی قصلوں کا قتل: باب عالی کی صلح جوئی اور انتہائی مراعات کے باوجود بلقان کے عیسائیوں میں سرکشی کا جذبہ یورپین حکومتوں کی حوصلہ افزائی سے روز بروز زیادہ مشتعل ہوتا جا رہا تھا کہ ۵ مئی ۱۸۷۶ء کو سالونیکا میں جرمن اور فرانسیسی قصلوں کے قتل کا واقعہ پیش آیا، جس نے سارے یورپ کو ترکوں کے خلاف دفعہ براہیختہ کر دیا، سبب یہ ہوا کہ ایک بلغاری لڑکی اسلام قبول کر کے اپنے گاؤں سے سالونیکا آئی تاکہ وہاں کی مجلس عالیہ کے سامنے اس کا اعلان کر کے اپنے ایک ہم وطن نوجوان مسلمان سے شادی کی اجازت حاصل کرے، جب وہ سالونیکا کے اسٹیشن پر پہنچی۔ یونانیوں اور بلغاریوں کا ایک کثیر مجمع پہنچے سے موجود تھا، ان لوگوں نے لڑکی کی نقاب اور فرغل کو نوچ کر پھینک دیا اور اسے زبردستی ایک گاڑی میں بٹھا کر فوراً امریکن قنصل خانہ میں پہنچا دیا، جہاں نائب قنصل نے جو ایک بلغاری عیسائی تھا اور اسی نے یہ تمام انتظامات کیے تھے لڑکی کو رات بھر چھپائے رکھا اور دوسرے دن اسے اپنے ایک دوست کے گھر بھیج دیا کہ سرانجام مل سکے، علی الصبار مسلمانوں کا ایک گروہ جس میں زیادہ تر ادنیٰ طبقہ کے لوگ تھے قنصل خانہ کے پاس جمع ہوا اور لڑکی کی واپسی کا مطالبہ کیا، ادھر سے جواب ملا کہ لڑکی یہاں نہیں ہے، اس کے بعد یہ لوگ برہم ہو کر قریب کی مسجد میں اکٹھے ہوئے اور آئندہ تدبیروں پر غور کرنے لگے، بد قسمتی سے مسلمانوں کے اس جوش کی حالت میں

جرمن اور فرانسیسی قنصل مسجد میں داخل ہوئے، یہ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ مجمع کو سمجھانے کے لیے عداً مسجد میں گئے تھے یا مسجد کے دروازہ کے قریب تھے اور بھیڑ کے دھکے میں بلا ارادہ اندر پہنچ گئے تھے، بہر حال جس صورت سے بھی وہ گئے ہوں مجمع انھیں مسجد کے اندر دیکھتے ہی بے قابو ہو گیا اور چند آدمی کھڑکیوں کی آہنی سلاخیں کھینچ کر ان پر ٹوٹ پڑے اور دونوں کو وہیں ختم کر دیا، انگریزی قنصل مسٹر بلنٹ نے شروع ہی میں مجمع کا رنگ دیکھ کر امریکن نائب قنصل لزارو (Lazaro) کے یہاں جو اس ہنگامہ کا اصلی باعث تھا بہت اصرار کے ساتھ کہلا بھیجا کہ لڑکی فوراً واپس کر دی جائے ورنہ جرمن اور فرانسیسی قنصلوں کی جان خطرہ میں ہے لیکن لزارو نے پہلے تو یہ عذر کیا کہ معلوم نہیں لڑکی کہاں ہے اور جب بلنٹ کے مزید اصرار پر اس نے لڑکی واپس کی تو وقت گزر چکا تھا اور دونوں قنصل مارے جا چکے تھے۔

اگرچہ باب عالی نے مجرموں کو سزا کے لیے فوراً احکام صادر کیے اور چھ آدمیوں کو پھانسی دے دی گئی اور بہتوں کو قید کی سزائیں دی گئیں تاہم یورپ کا جوش انتقام اس کے بعد بھی ٹھنڈا نہ ہوا، یوروپین پریس نے اس آگ کو خوب بھڑکایا اور ہر طرف سے یہ صدا بلند ہونے لگی کہ سلطنت عثمانیہ کے تمام عیسائیوں کی جانیں خطرہ میں ہیں اور وہاں کی پوری مسلمان آبادی عیسائیوں کے قتل عام پر آمادہ ہو گئی ہے، عیسائیوں کے تحفظ کے لیے جو تجویزیں پیش کی گئیں ان میں ایک یہ بھی تھی کہ ترکوں کے مقابلہ میں صلیبی اتحاد قائم کیا جائے۔

www.KitaboSunnat.com

بغاوت بلغاریا: اتفاق سے اسی زمانہ میں بلغاریا میں بھی بغاوت شروع ہوئی تھی، اس لیے صلیبی اتحاد کی ضرورت اور بھی شدت کے ساتھ محسوس کی جانے لگی، حقیقت یہ تھی کہ بدتن کی تمام شورشیں ایک منظم تحریک کا نتیجہ تھیں، روس کی سرپرستی میں 'جمعیۃ سلافیہ' کے ارکان نے پورے جزیرہ نما میں خفیہ کمیٹیوں کا جال بچھا رکھا تھا، آسٹریا، یونینیا اور ہرزیگووینا کے لالچ سے روس کا معاون تھا، چنانچہ ابھی ان صوبوں کی بغاوت جاری ہی

تھی کہ بلغاریا کے بعض ضلعوں میں بھی یہ فتنہ رونما ہوا، مقامی حکام نے یہ دیکھ کر کہ ہرز یگووینا میں ابتدائی غفلت کا نتیجہ کیا ہوا، اس شورش کے تمام لیڈروں کو گرفتار کر لیا، اس پر جنرل اگنٹیف نے باب عالی میں اتنا سخت احتجاج کیا کہ قسطنطنیہ سے نہ صرف ان لیڈروں کی رہائی کا حکم پہنچا بلکہ حکومت کے جو عہدہ داران کی گرفتاری میں شریک تھے وہ برخاست کر دئے گئے (۱) اس کارروائی سے بلغاریا کے مسلمانوں میں سخت اشتعال پیدا ہوا، انھوں نے یہ دیکھ کر کہ باغیوں کی ٹولیاں یورپین قنصلوں کی حمایت میں منظم ہوتی جا رہی ہیں اور مقامی حکام جو انسدادی تدبیریں اختیار کرتے ہیں ان پر سزا دی جاتی ہے، اس معاملہ کو خود اپنے ہاتھ میں لینے کا فیصلہ کر لیا اور تمام صوبہ میں مدافعتی کمیٹیاں بنا کر پٹیشن یافتہ فوجیوں کی کمان میں مقامی جتھے قائم کر لیے۔

علم بغاوت باضابطہ طور پر تو یکم مئی ۱۸۷۶ء کو بلند کیا گیا لیکن فساد کے بادل مہینوں پہلے سے مختلف اطراف سے اٹھتے ہوئے نظر آرہے تھے، چنانچہ اکتوبر ۱۸۷۵ء سے قبل باب عالی کو اطلاع دی گئی تھی کہ بلغاریا کے تین ضلعوں فلوپولیس، اسکی زغرا اور ٹرنو و میں سخت شورش برپا ہونے کا خطرہ ہے اور ان اضلاع کے حکام نے باب عالی سے پرزور استدعا کی تھی کہ فوجی دستے فوراً روانہ کر دئے جائیں تاکہ پراسن باشندوں کی جان و مال کی حفاظت کی جاسکے، لیکن اگنٹیف نے پھر مداخلت کی اور اس بات پر زور دیا کہ باضابطہ فوجوں کی موجودگی سے مقامی باشندوں میں اور بھی اشتعال پیدا ہوگا اور شورش جلد شروع ہو جائے گی، محمود دوم اس کی باتوں میں آگیا اور ان اضلاع کے حکام کی پیہم درخواستوں کے باوجود اس نے کوئی باضابطہ فوج بلغاریا میں نہیں بھیجی، چنانچہ اکتوبر ۱۸۷۵ء میں اس کی زغرا کے عیسائیوں نے دفعۃً مسلمانوں پر حملہ کر دیا، اس کے متعلق نائب قنصل برونی (Brophy) سرہنری الیٹ (Sir H. Elliot) سفیر برطانیہ مقيم قسطنطنیہ کو لکھتا ہے:

”اکتوبر ۱۸۷۵ء میں یہ بالکل طے تھا کہ بلغاریا کے آٹھ دس مقامات پر بیک وقت شورش شروع کر دی جائے گی لیکن کسی خاص وجہ کے پیش آ جانے سے بغاوت کو ملتوی کر دینا منسب سمجھا گیا، چنانچہ تمام مرکروں میں ہر کارے بھیج دئے گئے لیکن اس کی زغرا میں التوا کی اطلاع چوبیس گھنٹے بعد پہنچی اور وہاں کے لوگوں نے یہ یقین کرتے ہوئے کہ باغیوں کی پوری فوج ان کی حمایت میں اٹھ کھڑی ہوگی، علم بغاوت بلند کر دیا، واقعہ یہ ہے کہ گذشتہ مئی (۱۸۷۶ء) کی شورش، بغاوت یا انقلاب جو کچھ بھی وہ رہا ہوا اکتوبر ۱۸۷۵ء میں واقع ہونے والا تھا مگر نہیں ہوا۔“ (۱)

حقیقت حال: بہتر ہوگا کہ بغاوت بلغاریا کی اصل حقیقت خود برطانوی قنصلوں اور سرہنری ایٹ کے مراسلوں سے پیش کی جائے، فلوپولیس کا نائب قنصل ڈیوپوئی (Dupuis) ۷ اگست ۱۸۷۶ء کو لارڈ ڈربی وزیر خارجہ انگلستان کو مندرجہ ذیل رپورٹ بھیجتا ہے:

”صورت حال یہ تھی جب ۲ مئی کو انقلابی کمیٹیوں کی مرتب اور منظم کی ہوئی بغاوت جو گذشتہ تیرہ سالوں سے بخارست اور ماسکو میں قائم تھی، دفعۃً ادرات آلان (Auratalan) میں شریع ہو گئی، انقلابیوں کی تجویز یہ تھی اور ان کی مدد دیہاتوں کے پادری، اسکول ماسٹر کر رہے تھے کہ ساری ولایت میں ریوے اسٹیشن اور پبل برہد کر دئے جائیں، اور نہ اور فلوپولیس کے شہروں میں آگ لگادی جائے، پانچ سو آدمیوں کو لے کر تار تار بازار حقیق پر چھاپا مارا جائے اور وہاں حکومت کے ذخیرہ پر قبضہ کر لیا جائے، فوجوں کے لیے گورنر جنرل

کے پاس اور نہ تاریخچہ لکھا گیا، بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے یہ جواب دیا کہ چونکہ کوئی باضابطہ فوج بھیجنے کے لیے موجود نہیں ہے، اس لیے بہتر ہوگا کہ بے ضابطہ دستے فراہم کر لیے جائیں، ۴۴ مئی کو فلیپو پولیس کے چند ممتاز اشخاص نے وہاں کے ملا کے زیر صدارت ایک جلسہ کیا جس میں گورنر جنرل کی یہ تجویز کہ نفعی (بے ضابطہ سپاہی) بھرتی کر لیے جائیں منظور کی گئی اور فیصلہ کی اطلاع ارکان جلسہ کے دستخطوں کے ساتھ اور نہ بھیج دی گئی، اس کے بعد فوراً باش بوزقوں یعنی بے ضابطہ سپاہیوں کو بھرتی کرنے کے لیے ولایت کے مختلف حصوں میں احکام بھیجے گئے۔“

باغیوں کا طریقہ کار یہ تھا کہ جو مسلمان بھی ملتا اسے بے دریغ قتل کر دیتے، بوڑھے بچے یا مرد عورت کی کوئی تفریق نہ تھی، مقصد یہ تھا کہ مسلمان بھی انتقام کے لیے اٹھ کھڑے ہوں اور پھر یورپین حکومتوں کو مداعت کا موقع ہاتھ آئے، اس میں شبہ نہیں کہ عیسائیوں نے ایسی درندگی کا ثبوت دیا کہ مسلمانوں کا جوش انتقام بالآخر بھڑک اٹھا اور باشبوزق بھی اعتدال سے متجاوز ہو گئے، لیکن عیسائی بیانات میں تصویر کا صرف ایک رخ پیش کیا گیا ہے، چنانچہ ڈیو پوٹی مذکورہ بالا رپورٹ کے سلسلہ میں لکھتا ہے:

”یہ علانیہ کہا جاتا ہے کہ فلیپو پولیس کا روسی نائب قنصل ان

غمناک مصیبتوں کا تہاڑمہ در ہے جو بانک پر نازل ہوئی ہیں، علاوہ بریں بہت سے دیہاتوں میں خود بلغاریوں نے آگ لگا دی تا کہ وہاں کے باشندوں کو بغاوت پر مجبور کریں، سنگری کا گاؤں جو اس وقت صرف کھنڈر ہے شروع میں ایک پادری ہی نے اس میں آگ لگائی، یہ شخص لوگوں کو حکومت کے خلاف بغاوت پر مجبور کرنے کی غرض سے ہاتھ میں چاقو لے کر ادھر ادھر دوڑتا پھرتا تھا اور ان سے کہتا تھا کہ تمہاری مخلصی کا وقت اب آ گیا ہے اور روسی سپاہی ترکوں کے مقابلہ میں تمہاری

مدد کرنے کے لیے قریب پہنچ گئے ہیں، قابل اعتماد اور آزاد شہادت کی بنا پر مجھے یقین ہے کہ بلغاریا کی بغاوت کا خاکہ احتیاط اور ہوشیاری کے ساتھ ان لوگوں نے تیار کیا تھا، جو غیر علاقوں سے آئے تھے اور فوجی مصافیات (Tactics) کے ماہر اور تجربہ کار تھے، اگر ان کی تدبیریں کامیاب ہو جاتیں اور اہل بلغاریا ترکوں پر غلبہ حاصل کر لیتے تو کوئی شبہ نہیں کہ یورپ میں ترکی کا وجود خطرہ میں پڑ جاتا اور بلغاریا والوں نے اس سے کہیں زیادہ مظالم کیے ہوتے جتنے مسلمانوں کے سر عاید کیے جاتے ہیں، کیوں کہ ابتداءے بغاوت ہی سے اول الذکر نے ہر ترک کو جو انھیں ملا عمر یا جنس کا لحاظ کیے بغیر قتل کر ڈالا اور متعدد مواضع پر ان کے ساتھ ناقابل بیان مظالم کیے، اس میں شبہ نہیں کہ سفاکیوں کا ارتکاب دونوں طرف سے ہوا ہے مثلاً مجھ سے قابل وثوق طور پر بیان کیا گیا ہے کہ کارلوو کے مقام پر بلغاریوں نے ایک ترک ٹرکے کی دونوں باہوں کی کھال کنٹی تک کھینچ لی اور اوتلو کوئی میں بلغاریوں نے اسی (۸۰) مسلمانوں کو تہ تیغ کر دیا اور ایک بچہ کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے اس کا گوشت علانیہ فروخت کیا، اس کے علاوہ عورتوں کے ساتھ ایسے وحشیانہ مظالم کیے کہ ان کا ذکر بھی نہیں کیا جاسکتا۔“ (۱)

ترکوں کے انتقام کی خبر سب سے پہلے لندن کے اخبار ڈیلی نیوز (Daily News) میں شائع ہوئی جس کا نامہ نگار قسطنطنیہ میں مقیم تھا، اس خبر سے انگلستان میں سخت برہمی پیدا ہوئی، مسٹر گلڈسن (Gladstone) نے بلغاری سفاکیوں کو اپنی مسلسل تقریروں کا موضوع بنا کر سارے ملک میں ترکوں کے خلاف ایک ہنگامہ برپا کر دیا اور پھر اسی عنوان سے ایک رسالہ لکھ کر شائع کیا جو ہزاروں کی تعداد میں تقسیم ہوا اور اس نے

(۱) رپورٹ پارلیمنٹ، بحوالہ ضمیمہ سوانح مدحت پاشا ص ۲۸۷

اس آگ کو اور بھی بھڑکایا، حکومت برطانیہ کی طرف سے والٹر بیرنگ (walter Baring) واقعات کی تحقیق کے لیے روانہ کیا گیا، اس نے لکھا کہ ابتدا میں باغیوں نے (۱۳۶) مسلمانوں کو قتل کیا تھا مگر بعد کے قتل عام میں جب مسلمانوں نے انتقام لیا تو بارہ ہزار عیسائیوں سے کم ہلاک نہیں ہوئے۔ (۱)

ڈیلی نیوز کے جس مقالہ نے ترکوں کے خلاف انگلستان میں ایچی ٹیشن کا آغاز کیا اس کی نسبت سر ہنری ایسٹ ۲۵ جولائی ۱۸۷۶ء کو لکھتے ہیں:

”میں یہ یقین کرنے کی وجہ رکھتا ہوں کہ ڈیلی نیوز کا نامہ نگار جس کے خطوط نے انگلستان کے لوگوں کو بلغاری سفاکیوں کی طرف اس قدر متوجہ کیا، ایک باغی سردار کے دو بلغاری عزیزوں کی باتوں سے فریب کھا گیا، ان میں سے ایک قسطنطنیہ میں ایک بلغاری اخبار کا ایڈیٹر تھا، ظاہر ہے کہ اس کے ذریعہ جو اطماع حاصل کی گئی ہوگی وہ محض ناقابل اعتماد خیال کی جاسکتی ہے۔“ (۲)

چوں کہ اس بغاوت کا ایک بڑا مقصد یہ تھا کہ یورپ میں ترکوں کے خلاف اشتعال اور نفرت پھیلائی جائے اس لیے انتہائی مبالغہ آمیز خبریں بھی ناقابل انکار حقیقت کے طور پر تسلیم کر لی جاتی تھیں، سر ہنری ایسٹ ۶ جولائی کو لکھتے ہیں:

”بغاوت کے فرو کرنے میں جو زیادتیاں کی گئیں وہ یقیناً بہت بڑی تھیں جیسا کہ اس فوج کی نوعیت کا لازمی تقاضا تھا جس سے فوری ضرورت کے موقع پر باب عالی کو مجبوراً کام لینا پڑا، لیکن یہ بھی اسی حد تک یقینی ہے کہ جو تفصیلات دی گئیں ہیں وہ تقریباً تمام تر روسی اور بلغاری ذرائع سے ماخوذ ہیں اور ان میں اس قدر شرم ناک حد تک مبالغہ کیا گیا ہے کہ وہ زیادہ توجہ کی مستحق نہیں ہو سکتیں، نفرت انگیز مظالم

کے واقعات ایسے تفصیلی طریقہ سے مجھ سے بیان کیے گئے تھے کہ ان کی سچائی میں شبہ کرنا تقریباً ناممکن تھا، لیکن تفتیش کرنے سے وہ سراسر بناوٹی ثابت ہوئے۔“ (۱)

بغاوت کی اسکیم یوں مرتب کی گئی تھی کہ انقلابی کمیٹیوں کے ایجنٹ باہر سے آکر عیسائیوں کو ابھارتے تھے جنہیں روسی مدرسوں کے تعلیم یافتہ پادری اور اسکول، سٹر پہلے سے تیار کر رہے تھے، یہ ایجنٹ لوگوں کو اس بات پر براہیختہ کرتے تھے کہ مسلمانوں کے ساتھ انواع و اقسام کے مظالم کریں تاکہ عاجز آکر وہ انتقام کے لیے اٹھ کھڑے ہوں اور پھر ان کے خلاف یورپ میں صدارے احتجاج بلند کی جاسکے، چنانچہ نائب قنصل کاورٹ (Calvert) ۲۹ اگست کو فلپو پولیس سے لکھتا ہے:

”عیسائی کمشنر جن میں سے ایک یوانچو آفندی (Youantcho) خود بلغاری ہے، بیان کرتے ہیں کہ انھیں اس امر میں مطلق شبہ نہیں کہ گذشتہ مئی کی ابتداءے شورش میں باغیوں کی طرف سے بڑے وحشیانہ مظالم کیے گئے اور ان مظالم کا ارتکاب عمداً کیا گیا تاکہ وہ بلغاریہ میں عام بغاوت برپا کرنے کا بہترین ذریعہ ہوں، کیوں کہ اس کے بعد حاکم قوم کی طرف سے جس بے امتیاز انتقام کا ہونا لازمی تھا وہ عیسائیوں کی حالت کو اس قدر ناقابل برداشت بنا دیتا کہ خواہ وہ کتنا ہی پر اسن طریقہ سے رہنا چاہتے حفاظت خود اختیاری کے لیے انھیں مجبوراً اٹھنا ہی پڑتا، منجملہ دیگر واقعات کے بلیک بے (Blacque) نے ٹرنو کے قریب ایک گاؤں کے عیسائی باشندوں کی زبانی یہ واقعہ مجھ سے بیان کیا کہ شورش کے شروع میں باغیوں نے وہاں کے ایک دولت مند ترک کو پکڑا جس سے اس کی عدل پروری اور فیض رسانی کی وجہ سے

مسلمان اور عیسائی دونوں یکساں محبت کرتے تھے اور اس کو زمین میں
کمر تک دفن کر کے پتھروں سے مار مار کر ہلاک کر دیا۔“ (۱)
۳۴ مئی کو اوتلو کوئی کی شورش کی اطلاع دیتے ہوئے سرہنری الیٹ لارڈ ڈربی
کو لکھتے ہیں:

”یہ معلوم تھا کہ انقلابی ایجنٹ اہل بلغاریہ میں سرگرمی کے
ساتھ اپنا کام کر رہے ہیں اور حال میں اسلحہ اور گولہ بارود کثیر مقدار میں
باہر سے لایا گیا ہے۔“ (۲)

والٹر بیرنگ کی تحقیقات کے متعلق جو حکومت برطانیہ کی طرف سے بھیجا گیا تھا
سرہنری الیٹ ۱۱ اراگست کو لارڈ ڈربی کو لکھتے ہیں:

”مسٹر بیرنگ کا ایک خط کل ملا جس میں یہ الفاظ درج ہیں:
اس میں مطلق شبہ نہیں کہ گذشتہ بغادت کے برپا کرنے میں فلوپو پولیس
کاروسی قفل پیش پیش تھا۔“ (۳)

یادداشت برلن: روس ایک طرف تو انقلابی کمیٹیوں کے ذریعہ سے بلقان کے ہر صوبہ
میں بغاوت پھیلا رہا تھا اور دوسری طرف روس عظمیٰ کا دباؤ ڈال کر باب عالی سے باغیوں
کے لیے زیادہ سے زیادہ مراعات حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا، چنانچہ اس کی تحریک
سے آسٹریا اور پرشا بھی اس کے معاون ہو گئے اور ۱۱ مئی ۱۸۷۶ء کو پرنس گورچاکوف،
کانٹ اندر اسی اور پرنس بسمارک نے برلن میں باہم مشورہ کر کے باب عالی میں بھیجنے
کے لیے ایک یادداشت مرتب کی جو یادداشت برلن (Berlin Memorandum)
کے نام سے مشہور ہے، اس میں مندرجہ ذیل مطالبات پیش کیے گئے۔

(۱) بوسنیا اور ہرزیگووینا میں بغاوت کی وجہ سے جتنے مکان منہدم ہو گئے ہیں

وہ سب باب عالی کی طرف سے پھر بنادے جائیں، کاشت کاروں کو جسے بلیوں اور

(۱) رپورٹ پارلیمنٹ، بحوالہ ضمیمہ سوانح محدث پاشا ص ۲۸۹ (۲) ایضاً ص ۴۵۹ (۳) ایضاً ص ۲۸۸

سامان زراعت کی ضرورت ہو وہ فراہم کیے جائیں اور بوسنیا اور ہرزگووینا کے باشندوں کو تین سال کا ٹیکس معاف کر دیا جائے۔

(۲) بوسنیا اور ہرزگووینا کے لیے ایک مخلوط کمیشن بنھایا جائے، جس کے ارکان مسلمان اور عیسائی دونوں ہوں اور اس کمیشن کا صدر ایک مقامی عیسائی ہو۔

(۳) دونوں صوبوں سے ہرگز دس متعین قلعوں کے ترکی فوجیں بنالی جائیں۔

(۴) جب تک بوسنیا اور ہرزگووینا میں اصلاحات مکمل طور پر نافذ نہ ہو جائیں اور امن وامان از سر نو قائم نہ ہو جائے عیسائیوں کو ہتھیار رکھنے کی اجازت دی جائے۔

(۵) دولی عطیہ کے فیصلوں اور مندوبوں کو حق حاصل ہوگا کہ اپنی نگرانی میں یہ مطالبات پورے کرائیں۔

آخر میں یہ دھمکی دی گئی تھی کہ اگر فوجی کارروائیاں موقوف کر کے دو مہینے کی مدت میں یہ مطالبات پورے نہ کیے گئے تو دولت علیہ کے ساتھ سختی کا برت دیا جائے گا۔ فرانس اور اٹلی نے بھی اس یادداشت سے اتفاق کیا، لیکن حکومت برطانیہ کو یہ بات ناگوار ہوئی کہ روس، آسٹریا اور پرشیا نے اس سے مشورہ کیے بغیر یادداشت کو مرتب کر لیا، چنانچہ اس نے اس کارروائی میں شریک ہونے سے انکار کر دیا اور قسطنطنیہ کی حفاظت کے لیے انگریزی بیڑے کو خلیج سیکا میں جو درانیال کے دبانہ پر واقع ہے لنگر انداز ہونے کا حکم دیا، برطانیہ کے اس طرز عمل سے یادداشت برلن کی دھمکی بہت کچھ بے اثر ہو گئی اور مجوزہ مداخلت کا خیال ترک کر دیا گیا۔

دولت علیہ کی مشکلات: غرض دولت عثمانیہ کے لیے ہر طرف دشمنوں کا سامن تھا، سارے بلقان میں بغاوت کی آگ پھیلی جارہی تھی، روس اور آسٹریا کی سرپرستی میں بوسنیا، ہرزگووینا اور بلغاریا کی شورشیں جاری تھیں، مونٹی نگرو و غنقریب اعلان جنگ کرنے والا تھا، سرویا روسی فساد کی نگرانی میں پوری طرح مسلح ہو رہا تھا، رومانیہ بھی لڑائی کی تیاریوں میں مصروف تھا، یورپین پریس ترکوں کے خلاف منظم پروپیگنڈا کر رہا تھا،

اندرونی حالت یہ تھی کہ خزانہ بالکل خالی تھا، حکومت کی باگ محمود ندیم پاشا کے ہاتھ میں تھی اور وہ دولت علیہ کے سب سے بڑے دشمن جنرل اگنائیف کے زیر اثر تھا، خود سلطان ان حالات سے بے خبر یا بے پروا اپنے تعینات میں منہمک تھا، سلطنت کے اندرونی معاملات میں یورپین حکومتوں کی مداخلت روز بروز بڑھتی جا رہی تھی، ”اندراسی نوٹ“ اور ”یادداشت برلن“ سے اس مداخلت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

سلطان کا عزل: ان حالات میں سلطنت کو تباہی سے بچانے کے لیے کچھ محب وطن مدحت پاشا کے مکان پر جمع ہو کر غور و فکر کر رہے تھے، بالآخر وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ سلطان کو معزول کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں لیکن اس سے پہلے صدر اعظم محمود ندیم پاشا اور شیخ الاسلام حسن فہمی آفندی کو برطرف کرنا ضروری سمجھا گیا، ۱۰ مئی کو شہزادہ عزالدین (سلطان کا سب سے بڑا لڑکا) وزارت جنگ کے دفتر کو جا رہا تھا کہ راستہ میں کئی ہزار صوفیہ نے اسے روک کر سلطان کے پاس واپس بھیجا اور اس کے توسط سے یہ درخواست پیش کی کہ محمود ندیم اور حسن فہمی آفندی برخاست کر دیے جائیں، سلطان اس مطالبہ کو مسترد نہ کر سکا اور اس نے دونوں کو موقوف کر کے محمد رشدی پاشا کو صدر اعظم اور حسن خیر اللہ آفندی کو شیخ الاسلام مقرر کیا، رشدی پاشا کے اصرار سے مدحت پاشا کو بھی وزارت میں جگہ دی گئی، لیکن کوئی خاص شعبہ ان کے سپرد نہیں کیا گیا۔

اس کے بعد دزرائے صورت حالات پر غور کر کے خود سلطان کو معزول کرنے کا فیصلہ کیا لیکن سلطان کا عزل شیخ الاسلام کے فتوے کے بغیر ممکن نہ تھا، چنانچہ حسب ذیل استفتاء کیا گیا:

”اگر امیر المومنین اختلال دماغ کا ثبوت دے، سلطنت

کے معاملات سے عدم واقفیت ظاہر کرے، محاصل ملکی کو قوم و ملک کی

حاکم برداشت سے زیادہ ذاتی اخراجات میں صرف کرے، سیاسی اور

مذہبی معاملات میں ابتری پیدا کرنے کا باعث ہو اور اس کا برسر حکومت

رہنا قوم و ملک کے لیے مضرب ہو جائے تو ایسی صورت میں کیا اسے معزوں کیا جاسکتا ہے؟“

شیخ الاسلام نے جواب دیا کہ معزول کیا جاسکتا ہے۔

چنانچہ اس فتوے کے مطابق وزرا نے ۷ جمادی الاولیٰ ۱۲۹۳ھ مطابق ۲۹ مئی ۱۸۷۶ء کو سلطان عبدالعزیز کو معزول کر کے سلطان عبدالحمید خاں کے لڑکے شہزادہ مراد کو تخت پر بٹھایا، عبدالعزیز نے یہ دیکھ کر قسطنطنیہ کی فوج بھی وزرا کے زیر اثر آگئی ہے، مزاحمت بے سود خیال کی اور خاموشی سے کنارہ کش ہو گیا۔



سلطان مراد خاں خامس

۷ جمادی الاولیٰ ۱۲۹۳ھ (۲۹ مئی ۱۸۷۶ء) لغایہ ۱۲ شعبان ۱۲۹۳ھ (یکم ستمبر ۱۸۷۶ء)

تخت نشینی کے بعد مراد نے تمام وزرا کو ان کی جگہ برقرار رکھا اور صدر اعظم رشدی پاشا کے نام ایک فرمان صادر کیا کہ وزرا غور و خوض کرنے کے بعد حکومت کے مختلف شعبوں کی اصلاح کے لیے اپنی رائے حضور سلطانی میں پیش کریں، اس نے خود اپنے ذاتی خیالات بھی اس فرمان میں ظاہر کیے مثلاً یہ کہ تمام رعایا کو بڑا امتیاز نسل و مذہب پوری قانونی آزادی حاصل ہونی چاہیے تاکہ ان کے اندر قومی اور وطنی جذبات مستحکم ہو سکیں اور مختلف شعبوں خصوصاً شعبہ مالیات کی از سر نو تنظیم و اصلاح کی جائے، اس نے لکھا کہ شعبہ مالیات کی اصلاح کے لیے ضروری ہے کہ کوئی خرچ اس وقت تک جائز نہ سمجھا جائے، جب تک سلطنت کے بجٹ میں پہلے سے منظور نہ کر لیا گیا ہو، چنانچہ اس سلسلہ میں اس نے شاہی اخراجات میں سے تین لاکھ ترکی پونڈ سالانہ کی تخفیف کردی اور چند کونسلہ کی کانیں اور کارخانے جو شاہی ملک تھے صیغہ مالیات کو دے دئے، مدحت پاشا اور ان کے ساتھیوں نے سلطان عبدالعزیز کے آخر عہد حکومت میں دستوری حکومت کا ایک خاکہ تیار کر لیا تھا، لیکن عبدالعزیز کی مطلق العنانی اور محمود ندیم اور اگن تیف کے اثر و اقتدار کی وجہ سے وہ صرف مسودہ کی حد تک محدود تھا، مراد نے وعدہ کیا کہ جس قدر جلد ممکن ہو گا یہ دستور نافذ کر دیا جائے گا، کمال ہے اور ضیا ہے جو نہایت ممتاز شاعر اور اہل قلم

تھے، اس کے پرائیویٹ سکریٹری مقرر کیے گئے اور سعد اللہ بے چیف سکریٹری کے عہدہ پر مامور ہوئے، یہ تقررات اس بات کے ضامن تھے کہ باب عالی کے خلاف قصر سلطانی کی سرزشیں کامیاب نہ ہونے پائیں گی اور سلطنت کا کام ہمواری سے چلتا رہے گا۔

حامیان اصلاح اب تک کامیاب ہونے چلے آئے تھے، سلطان عبدالعزیز کی معزولی سے بظاہر استبداد اور مطلقیت کا خاتمہ ہو گیا تھا اور یہ انقلاب بغیر کسی کشت و خون کے عمل میں آیا تھا، مراد کی تخت نشینی سے بڑی بڑی توقعات قائم ہو گئی تھیں، لیکن سلطنت کی بد قسمتی سے وہ صرف تین مہینے حکومت کر سکا اور یہ ساری توقعات امید موہوم ثابت ہوئیں۔

جس روز مراد تخت پر بیٹھا اسی روز سے وزرانے محسوس کرنا شروع کیا کہ وہ اعصابی انتشار میں مبتلا ہے، چنانچہ بہترین ڈاکٹروں کے مشورہ سے علاج شروع کیا گیا اور امید کی جاتی تھی کہ تھوڑے دنوں کے بعد یہ شکایت جاتی رہے گی، لیکن دو واقعات یکے بعد دیگرے ایسے پیش آئے کہ ان سے اس کے اعصاب پر بے حد اثر پڑا اور صحت کی تمام امیدیں درہم برہم ہو گئیں۔

وفات عبدالعزیز: پہلا واقعہ سلطان عبدالعزیز کی خودکشی کا تھا، معزولی سے پانچ دن بعد اس نے ایک قہقہی لے کر اپنی دونوں باہوں کی رگیں کاٹ ڈالیں، جن سے خون اس کثرت سے نکلا کہ وہ جانبر نہ ہو سکا، قسطنطنیہ کے سترہ ممتاز ڈاکٹروں نے جن میں ہر قوم کے لوگ تھے لاش کا معاینہ کر کے خودکشی کا خیال ظاہر کیا اور اپنی رپورٹ میں لکھ کر موت ان زہموں سے واقع ہوئی ہے جو قہقہی سے دونوں باہوں میں کیے گئے تھے۔

کپتان حسن کا واقعہ: اس واقعہ سے مراد کے دماغ پر نہایت سخت اثر پڑا، دس روز بعد ایک دوسرا واقعہ پیش آیا، جس نے اس کو اور بھی زیادہ متاثر کیا، حسن نامی ایک چرکس کپتان کسی وقت سلطان عبدالعزیز کا ایڈی کا نگ رہ چکا تھا، اس کے متعلق یہ شبہ ہوا کہ وہ اپنے آقا کا انتقام لینا چاہتا ہے، چنانچہ وزیر جنگ حسین عونٰی پاشا نے اسے بغداد جانے

کا حکم دیا لیکن وہ نہ گیا، اس پر عونی پاشا نے اسے قید کر دیا، دو دن قید میں رہنے کے بعد اس نے اطاعت کا اظہار کیا اور رہا کر دیا گیا، ۱۵ جون کو رات کے وقت جبکہ تمام وزرا مدحت پاشا کے مکان پر کاہنہ کے ایک جلسہ میں شریک تھے چرکس حسن چھ بھرے ہوئے پستولوں سے مسلح ہو کر کسی طرح اس کمرہ میں داخل ہو گیا جہاں اجلاس ہو رہا تھا اور اندر پہنچتے ہی سب سے پہلے حسین عونی پاشا کو گولیوں کا نشانہ بنایا، اس کے بعد فوراً رشید پاشا، وزیر خارجہ کی طرف مڑا اور اسے بھی زخمی کیا، وزیر بحریہ قیصرلی احمد نے چاہا کہ جھپٹ کر حسن کے ہاتھ سے پستول چھین لے مگر حسن نے فوراً بخنجر سے وار کر کے اسے مرادیا، حسین عونی نہایت زخمی ہونے کے باوجود میڑھیوں تک پہنچ گیا تھا، لیکن حسن نے اس کا پیچھا کیا اور گردن پر بخنجر کی ایسی کاری ضرب لگائی کہ عونی وہیں ٹھنڈا ہو گیا، اس کے بعد کمرہ میں واپس آ کر اس نے بے تحاشہ ہر طرف گولی چلائی شروع کی اور اپنے تمام پستول خالی کر دئے، انہی گولیوں سے بیٹوں کا جھاز بھی چور چور ہو گیا اور کمرہ میں اندھیرا ہو گیا، یہ تاریکی اس وقت بہت مفید ثابت ہوئی کیوں کہ محمد رشدی پاشا، خالد پاشا اور قیصرلی احمد پاشا، حسن کی زد سے بچ کر قریب کے ایک کمرہ میں پہنچ گئے اور دروازہ بند کر لیا اندھیرے میں مدحت پاشا کے کوٹ کی آستین حسن کے ہاتھ آگئی مگر وہ خود بچ گئے، ان کا ایک ملازم احمد آغا گولیوں کی آواز سن کر دوڑا اور قاتل کو گرفتار کرنا چاہا مگر حسن نے وہیں اسے گولی سے مار کر ختم کر دیا، یہی حشر شکری بے کا ہوا جو وزیر بحریہ کا ایڈی کاٹنگ تھا اور اسے بچانے کے لیے دوڑا تھا، بالآخر فوجی پولیس کا ایک دستہ آیا اور فریقین کے درمیان کچھ دیر تک باقاعدہ جنگ ہوتی رہی، تب کہیں قاتل گرفتار ہوا، اسے عدالت سے پھانسی کی سزا دی گئی لیکن آخری وقت تک وہ اس سے انکار کرتا رہا کہ کوئی اور بھی اس کا شریک جرم ہے۔ (۱)

معزولی کا سوال: ان حادثات کا اثر مراد کے دماغ کے لیے تباہ کن ثابت ہوا، اس کی

صحت کی طرف سے اب مایوسی ہونے لگی، سلطنت کے لیے یہ صورت حال نہایت نازک تھی، مجلس وزرا میں دو جماعتیں قائم ہو گئیں، صدر اعظم محمد رشدی پاشا اور اکثر وزرا یہ جانتے تھے کہ مراد اصلاحات کا حامی ہے، اس لیے وہ اسے معزول کر کے اصلاحات کو خطرہ میں ڈالنے پر تیار نہ تھے، خصوصاً اس وجہ سے کہ آئندہ سلطان کے طرز عمل کے متعلق انھیں کوئی سگاہی نہ تھی، اس بنا پر ان کی رائے تھی کہ صبر سے کام لینا چاہیے اور مراد کی صحت یابی کا انتظار کرنا چاہیے۔

دوسری طرف سلطان کے بہنوئی داماد محمود جلال الدین پاشا کی پارٹی تھی، جس میں قصر سلطانی کے بعض اعلیٰ عہدہ داروں کے علاوہ فوج کے دو ایک با اثر مارشل مثلاً ردیف پاشا کمانڈر قسطنطنیہ شامل تھے، یہ لوگ مدحت پاشا اور حامیان دستور کے خیالات سے متفق نہ تھے، وہ دیکھتے تھے کہ اگر مراد معزول نہ کیا جائے گا تو ان کی امیدیں پوری نہ ہو سکیں گی، کیوں کہ وزارت میں ان کی اقلیت تھی، قصر سلطانی میں ضیاء اور کمال بے جیسے لوگوں کا اقتدار تھا اور باب عالی میں حامیان اصلاح کی حکومت تھی، لیکن اگر مراد معزول کر دیا گیا اور شہزادہ عبدالحمید تخت پر آیا تو اصلاحات کی پوری سکیم درہم برہم ہو جائے گی اور وہ خود برسر حکومت آجائیں گے، ان کے پیش نظر زیادہ تر اپنا ذاتی اقتدار تھا، اس پارٹی کی پشت پر رجعت پسندوں کی پوری جماعت تھی۔

بد قسمتی سے صورت حالات بھی اسی جماعت کے موافق تھی، عثمانی قانون کے رو سے کوئی ایسا شخص جس کا دماغ پوری طرح صحیح نہ ہو، سلطان نہیں ہو سکتا تھا، عثمان اول کی توار باندھنے کی رسم بھی بوتخت نشینی کی ایک ضروری اور نہایت اہم رسم تھی ابھی ادا نہیں ہوئی تھی، ابھی تک کوئی سلطان نماز جمعہ اور اس کے بعد کی رسم سلامتی سے غیر حاضر نہیں ہوا تھا، ان موقعوں پر مراد کے موجود نہ ہونے سے عوام میں بجا طور پر تشویش پھیل رہی تھی، یورپین حکومتیں الگ دخل انداز ہو رہی تھیں، ان کے سفر ایہ سوال کرتے تھے کہ انھیں کب اور کس سلطان کے سامنے اپنے سفارت نامے پیش کرنے چاہئیں۔

ان حالات میں مجلس وزرانے یہ فیصلہ کیا کہ مدحت پاشا، ولی عہد سلطنت شہزادہ عبدالحمید سے زبانی گفتگو کر کے یہ معلوم کر لیں کہ اصلاحات کے جاری کرنے میں اس کے تعاون پر اعتماد کیا جاسکتا ہے یا نہیں اور اگر اس طرف سے اطمینان ہو جائے تو اسے تخت پر بٹھانے سے پہلے مندرجہ ذیل شرائط منظور کرائیے جائیں۔

(۱) بتا تاخیر جدید دستور حکومت کا اعلان کر دیا جائے گا۔

(۲) امور حکومت میں صرف ذمہ دار وزیروں سے مشورہ کیا جائے گا۔

(۳) ضیا بے اور کمال بے کو کاتب خاص (پرائیویٹ سکرٹری) اور سعد اللہ

بے کو باشکاتب (چیف سکرٹری) مقرر کیا جائے گا۔

مراد کا عزل: عبدالحمید نے مدحت پاشا کی یہ تینوں شرطیں منظور کر لیں، اس کے وعدہ پر اعتماد کر کے وزرانے مراد کو معزول کرنے کا فیصلہ کیا، معزولی سے پہلے صدر اعظم رشیدی پاشا نے مراد کے دماغی اختلال کی نسبت قسطنطنیہ کے چھ بڑے بڑے ڈاکٹروں سے تصدیق کرائی، ان سب نے متفقہ طور پر لکھا کہ اگر مدت دراز کے بعد خلاف توقع مراد کا دماغ درست بھی ہو جائے تو بھی وہ اپنی اصلی حالت پر کبھی نہ آسکے گا، چنانچہ اختلال دماغ کی بنا پر شیخ الاسلام نے اس کے عزل کا فتویٰ دیا اور ۱۲ شعبان ۱۲۹۳ھ مطابق یکم ستمبر ۱۸۷۶ء کو وزرانے اسے تخت سے اتار کر شہزادہ عبدالحمید کو اس کی جگہ بٹھایا۔

سلطان عبدالحمید خاں ثانی

۱۲۹۳ھ تا ۱۳۲۷ھ مطابق ۱۸۷۶ء تا ۱۹۰۹ء

عبدالحمید کو تخت پر لانے سے پہلے مدحت پاشا اور ان کی پارٹی نے تین شرطیں اس سے منظور کرائی تھیں: (۱) قانون اساسی کا اعلان (۲) امور سلطنت میں صرف ذمہ دار وزیروں سے مشورہ کرنا (۳) ضیاء اور کمال بے کوکاتب خاص (پرائیویٹ سکریٹری) اور سعد اللہ بے کوباشکاتب (چیف سکریٹری) مقرر کرن، لیکن عنان حکومت کو ہاتھ میں لینے کے بعد عبدالحمید نے آخری دو شرطوں کی مطلق پابندی نہیں کی اور پہلی شرط صرف نام کے لیے پوری کی، پہلے ہی تقررات سے اس کی آئندہ پالیسی کا اندازہ ہو گیا، اس نے داماد محمود جلال الدین پاشا کو مشیر سر اسے سلطانی (Grand Marshal the Palace) اور انگلیز سعید پاشا (۱) کو رئیس یاوریہ (فرسٹ ایڈی کاٹنگ) کے عہدہ پر مقرر کیا، یہ دونوں مدحت پاشا کی جماعت کے خلاف تھے، لیکن چوں کہ ان عہدوں کا تعلق قصر سلطانی سے تھا، اس لیے ان کا تقرر تمام تر سلطان کی ذاتی رائے پر منحصر تھا مگر باشکاتب (چیف سکریٹری) کا معاملہ بالکل دوسرا تھا، یہ عہدہ دار ہمیشہ سے سلطان کا دست راست ہوتا آیا تھا اور اسی کے ذریعہ سے سلطان اور وزراء کے درمیان تمام (۱) سعید پاشا نے چوں کہ انگلستان جا کر تعلیم حاصل کی تھی اس لیے ”انگلیز“ کا اضافہ اس کے نام میں کر دیا گیا تھا اور وہ اسی امتیاز کے ساتھ مشہور ہو گیا تھا۔

مراسلت ہوا کرتی تھی، چوں کہ وہ برابر سلطان کی خدمت میں حاضر ہوتا رہتا تھا اس لیے اس کی اہمیت غیر معمولی تھی، اس کا عہدہ صدر اعظم کے عہدہ کے برابر اہم سمجھا جاتا تھا، یہی وجہ تھی کہ مدحت پاشا نے عبد الحمید سے شروع ہی میں یہ طے کر لیا تھا کہ وہ اس جگہ پر سعد اللہ بے کو مقرر کرے گا، لیکن اس نے بجائے سعد اللہ بے کے سعید بے کو (جو محمود پاشا کا آدمی تھا) چیف سکریٹری مقرر کر دیا، مدحت پاشا نے تمام وزیروں کی طرف سے اس فیصلہ پر نظر ثانی کرنے کی بہ اصرار درخواست کی لیکن عبد الحمید نے اپنا حکم نہ بدلا۔

صدارت مدحت پاشا: دسمبر ۱۸۷۶ء میں سلطان نے مدحت پاشا کو صدر اعظم مقرر کیا، پہلی ہی مجلس وزارت میں جو ان کے زیر صدارت محمود پاشا کے مکان پر منعقد ہوئی مخالف پارٹی کے ممبروں کی نیت ظاہر ہو گئی، جب قانون اساسی اور اس کے اعلان کا مسئلہ زیر بحث آیا تو جو دت پاشا وزیر عدل نے جو محمود پاشا کی پارٹی میں خفیہ طور پر شامل تھا یہ تجویز پیش کی کہ دستور کا مسئلہ فی الحال ملتوی کر دیا جائے کیوں کہ نئے سلطان کی تخت نشینی کے بعد اس کی ضرورت باقی نہیں رہی، مدحت پاشا کو اس پر سخت غصہ آیا اور انھوں نے جواب دیا کہ مراد کو معزول کرنے اور عبد الحمید کو تخت پر لانے کا مقصد ہی یہ تھا کہ دستور اساسی کا اعلان جلد سے جلد کر دیا جائے، انھوں نے محمود، جو دت اور ان کی پارٹی کے ممبروں کو صاف الفاظ میں متنبہ کر دیا کہ اگر اس بنیادی مسئلہ کے طے کرنے میں کچھ بھی پس و پیش کیا گیا تو وہ اپنے عہدہ سے مستعفی ہو جائیں گے، مصلحت دیکھ کر مخالفین اس وقت خاموش ہو گئے۔

ملک میں دستور کے اعلان کا بے چینی سے انتظار ہو رہا تھا، اسی اثنا میں اخبار استقبال میں چند مضامین شائع ہوئے، جن سے دستور کی اشاعت کے متعلق سلطان کے خلوص نیت میں شبہ کا اظہار ہوتا تھا، یہ مضامین قصر سلطانی میں سخت ناگواری کی نظر سے دیکھے گئے اور یہ خیال کیا گیا کہ ان کا لکھنے والا ضیاء بے کے علاوہ کوئی دوسرا نہیں ہے، چنانچہ سلطان نے ضیاء بے کو قسطنطنیہ سے ہٹا دینے کا عزم کر لیا اور اسے بحیثیت سفیر کے

برلن بھیجنے کا حکم صادر کیا، اس سے یہ غرض بھی تھی کہ اہل قسطنطنیہ ضیاء کو آئندہ پارلیمنٹ میں ممبر منتخب نہ کر سکیں جیسا کہ انھوں نے فیصدہ کر لیا تھا، اس کے بعد سلطان نے استقبال کی اشاعت بھی بند کر دی۔

دستور اساسی کا اعلان: بالآخر ۲۳ دسمبر ۱۸۷۶ء کو دستور اساسی کا اعلان کیا گیا، باب عالی کے سامنے کھلے میدان میں ایک وسیع شہ نشین بنا کر اسے پھولوں سے خوب آراستہ کیا گیا تھا، وہاں تمام اعیان حکومت، علما اور وزراء جدید دستور کا اعلان سننے کے لیے جمع ہوئے، جس کی نسبت یہ توقع قائم کی گئی تھی کہ سلطنت عثمانیہ کے ایک نئے دور کا افتتاح کرے گا، سڑک پر دو روئیہ فوجوں کی قطار تھی، فوجی بینڈ کی آواز پر مجمع کی نگاہیں ادھر اٹھیں اور سعید پاشا پورے یونیفارم میں آتا ہوا دکھائی دیا، اس نے سلطان کا خط ہمایوں، جو صدر اعظم کے نام تھا اور جس کے ساتھ دستور اساسی کا مسودہ بھی تھا، لا کر مدحت پاشا کو دیا، خط ہمایوں اور دستور کا مسودہ حاضرین کو پڑھ کر سنایا گیا اور اسی وقت دستور کی ہزاروں چھپیں ہوئی نقلیں مجمع میں تقسیم کی گئیں، اس کے بعد مدحت پاشا نے تقریر کی جس میں سلطان کا شکریہ ادا کیا اور اس دستور کی اہمیت حاضرین کو سمجھائی، جب انھوں نے تقریر ختم کی تو مفتی اور نہ نے دعا مانگی اور سب نے آمین کہی اور ایک سو ایک توپوں کی سلامی کے ذریعہ قسطنطنیہ کے تمام باشندوں کو اطلاع دی گئی کہ دستور اساسی کا اعلان ہو گیا۔

اس دستور کے رد سے ایک پارلیمنٹ قائم کی گئی جو دیوانوں پر مشتمل تھی: دارالاعیان اور دارالمجموعین، دارالاعیان کے ممبروں کا انتخاب نامزدگی کے ذریعہ اور دارالمجموعین کے ممبروں کا کثرت رائے سے ہونا قرار پایا، پارلیمنٹ کے ماتحت ایک کابینہ وزارت بھی قائم کی گئی، سلطان کی تمام رعایا کو بلا امتیاز مذہب و ملت برابر حقوق دئے گئے اور حکومت کے عہدے سب کے لیے یکساں طور پر کھول دئے گئے، دستور میں اس بات پر خاص طور سے زور دیا گیا تھا کہ سلطنت کے تمام باشندوں کے لیے ایک مشترک قانون نافذ کیا جائے اور ان سب کا سرکاری نام خواہ وہ کسی قوم یا فرقہ سے تعلق

رکھتے ہوں عثمانی، قرار دیا گیا، اس کے علاوہ فرمان میں جلسوں اور پریس کی آزادی، عدل و انصاف کے قیام اور جبری تعلیم کا بھی وعدہ کیا گیا۔

دستور اساسی کے اعلان پر ملک کے ہر طبقہ نے مسرت کا اظہار کیا، علما شیخ الاسلام خیر اللہ آفندی کی قیادت میں، عیسائی پادری اپنے بطریقوں کے ساتھ، شاہکار آفندی جو قسطنطنیہ کے کبار علما میں تھے طلبہ کی جماعت لے کر اور دار السلطنت کے عام باشندے جھنڈے لیے ہوئے جن پر 'آزادی' کا لفظ منقوش تھا، مدحت پاشا کے مکان پر مبارک باد دینے کے لیے آئے، شام کے وقت تمام مسجدوں میں چراغاں کیا گیا، لوگ مشعلیں لیے ہوئے سڑکوں پر گشت کرتے تھے اور "سلطان زندہ باد" اور "مدحت پاشا زندہ باد" کے نعرے لگاتے تھے، سلطنت کے تمام صوبوں سے مبارک باد کے تار آئے، جن میں مسرت کا اظہار کیا گیا تھا، دوسرے روز صبح کو مدحت پاشا یونانی اور آرمینی بطریقوں اور یہود کے بڑے ربی کے پاس گئے، ان کی مبارک باد کا شکریہ ادا کیا اور انھیں ترغیب دی کہ ملک کی فلاح و بہبود کے لیے ایک علم کے نیچے متحد ہو کر کام کریں، بطریقوں نے ان کا پر جوش استقبال کیا، مدحت پاشا نے اپنی تقریر میں کہا کہ وہ مسلمان اور عیسائیوں میں کوئی فرق نہیں کرتے کیوں کہ دونوں ایک ہی ملک کے باشندے ہیں۔

ایک بدگمانی: عیسائی رعایا کے لیے دستور اساسی کا اعلان خواہ کتنی ہی مسرت کا باعث ہوا ہو، یورپین حکومتوں خصوصاً برطانیہ کو یہ چیز پسند نہ آئی کیوں کہ اس سے دولت علیہ کے اندرونی معاملات میں ان کی مداخلت کا بہت کچھ سد باب ہو رہا تھا، چنانچہ سب سے پہلا اعتراض یہ کیا گیا کہ اس دستور کا مقصد محض دول یورپ کی اس کانفرنس کو شکست دینا تھا جو عیسائیوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے قسطنطنیہ میں منعقد ہونے والی تھی، یہ صحیح ہے کہ دستور کا اعلان اسی روز ہوا جس روز کانفرنس منعقد ہوئی لیکن اس کے لیے مدحت پاشا اور ان کے ساتھی ایک سال سے کوشش کر رہے تھے جیسا کہ سر ہنری ایٹ سفیر برطانیہ کے ایک خط سے صاف معلوم ہوتا ہے، جو رسالہ نائنٹیٹھ سچری (Nineteenth Century)

بابت فروری ۱۸۸۸ء میں شائع ہوا تھا، سرہنری لکھتے ہیں:

”دسمبر ۱۸۷۵ء کے شروع میں مجھ سے مدحت پاشا کے ایک ساتھی نے بیان کیا جو سلطنت کے بعض اعلیٰ ترین عہدوں پر مامور رہ چکا تھا کہ مدحت پاشا کی پارٹی کا مقصد ایک دستور اساسی حاصل کرنا تھا، یہ واقعہ دستور کے اعلان سے ایک سال سے زیادہ پہلے کا ہے، جبکہ یہ کہا گیا کہ دستور کا اعلان محض اس لیے کیا گیا ہے کہ اس کا نفرنس کو شکست دی جائے جو اس وقت قسطنطنیہ میں منعقد کی گئی تھی، چند دنوں کے بعد مدحت پاشا خود مجھ سے ملنے آئے اور اپنے خیالات کو اس تفصیل سے بیان کیا کہ اس سے پہلے کبھی اس طرح بیان نہیں کیا تھا، گو میں ان خیالات کے عام منشا سے واقف تھا، انھوں نے بیان کیا کہ سلطنت تیزی کے ساتھ بربادی کی طرف لائی جا رہی ہے، رشوت ستانی اور دوسری بے عنوانیاں جس حد تک پہنچ چکی ہیں اس سے پہلے کبھی نہیں پہنچی تھیں، سرکاری محکمے روپیے سے بالکل خالی ہیں، لیکن کروڑوں روپیے قصر سلطانی میں پہنچ رہے ہیں، صوبے گورنروں کی بے روک ٹوک سے جنھوں نے اپنے عہدے قصر سلطانی سے خریدے ہیں برباد ہو رہے ہیں، جب تک پورا نظام نہ بدل دیا جائے کوئی چیز سلطنت کو بچا نہیں سکتی، مدحت پاشا کے نزدیک اس کا واحد علاج یہ تھا کہ پہلے سلطان پر قابو حاصل کیا جائے، اس طرح کہ وزیر اکو ذمہ دار بنا کر بالخصوص مالیات میں ایک قومی مجلس عمومی کا جواب دہ بنادیا جائے، دوسرے یہ کہ اس مجلس کو حقیقی طور پر قومی بنایا جائے، جس کی صورت یہ ہے کہ مختلف طبقات اور مذہبوں کے تمام امتیازات مٹا دیے جائیں اور عیسائیوں کو بالکل مسلمانوں کے مساوی حقوق دے دیے جائیں،

تیسرے یہ کہ مرکزیت تو ذکر مقامی حکومت قائم کر دی جائے اور گورنروں کو صوبہ جاتی نگرانی کے ماتحت رکھا جائے، یقیناً اسے تسلیم کرنا چاہیے کہ یہ خیالات روشن خیالی پر مبنی اور مدبرانہ تھے اور حوصلہ افزائی کے مستحق تھے، مدحت پاشا نے بار بار اس کا ذکر کیا کہ انگریز قوم کی ہمدردی مصلحین کے لیے کس قدر قیمتی ہوگی اور کس طرح ان کے ہم وطن انگلستان کی مثال کو سامنے رکھ کر اس کی تقلید کرنی چاہتے ہیں، میں نے جواب دیا کہ مجھے اس میں ذرا بھی شبہ نہیں ہے کہ ان کے قائم کیے ہوئے اصولوں پر جو تجویزیں مرتب کی جائیں گی، انہیں ہر انگریز جو میری طرح مطلقیت کے لیے دستوری حکومت کی پابندیوں کے فوائد کا قائل ہے ضرور پسند کرے گا اور ان کی کامیابی چاہے گا، میں نے دیانت داری کے ساتھ انہیں اس کا یقین دلایا تھا کہ کیوں کہ بلاشبہ سب سے آخری چیز جس کی میں توقع کر سکتا تھا یہ تھی کہ جو لوگ اس ملک میں دستوری اصولوں کے لیے اپنی سرگرمی کا سب سے زیادہ مظاہرہ کرتے ہیں وہی سب سے پہلے ان لوگوں کی تحقیر و تذلیل اور ان کی تجویزوں کا استہزاء کریں گے جو ان اصولوں کو اپنے ملک میں رائج کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔“ (۱)

اس موقع پر برٹش پارلیمنٹ کے ایک ممبر جوزف کاوین (Joseph Cowen) کی ایک تقریر کا اقتباس بھی بے محل نہ ہوگا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ برطانیہ کے ارباب حکومت ترکی میں دستوری حکومت کے قیام کو کس نظر سے دیکھتے تھے، مسٹر کاوین ۳۱ جنوری ۱۸۸۰ء کو انگلستان کی خارجی پالیسی پر تقریر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

”ترکی میں سالوں سے ایک سرگرم اور محبت وطن پارٹی

موجود ہے، جو اپنے ادارت کو مغربی طرز زندگی اور یورپین ضروریات کے مطابق بنانے کی کوشش کر رہی ہے، اس پارٹی کا سیدھا سدا پروگرام یہ ہے کہ اس جزیرہ نما کی مختلف قوموں کو باہم ملا کر ایک متحدہ حکومت قائم کی جائے، جس کی بنیاد سب کی مذہبی اور سیاسی مساوات پر ہو، نواد پاشا اور عالی پاشا نے ان اصولوں کے لیے مدت تک جدوجہد کی اور اب انہی اصولوں کو اسی خلوص کے ساتھ مدحت پاشا اور ان کے حامی پیش کر رہے ہیں، ہر مذہب اور قوم کے لوگ ایک ہی سطح پر رکھے جائیں گے، اس پروگرام کی تائید عیسائی اور مسلمان دونوں یکساں طور پر کر رہے ہیں مگر ان ترک مصلحین کی مخلصانہ کوششوں کا ذکر جس تحارت کے ساتھ انگلستان کے لیبرل سیاست داں کرتے تھے وہ اس بحث کے مجملہ دیگر قابل افسوس واقعات کے ایک نہایت تکلیف دہ اور افسوس ناک واقعہ تھا، جو بھی ترکی دستور پر آوازے کستا یقیناً لیبرل گورنمنٹ کے حامیوں کا کام نہ تھا کہ وہ اس کے لیے تحقیر و استہزا کا طریقہ اختیار کرتے، بلاشبہ ایسی حکومت کے قیام کا تصور ناممکن نہیں ہے جس میں مسلمان اور عیسائی دونوں متحد ہوں اور جو ہمہک اثر اس وقت قسطنطنیہ پر غالب ہے، وہ ترکی کی سیاسی زندگی سے دور

کر دیا جائے۔“ (۱)

قسطنطنیہ کی کانفرنس: ۲۳ دسمبر ۱۸۷۶ء کو جس روز قانون اساسی کا اعلان ہوا قسطنطنیہ میں دولی عظمیٰ کے نمائندوں کی کانفرنس منعقد ہوئی، ابتدائی کارروائی مشکل سے ختم ہوئی تھی کہ باسفورس کے دوسرے کنارہ سے توپوں کی آواز آنے لگی، صفوت پاشا وزیر خارجہ دولت عثمانیہ نے کھڑے ہو کر ارکان مجلس کو مخاطب کیا اور کہا کہ ان توپوں کی

(۱) تقریرات جازف کا دین مطبوعہ لندن ۱۹۰۹ء

آواز جو آپ سن رہے ہیں وہ سلطان المعظم کی طرف سے اعلان قانون اساسی کی دلیل ہے اور یہ قانون بلا استثناء سلطنت کی تمام رعایا کے حقوق و حریت کا کفیل ہے، کانفرنس کا جو مقصد تھا وہ حاصل ہو گیا، اب اس کا انعقاد اور اس کی کارروائیاں فصول ہیں، صفوت پاشا کی تقریر سے مجلس پر سناٹا چھا گیا، چند لمحوں کے بعد اگناٹیف نے مہر خاموشی توڑی اور یہ تجویز پیش کی کہ کانفرنس کو اپنا کام شروع کرنا چاہیے، دول عظمیٰ کے وکلا ایک مہینہ سے قسطنطنیہ میں مقیم تھے اور باہم جلسے کر رہے تھے، ان جلسوں میں ترک مندوبین عمداً شریک نہیں کیے گئے تھے، ۲۳ دسمبر کے باضابطہ اجلاس سے پہلے وہ لائحہ عمل جو دولت عدیہ کے سامنے پیش کیا جانے والا تھا طے کر لیا گیا تھا، اس غیر معمولی کارروائی کا مقصد باب عالی کو یہ یقین دلانا تھا کہ کانفرنس جو فیصلہ کرے گی وہ دول یورپ کا متفقہ فیصلہ ہوگا اور باب عالی کو یہ توقع نہ رکھنی چاہیے کہ وہ دول عظمیٰ کی رقابتوں سے کچھ فائدہ اٹھا سکے گا چونکہ تمام معاملات حقیقتاً پہلے ہی طے کر لیے گئے تھے اس لیے کانفرنس کا کام صرف اتنا رہ گیا تھا کہ اپنے فیصلوں کو باضابطہ طور پر مرتب کر دے، چنانچہ کانفرنس کی کارروائی رومی سفیر کی اس تجویز سے شروع ہوئی کہ صوبہ بلغاریا کو حکومت خود اختیاری دے دی جائے، وہاں ایک عیسائی والی مقرر کیا جائے، ایک قومی ردیف قائم کی جائے اور ترکی فوجیں صرف چند متعین قلعوں میں باقی رکھی جائیں، ترک مندوبین کے اس جواب پر کہ یہ امور دائرۂ بحث سے بالکل خارج اور قطعاً ناقابل قبول ہیں، یہ تجویز یوں ترمیم کر دی گئی کہ بلغاریا کو ایک خاص رعایتی گورنمنٹ دے دی جائے، ایک بین الاقوامی کمیشن اس کے انتظامات کی نگرانی کے لیے مقرر کر دیا جائے اور اس کے گورنر کا تقرر دول عظمیٰ کی منظوری سے ہوا کرے، اگناٹیف نے یہ تجویز کم سے کم مطالبہ کے طور پر پیش کی تھی، ترک مندوبین نے اس پر بھی اعتراض کیا اور کہا کہ سرویا اور رومانیہ کی مثالیں سامنے ہیں، جن کو مخصوص رعایتی حکومتیں دی گئی تھیں اور وہی خاص انتظامات ان کے لیے بھی کیے گئے تھے جو بلغاریا کے لیے تجویز ہو رہے ہیں لیکن نتیجہ کو دیکھتے ہوئے اسی تجویز کو بلغاریا میں

دہرانا مناسب نہیں معلوم ہوتا، انھوں نے بتایا کہ سرویا اور رومانیہ کی مسلمان آبادی کے ساتھ رواداری اور مساوات کا وہ سلوک نہیں کیا گیا جس کا وعدہ کیا گیا تھا اور جو بطور شرط کے منظور کیا گیا تھا، برخلاف اس کے وہاں کے مسلمان باشندے ترک وطن پر مجبور ہوئے، علاوہ بریں یہ ریاستیں زیادہ سے زیادہ مراعات حاصل کرنے کے بعد بھی جب کہ انھیں کسی قسم کی شکایت کا موقع باقی نہ رہ گیا، سلطنت عثمانیہ کے دشمنوں سے اتحاد کرنے یا اس کے خلاف سازش کرنے سے کبھی باز نہ آئیں، بالآخر طویل بحث و مباحثہ کے بعد دولِ عظمیٰ کے نمائندوں کی طرف سے کم سے کم مطالبہ یہ پیش کیا گیا جس میں اب کسی تخفیف کی گنجائش نہ تھی کہ مقامی حکام کی مدد کے لیے ایک تفصیلی کمیشن مقرر کر دیا جائے اور بلغاریا، ہرزیگووینا اور بوسنیا کے صوبوں کے والی پہلے پانچ سال تک دولِ عظمیٰ کی منظوری سے مقرر کیے جائیں، ترک مندوین اس تجویز سے بھی اتفاق نہ کر سکے، انھوں نے کہا کہ تفصیلی کمیشن کا تقرر قوم کے حقوق خاص میں رخنہ اندازی کا باعث ہوگا، جسے منظور کرنا ہمارے اختیارات سے باہر ہے، اس کے علاوہ ایک عملی دشواری یہ بھی ہے کہ ان صوبوں کے لیے کوئی مخصوص انتظام کر دینے سے سلطنت کے دوسرے صوبوں میں بے اطمینانی پیدا ہو جائے گی اور غالب ہے کہ بعض میں شورش بھی رونما ہو جائے، انھوں نے اس بات پر خاص طور سے زور دیا کہ یہ موقع سلطنت کے کسی ایک حصہ کے لیے مخصوص مراعات حاصل کرنے کا نہیں ہے جب کہ سلطان کی طرف سے ایک ایسے دستور کا اعلان کر دیا گیا ہے، جس میں بلا امتیاز تمام رعایا کو سلطنت کے ہر حصہ میں زیادہ سے زیادہ امکانی آزادی اور مساوی حقوق دئے گئے ہیں، اس پر جنرل اگناٹیف نے ایک نہایت سخت تقریر کی جس کے بعد جلسہ برخاست ہو گیا اور ارکان مجلس نے ترک مندوبوں کی اس احتجاجی تقریر کے سننے کا بھی انتظار نہیں کیا جو اگناٹیف کی تقریر کے جواب میں وہ کرنا چاہتے تھے۔ (۱)

مجلس عالیہ کا فیصلہ: بہر حال یہ آخری ترمیم شدہ تجویزِ دولِ عظمیٰ کے نمایندوں نے ایک ایسی میٹم کی شکل میں بابِ عالی میں بھیجی اور یہ دھمکی دی کہ اگر ایک ہفتہ کے اندر اس کا جواب قابلِ اطمینان نہ آیا تو ہم قسطنطنیہ سے روانہ ہو جائیں گے، مدحت پاشا نے سلطان کے حکم سے ایک مجلس عالیہ منعقد کی جس میں سلطنت کی تمام قوموں کے نمائندے شریک کیے گئے اور ان کے سامنے کانفرنس کی یہ آخری تجویز پیش کی گئی، مدحت پاشا نے اپنی تقریر میں صاف صاف بتا دیا کہ اگر یہ تجویز مسترد کر دی گئی تو جنگ کے سوا کوئی چارہ نہیں، اس کے بعد حاضرین نے پوری آزادی کے ساتھ اپنی رائے کا اظہار کیا، رؤف بے بنِ رفعت پاشا نے کہا کہ لڑائی مثلِ بخار کی بیماری کے ہے جس سے بچنا ممکن ہے لیکن کانفرنس کی تجویز مثلِ پھیپھڑوں کی دق کے ہے جس کا لازمی نتیجہ قبر ہے، صاوا پاشا نے ایک طویل خطبہ میں کہا کہ ہم اپنی عزت کی اہانت پر موت کو ترجیح دیتے ہیں، وکیل بطریق ارمنی نے بھی ایک لمبی تقریر کی جس میں کانفرنس کے مطالبات کے مسترد کرنے پر زور دیا (۱) غرض مجلس نے متفقہ طور پر دولِ عظمیٰ کے مطالبات منظور کرنے سے انکار کر دیا، دولِ عظمیٰ کے ایسی میٹم کے خلاف مجلس عالیہ کا یہ فیصلہ یقیناً تعجب خیز تھا لیکن اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز وہ اتفاق و اتحاد تھا جو اس نازک موقع پر وطن کی محبت اور عزت کے لیے مجلس کے مسلمان، عیسائی اور یہودی ممبروں میں ظاہر ہو رہا تھا، یونانی اور کیتھولک آرمینی ممبروں کا جوش خصوصیت کے ساتھ بہت نمایاں تھا، بابِ عالی نے مجلس کے اس فیصلہ کی اطلاع دولِ عظمیٰ کے نمایندوں کو دے دی، چنانچہ ۲۰ جنوری ۱۸۷۷ء کو وہ قسطنطنیہ سے روانہ ہو گئے اور کانفرنس برخواست ہو گئی۔

روس سے جنگ: روس نے جنگ کی تیاری شروع کر دی، ۱۶ اپریل ۱۸۷۷ء کو اس نے رومانیہ کے ساتھ اس شرط پر کہ اس کی آزادی اور خود مختاری تسلیم کر لی جائے گی ایک معاہدہ کر لیا جس کے مطابق روسی فوجوں کو رومانیہ کے علاقوں سے گزرنے کی اجازت مل

گئی، اس کے بعد ۲۴ اپریل کو روس نے دولت عثمانیہ کے خلاف باضابطہ اعلان جنگ کر کے اپنی فوجوں کو عثمانی سرحدوں کے عبور کرنے کا حکم دیا اور پانچ روز کے بعد منوئی نیکرو نے بھی صلح توڑ کر از سر نو جنگ شروع کر دی۔

روس نے پہلے ہی کافی تیاری کر لی تھی، رومانیہ کے علاوہ اس نے آسٹریا کی صرف سے بھی اطمینان کر لیا تھا، زار نے رایشٹاٹ (Reichstadt) میں شہنشاہ آسٹریا سے خود ملاقات کر کے اسے مطمئن کر دیا تھا کہ وہ قسطنطنیہ پر قبضہ کرنے کا مطلق ارادہ نہیں رکھتا، نیز یہ معاہدہ بھی کر لیا تھا کہ اگر اس جنگ میں آسٹریا غیر جانبدار رہتا تو بصورت فتح بوسنیا اور ہرزگووینا کے صوبے اس کے حوالہ کر دیے جائیں گے، جنگ شروع کرنے کے چند دنوں بعد (۸ جون ۱۸۷۷ء) روس نے انگلستان کی غیر جانبداری بھی اسی قسم کے ایک معاہدہ سے حاصل کر لی اور وعدہ کیا کہ مصر اور نہر سوئز سے کوئی تعرض نہ کیا جائے گا اور نہ قسطنطنیہ یا آبنائے باسفورس پر حملہ ہوگا۔

بحر اسود پر ترکی بیڑا قابض تھا، اس لیے روسیوں کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ رومانیہ کی راہ سے حملہ آور ہوں، اہل رومانیہ نے نہ صرف روسی فوجوں کو اپنے ملک سے گزرنے کی اجازت دی بلکہ ان کے امیر شہزادہ چارلس اور وزیراعظم نے ملکی پارلیمنٹ پر دباؤ ڈال کر یہ تجویز بھی منظور کرائی کہ روس کی حمایت میں رومانی فوجیں بھی میدان جنگ میں روانہ کر دی جائیں لیکن روسی جنرل گورچاکوف (Gortchakoff) نے رومانی فوجوں کی خدمات قبول کرنے سے حقارت کے ساتھ انکار کر دیا، باب عالی نے رومانیہ کا یہ طرز عمل دیکھ کر جو دولت علیہ کی ایک باج گزار ریاست تھی، رومانی شہر کلفات (Kalafat) پر گولہ باری کا حکم دیا، رومانیہ نے اس کے بعد باضابطہ طور پر اعلان جنگ کر کے اپنی آزادی اور خود مختاری کا اعلان کر دیا۔

۲۲ جون ۱۸۷۷ء کو روسی فوجوں نے دریائے ڈینیوب کو عبور کر لیا اور اب بلغاریہ میدان جنگ بن گیا، ۲۷ جون کو انھوں نے سسٹو اور پھر وہاں سے آگے بڑھ کر

۷ جولائی کو نر نو و پر جو بلغاریا کا قدیم پایہ تخت تھا قبضہ کر لیا، اس کے بعد جنرل گورکوکوہ بلقان کو طے کرتا ہوا درہ شیکہ پر حملہ آور ہوا اور اسے ترکوں سے لے لیا، روس کے لیے اب اور نہ اور وہاں سے قسطنطنیہ کا راستہ کھلا ہوا تھا، اس نازک موقع پر سلطان نے فرانسیسی نو مسلم محمد علی کو جو کریٹ کا گورنر جنرل تھا، تمام عثمانی افواج کا سپہ سالار اعظم مقرر کر کے روسیوں کے مقابلہ میں روانہ کیا، محمد علی کے پہونچتے ہی جنگ کا نقشہ بدل گیا، جنرل گورکوکو اپنے بلغاری حلیفوں کی مدد کے باوجود سناراز گورا میں شکست کھا کر کوہ بلقان کی طرف بھاگا، اسی اثنا میں عثمان پاشا و دین سے نکل کر پلونا میں آ گئے تھے، جو دریائے ڈینیوب کے جنوب میں بیس میل کے فاصلہ پر واقع ہے، جنرل شلد رنے حملہ کرنے میں غلت کی مگر اس کی فوج کو نہایت بے ترتیبی کے ساتھ پسپا ہو کر ناکو پولیس میں پناہ لینی پڑی، اس کے بعد ایک دوسری روسی فوج جنرل کروڈنر کی قیادت میں آگے بڑھی لیکن اسے بھی اپنے آٹھ ہزار مقتول میدان جنگ میں چھوڑ کر بھاگنا پڑا، پلونا کا چھوٹا سا شہر روسی فتوحات کے لیے سب سے بڑا سنگ راہ ثابت ہوا۔

پلونا: مسٹر ایلیں فلپس اس موقع پر لکھتے ہیں: ”اب جنگ کا سارا نقشہ یک بیک بدل گیا تھا، زار گیریڈ قسطنطنیہ پر فاتحانہ شوکت و جلال کے ساتھ پیش قدمی کرنے کا وہ خواب جو باوجود گذشتہ تلخ تجربات کے روسی اب تک دیکھ رہے تھے نسیا منیا ہو گیا، فی الحال تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ سلطنت عثمانیہ نہیں بلکہ روسی سلطنت موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا ہے اور تمام یورپ کی نظریں انتہائی بیم ورجا کے ساتھ اس محاربہ پر جمی ہوئی تھیں، جو بلغاریا کے ایک معمولی شہر کے گرد و نما تھا اور جس کے انجام سے سارے مشرق کی قسمت وابستہ تھی، روسی مستقر جنگی میں اس خطرہ کا پورا احساس تھا، گرینڈ ڈیوک نکولس نے محمد علی کی نقل و حرکت پر نظر رکھنے کے لیے فوج کا ایک حصہ چھوڑا اور فوج کے اصلی حصہ کو جس کی تعداد ستر ہزار تھی ہمراہ لے کر بسرعت تمام پلونا پہنچا، یہاں پہونچ کر ۱۱ ستمبر کو اس نے ایک زبردست حملہ کیا جس کے متعلق امید واثق تھی کہ وہ پچھلی ناکامیوں کی کافی سے زیادہ

تلافی کر دے گا، اس کا انجام سنگین تر ہوا، اس میں شک نہیں کہ داہنے بازو پر رومانیوں اور بائیں بازو پر سکولیف نے ترکی مقامات پر قبضہ کر لیا لیکن مرکزی حملہ خوفناک خون ریزی کے ساتھ جس میں سولہ ہزار مقتول و مجروح ہوئے پسپا کر دیا گیا، ان سب سے زیادہ تہلکہ انگیز وہ خبر تھی جو ایشیا سے موصول ہوئی جہاں مختار پاشا نے روسی حملہ آوروں کو جو میلکاف کے زیرِ کمان تھے سرحد پار بھگا کر غازی کا لقب اختیار کر لیا تھا۔“ (۱)

پے در پے تین حملوں میں ہزیمت اٹھانے کے بعد روسیوں کو اندازہ ہو گیا کہ پلونا کو فتح کرنے کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ اس کا محاصرہ سختی سے کر لیا جائے، یہ تدبیر کارگر ثابت ہوئی، تقریباً پانچ ماہ تک حیرت انگیز استقلال اور جاں بازی کے ساتھ ایک لاکھ بیس ہزار روسیوں کا مقابلہ کرے کے بعد جب سامانِ رسد بالکل ختم ہو گیا تو عثمان پاشا اپنے بیس ہزار قافلہ کش سپاہیوں کو لے کر قلعہ سے نکلنے پر مجبور ہوئے اور اس مہم کے آخر معرکہ میں شجاعت کے انتہائی جوہر دکھا کر ۱۰ دسمبر ۱۸۷۷ء کو انھیں ہتھیار ڈال دینے پڑے۔

ایشیا میں بھی ترکوں کو متعدد شکستیں ہوئیں، روسیوں نے دوبارہ سرحد عبور کر کے قرص، ارض روم اور طرابزون پر قبضہ کر لیا، سرویا کو یہ موقع بہت غنیمت معلوم ہوا، اس نے دولت علیہ کے خلاف اعلانِ جنگ کر کے نیش کے اہم شہر کو فتح کر لیا، دوسری طرف مونٹی نگرو، اسپیز اور ڈسینو پر قابض ہو گیا۔

پلونا کی تسخیر کے بعد جنرل گورکوری فوج کے بڑے حصہ کو لے کر صوفیا کی طرف بڑھا اور ۵ جنوری کو اس پر قبضہ کر لیا، ۲۸ جنوری کو گرانڈ ڈیوک نکولس جو تمام افواجِ روس کا سپہ سالار اعظم تھا، فاتحانہ شان سے اورنہ میں داخل ہوا۔

ستوپ اورنہ کی خبر سے انگلستان اور آسٹریا میں سخت بے چینی پیدا ہوئی، روس نے شروع ہی میں ان دونوں حکومتوں سے وعدہ کر لیا تھا کہ بوسنیا اور قسطنطنیہ سے کوئی تعرض

نہ کیا جائے گا لیکن اب سوال یہ تھا کہ ان فتوحات کے بعد بھی وہ اپنے وعدہ پر قائم رہے گا اسی گھبراہٹ میں آسٹریا نے اپنے حقوق کے تحفظ کے لیے ایک فوج کوہ کارپتھین میں تعینات کر دی اور انگلستان نے ایک بحری بیڑہ خلیج بسیکا میں روانہ کیا، جو دردنیاں کے دہانہ پر واقع ہے، انگلستان کو یہ خطرہ تھا کہ اور نہ کی فتح کے بعد جب کہ ترکوں کی فوجی قوت ٹوٹ چکی ہے، خود قسطنطنیہ کا مسخر ہو جانا کوئی بڑی بات نہیں، یہی وجہ تھی کہ جن لوگوں نے ابتداءے جنگ میں وزیر اعظم لارڈ بیکنس فیلڈ کی مخالفت کی تھی اور روس کے مقابلہ میں سلطنت عثمانیہ کی حمایت کے لیے آمادہ نہیں ہوئے تھے، انھوں نے بھی اب اپنی راے بدل دی اور قسطنطنیہ پر روسی قبضہ کے خلاف خواہ وہ عارضی کیوں نہ ہو شدت کے ساتھ صدارے احتجاج بلند کی، اسی شورش کا نتیجہ تھا کہ حکومت برطانیہ نے اپنے بحری بیڑے کو خلیج بسیکا سے نکل کر دردنیاں میں داخل ہونے کا حکم دیا اور اس اندیشہ سے کہ اب روس سے جنگ چھڑ جانا یقینی ہے، پارلیمنٹ سے مصارف جنگ کے لیے ساٹھ لاکھ پونڈ کی منظوری کی درخواست کی، علاوہ بریں حکومت برطانیہ نے روس کو متنبہ کر دیا کہ اگر اس نے قسطنطنیہ کی طرف کوئی قدم اٹھایا تو یہ اقدام برطانیہ کے ساتھ جنگ کا اعلان سمجھا جائے گا۔

مضبوط اور نہ: اس اثنا میں روس اور دولت علیہ کے درمیان صلح کی گفتگو ہوتی رہی اور ۳۱ جنوری ۱۸۷۸ء کو فریقین کے نمائندوں نے عارضی صلح کے لیے اور نہ میں ایک نوشتہ پر دستخط کر دئے، جو ”مضبوط اور نہ“ کے نام سے مشہور ہے، اس تحریر کے روسے باسفورس اور دردنیاں میں روسی حقوق کی توثیق کی گئی اور طے پایا کہ تاوان جنگ میں جس کی نوعیت بعد کو متعین ہوگی، روس کو ادا کیا جائے گا، یہ بھی طے پایا کہ بلغاریا ایک خود مختار اور باج گزار ریاست بنادی جائے گی اور اس کی حکومت قومی اور عیسائی ہوگی، نیز اس میں ایک قومی ردیف تعینات رہے گی، مونٹی نیگرو، رومانیہ اور سربیا کو خود مختاری دی جائے گی، مونٹی نیگرو کے مقبوضات وسیع کیے جائیں گے، رومانیہ کو تاوان جنگ مقبوضات کی شکل میں

دیا جائے گا، سرویا کی سرحدیں از سر نو درست کی جائیں گی، بوسنیا اور ہرزیگووینا کو اپنے معاملات میں آزادی دے دی جائے گی اور ایسی ہی اصلاحات دوسرے عیسائی صوبوں میں بھی نافذ کر دی جائیں گی، اس صلح نامہ کے رو سے رستحق، سلسٹریا اور وین کے قلعے روس کے حوالہ کر دئے گئے اور بلغاریا میں ترکوں کا قبضہ صرف وارنا کے ضلع پر باقی رکھا گیا۔

اس عارضی صلح کے بعد گرانڈ ڈیوک نکولس نے اپنا فوجی مستقر بحر مارمورا کے ساحل پر سان اسٹیفانو میں قائم کیا، جہاں سے قسطنطنیہ کے منارے نظر آتے تھے، برطانیہ نے اپنے جنگی جہازوں کو جزائر الملوک سے کچھ فاصلہ پر جہاں سے قسطنطنیہ نظر آتا تھا، مستعذر بننے کا حکم دیا، اندیشہ تھا کہ روس اور برطانیہ میں غمخیز جنگ چھڑ جائے گی، آسٹریا بھی آمادہ پیکار نظر آتا تھا، کاؤنٹ اندرا سی نے علی الاعلان اس امر کا اظہار کر دیا تھا کہ جو شرائط اور نہ میں طے ہوئے ہیں وہ آسٹریا ہنگری کے اغراض و مقاصد کے خلاف ہیں۔

معاهدہ سان اسٹیفانو: اس درمیان میں ۳ مارچ ۱۸۷۷ء کو روس اور سلطنت عثمانیہ کے درمیان ’’معاهدہ سان اسٹیفانو‘‘ پر دستخط ہو گئے، جس کے شرائط مضبوط اور نہ میں پہلے ہی طے ہو گئے تھے، اس معاہدہ کے رو سے قسطنطنیہ، صوبہ تھریس اور اور نہ ترکوں کے قبضہ میں رہنے دئے گئے، سرویا، رومانیہ اور مونٹی نگر و خود مختار ملک تین قراردی گئیں اور ان کے رقبوں میں اضافہ کر دیا گیا، سرویا کونیش اور مٹروویزا کے ضلع دئے گئے اور مونٹی نگر و میں بوسنیا کے کچھ ٹکڑے اور اسپز انتی داری اور ڈیسنو کی بندرگاہیں جو ساحل ایڈریاٹک پر واقع ہیں شامل کر دی گئیں، روس اور آسٹریا کی نگرانی میں بوسنیا اور ہرزیگووینا میں ان اصلاحات کے فوراً نافذ کیے جانے کا وعدہ کیا گیا، جو قسطنطنیہ کی کانفرنس میں پیش کی گئی تھیں، رومانیہ کو جو کچھ ملا وہ اس کی توقع سے بہت کم تھا، اس کو صرف دو برو جا کا علاقہ دیا گیا جو ایک غیر زرخیز علاقہ تھا اور اس میں جو تھوڑی بہت آبادی تھی وہ بھی بلغاریوں اور ترکوں پر مشتمل تھی لیکن دو برو جا کے معاوضہ میں بسر آبیہ کا وہ حصہ جس میں رومانیوں کی آبادی کثرت سے تھی اور جو ’’صلح نامہ پیرس‘‘ کے رو سے علاحدہ کر کے مولڈوویا میں شامل کر دیا گیا تھا، پھر

زار کو واپس کر دیا گیا اور اس میں ایک چھوٹے سے علاقہ کا اور بھی اضافہ کر دیا گیا، جس سے روس کی سلطنت دریائے ڈینیوب تک پہنچ گئی، اس صلح نامہ کی سب سے اہم دفعہ بلغاریہ سے متعلق تھی، بلغاریہ کو ایک باج گزار خود مختار ولایت بنا کر اس کا رقبہ دریائے ڈینیوب سے بحر اٹھین اور بحر اسود تک وسیع کر دیا گیا اور اس میں مشرقی رومیلیا اور مقدونیا کے علاقے بھی شامل کر دئے گئے، طے پایا کہ اس کے لیے ایک عیسائی حکمران خود وہیں کے باشندے منتخب کریں، جس کا تقرر روسی کمشنر کی نگرانی میں دو سال کے لیے ہو، نیز بیچاس ہزار سپاہیوں کی ایک قومی ردیف (میلیشیا) مقرر کی جائے، بلغاریہ کی اس جدید ولایت کے قائم کرنے کا ایک مقصد یہ تھا کہ باب عالی سے اس کے دوسرے صوبوں مثلاً مقدونیا، اپائرس اور البانیا کا براہ راست تعلق منقطع ہو جائے، مندرجہ بالا تبدیلیوں کے علاوہ باب عالی کی طرف سے بلقان کے دوسرے صوبوں میں اصلاحات کے جاری کرنے کا وعدہ کیا گیا، یونان کے رقبہ میں کوئی اضافہ نہیں منظور ہوا، البتہ تحصیل، اپائرس اور کریٹ میں بھی اصلاحات کا وعدہ کیا گیا، ایشیا میں قارص، اردہان، بایزید اور باطوم کے ضلع روس کو ملے، ارض روم دولت عہد کو واپس کر دیا گیا، یہ بھی طے پایا کہ سواحل ڈینیوب کے سارے قلعے منہدم کر دئے جائیں، اس کے علاوہ سلطنت عثمانیہ پر ایک کروڑ بیس لاکھ پونڈ تاوان جنگ بھی عاید کیا گیا۔

اس معاہدہ کی مخالفت: معاہدہ سان اسٹیفانو کے شائع ہوتے ہی ہر طرف سے احتجاج کی آواز بلند ہوئی، یونان نے حکومت برطانیہ سے اپیل کی کہ اس کے حقوق کی مطلق پروا نہیں کی گئی، سر ویل نے شکایت کی کہ اس کے بعض علاقے بلغاریہ میں شامل کر دئے گئے، اہل البانیا نے ایک انجمن قائم کر کے عہد کیا کہ اپنے ملک کا کوئی ٹکڑا اتلا حد نہ ہونے دیں گے اور اس کے لیے ”آخروم تک مت بلہ کریں گے“، رومانیہ نے اس معاوضہ پر جو اس کی خدمات کے صلہ میں اسے دیا گیا تھا، روس کو سخت لعنت ملامت کی اور احتجاج کیا کہ جب تک ان تمام حکومتوں کی منظوری حاصل نہ ہو جائے، جنہوں نے ”عہد نامہ پیرس“

میں اس کے حقوق متعین کر دئے تھے، محض روس اور باب عالی کی باہمی مفاہمت سے اس کے مقبوضات میں کوئی ترمیم جائز نہیں ہو سکتی، حکومت برطانیہ نے یونان اور رومانیہ دونوں کو اطمینان دلایا کہ آئندہ کانگریس میں ان کے حقوق کا لحاظ رکھا جائے گا لیکن برطانیہ کے نزدیک معاہدہ اسٹیفانو کی مخالفت سب سے زیادہ اس لیے ضروری تھی کہ جدید بلغاریہ محض ایک روسی صوبہ بن کر رہ جائے گا اور روس کے لیے قسطنطنیہ کی راہ پھر کھلی رہے گی، روس کی گذشتہ تاریخ سے اس امر کا کافی ثبوت ملتا تھا کہ مشرقی عیسائیوں کے ساتھ اس کی ہمدردی بے لوث نہ تھی، جدید بلغاریہ کو اگرچہ معاہدہ مذکور کے رو سے ایک خود مختار مملکت قرار دیا گیا تھا، تاہم آئندہ دستور حکومت کے لیے یہ پابندی کہ وہ ایک شاہی روسی کمشنر کے زیر نگرانی مرتب کی جائے گی اور اس پر عمل درآمد بھی دو سال تک روس ہی کی نگرانی میں ہوگا، صاف طور پر بتا رہی تھی کہ اس خود مختار مملکت کی حیثیت روس کے ایک صوبہ سے زیادہ نہ ہوگی، برطانیہ اس کو کسی طرح گوارا نہیں کر سکتا تھا، لیکن صرف برطانیہ ہی معاہدہ سان اسٹیفانو کا مخالف نہ تھا، آسٹریا کو بھی اس سے شدید اختلاف تھا راشٹات (Reichstadt) میں جو گفتگو شہنشاہ اور زار کے درمیان ہو چکی تھی، اس کے رو سے آسٹریا، ہونسیا اور ہرزگووینا پر فوجی قبضہ رکھنے کا دعویٰ کرتا تھا، فرانس بھی اپنے مصالح کی بنا پر اس معاہدہ کا مخالف تھا۔

روس اور برطانیہ کا خفیہ معاہدہ: غرض ہر طرف سے معاہدہ سان اسٹیفانو کی مخالفت شروع ہوئی اور ایک جدید بین الاقوامی کانگریس کا مطالبہ کیا جانے لگا، پرشا کے زیرِ اہتمام ہسمارک نے کانگریس کے انعقاد کے لیے برلن کا مقام تجویز کیا اور ایک "ایماندار و اہل" کی حیثیت سے اپنی خدمات پیش کیں، روس نے کانگریس کی شرکت کے لیے آمادگی ظاہر کی، لیکن اس شرط کے ساتھ کہ معاہدہ اسٹیفانو کے صرف وہی دفعات کانگریس کے سامنے رکھے جائیں جن کو پیش کرنا روس مناسب خیال کرے، حکومت برطانیہ کو اصرار تھا کہ تمام دفعات پیش کیے جائیں، اس مسئلہ پر برطانوی وزارت میں اختلاف پیدا ہو گیا اور

لارڈ ڈربی نے استعفادے کر وزارت خارجہ لارڈ ساسبری کے سپرد کردی، جو ترکی سیاست سے پوری طرح واقف تھا اور ہی روز پیشتر قسطنطنیہ کی کانفرنس میں شرکت کر کے انگلستان واپس آیا تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ برطانیہ اور روس میں جنگ عنقریب چھڑ جائے گی، چنانچہ لارڈ بیکنس فیلڈ وزیراعظم نے جنگ کی تیاریاں شروع کر دیں اور ہندوستانی فوجیں مالٹا روانہ کر دی گئیں، دوسری طرف وزیر خارجہ نے ایک کشتی مراسدہ دوسری دولِ عظمیٰ کے پاس بھیج کر ان اعتراضات کو واضح کر دیا جو حکومتِ برطانیہ کو معاہدہ سان اسٹیفانو پر تھے، زار نے یہ دیکھا کہ آسٹریا بھی جنگ کے لیے آمادہ ہے اور رومانیہ میں بھی روس کی بے وفائی کے خلاف سخت برہمی پھیلی ہوئی ہے، علاوہ بریں خود اس کی سلطنت میں بھی بے اطمینانی کے آثار نمایاں تھے، ان حالات سے مجبور ہو کر اسے برطانیہ کی خواہش کے مطابق کانگریس کا انعقاد منظور کرنا پڑا، دونوں حکومتوں کے درمیان ایک خفیہ معاہدہ ہوا جس میں وزارتِ برطانیہ نے وعدہ کیا کہ وہ کانگریس میں صلح نامہ سان اسٹیفانو کے تمام اہم دفعات سے متعلق روس کی حمایت کرے گی، اس شرط کے ساتھ کہ جدید بلغاریہ کی قطع و برید میں روس برطانیہ کا ساتھ دے گا، یہ معاہدہ بالکل خفیہ تھا لیکن وزارتِ خارجہ کے ایک ملازم کی غلطی سے اس کی اطلاع پریس کو ہو گئی، اس معاہدہ کے رو سے جدید بلغاریہ کے تین حصے کیے جانے والے تھے، جو حصہ دریائے ڈینیوب اور سسلہ کوہِ بلقان کے درمیان پڑتا تھا اس کا انتظام سان اسٹیفانو کی تجویز کے مطابق قائم رکھا گیا یعنی سلطان کے زیرِ سیادت یہ ایک خود مختار مملکت قرار پایا اور اس کے فرماں روا کے انتخاب کا حق وہیں کے باشندوں کو دیا گیا، دوسرے حصہ کو بھی جو کوہِ بلقان کے جنوب میں واقع تھا حکومتِ خود اختیاری کے حقوق دئے گئے، لیکن اس پر باب عالی کی نگرانی بہ نسبت پہلے حصہ کے زیادہ رکھی گئی، یہ حصہ مشرقی رومیلیہ کے نام سے موسوم ہوا، تیسرے حصہ کے متعلق جو بحرِ تجکین کے ساحل پر واقع تھا اور جس کی آبادی میں بلغاری، سر دی، یونانی اور مسلمان سب شامل تھے، یہ طے پایا کہ دولتِ عثمانیہ کو واپس کر دیا جائے، اس

شرط کے ساتھ کہ دوسرے یورپین صوبوں کی طرح باب عالی کی طرف سے اس میں بھی اصلاحات جاری کر دی جائیں گی، یہ حصہ اس وقت سے مقدونیا کہا جاتا ہے۔

برلن کانگریس: اس معاہدہ کے طے ہو جانے کے بعد ۱۳ جون ۱۸۷۸ء کو دولِ عظمیٰ کے نمائندوں کی ایک عظیم الشان کانگریس بسمارک کے زیرِ صدارت برلن میں منعقد ہوئی، ویانا کی کانگریس کے بعد جو ۱۸۱۵ء میں منعقد ہوئی تھی یہ اپنی قسم کی سب سے زیادہ اہم یورپین کانگریس تھی، بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کانگریس کو ان تمام مسائل پر از سر نو بحث و تصفیہ کا حق حاصل ہے، جو ”معاہدہ سان اسٹیفانو“ میں مذکور تھے، لیکن بہت جلد یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ روس اور برطانیہ کے خفیہ معاہدہ کی وجہ سے کانگریس کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے کیوں کہ صدارت کی کرسی پر اگرچہ بسمارک متمکن تھے لیکن کانگریس میں لارڈ بیکنس فیلڈ ہی کی شخصیت چھائی ہوئی تھی، ایک ماہ کے بحث و مباحثہ کے بعد جس میں اکثر یہ اندیشہ ہونے لگتا تھا کہ ساری گفت و شنید درہم برہم ہو جائے گی، ۱۲ جولائی کو ایک معاہدہ مرتب ہو گیا اور ارکان کانگریس نے اس پر دستخط کر دئے۔

عہد نامہ برلن: عہد نامہ برلن کے رو سے معاہدہ سان اسٹیفانو کے وہ شرائط جو اپنے اثرات کے اعتبار سے نہایت دور رس تھے بہت کچھ معتدل کر دئے گئے، سب سے زیادہ اہم مسئلہ بلغاریہ مملکت کی نکوین کا تھا، اب بجائے اس کے کہ ایک ایسا بلغاریہ معرض وجود میں آتا جو اپنی وسعت کے لحاظ سے دریاے ڈینیوب سے مجمع الجزائر تک پھیلا ہوتا، جدید خود مختار ولایت کی جنوبی سرحد بلقان سے محدود کر دی گئی، جنوبی بلغاریہ کو جواب مشرقی رومیلیا کے نام سے موسوم ہوا حکومت خود اختیاری کے حقوق دئے گئے لیکن یہ طے پایا کہ اس کے والی کی نامزدگی باب عالی کی طرف سے ہوگی، روس کو بسرابیا کا وہ حصہ دیا گیا جو ۱۸۵۶ء میں رومانیہ کو ملا تھا، ایشیا میں باطوم، اردہان اور قارص پر اس کا قبضہ باقی رکھا گیا، بوسنیا اور ہرزگووینا کے صوبے ایک غیر متعین مدت کے لیے آسٹریا کے حوالہ کر دئے گئے، جسے نووی بازار کے منہ پر بھی فوجی قبضہ رکھنے کی اجازت دی گئی،

رومانیا کو دوبرو جا کے ساتھ بحر اسود پر بندرگاہ قسطنطنیہ دی گئی، بلغاریا کا ایک حصہ نکال کر
 سرویا میں شامل کر دیا گیا، تھسلی اور مقدونیا کے متعلق یونان کے جو مطالبات تھے وہ
 مسموع ہوئے لیکن منظور نہ ہوئے، ایک خفیہ معاہدہ کے رو سے جو ۴ جون کو حکومت
 برطانیہ اور باب عالی کے درمیان طے ہوا تھا لیکن ۹ جولائی کو کانگریس کے سامنے پیش
 ہوا، جزیرہ قبرص انگلستان کے حوالہ کر دیا گیا، اس شرط کے ساتھ کہ سالانہ خراج پابندی
 سے باب عالی میں پیش ہوتا رہے گا، منہی نگر کو وہ تمام مقامات دے دئے گئے جن کا
 وعدہ معاہدہ سان اسٹیفانو میں کیا گیا تھا، یہ علاقہ پہلے سے آزاد تھا، عہدنامہ برلن میں
 اس کی آزادی کا اعلان از سر نو کر دیا گیا تاکہ اسے بین الاقوامی ضمانت حاصل ہو جائے۔
 غرض عہدنامہ برلن نے معاہدہ سان اسٹیفانو کو تقریباً تمام تر باطل کر دیا،
 بلغاریا عظمیٰ کے بجائے جوڈینوب سے بحر اٹھین تک اور بحر اسود سے مقدونیا کی جھیلوں
 تک پھیلی ہوئی، سلطان کی فرماں روائی میں ایک چھوٹی سی خود مختار باج گزار حکومت قیام
 کر دی گئی، جس کی سرحدیں ڈینوب، کوہ بلقان، بحر اسود، سرویا اور مقدونیا کی سرحدوں
 سے محدود کر دی گئیں، کوہ بلقان کے جنوب میں 'مشرقی رومیلیا' کے نام سے ایک خود مختار
 صوبہ قائم کیا گیا، جو براہ راست سلطان کی سیاسی اور فوجی حکومت کے تحت میں رکھا گیا،
 لیکن اس کا انتظام ایک عیسائی گورنر جنرل کے سپرد ہوا جس کے تقرر کے لیے یہ طے پایا
 کہ باب عالی کی نامزدگی اور دولِ یورپ کی منظوری سے پانچ سال کے لیے ہوا کرے،
 یہ بھی قرار پایا کہ بلغاریہ کے فرماں روا کا انتخاب وہاں کے باشندے خود کریں اور اس کا
 تقرر دولِ عظمیٰ کی منظوری کے بعد باب عالی کی طرف سے عمل میں آئے لیکن ان بڑے
 شاہی خاندانوں کے ارکان کے سیسے جو اس وقت برسرِ حکومت تھے، اس عہدہ کی
 امیدواری ممنوع قرار دی گئی، طے پایا کہ جب تک بلغاریا کی 'مجلس اعیان' دستور حکومت
 مرتب نہ کرے حکومت کا انتظام ایک روسی کمشنر کے سپرد کر دیا جائے مگر اس عارضی انتظام
 کی مدت صرف نو ماہ کے لیے محدود کر دی گئی، مشرقی رومیلیا کی تنظیم ایک یوروپین کمیشن کو

تفویض ہوئی اور اس کے لیے تین ماہ کی مدت متعین کی گئی، بوسنیا اور ہرزیگووینا کے صوبے آسٹریا ہنگری کے قبضہ و انتظام میں دے دئے گئے، لیکن ایک خفیہ معاہدہ کے رو سے جو آسٹریا اور باب عالی کے درمیان ۱۳ جولائی ۱۸۷۸ء کو ہوا یہ واضح کر دیا گیا کہ یہ قبضہ عارضی سمجھا جائے گا، رومانیہ کے ساتھ جو معاملہ ہوا وہ اس کی توقع کے بالکل خلاف تھا، اس کی آزادی کے لیے یہ شرط قرار پائی کہ جنوبی بسرابیا کا علاقہ روس کے حوالہ کر دیا جائے اور اس کے معاوضہ میں رومانیہ جنوبی دو برو جا کے لینے پر قناعت کرے، یونان نے کریٹ اور ان عثمانی صوبوں کا مطالبہ کیا تھا جو یونانی حکومت کی سرحد پر واقع تھے، فرانس کے نمائندہ وڈنگٹن (Waddington) نے کانگریس سے اس کی پرزور سفارش کی، لیکن لارڈ بیکنس فیلڈ نے ان مطالبات کی مخالفت کی اور کانگریس نے صرف اس قدر کیا کہ باب عالی سے سفارش کردی کہ یونان میں تھسلی اور اپازس کا ایک حصہ شامل کر دیا جائے، عہد نامہ برلن کی دفعہ (۶۱) کے رو سے باب عالی نے آرمینیا کے میسوپوں کی مقامی ضروریات کے مطابق جلد سے جہد اصلاحات جاری کر دینے کا وعدہ کیا، نیز اس بات کی ضمانت کی کہ آرمینی عیسائی چرکسوں اور کردوں کی دست برد سے محفوظ رکھے جائیں گے، باب عالی نے اس کا بھی وعدہ کیا کہ ان اصلاحات کی اطلاعیں متعین وقفوں کے بعد دولِ عظمیٰ کو دی جاتی رہیں گی، معاہدہ قبرص کے رو سے برطانیہ نے آرمینیوں کے تحفظ کی ذمہ داری خاص طور پر اپنے سر لے لی اور اصلاحات کے وعدہ کے معاوضہ میں جو سلطان کی طرف سے کیا گیا تھا، دولت عثمانیہ کے ایشیائی مقبوضات کو روس کے آئندہ حملوں سے محفوظ رکھنے کا عہد کیا، جزیرہ قبرص اس وقت تک کے لیے برطانیہ کے حوالہ کر دیا گیا جب تک روس گذشتہ جنگ کی ایشیائی فتوحات سے اپنا قبضہ نہ اٹھالے، یہ جزیرہ برطانیہ کو اس غرض سے دیا گیا تھا کہ وہ روس کے مقابلہ کے لیے وہاں سامان جنگ تیار رکھ سکے، سلطان کی فرماں روائی کا حق قائم رکھنے کے لیے سالانہ خراج کی ادائیگی ضروری قرار دی گئی۔

عہد نامہ برلن نے یورپ میں سلطنت عثمانیہ کا تقریباً خاتمہ کر دیا، عثمانی صوبوں کے بجائے یونان، رومانیہ، سربو، مونٹی نیگرو اور بلغاریا کی خود مختار حکومتیں قائم ہو گئیں، جن کا تعلق باب عالی سے محض سالانہ خراج کی حد تک رہ گیا، جو صوبے براہ راست باب عالی کے زیر حکومت رہ گئے ان میں بھی آزادی کی تحریک پیدا ہو چکی تھی، چنانچہ باوجود اس کے کہ ۱۸۷۸ء کے بعد سے سلطان عبدالحمید خاں ثانی کے آخر عہد حکومت تک کسی بیرونی سلطنت سے جنگ کی نوبت نہیں آئی، دولت علیہ کو مسلسل مختلف صوبوں کے اندرونی ہنگاموں اور بغاوتوں کے فرو کرنے میں مصروف رہنا پڑا، علاوہ بریں مذکورہ بالا خود مختار مملکتوں کی طرف سے بھی کوئی نہ کوئی نزاع برابر جاری رہی اور دولِ عظمیٰ کے کسی نہ کسی رکن نے انھیں مدد پہنچا کر دولت عثمانیہ کی شکست و ریخت میں حتی الامکان کوئی دقیقہ اٹھانہ رکھا۔

مونٹی نیگرو کی نزاع: سب سے پہلی نزاع مونٹی نیگرو سے پیش آئی، عہد نامہ برلن کے رو سے مونٹی نیگرو کا رقبہ معاہدہ پیرس کے مقابلہ میں دو چند سے زیادہ ہو گیا تھا اور اس کی آبادی ایک لاکھ چھیانوے ہزار سے بڑھ کر دو لاکھ اسی ہزار تک پہنچ گئی تھی، چند اہم مقامات اس میں شامل کر دئے گئے تھے، نیز انتی واری کا علاقہ مع بندرگاہ کے اس کے حوالہ کر دیا گیا تھا، لیکن شرط یہ تھی کہ جنگی جہاز نہ رکھے جائیں گے، برلن کانگریس نے ڈیسینیو کی بندرگاہ کے لیے یہ فیصلہ کیا تھا کہ وہ دولت عثمانیہ کو واپس کر دی جائے اور اسپانسا (Spica) کا موضع جو خلیج انتی واری کے دبانہ پر واقع تھا، مونٹی نیگرو سے نکال کر آسٹریا ہنگری کی سلطنت میں شامل کر دیا تھا، اس کے معاوضہ میں البانیا کے دوشہر گوسنجا اور پلاوا مونٹی نیگرو کو دے دئے گئے تھے، باب عالی نے مونٹی نیگرو کی آزادی تسلیم کر لی اور مونٹی نیگرو نے اس رقبہ کی مناسبت سے جو سلطنت عثمانیہ سے علاحدہ کر کے اس میں شامل کر دیا گیا تھا عثمانی قرضہ جات کے ایک جزو کی ادائیگی اپنے ذمہ لے لی مگر کانگریس کے اس فیصلہ سے البانیا کے باشندوں میں سخت برہمی پیدا ہوئی، انھوں نے گوسنجا اور پلاوا کو مونٹی نیگرو میں شامل ہونے سے روکنے کے لیے ایک 'البانی لیگ' قائم کی اور دونوں قوموں

میں جنگ شروع ہو گئی، بالآخر دول یورپ نے یہ فیصلہ کیا کہ گوسنچہ اور پلاوا سلطنت عثمانیہ کو واپس کر دے جائیں اور ان کے معاوضہ میں ڈیسنو کا علاقہ اور بندرگاہ پھر مونٹی نیگرو کو دے دیا جائے، باب عالی نے اس فیصلہ کو نامنظور کر دیا، لیکن برطانیہ کی تحریک پر جس کی عنان وزارت گلڈسٹن کے ہاتھ میں آچکی تھی دول یورپ کا ایک جنگی بیڑا ستمبر ۱۸۸۰ء کو ڈیسنو کے سامنے نمودار ہوا اور باب عالی کو مجبور ہو جانا پڑا۔

یونان کا قضیہ: یونان کا مسئلہ مونٹی نیگرو سے بھی زیادہ دشوار تھا، عہد نامہ برلن میں اس کے رقبہ کی توسیع کا کوئی وعدہ نہیں کیا گیا تھا، دولِ عظمیٰ نے صرف اتنا کیا تھا کہ اپائرس اور تھسلی کے الحاق سے متعلق باب عالی سے یونان کی سفارش کر دی تھی، عہد نامہ مذکور کے تکملہ کے بعد تین سال تک دولِ عظمیٰ رہا سہا بے یقینان کی جدید سرحدوں کے متعین کرنے میں مصروف رہیں اور جب رومانیاء، بلغاریاء، سربو یا اور مونٹی نیگرو کی سرحدوں کا معین ہونے لگا تو یونان نے بھی اپائرس اور تھسلی کا مطالبہ پیش کر کے بین الاقوامی تصدیق حاصل کرنی چاہی، چنانچہ برلن میں دولِ عظمیٰ کی ایک کانفرنس نے اس مطالبہ کی سماعت کر کے باب عالی سے سفارش کی کہ تھسلی اور اپائرس کا پورا علاقہ مملکت یونان میں شامل کر دیا جائے لیکن سلطان نے اسے منظور نہ کیا اور چون کہ دولِ عظمیٰ یونان کی خاطر اس وقت دولتِ علیہ سے جنگ چھیڑنے پر آمادہ نہ تھیں، اس لیے یہ مسئلہ بدستور قائم رہا پھر بھی گفت و شنید کا سلسلہ منقطع نہیں ہوا اور دو سال کی جدوجہد کے بعد بالآخر ۱۸۸۱ء میں یہ طے پایا کہ تھسلی کا تقریباً پورا علاقہ اور اپائرس کا ایک ثلث یونان میں شامل کر دیا جائے، یانینا اور دوسرے اضلاع جس میں مسلمانوں کی آبادی تھی، یونانی سرحد سے باہر رکھے گئے۔

مشرقی رومیلیا اور بلغاریا کا اتحاد: عہد نامہ برلن کے مطابق بلغاریا کے عضوی قانون کی ترتیب و تکمیل تک انصرا م حکومت ایک روسی کمشنر کے سپرد کر دیا گیا تھا، دسمبر ۱۸۷۸ء میں مجلس وضع دستور (Conatitutunt Assembly) کے ارکان کا انتخاب عمل میں آیا اور ۲۶ فروری ۱۸۷۹ء کو کمشنر مذکور نے اس مجلس کو طلب کر کے عضوی قانون کی

ترتیب کا مسئلہ پیش کیا، خودکشنر نے دستور حکومت کا جو مسودہ تیار کیا تھا اسے نوجوان ارکان مجلس نے ترمیم و تنسیخ کے بعد ایک حد درجہ جمہوری دستور بنادیا، اس دستور کے مطابق مجلس قانون ساز میں صرف ایک ہی ایوان رکھا گیا، ہر شخص جس کی عمر میں سال سے زیادہ تھی اور جو لکھنا پڑھنا جانتا تھا بشرطے کہ وہ کوئی پادری یا فوجی سپاہی نہ ہو یا ملکی حقوق سے محروم نہ کر دیا گیا ہو، اس مجلس کے لیے منتخب ہونے کا حق رکھتا تھا، ملک کے تمام مرد اس کے رائے دہندہ بنائے گئے، جماعتِ عاملہ کا کام آٹھ وزیروں کی ایک مجلس کے سپرد کیا گیا، ان کی نامزدگی حکمران کے ہاتھ میں رکھی گئی، لیکن جواب ۵۶ مجلس ملیہ کے ٹھہرائے گئے، ارکان مجلس کے انتخاب کے بعد حکمران مملکت کے انتخاب کی باری آئی، عام رائے پرنس الکزنڈر آف بیٹن برگ (Alexander of Batten Berg) کے موافق تھی، مجلس ملیہ کے نزدیک اس کے انتخاب کی اہمیت اس وجہ سے بھی زیادہ تھی کہ وہ زار الکزنڈر دوم کا عزیز تھا اور زار اسے بلغاریا کا حکمران منتخب کرانا چاہتا تھا، چنانچہ اپریل ۱۸۷۹ء میں اس کا انتخاب بلا کسی اختلاف رائے کے ہو گیا اور اس نے بلغاریا پہنچ کر عیان حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی۔

لیکن تھوڑے ہی دنوں کے بعد الکزنڈر اور بلغاریا کی مجلس ملیہ میں اختلافات شروع ہو گئے، الکزنڈر اگرچہ ملک کی خدمت کا پورا دلولہ اپنے اندر رکھتا تھا، تاہم وہ اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا کہ روس کا آدمی ہے، نتیجہ یہ ہوا کہ وزارتیں سرعت کے ساتھ تبدیلی ہونے لگیں اور بہت جلد الکزنڈر اور اس کے روسی مددگاروں کو معلوم ہو گیا کہ یہ دستور حکومت کامیابی کے ساتھ نہیں چل سکتا، چنانچہ ۱۸۸۱ء میں الکزنڈر نے اس دستور کو منسوخ کر دیا اور دو سال تک بغیر کسی قومی مجلس کے حکومت کرتا رہا، دوروی جنرل اس کی حمایت کے لیے پٹرو گراڈ سے بھیجے گئے، انھوں نے وزارت پر اپنا اقتدار بہت جلد قائم کر لیا اور الکزنڈر کو محسوس ہونے لگا کہ اس کی حیثیت محض ایک نام کے فرماں روا کی ہے، اس کے لیے دستور حکومت کو دوبار نافذ کر دینے کے علاوہ اب اور کوئی صورت نہ تھی،

چنانچہ ۱۸۸۳ء میں اس نے مجلس ملیہ پھر طلب کی، ملک میں جو برہمی اس کے خلاف پھیلی ہوئی تھی وہ دستور کے جاری ہوتے ہی جاتی رہی لیکن اب روس کے تیور بدل گئے، دونوں روسی جنرل بلغاریا سے روانہ ہو گئے اور نئے زار الکزنڈر سوم نے اپنے عزیز کے خلاف توقع رویہ پر ناراضگی ظاہر کی، شہزادہ الکزنڈر نے بہت کوشش کہ روس سے مخالفت کی نوبت نہ آئے لیکن جن لوگوں نے اسے اپنا فرماں روا منتخب کیا تھا، ان کے سیاسی حوصلوں سے متفق ہونے کے بعد محال تھا کہ وہ روس کو بھی راضی رکھ سکے، اس وقت اہل بلغاریا کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ مشرقی رومیلیا کا صوبہ جو برلن کانگریس کے فیصلہ کے مطابق باب عالی کو واپس کر دیا گیا تھا، اپنی مملکت میں شامل کر لیں، مشرقی رومیلیا کا نظام حکومت دولِ عظمیٰ کے ایک کمیشن نے اس طرز پر مرتب کیا تھا کہ وہ بھی بلغاریا کا ایک 'ناقص شئی' نظر آتا تھا اور دونوں میں نمایاں فرق صرف یہ تھا کہ ایک کا حکمران خود اسی کا منتخب کردہ تھا اور دوسرے کی حکومت ایک عیسائی گورنر کے سپرد تھی، جس کا تقرر پانچ سال کے لیے باب عالی کی طرف سے ہوا تھا۔

ابتداء ہی سے کوہِ بلقان کے ہردوست کے بلغاریوں کی خواہش تھی کہ یہ دونوں ولایتیں متحد کر دی جائیں، چنانچہ ستمبر ۱۸۸۵ء میں مشرقی رومیلیا کے پاپیہ تخت فلپو پولیس کے باشندوں نے اسی غرض سے علم بغاوت بلند کر کے بلغاریا سے اتحاد کا اعلان کر دیا اور اہل رومیلیا کے ایک وفد نے شہزادہ الکزنڈر کی خدمت میں حاضر ہو کر اسے فلپو پولیس آنے کی دعوت دی، الکزنڈر کا تامل دیکھ کر ایک بلغاری مدبر اسٹامبولوف (Stambuloff) نے صاف الفاظ میں اس سے کہا کہ یا تو حضور فلپو پولیس کی دعوت قبول فرمائیں یہ خاموشی کے ساتھ اپنے جرمن وطن کو واپس تشریف لے جائیں، الکزنڈر نے پہلی صورت کو ترجیح دی، فلپو پولیس میں متحدہ بلغاریا کے فرماں روا کی حیثیت سے اس کا استقبال شاندار طریقہ پر کیا گیا۔

سرویا اور بلغاریا کی جنگ: لیکن یہ معاملہ معاہدہ برن کی صریح خلاف ورزی تھا،

باب عالی کے ملاوہ دولِ عظمیٰ بھی اسکرنڈر کی اس خود سری پر برا فروخت ہوئیں اور انھوں نے اس کے متعلق آپس میں مراسلت شروع کر دی مگر قبل اس کے کہ وہ کوئی عملی قدم بڑھاسکیں، بلغاریا پر سرویا کے غیر متوقع حملہ نے انھیں اپنی طرف متوجہ کر دیا، سرویا کا جذبہ رشک بلغاریا کے اس اقدام سے بھڑک اٹھا تھا، جزیرہ نماے بلقان میں توازنِ قوت کو برقرار رکھنے کے لیے اسے اپنی ممکنہ کی توسیع ضروری معلوم ہوئی، چنانچہ اس غرض سے پہلے تو اس نے عثمانی مقبوضات پر دست درازی کے لیے فوجیں اکٹھ کیں لیکن پھر دولتِ علیہ کی قوت سے خائف ہو کر اچانک ۱۴ نومبر ۱۸۸۵ء کو بلغاریا کی سرحد پر حملہ کر دیا، اہل بلغاریا نے جو قومی جوش سے سرشار ہو رہے تھے نہایت دلیری کے ساتھ مقابلہ کیا اور ۱۹ نومبر کو سلیوٹزا (Slivintza) کے معرکہ میں حملہ آوروں کو زبردست شکست دی، ان کی اس خلاف توقع کامیابی نے سارے یورپ کو حیرت میں ڈال دیا، کیوں کہ سرویا ایک طاقتور حکومت تھی اور بلغاریا سے بہت پہلے آزاد ہو چکی تھی، علاوہ بریں بلغاریا اور مشرقی رومیلیا کے اتحاد سے زار اس درجہ برا فروخت ہوا تھا کہ اس نے جنگ شروع ہونے سے قبل ہی تمام روسی افسروں کو جو بلغاریا کی فوج میں تھے روس واپس بلا لیا تھا، بہر حال سلیوٹزا کی فتح کے بعد بلغاری فوج نے حملہ آوروں کا تعاقب کیا اور سرویا کی سرحد عبور کر کے آگے بڑھی، بلغادکارا سے اب کھلا ہوا تھا لیکن عین اس وقت دولِ عظمیٰ نے مداخلت کی اور حکومت آسٹریا نے الٹی میٹم دے دیا کہ بلغاری فوج ذرا بھی آگے بڑھے گی تو آسٹریا کی طرف سے اعلانِ جنگ کر دیا جائے گا، دولِ عظمیٰ کے دباؤ سے مجبور ہو کر بلغاریا کو صلح کر لینی پڑی اور اسے اپنی فتوحات سے دست بردار ہو جانا پڑا، سرویا تاوانِ جنگ سے بھی بری کر دیا گیا۔

اتحادِ بلغاریا کی تکمیل: لیکن اس جنگ سے بلغاریا کو ایک نمایاں فائدہ یہ پہنچا کہ مشرقی رومیلیا کے اتحاد کی بنا پر دولِ عظمیٰ میں اس کے خلاف جو راست شروع ہو گئی تھی وہ موقوف ہوئی اور بلغاریا اور مشرقی رومیلیا کا اتحاد تسلیم کر لیا گیا، البتہ زار نے اس کی

شدید مخالفت کی، حالاں کہ برلن کانگریس میں اسی کی طرف سے اتحاد پر سب سے زیادہ زور دیا جا رہا تھا، ایسا ہی تعجب خیز برطانیہ کا طرز عمل تھا، اس نے نہ صرف اس اتحاد کی موافقت کی بلکہ اپنے اثر سے سلطان کو بھی اسے منظور کر لینے پر راضی کر دیا، معاہدہ برلن میں یہ طے ہوا تھا کہ مشرقی رومیلیا کا گورنر باب علی کی طرف سے مقرر ہوگا، اس دشواری کو حل کرنے کے لیے سلطان نے اپریل ۱۸۸۶ء میں شہزادہ الکزنڈر کی بیوی کو اس صوبہ کا گورنر مقرر کر دیا، اس کے بعد دونوں ولایتوں کا اتحاد عملاً مکمل ہو گیا، روس کو بھی بدرجہ مجبوری یہ اتحاد تسلیم کرنا پڑا لیکن زار نے الکزنڈر کی یہ خودمختاری معاف نہیں کی، بلغاریا میں ایک سازش کرنے والی روسی جماعت اب بھی موجود تھی اس نے رات کے وقت الکزنڈر کے محل میں گھس کر اسے گرفتار کر لیا اور تاج و تخت سے دست برداری کی ایک تحریر جبراً اس سے حاصل کر لی، اس کے بعد اس جماعت نے اسے سرحد پار سلطنت روس میں پہنچا دیا، اس واقعہ سے بغیریا میں روس کے خلاف سخت شورش برپا ہوئی، جماعت ملی نے اسٹامبولوف کی رہبری میں روسی جماعت کو ملک سے باہر نکال دیا اور پھر شہزادہ الکزنڈر کو واپس آنے کی دعوت دی، چنانچہ وہ فاتحانہ تڑک و احتشام کے ساتھ دوبارہ صوفیا میں داخل ہوا، لیکن اب کی بار وہ روس کی مخالفت اور زار کی خفگی کا مقابلہ نہ کر سکا اور باوجود اس کے کہ بلغاریا کی جماعت ملی، اس کی حمایت کے لیے ہر طرح مستعد تھی، ۷ ستمبر ۱۸۸۶ء کو وہ زار کی خواہش کے مطابق تاج و تخت سے دست بردار ہو گیا، اس کی جگہ شہزادہ فرڈیننڈ آف سیکس کو برگ (Ferdinand of saxf coburg) سلطان کے زیر سیادت متحدہ بلغاریا کا حکمران منتخب کیا گیا۔

دولت یورپ کی مداخلت: سلطان عبدالحمید ثانی کے عہد حکومت میں جو چیز سب سے زیادہ نمایاں نظر آتی ہے وہ سلطنت عثمانیہ کے اندرونی معاملات میں یورپین حکومتوں کی مداخلت ہے، حالاں کہ عہد نامہ برلن میں جس چیز پر خصوصیت کے ساتھ زور دیا گیا تھا، وہ یہی تھی کہ دولت علیہ کے حقوق فرمان روائی غیروں کی دست برد سے محفوظ رکھے

جائیں گے، مداخلت کے لیے کسی حیلہ کا ہاتھ آ جانا بہت آسان تھا، عیسائی رعایا کے حقوق کی حفاظت کا عذر ایک ایسا عذر تھا جس کی معقولیت میں کلام ممکن ہی نہ تھا، چنانچہ اسی عذر کی بن پر مغربی حکومتوں نے ان صوبوں کے آزاد کرانے میں ہر طرح کی کوشش کی، جن میں عیسائیوں کی آبادی مسلمانوں کے مقابلہ میں زیادہ تھی، دولت عثمانیہ کے جس صوبہ نے علم بغاوت بلند کیا اسے یورپ کی کسی نہ کسی حکومت کی حمایت ضرور حاصل تھی، مشرقی رومیلیا نے جب بلغاریا سے اتحاد کا مطالبہ پیش کیا تو انہی حکومتوں نے جن کی طرف سے برلن میں اس اتحاد کی شدید مخالفت کی گئی تھی، سلطان پر دباؤ ڈال کر اس مطالبہ کو منظور کرایا اور پھر چند سالوں کے بعد وہی حکومتیں ایک دوسرے صوبہ کی آزادی کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

کریٹ: کریٹ یورپ میں سلطنت عثمانیہ کا آخری مفتوحہ تھا، یہ ۱۶۶۹ء میں جمہوریہ ونیس کی حکومت سے نکل کر باب عالی کے زیر نگین آیا تھا، اس کے یونانی باشندے ابتدا ہی سے شورش پسند تھے اور دولت علیہ کے خلاف وقتاً فوقتاً بغاوتیں برپا کرتے رہتے تھے، ۱۸۳۰ء میں یہ جزیرہ ان خدمات کے صلہ میں جو محمد علی پاشا نے بغاوت یونان کے فرو کرنے میں انجام دی تھیں، ولایت مصر میں شامل کر دیا گیا تھا لیکن دس سال بعد معاہدہ لندن کے رد سے ۱۸۳۰ء میں یہ پھر دولت عثمانیہ کو واپس کر دیا گیا، ۱۸۳۰ء سے ۱۹۱۲ء تک جب تک کریٹ مملکت یونان میں شامل نہ ہو گیا، اس کے باشندوں نے حکومت کے خلاف چودہ بار بغاوتیں کیں (۱) اور ان تمام بغاوتوں کا مقصد صرف ایک تھا یعنی یونان سے الحاق، چنانچہ ۱۸۶۱ء میں بھی جزیرہ والوں نے حسب دستور بغاوت برپا کی اور ایک مجلس عمومی منعقد کر کے ۲ ستمبر کو سلطنت عثمانیہ سے آزادی اور مملکت یونان سے الحاق کا اعلان کر دیا، تین سال تک بغاوت جاری رہی بالآخر ۱۸۶۸ء میں سلطان نے کریٹ کے دستور حکومت میں چند اہم اصلاحات نافذ کر کے اس بغاوت کا خاتمہ کر دیا،

جدید دستور قانون عضوی (Organic Statute) کے نام سے مشہور ہے، کریٹ کے عیسائیوں کو پہلے سے جو حقوق حاصل تھے جدید دستور کے رو سے وہ از سر نو مستقل کر دیئے گئے، علاوہ بریں کچھ نئی اصلاحات بھی جاری کی گئیں، گورنر جنرل کی مدد کے لیے وائسیر مقرر کیے گئے، جن میں سے ایک عیسائی اور دوسرا مسلمان تھا، جزیرہ کوکوس صوبوں میں تقسیم کیا گیا اور ہر صوبہ میں ایک گورنر مقرر کیا گیا، مسلمان گورنر کے ساتھ عیسائی ایسیر اور عیسائی گورنر کے ساتھ مسلمان ایسیر رکھا گیا، گورنر جنرل کو مشورہ دینے کے لیے ایک مرکزی مجلس انتظامیہ قائم کی گئی، ایسی ہی ایک مقامی مجلس ہر صوبہ کے لیے مقرر ہوئی، پورے جزیرہ کے لیے ایک مجلس نیابہ تجویز ہوئی، عدالتوں میں عیسائی اور مسلمان دونوں فرقوں کے جج مقرر ہوئے، عیسائیوں کو مذمتی تعدی اور ٹیکسوں کی زیادتی کی جو شکایت تھی اس کا تدارک کر دیا گیا۔

لیکن یہ دستور بھی جس کے رو سے کریٹ کے مسلمانوں کے بہترے حقوق جو انھیں پہلے حاصل تھے تلف کر دیئے گئے تھے، عیسائیوں کی تشفی کا باعث نہ ہوا اور انھوں نے یونان سے الحاق کے لیے پھر کوشش شروع کی، چنانچہ ۱۸۷۷ء میں جب روس اور دولت عثمانیہ کے درمیان جنگ چھڑی تو کریٹ کے عیسائیوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھانے میں کوئی بات اٹھانہ رکھی، پہلے ایک کمیٹی قائم کر کے انھوں نے باب عالی سے حکومت خود اختیاری کا مطالبہ کیا اور پھر باب عالی کے انکار پر برلن کانگریس میں دولِ عظمیٰ کے سامنے اپیل پیش کی، دولِ عظمیٰ نے اس اپیل کے جواب میں صرف یہ وعدہ کیا کہ قانون عضوی کی اصلاحات میں اضافہ کر کے انھیں پوری پابندی کے ساتھ نافذ کر دیا جائے گا، چنانچہ اس وعدہ کے مطابق برطانوی سفیر کی وساطت سے قانون عضوی میں اضافہ کر کے معاہدہ ہلپا (Halepa Pact) مرتب کر دیا گیا، اس معاہدہ کے رو سے محمد علی عدالت صیغہ انتظامی سے علاحدہ کر دیا گیا، ایک مجلس عمومی (جنرل اسمبلی) تجویز ہوئی، جس کے ارکان میں انچاس عیسائی اور اکتیس مسلمان رکھے گئے، جزیرہ کے ملکی

باشندے (یعنی عیسائی) سرکاری عہدوں کے لیے زیادہ مستحق قرار دئے گئے اور سرکاری زبان اسمبلی اور عدالت دونوں میں یونانی قرار پائی، مال گزاری کی تنظیم اس طرح کی گئی کہ پبلک ورکس کے لیے کافی روپیہ بچ سکے، کاغذی سکوں کا اجرا روک دیا گیا اور پریس کو آزادی دی گئی، چند دنوں کے لیے ان شورش پسندوں کی زبان بندی ہو گئی لیکن ان کا اصلی مقصد یعنی یونان سے الحاق ابھی تک حاصل نہ ہوا تھا اور کچھ عرصہ کے بعد انھوں نے پھر ہنگامہ برپا کیا۔

معاهدہ بلیپا کے رو سے کریٹ میں دستوری حکومت قائم ہو گئی تھی، اس کا نتیجہ صرف یہ ہوا کہ تھوڑے دنوں کے لیے عیسائیوں اور مسلمانوں کی فرقہ وارانہ کشمکش موقوف ہو گئی اور بجائے اس کے پارلیمنٹری جنگ خود عیسائیوں میں شروع ہو گئی جو مجلس عمومی میں اکثریت رکھتے تھے، اس جنگ میں ملکی مفاد کو بالکل پس پشت ڈال دیا گیا اور عیسائیوں کی مخالف پارٹیاں ایک دوسرے کو شکست دے کر سرکاری عہدے اور اقتدار حاصل کرنے کی کوششوں میں مصروف ہو گئیں، مالیات کا نظام درہم برہم ہونے لگا، جس پارٹی کو شکست ہوتی وہ موجودہ گورنر جنرل کے خلاف سازشیں کرتی اور قسطنطنیہ میں گورنر جنرل کے دشمنوں سے مل کر اسے نقصان پہنچانے کی کوشش کرتی، اس جنگ میں قدامت پسند (کنزرویٹو) پارٹی کو ۱۸۸۹ء میں شکست ہوئی اور اس کے لیڈروں نے ہتھیار سنبھال کر پہاڑوں کی راہ لی، اگرچہ اس معاملہ کو مذہبی عناد سے کوئی تعلق نہ تھا، تاہم حالات کچھ ایسے پیش آئے کہ دونوں فرقوں کے مذہبی جذبات جلد براہیختہ ہو گئے اور جزیرہ میں قتل و غارت کا ہنگامہ پھر برپا ہو گیا، اس سے پیشتر کی دوشورشوں میں غلبہ عیسائیوں کو حاصل ہوا تھا مگر اب کی بار مسلمان غالب آئے، باب عالی نے ہنگامہ فرو کرنے کے لیے ایک فوجی گورنر کریٹ کو روانہ کیا اور وہاں فوجی قانون جاری کر کے ایک فرمان کے ذریعہ معاہدہ بلیپا کی بعض اہم دفعات کو منسوخ کر دیا مثلاً مجلس عمومی کے انتخاب کا طریقہ بدل دیا گیا، اس کے ارکان کی تعداد کم کر دی گئی اور محصول درآمد و برآمد کی آمدنی جو اب تک قسطنطنیہ

اور کریٹ کے خزانوں میں تقسیم ہوتی آئی تھی، کل کی کل باب عالی میں طلب کر لی گئی، اس کے بعد جدید نظام کے مطابق جو انتخابات ہوئے ان میں عیسائیوں نے شرکت کرنے سے انکار کر دیا، چنانچہ پانچ سال تک کریٹ میں مسلمان والیوں کی حکومت رہی، ۱۸۹۴ء میں باب عالی نے دولِ عظمیٰ کی تحریک پر ایک عیسائی قرہ تھیوڈوری پاشا (Kara Theodory Pasha) کو کریٹ کا گورنر بنا کر بھیجا، عیسائی اب مجلس عمومی میں شرکت کرنے پر راضی ہو گئے، لیکن بہت جلد مالیات کا مسئلہ نئی دشواریوں کا سبب بن گیا باب عالی نے ان قوم کی واپسی سے انکار کر دیا جو پچھلے ہنگامہ کے دوران میں کریٹ کے خزانہ سے نکال کر قسطنطنیہ منتقل کر دی گئی تھیں، قرہ تھیوڈوری پاشا حالات کو درست نہ کر سکا، اس لیے باب عالی نے اسے واپس بلا لیا، اس پر عیسائیوں میں سخت برہمی پیدا ہوئی، لیکن اس واقعہ سے قبل ہی 'انجمن اصلاح' (Committee of Reform) کے نام سے ایک جماعت انھوں نے قائم کر لی تھی، اس انجمن کی ابتدا دراصل یوں ہوئی تھی کہ چند شکست خوردہ لیڈروں نے جو پارٹیوں کی گذشتہ کشمکش میں قوت و اقتدار حاصل کرنے میں ناکام رہے تھے، اپنے حریفوں کے مقابلہ کے لیے پہازوں میں ایک مسلح جماعت تیار کی تھی، کبھی کبھی اس جماعت کو بعض ترک سپاہیوں سے لڑنے کی نوبت آئی اور ان آویزشوں میں اسے ایک حد تک کامیابی ہوئی، یہ دیکھ کر ہزاروں مسلح عیسائی اس جماعت میں شامل ہو گئے، اپریل ۱۸۹۶ء تک اس نے اتنی قوت حاصل کر لی کہ واموس (Vamos) کے اہم شہر کا محاصرہ کر لیا مگر خانہ جنگی پھر شروع ہو گئی، دولِ عظمیٰ نے دباؤ ڈال کر باب عالی سے چند خاص مراعات اس شورش کو فرو کرنے کے لیے منظور کرائیں، چنانچہ معاہدہ ہلپا ازسرو نافذ کر دیا گیا، ترکی فوجیں واپس بلا لی گئیں، مالی مدد کا وعدہ کیا گیا اور ایک عیسائی گورنر جنرل مقرر ہوا، عیسائی لیڈروں نے معاہدہ ہلپا کی بنا پر اصلاحات کا ایک نظام مرتب کیا جسے دولِ عظمیٰ کی سفارش سے باب عالی نے منظور کر لیا۔ اس درمیان میں ایک قومی تحریک یونان میں شروع ہو گئی تھی، جس کی ایک

شاخ نیشٹل سوسائٹی (Ethnike Hetareia) کے نام سے ۱۸۹۴ء میں قائم کی گئی تھی، اس سوسائٹی کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ کریٹ اور یونان کے الحاق میں مدد دی جائے لیکن اس کا اصلی مقصد یہ تھا کہ مقدونیا کے حصول کے لیے ترکی سے جنگ کی جائے، اس کو اپنی تدبیروں کی کامیابی کے لیے کریٹ کے عیسائیوں کی حالت جو ۱۸۹۶ء کی اصلاحات سے بھی غیر مطمئن ہو رہے تھے بہت کارآمد معلوم ہوئی، چنانچہ اس نے اپنے گماشتے کریٹ میں بھیجے اور اسٹوں کی ایک کثیر تعداد وہاں پہنچائی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۸۹۷ء کی ابتدا ہی میں عیسائیوں نے علم بغاوت بند کر دیا، فروری ۱۸۹۷ء میں کینیا (Canea) میں جنگ شروع ہو گئی اور باغیوں نے یونان سے الحاق کا اعلان کر دیا، اب نیشٹل سوسائٹی کا مقصد پورا ہوتا نظر آ رہا تھا، تمام یونانیوں نے ان باغیوں کی حمایت میں مظاہرے شروع کر دیے، اتھینز میں ان کا جوش و خروش سب سے زیادہ تھا، حکومت یونان جواب تک دولِ عظمیٰ کے مصالح کی بنا پر اہل کریٹ کو عملاً کوئی مدد نہ دے سکتی تھی اس قومی جوش سے اپنی مجبوری کا اعلان کر کے آگے بڑھی اور ۱۰ فروری ۱۸۹۷ء کو بادشاہ کے منجھلے لڑکے شہزادہ جارج کو جنگی جہازوں کے ساتھ روانہ کیا اور پھر تین روز بعد کرنل واسوس (Vassos) کی سرکردگی میں ایک یونانی فوج کریٹ پہنچ گئی، حکومت یونان کا یہ فعل گویا سلطنت عثمانیہ سے جنگ کا اعلان تھا، دولِ عظمیٰ کے نزدیک یہ جنگ اس وقت مناسب نہ تھی، لہذا انھوں نے فوراً اپنے جنگی جہاز اور فوجیں کریٹ روانہ کیں اور سینیا پر قبضہ کر کے دونوں فریق کو صلح پر مجبور کیا، لیکن کریٹ کے باغیوں کو اصلی قوت اتھینز سے پہنچ رہی تھی اور اتھینز باب عالی سے صلح کے لیے تیار نہ تھا، حکومت یونان نے دولِ عظمیٰ سے پیش کردہ شرائط صلح منظور نہیں کیے اور کریٹ کے عیسائیوں کی حمایت سے دست کش ہونے یا وہاں سے اپنی فوجیں ہٹانے سے اس وقت تک کے لیے انکار کر دیا جب تک خود اہل کریٹ کو اپنے وطن کے مستقبل کی نسبت استشارہ کے ذریعہ فیصلہ کرنے کی اجازت نہ دے دی جائے، باغیوں کے لیے یہ شہ کافٰی تھی، انھوں نے بھی ہتھیار رکھنے

سے انکار کر دیا اور دوسری طرف دولِ عظمیٰ کے جہازوں نے کریٹ کی بندرگاہوں پر قبضہ کر کے پورے جزیرہ کی ناکہ بندی کر دی اور ایک اعلان اس مضمون کا شائع کیا کہ آئندہ یہ جزیرہ دولِ یورپ کے سایہ عاطفت میں رہے گا جو اس کی حکومت خود اختیاری کی ضامن ہوں گی۔ (۱)

جنگ یونان: تاہم کریٹ کی ناکہ بندی اور دولِ یورپ کا یہ اعلان یونان اور دولتِ علیہ کی جنگ کو روک نہ سکا، نیشنل سوسائٹی نے اہل یونان کو توسیعاتِ ملی کی جو شراب پلائی تھی اس کے نشہ سے وہ بدمست ہو رہے تھے، یونانیوں نے سرحد عبور کر کے مقدونیا کے بعض علاقوں پر حملہ کرنا شروع کر دیا، باب عالی کے لیے مدافعت ناگزیر تھی، چنانچہ ۷ اپریل ۱۸۹۷ء کو ادھر سے بھی اعلانِ جنگ ہوا، عثمانی فوجیں حال ہی میں جرمن افسروں کے زیر نگرانی اعلیٰ تربیت اور تنظیم حاصل کر چکی تھیں، جس کے باعث ان کی قوت یونانی فوجوں سے بڑھی ہوئی تھی، ترکوں کے پہلے ہی حملہ میں یونانیوں کا نشہ ہرن ہو گیا اور وہ بدحواس ہو کر بھاگے، ایک مہینہ کے اندر اس جنگ کا جس کے لیے یونانی اس درجہ بے قرار تھے خاتمہ ہو گیا، ترک ان کا پیچھا کرتے ہوئے تھسلی میں داخل ہو گئے اور قریب تھا کہ ایتھنز پہنچ جائیں مگر عین اس وقت دولِ عظمیٰ کی مزاحمت نے حسبِ دستور قدیم ترکوں کی راہ روک لی اور ۲۰ مئی کو انھیں مجبوراً ایک عارضی صلح کے لیے راضی ہونا پڑا، دسمبر میں اس عارضی صلح کو مستقل کر دیا گیا، یونان کو تھسلی کے ایک حصہ سے جو سلطنتِ عثمانیہ کی سرحد پر واقع تھا دست بردار ہونا پڑا، علاوہ بریں اس پر تھینا چالیس لاکھ پونڈ تاوانِ جنگ بھی عاید کیا گیا، ترکوں نے اس کے بعد تھسلی کو خالی کر دیا۔

یونان سے کریٹ کا الحاق: لیکن یہ جنگ یونان کے لیے خواہ کتنی ہی نقصان رساں رہی ہو کریٹ کے حق میں مفید ہی ثابت ہوئی، دولِ عظمیٰ کی جمعیت سے جرمنی اور آسٹریا ہنگری نے ذاتی مصالح کی بنا پر علاحدگی اختیار کر لی تھی، تاہم انگلستان، اٹلی، روس اور

فرانس نے متفقہ طور پر دباؤ ڈال کر باب عالی کو اس بات پر مجبور کیا کہ وہ کریٹ سے عثمانی فوجوں اور ترکی عہدہ داروں کو واپس بلا لے اور محض خراج قبول کرنے پر قناعت کرے۔ اس کے بعد ۲۱ دسمبر ۱۸۹۸ء کو انھوں نے یونان کے شہزادہ جارج کو بلا کر آٹھ سال کے لیے کریٹ کا ہائی کمشنر مقرر کیا، ایک جدید دستور حکومت مرتب کیا گیا، جس پر ۱۹۰۵ء تک کامیابی کے ساتھ عمل درآمد ہوتا رہا لیکن ۱۹۰۵ء میں کریٹ کے عیسائیوں نے پھر شورش برپا کی اور یونان سے اتحاد کا مطالبہ از سر نو پیش کیا، شہزادہ جارج کے تقرر سے ان کو یقین ہو گیا تھا کہ دولِ عظمیٰ اس الحاق کی حامی ہیں کیوں کہ یونان کے شاہی خاندان کے ایک فرد کو ہائی کمشنر مقرر کرنے کے معنی ہی یہ ہیں کہ یونان اور کریٹ کا الحاق پیش نظر ہے، لیکن یہ دیکھ کر کہ شہزادہ کی آمد کے بعد بھی سالوں گزر گئے اور یہ مقصد حاصل نہ ہوا، ان میں بے چینی پیدا ہوئی اور ۱۹۰۵ء میں وینیزیلوس (M. Venizelos) کی سرکردگی میں انھوں نے علم بغاوت بلند کر کے یونان سے الحاق کا اعلان کر دیا، دولِ عظمیٰ کو پھر مداخلت کا موقع ملا، شہزادہ جارج نے اپنے عہدہ سے استعفا دے دیا اور شاہ یونان نے دولِ عظمیٰ کی اجازت سے زیمیس (M. Zaimis) نامی ایک یونانی کو ہائی کمشنر مقرر کیا، تین سال تک دولِ عظمیٰ کے فوجی دستے 'قیام امن' کے خیال سے کریٹ میں مقیم رہے لیکن زیمیس کے 'حسن انتظام' نے ان کی ضرورت باقی نہیں رکھی اور ۱۹۰۸ء میں وہ واپس بلا لیے گئے، ۱۹۰۸ء میں جب بلغاریا نے اپنی آزادی کا اعلان کیا اور نوجوان ترکوں کے انقلاب کے بعد آسٹریا نے بوسنیا اور ہرزیگووینا کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا تو کریٹ نے پھر الحاق کا مطالبہ پیش کیا اور ایک عارضی حکومت قائم کر کے وینیزیلوس کو وزیر عدالت و امور خارجہ مقرر کیا، دولِ عظمیٰ نے باضابطہ طور پر اس عارضی حکومت کو تسلیم تو نہیں کیا لیکن عملاً اس سے تعلقات قائم کر لیے، چند ہی سالوں میں یونان اور کریٹ کا باضابطہ الحاق بھی عمل میں آ گیا اور سلطنت عثمانیہ کا ایک اور صوبہ دولِ عظمیٰ کی سرپرستی میں آزاد کر دیا گیا، کریٹ کی آزادی بھی دولِ عظمیٰ کی اسی حد تک رہن منت ہے جس حد تک یونان کی، اگرچہ

کریٹ کے معاملہ میں ان مغربی حکومتوں نے باغیوں کی حمایت علانیہ اس طرح نہیں کی، جس طرح یونان کی تھی، یہ احتیاط کسی خوش نیتی پر مبنی نہ تھی بلکہ خطرہ یہ تھا کہ علانیہ مدد کرنے سے دولت عثمانیہ سے جنگ چھڑ جائے گی اور چونکہ جرمنی اور آسٹریا ہنگری ان کی جمعیت سے علاحدہ ہو گئے تھے اور جرمنی کے استعماری مقاصد اسے روز بروز دوست علیہ سے زیادہ قریب لاتے جا رہے تھے، اس لیے جنگ میں خود مغربی حکومتوں کا باہم دگر مقابل ہو جانا بعید از قیاس نہ تھا، یہ وہ خطرہ تھا جس کے لیے باغیان کریٹ کی علانیہ مدد سے اجتناب کیا جاسکتا تھا، خصوصاً جب مقصد ایسی مدد کے بغیر بھی حاصل ہو سکتا تھا۔

مسئلہ آرمینیا: سلطنت عثمانیہ کے معاملات میں دخل دینے کے لیے دولِ عظمیٰ کو کسی خاص حیلہ کے تلاش کرنے کی ضرورت نہ تھی، عیسائی رعایا کے حقوق کا تحفظ جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے، ہر مداخلت کے لیے کافی عذر ہو سکتا تھا، تمام یورپین حکومتوں نے اپنی جگہ یہ فرض کر لیا تھا کہ سلطنت عثمانیہ میں عیسائیوں کے ساتھ بے انتہا مظالم ہو رہے ہیں اور ان مظالم کے تدارک کی اس سے بہتر کوئی صورت نہیں کہ عیسائیوں کو دولت علیہ کی فرماں روائی سے آزاد کر دیا جائے اور ان کی خود مختار حکومتیں قائم کر دی جائیں، یونان، سرویا، بلغاریا، رومانیہ، کریٹ یہ تمام صوبے اسی مقصد کے ماتحت اور دولِ عظمیٰ کی سرپرستی میں سلطنت عثمانیہ سے علاحدہ کر دئے گئے تھے، اب صرف دو علاقے اور رہ گئے تھے جن میں عیسائیوں کی آبادی مسلمانوں سے زیادہ تھی آرمینیا اور مقدونیا، یورپ کا اخلاقی فرض تھا کہ وہ ان 'مظلوموں' کو بھی ترکوں کے پنجہ سے آزاد کرائے۔

آرمینی قوم نہایت قدیم زمانہ سے ایشیائے کوچک کے ان کوہستانی علاقوں میں رہتی آئی تھی جو شمال مشرق میں واقع ہیں، اس سے بہت پہلے عیسائیت قبول کر لی تھی اور سب سے قدیم کلیسا کی متبع تھی، جس کی بنیاد سن ۳۳۲ء) نے رکھی تھی، آرمینی کلیسا یونانی کلیسا سے اکثر باتوں میں مشابہہ ہونے کے باوجود اپنی ایک مستقل اور جداگانہ ہستی رکھتا ہے، اس کا پیشوا کیتھولکس (Catholicus) کہلاتا ہے، لیکن

باوجود اس کے کہ یہ قوم زمانہ قدیم سے آباد ہے اور اس کا ایک مستقل کلیسا بھی ہے جہاں تک جغرافی رقبہ کا تعلق ہے، اس کے حدود مستقل اور متعین نہیں، یہ قوم جن علاقوں میں پھیلی ہوئی ہے، وہ بحر کاسپین، بحر اسود، کوہ کاف اور کردستان سے گھرے ہوئے ہیں اور روس، ترکی اور ایران کی سلطنتوں میں تقسیم ہیں۔

سلطنت عثمانیہ میں آرمینیوں کی حالت ابتدائی سے اچھی تھی، تجارت ان کا خاص پیشہ تھا اور اس حیثیت سے وہ قسطنطنیہ اور سلطنت کے تمام دوسرے شہروں میں پھیلے ہوئے تھے، انھوں نے اس پیشہ میں یہاں تک فروغ حاصل کیا کہ مشرق ادنیٰ کی تجارتی قوموں میں وہ یونانیوں اور یہودیوں کے مد مقابل ہو گئے، انیسویں صدی کے آغاز میں جب مغربی تہذیب و تمدن نے سلطنت عثمانیہ میں بار پانا شروع کیا تو آرمینی بھی جدید خیالات سے متاثر ہوئے اور انھوں نے اپنی قوم میں تعلیم پھیلانے کی غرض سے یورپ کے جدید نظام تعلیم کے مطابق مدرسے قائم کئے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت جلد وہ اپنی ہمہ یہ قوموں سے تعلیم میں آگے بڑھ گئے۔

تعلیم کی ترقی کے ساتھ سیاسی خیالات بھی پھیلنا شروع ہوئے اور ریاستہائے بلقان کی مثالیں دیکھ کر آرمینیوں میں بھی حصول آزادی کا جذبہ پیدا ہوا، لیکن اس راہ میں سب سے بڑی دقت یہ تھی کہ کوئی متعین علاقہ ایسا نہ تھا جس میں آرمینیوں کی اکثریت ہو، علاوہ بریں تمام آرمینی سلطنت عثمانیہ کے زیر نگین بھی نہ تھے، ان میں سے کچھ روس اور کچھ ایران کی سلطنت میں آباد تھے، اکثریت جو تقریباً بارہ لاکھ افراد پر مشتمل تھی، سلطنت عثمانیہ کی چھ ولایتوں، سیواس، بطلیس، ارض روم، خارپت و یار بکر اور وان میں پھیلی ہوئی تھی، لیکن ان میں سے کسی ولایت میں ان کی تعداد وہاں کے دوسرے باشندوں یعنی ترک، یونانی اور کرد سے زیادہ نہ تھی (۱) ۱۸۶۳ء میں باب عالی نے ایک ”آرمینی دستور“ عطا کیا تھا جس کے رو سے آرمینیوں کے تمام ملکی اور مذہبی معاملات ایک ’قومی مجلس عامہ‘ کو تفویض کر دئے گئے تھے، اس مجلس کا صدر آرمینی کلیسا کا پیشوا تھا اور اس

کے ماتحت دو چھوٹی مجلسیں تھیں جن میں علاحدہ علاحدہ ملکی اور مذہبی امور طے ہوتے تھے۔ (۱)
 سلطان عبدالحمید ثانی کی تخت نشینی کے وقت آرمینیوں کی حالت پہلے سے بہتر
 تھی، لیکن روس اور ترکی کی جنگ (۱۸۷۷ء تا ۱۸۷۸ء) کے بعد ہی مسئلہ آرمینیا پیدا
 کر دیا گیا اور سب سے پہلے معاہدہ سان اسٹیفانو میں روس نے باب عالی سے یہ وعدہ
 لیا کہ جن صوبوں میں آرمینی آباد ہیں ان میں اصلاحات جاری کر دی جائیں گی اور انھیں
 اردوں اور چرکسوں کے دست برد سے محفوظ رکھا جائے گا پھر جب معاہدہ سان اسٹیفانو
 کی منسوخی کے بعد ۱۳ جولائی ۱۸۷۸ء کو صلح نامہ برلن مرتب ہوا تو باب عالی نے یہی
 وعدہ تمام دولِ عظمیٰ سے کیا، اس سے قبل معاہدہ سائپرس میں بھی جون ۱۸۷۸ء کو
 باب عالی اور برطانیہ کے درمیان طے ہوا تھا، سلطان نے اپنے ایشیائی علاقوں کی عیسائی
 رعایا کے لیے ضروری اصلاحات اور تحفظ کا وعدہ کیا تھا، اس طرح ۱۸۷۸ء کے بعد
 آرمینی اپنے کو دولِ عظمیٰ اور خصوصاً برطانیہ کے زیر حمایت سمجھنے لگے، معاہدہ سائپرس میں
 آرمینیوں کا ذکر اگرچہ تصریح کے ساتھ نہیں آیا تھا، تاہم عیسائی ہونے کے عداوہ انھیں
 برطانیہ کی مخصوص حمایت کا یقین جس وجہ سے ہوا وہ یہ تھی کہ معاہدہ برلن میں برطانیہ نے
 اس بات پر زور دیا تھا کہ روس سلطان کے وعدہ پر اعتماد کر کے اپنی ایشیائی مفتوحات سے
 قبضہ اٹھالے اور ان اصلاحات کے اجرا کا انتظار نہ کرے۔

غرض ۱۸۷۸ء کے بعد آرمینی قوم نے مسیحی یورپ کی حمایت پر اعتماد کرنا
 شروع کیا اور معاہدہ برلن میں جن اصلاحات کا وعدہ کیا گیا تھا، انھیں حکومتِ خود اختیاری
 کا زینہ قرار دے کر ان کے حصول کے لیے ایچی ٹیشن کرنے لگی، یہ صورت حال باب عالی
 کے لیے تشویشناک تھی کیوں کہ دولِ عظمیٰ کی ایسی ہی حمایت اور ایچی ٹیشن کی یہی شکل اس
 سے قبل عیسائی صوبوں کی آزادی کا باعث ہو چکی تھی، بوسنیا، سربیا اور بلغاریا میں جو
 ہنگامے دولِ عظمیٰ کی سرپرستی میں کامیاب ہو چکے تھے، وہ آرمینیا کی حوصلہ افزائی کے لیے

کافی تھے، باب عالی کے لیے آرمینیوں کی شورش اس وجہ سے بھی زیادہ تشویش ناک تھی کہ ان میں اعدائیت (Nihilism) کی تحریک رونما ہو چکی تھی، جو ایک نہایت شدید انقلابی تحریک تھی اور موجودہ نظام حکومت کو درہم برہم کر دینا چاہتی تھی، یہ تحریک کسی خاص مذہب سے وابستہ نہ تھی، بلکہ اس کے انقلابی مقاصد کے سامنے اسلامی اور مسیحی سطنتوں میں کوئی فرق و امتیاز نہ تھا، چنانچہ یہ اعدائی سازش ہی کا نتیجہ تھا کہ ۱۸۸۱ء میں زار الکوز نڈر ثانی قتل کیا گیا، اس تحریک کا خوف سلطان عبدالحمید ثانی اور زار الکوز نڈر ثالث دونوں پر یکساں طاری تھا، ۱۸۸۵ء میں بھی اس جماعت نے ایک شورش برپا کی تھی لیکن باب عالی نے اسے آسانی کے ساتھ فرو کر دیا تھا، آرمینیوں کو بحیثیت عیسائی ہونے کے روس کی جو سرپرستی حاصل تھی وہ ۱۸۸۱ء میں زار الکوز نڈر ثانی کے قتل کے بعد جاتی رہی، حکومت روس نے ان کے مدرسے بند کر دئے، آرمینی زبان دہائی جانے لگی اور آرمینیوں کو روسی کلیسا میں داخل کرنے کی کوشش کی گئی، مسیحی روس کی سرپرستی میں حکومت خود اختیاری کی جو توقعات تھیں وہ ان کا ردوائیوں سے مفقود ہو گئیں، ٹفلس کے آرمینیوں نے اس کے بعد ترکی آرمینیوں کی طرف توجہ کی، وہ ریاستہائے بلقان میں سلاوی شورشوں کی کامیابی دیکھ چکے تھے، اسی قسم کے ہنگامے انھوں نے آرمینیا میں برپا کرنے شروع کیے۔ (۱)

روس کی حمایت سے محروم ہو جانے کے بعد آرمینیوں کی انقلابی جماعت نے جس میں سے بعض یورپ کے تعلیم یافتہ اور وہاں کی آزاد خیالی اور تحریک اعدائیت سے حد درجہ متاثر تھے، اپنے مقصد کے حصول کے لیے وہی تدبیریں اختیار کیں جو بلغاریا میں کامیاب ہو چکی تھیں، چنانچہ انقلابی رسالوں اور اخباروں کی اشاعت کے لیے ٹفلس اور متعدد دیوروپین پایہ تختوں میں انجمنیں قائم کی گئیں اور خفیہ موسائیاں انقلابی تجاویز کو عمل میں لانے کی غرض سے بنائی گئیں، گماشتوں کے ذریعہ ترکی آرمینیا میں پروپگنڈا جاری کیا گیا، اسلحہ اور بم وغیرہ بھجوائے گئے اور حکومت عثمانیہ کی معمولی بد نظمی کے واقعات

کو یورپ کے سامنے شدید مظالم کی صورت میں پیش کیا گیا، اس انقلابی تحریک میں کچھ نوجوان بھی شریک ہو گئے، جنہوں نے اعدائی اصول کی بنا پر مقامی کمیٹیاں قیام کیں، لیکن آرمینی پادری اور امریکن مشنری اس سے علاحدہ رہے، جس کی وجہ یہ تھی کہ اس تحریک کا رجحان مذہب کے خلاف تھا، مخالف مذہب ہونے کے باعث نیز اس وجہ سے کہ اس میں بیڈروں کے ذاتی اغراض کو بہت کچھ دخل تھا یہ تحریک عوام میں مقبول نہ ہو سکی، اپنی تدبیروں میں ناکام ہو کر آرمینی گماشتوں نے افراد پر حملے کرنے شروع کئے، لوگوں کے نام تہدید کی خطوط بھیجے اور مشنریوں کو حکومت کی نظر میں مشکوک بنانے کے لیے ۵ جنوری ۱۸۹۳ء کو مارسوان (Marsivan) میں امریکن کالج کی دیواروں پر انقلابی اشتہارات چسپاں کر دئے، یہ آخری تدبیر کارگر ہوئی، اشتہارات کی اشاعت کا الزام امریکن مشنریوں پر عاید کیا گیا اور دو آرمینی پروفیسر قید کر دئے گئے، اس کے بعد قیصراریہ اور دوسرے مقامات پر بلوے ہوئے جو آسانی سے فرو کر دئے گئے۔

انقلابیوں کا ایک مقصد یہ تھا کہ ڈارون (Daron) کے قدیم شہر کو جدید آرمینیا کا پایہ تخت بنائیں، ۱۸۹۳ء کے موسم گرما میں ایک انقلابی گماشتہ موش کے قریب گرفتار ہوا، اس خیال سے کہ ممکن ہے اور گماشتے بھی ہاتھ آجائیں گورنر نے کرد سواروں کے بے ضابطہ دستہ کو وہاں کے پہاڑی علاقہ پر حملہ کرنے کا حکم دیا، آرمینیوں نے کردوں کو بھگا دیا اور دوسرے سال موسم بہار میں جب دوبارہ حملہ کیا گیا تو پھر آرمینی مغلوب نہ ہوئے، انقلابی جماعت کی باغیانہ کوششوں کو دیکھتے ہوئے اس فتنہ کا استیصال ضروری تھا، چنانچہ صوبہ کے والی نے باضابطہ فوجیں روانہ کیں، اب کی بار آرمینی مقابلہ میں کامیاب نہ ہو سکے اور کثرت سے مارے گئے، اس واقعہ کی خبر جب یورپ پہنچی تو مسیحی حکومتوں نے ایک قیامت برپا کردی اور باغیوں کی سزا کو جو حکومت عثمانیہ کے خلاف لڑتے ہوئے مارے گئے تھے، بے گناہوں کے قتل عام سے تعبیر کر کے ایک تحقیقاتی کمیشن کا مطالبہ کیا، نومبر ۱۸۹۳ء میں یہ کمیشن آرمینیا بھیجا گیا، برطانیہ، فرانس اور روس کے قفل اس کے ممبر

بنائے گئے، تحقیقات کے بعد کمیشن اس نتیجہ پر پہنچا کہ آرمینیا میں اصلاحات کے نافذ کرنے کی سخت ضرورت ہے، چنانچہ متفقہ طور پر برطانیہ، فرانس اور روس کی طرف سے ۱۱ مئی ۱۸۹۵ء کو اصلاحات کی ایک تجویز باب عالی کے سامنے پیش کی گئی۔

لیکن اس درمیان میں آرمینیوں کی خفیہ انجمنیں اپنا کام کرتی رہیں، طاروس میں ہنگامے برپا ہوئے اور جو آرمینی اس 'قومی تحریک' میں شریک نہیں ہوئے تھے قتل کر دیے گئے، خفیہ انجمنوں کے کارکنوں نے خود آرمینی کلیسا کے پیشوا کو قتل کی دھمکی دی اور یہ خبر مشہور ہوئی کہ برطانوی سفیر چاہتا ہے کہ چند آرمینی قتل کر دیے جائیں تاکہ اسے جنگی بیڑا قسطنطنیہ کے سامنے لانے کے لیے بہانہ ہاتھ آئے (۱)، یکم اکتوبر ۱۸۹۵ء کو آرمینیوں کا ایک جلوس جس میں مسلح اشخاص بھی تھے، اپنے مطالبات لے کر باب عالی میں حاضر ہوا، باب عالی کی طرف سے غور کر کے جواب دینے کا وعدہ کیا گیا، لیکن آرمینیوں نے مطالبات کے اسی وقت منظور کیے جانے پر اصرار کیا اور جب پولیس نے ان کو منتشر کرنا چاہا تو بوبہ کر دیا، دونوں طرف سے گولیاں چلیں اور فریقین میں سے کچھ ہلاک ہوئے، اس کے بعد برطانیہ نے اصلاحات کی منظوری پر پھر زور دیا اور ۱۷ اکتوبر ۱۸۹۵ء کو سلطان نے تجویز اصلاحات کو منظور کر لیا، لیکن قبل اس کے کہ اصلاحات نافذ کی جائیں آرمینیا کی شورشوں سے مجبور ہو کر باب عالی کو ادھر فوجیں روانہ کرنی پڑیں، باغیوں نے مقابلہ کیا اور اکتوبر و نومبر ۱۸۹۵ء میں ان کی ایک بڑی تعداد قتل کر دی گئی، بغاوت کے فرو کرنے سے پہلے اصلاحات کا نفاذ ناممکن تھا، خفیہ انجمنوں کی کوشش سے یہ فتنہ اس حد تک پھیل چکا تھا کہ اس کے استیصال کے لیے باضابطہ فوجوں کی مدد کے بغیر چارہ نہ تھا، ۲۶ اگست ۱۸۹۶ء کو قسطنطنیہ کے آرمینیوں نے بینک عثمانی پر قبضہ کر لیا، باب عالی نے فوراً اس کا تدارک کیا اور چوبیس گھنٹے کے اندر یہ بغاوت فرو کر دی گئی، بعض انگریز مورخین کا بیان ہے کہ قسطنطنیہ کے ہنگامہ میں چھ ہزار آرمینی قتل کیے گئے، لیکن وہ

بھی اعتراف کرتے ہیں کہ اس قتل عام میں مذہبی تعصب کو مطلق دخل نہ تھا، میریٹ لکھتا ہے: ”صرف گریگورین کلیسا کے آرمینی قتل کیے گئے، شاید ہی کسی کیتھولک کو ہاتھ بھی لگایا گیا ہو، قسطنطنیہ میں فساد کی ابتدا آرمینیوں ہی نے کی، ترک مسلح بغاوت کے فرو کرنے میں بالکل حق بجانب تھے“ (۱) ملر کہتا ہے کہ ”شاید ہی کوئی غیر آرمینی قتل کیا گیا ہو“ (۲) قسطنطنیہ کے علاوہ مقتولین کی مجموعی تعداد بیس سے پچیس ہزار تک بتائی جاتی ہے۔ (۳) آرمینیوں کے قتل عام کا پروپگنڈا یورپ میں اس کثرت اور مبالغہ سے کیا گیا ہے کہ اب تک محض اس کا اشارہ ترکوں کے خلاف انتہائی نفرت اور غصہ کے جذبات براہیختہ کر دینے کے لیے کافی ہے، سلطان عبدالحمید ثانی کی فرد جرائم میں جو مدبرین یورپ کے قلم سے مرتب ہو کر تمام دنیا میں شائع ہو چکی ہے، سب سے بڑا جرم یہی آرمینیا کا قتل عام ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اگر اس قتل عام کی نوعیت وہی تھی جو بیان کی جاتی ہے تو مسیحی یورپ کی وہ حکومتیں کیوں خاموش تھیں جن کا جذبہ دینی اس سے پیشتر کبھی دولت عثمانیہ کے مقابلہ میں براہیختہ ہونے سے قاصر نہیں رہا اور جنہوں نے رعایا کو باب عالی کی ”مطلق العنانی“ سے آزاد کرنے میں کوشش کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا، سر دیا اور یونان کی آزادی جن حکومتوں کی رہین منت تھی، رومانی کا استقلال جن کی کوششوں سے عمل میں آیا، بلغاریا نے جن کی حمایت میں خود مختاری کا اعلان کیا، وہ حکومتیں یورپ میں اس وقت بھی موجود تھیں اور ان میں سے ایک بھی دائرہ مسیحیت سے نکل کر اسلام کی حلقہ بگوش نہیں ہوئی تھی، پھر کیا وجہ تھی کہ سر دیا اور یونان، رومانیہ اور بلغاریا کے عیسائیوں کی مدد کے لیے جن کی ”مظلومیت“ یقیناً اس درجہ تک نہیں پہنچی تھی جو آرمینیا کے مقتولین کی نسبت بیان کیا جاتا ہے، سارا یورپ متحد ہو کر سلطنت عثمانیہ پر ٹوٹ پڑا اور اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دینے میں جہاں تک ممکن تھا کوئی تسمہ لگا نہیں رکھا، لیکن جب آرمینیا کے

(۱) میریٹ ص ۴۰۱ (۲) سلطنت عثمانیہ اور اس کے جانشین از مرص ۴۳۰ (۳) انسائیکلو پیڈیا

عیسائیوں نے ان حقوق کا مطالبہ کیا جن کی ضمانت تمام دولِ عظمیٰ نے معاہدہ برلن میں کی تھی اور اس مطالبہ پر بابِ عالی کی طرف سے 'قتلِ عام' کا حکم دے دیا گیا تو ان مدعیانِ حق و انصاف میں سے کسی ایک کا ہاتھ بھی مظلوموں کی حمایت کے لیے نہیں اٹھا؟ معبودہ حقوق کے مطالبہ کرنے پر اگر آرمینیوں کا 'قتلِ عام' ضروری سمجھا گیا تو یہی مطالبہ تو کریٹ کے عیسائیوں نے بھی کیا تھا اور انھوں نے نہ صرف وفد و جلوس کے ذریعہ اپنے مطالبات پیش کیے تھے بلکہ سالہا سال تک شورشوں اور بغاوتوں کا ایک بنگامہ برپا کر رکھا تھا جس کا سلسلہ ۱۹۱۲ء میں اس وقت منقطع ہوا جب کریٹ اور یونان کا الحاق عمل میں آگیا، لیکن کیا ایہ ہی 'قتلِ عام' کریٹ میں بھی جاری کر دیا گیا تھا؟ برعکس اس کے وہاں تو یہ صورت پیش آئی کہ بغاوتوں کے فرو کرنے کے لیے جب عثمانی فوجیں پہنچیں تو فوراً ہی دولِ عظمیٰ کے جنگی بیڑوں نے کریٹ کی ناکہ بندی کر دی اور بالآخر سلطان کو مجبور ہو کر اپنی تمام فوجیں وہاں سے واپس کر مینی پڑیں۔

اصل یہ ہے کہ سلطان عبدالحمید ثانی کے ابتدائی دور میں آرمینیوں میں ایک انقلابی جماعت پیدا ہو گئی تھی، جو اصولِ اعدائیت (Nihilism) سے بغایت متاثر تھی اور موجودہ نظام کو خواہ وہ حکومت کا نظام ہو خواہ مذہب و معاشرت کا درہم برہم کر دینا چاہتی تھی، جہاں تک اصول کا تعلق تھا اس جماعت کے نزدیک روس کی مسیحی حکومت اور ترکی کی اسلامی حکومت میں کوئی امتیاز نہ تھا، چنانچہ ۱۸۸۱ء میں زار الکزنڈر ثانی کا قتل اسی جماعت کی سازش کا نتیجہ تھا، جس کے بعد ہی آرمینیوں کے ساتھ روس کی ساری ہمدردی کا خاتمہ ہو گیا اور حکومتِ روس آرمینیوں کی شدید مخالف ہو گئی جیسا کہ اوپر بیان ہوا، یہ اسی مخالفت کا نتیجہ تھا کہ آرمینیوں کے مدارس بند کر دئے گئے، آرمینی زبان کا استعمال روکا جانے لگا اور آرمینیوں کو روسی بنانے اور روسی کلیسا میں داخل کرنے کی کوشش کی گئی، آرمینی بہر حال عیسائی تھے اور بالکل سرحد پر آباد ہونے کی وجہ سے سلطنتِ روس پر ہمسائیگی کا حق بھی رکھتے تھے، روس کو دولت عثمانیہ سے جو بغض سترہویں صدی سے

چلا آتا تھا وہ پوشیدہ نہیں، اس طویل مدت میں سلطنت عثمانیہ پر حملہ کرنے اور اسے نقصان پہنچانے کا کوئی موقع اس نے کبھی ہاتھ سے جانے نہ دیا پھر اس مقصد کے لیے اس سے بہتر موقع کیا مل سکتا تھا کہ ایک عیسائی قوم جس کے لاکھوں افراد خود اس کی سلطنت میں بھی آباد تھے، عین سرحد پر قتل کی جا رہی تھی اور اشتراکِ مذہب اور حق ہمسائیگی کے علاوہ اس معاہدہ کی بنا پر بھی حمایت کا مطالبہ کر رہی تھی، جو برلن کی مجلس اقوام میں مرتب ہوا تھا، لیکن نہ صرف یہ کہ روس نے خود کوئی مدد نہ کی بلکہ جب برطانیہ نے ترکی آرمینیوں کی حمایت میں عملی قدم اٹھانا چاہا تو ۱۸۸۴ء کے بعد سے برابر اس کی پرزور مخالفت کرتی رہی (۱) ظاہر ہے کہ جس فتنہ کا استیصال سلطان کے نزدیک ضروری تھا، اس کا خوف زار پر بھی پوری طرح مسلط تھا، آرمینیوں کی خفیہ انقلابی انجمنوں کا قیام پہلے روس ہی میں ہوا اور وہیں سے ان کے گمشتے ترکی آرمینیا میں پروگنڈا کرنے اور اسلحہ اور بم وغیرہ تقسیم کرنے کے لیے روانہ کیے گئے، روس کے علاوہ جرمنی، آسٹریا، ہنگری اور اٹلی کی طرف سے بھی ان باغیوں کی حمایت میں کوئی آواز نہیں اٹھی، حالانکہ یہ حکومتیں بھی معاہدہ برلن میں شریک تھیں جس میں آرمینیا کے حقوق و اصلاحات کا وعدہ کیا گیا تھا، برخلاف اس کے ۱۸۸۳ء میں ہسپارک نے حکومت برطانیہ کو مطلع کر دیا تھا کہ جرمنی کو آرمینیا کی اصلاحات کی مطلق پروا نہیں ہے اور یہ مشورہ دیا تھا کہ بہتر ہے کہ اس قصہ کو چھوڑ ہی دیا جائے (۲) ۱۸۹۳ء کے قتل عام کے بعد جو تحقیقاتی کمیشن مقرر ہوا، اس میں روس، برطانیہ اور فرانس کے قضاصل تو شریک ہوئے لیکن دوسری حکومتوں نے کوئی حصہ نہیں لیا، اگر یہ قتل عام اتنے ہی بڑے پیمانہ پر تھا جتنا برطانوی مورخین بیان کرتے ہیں تو کم از کم یہ عیسائی حکومتیں اپنے نمایندگان کو تحقیق حال کے لیے تو روانہ کر سکتی تھیں، دفع دخل مقدر کے طور پر یہ کہا گیا ہے کہ دولِ عظمیٰ کی باہمی رقابتوں کے باعث باب عالی پر کافی دباؤ ڈالا نہ جاسکا (۳) قیصر جرمنی اپنے اقتصادی مقاصد کی خاطر جنھیں وہ ایشیائے کوچک میں

(۱) انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا جلد ۲ ص ۵۶۷ (۲) انسائیکلو پیڈیا جلد ۲ ص ۵۶۷ (۳) میریٹ ص ۳۹۷

حاصل کرنا چاہتا تھا سلطان کا دوست بنا رہا، آسٹریا ہنگری کے بلقانی مصالح اسے جنگ کی اجازت نہیں دیتے تھے، روس نے اعلان کر دیا تھا کہ یورپ کے پچھلے تجربات کی بنا پر وہ اب ایشیاء کو چمک میں کوئی دوسرا بلغاریا پیدا کرنا نہیں چاہتا (۱) لیکن جرمنی اور آسٹریا ہنگری کے مقاصد و مصالح اور روس کا پچھلے تجربات کی بنا پر آرمینیوں کی مدد سے صاف انکار کر دینا اگر باہمی رقابتوں کا سبب بن سکتا تھا جس کے باعث باب عالی پر متحدہ دباؤ ڈالنا ممکن نہ تھا تو عین اسی زمانہ اور انہی رقابتوں کی موجودگی میں برطانیہ، فرانس اور روس کے جنگی بیڑے کریٹ کی ناکہ بندی کیوں کر رہے تھے اور پھر جب یونان نے سلطنت عثمانیہ پر حملہ کر دیا اور عثمانی فوجیں ان حملہ آوروں کے مقابلہ میں آگے بڑھیں تو باہمی رقابتیں کیوں مفقود ہو گئیں اور ایتھنز کو خطرہ سے بچانے کے لیے ان حکومتوں نے باب عالی کو صلح پر کیوں کر مجبور کیا؟

مقتولین کی تعداد کے تعین میں بھی مغربی مورخین پروپگنڈے کے جوش میں کہیں سے کہیں نکل گئے ہیں، انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کا مقالہ نگار میں سے پچیس ہزار تک تخمینہ کرتا ہے، علاوہ ان کے جو قسطنطنیہ میں مارے گئے اور جن کی مجموعی تعداد چھ ہزار بتائی جاتی ہے، میریٹ کے نزدیک قسطنطنیہ کے مقتولین کے علاوہ مجموعی تعداد غالباً 'پچیس ہزار تھی، ایک دوسرے تخمینہ کے رو سے جو امریکہ کے 'محققین' نے کیا ہے، یہ تعداد 'پچھتر ہزار تھی' (۲)، امریکہ ہی کا ایک اور 'محقق' پروفیسر فرڈی نیڈ شیول (Ferdinand Schevill) اپنی کتاب 'جزیرہ نماے بلقان اور مشرق ادنیٰ' میں لکھتا ہے کہ غالباً ایک لاکھ مرد، عورتیں اور بچے بے دردی سے قتل کر دئے گئے، علاوہ ان ہزاروں کے جو پہاڑوں میں بھاگ گئے اور وہاں فاقہ کشی اور بیماریوں سے ہلاک ہو گئے (۳۲۸) میریٹ نے ضلع ساسون کے قتل عام کے ذکر میں الیسٹ (Elist) کے حوالہ سے لکھا ہے کہ ابتدائی اطلاعات کے رو سے وہاں کے مقتولین کی تعداد سات آٹھ ہزار تھی

(۱) ملر ص ۴۳۱ (۲) میریٹ ص ۴۰۰، فٹ نوٹ

لیکن سرکاری تفتیش سے نوسو نکلی۔ (۱)

آرمینیا میں اعدامیت کی شورش جس تیزی سے پھیل رہی تھی، اس سے ہر موجودہ نظام کو خطرہ تھا، حسن بن صباح کا فرقہ باطنیہ اس قدر خطرناک نہ تھا جس قدر آرمینیا کا فرقہ اعدامیہ، اس لیے کہ باطنیوں کا وار صرف افراد پر پڑتا تھا اور اعدامیوں کی زد میں افراد اور موجودہ نظام سب آتے تھے، روس کو الکوئڈرٹائی کے قتل سے اس خطرناک تحریک کا پورا تجربہ ہو گیا تھا، اس لیے باوجود اس کے کہ سلطنت عثمانیہ پر حملہ کرنے کا بہت اچھا موقع سامنے تھا وہ کبھی آرمینیوں کی حمایت کے لیے تیار نہ ہوا بلکہ برطانیہ کو بھی ان کی عملی ہمدردی سے روکنے کی کوشش کرتا رہا، جرمنی اور آسٹریا ہنگری کو ان کے ذاتی اغراض نے دولت علیہ کی مخالفت سے روک رکھا ہو مگر برطانیہ اور فرانس کے ہاتھ تو کھلے ہوئے تھے اور کریٹ میں ان کے متحدہ بیڑے باغیوں کی حمایت کر رہے تھے، لیکن یہ دونوں حکومتیں بھی خوب واقف تھیں کہ آرمینیا میں جس فتنے کے استیصال کی کوشش ہو رہی ہے وہ تمام حکومتوں کے لیے یکساں طور پر خطرناک ہے، یہی سبب تھا کہ زبان اور قلم سے تو ان حکومتوں نے باب عالی پر دباؤ ڈالنے کی بہت کوشش کی مگر کبھی ان دھمکیوں کو عمل میں لانے کی جرأت نہیں ہوئی، حالاں کہ کریٹ اور یونان میں ان کے جنگی بیڑے اور فوجیں فوراً پہنچ گئیں، یہ زبانی دھمکیاں بھی جو برطانیہ اور فرانس برابر دیتے رہے اس کی وجہ زیادہ تر یہ تھی کہ آرمینیوں نے اپنی مظلومیت کا پروپگنڈا تمام یورپ میں نہایت کثرت سے کیا تھا اور مغربی اقوام کو یقین ہو گیا تھا کہ ترک ان کے مشرقی بھائیوں کو صفحہ ہستی سے مٹا دینا چاہتے ہیں، باب عالی کی معمولی بد نظمیوں کو شدید مظالم کا رنگ دے کر یورپین قوموں کے سامنے پیش کرنا آرمینیوں کا عام شیوہ تھا اور اس میں انھیں پوری کامیابی حاصل ہوئی، ترکوں کے خلاف نفرت اور غصہ کے جذبات یورپ میں مدت سے پھیلے ہوئے تھے اور بقول مسٹر نائٹ ان کے خلاف ہر بیان خواہ وہ کسی قدر مبالغہ آمیز کیوں نہ ہو بے چوں و چرا

تسلیم کر لیا جاتا تھا (۱) ایسی صورت میں آرمینی پروپگنڈے کی کامیابی تعجب خیز نہیں، فرانس اور برطانیہ کی حکومتوں نے اس باب میں جو کچھ کیا وہ قوم کے شدید تقاضوں سے کیا، ورنہ وہ آرمینی انقلابیوں کی خفیہ سرگرمیوں سے پوری طرح باخبر تھیں۔

تونس: اب تک سلطنت عثمانیہ کے جو صوبے مغربی حکومتوں کے زیر سایہ آزاد ہو چکے تھے، ان میں عیسائیوں کی آبادی بہ نسبت مسلمانوں کے زیادہ تھی اور انہی کے حقوق کا تحفظ دولِ عظمیٰ کے لیے مداخلت کا حیلہ بن جاتا تھا، لیکن دولتِ علیہ کے روز افزوں انحطاط نے اب دشمنوں کے اندر اس سے بڑے جوصلے پیدا کر دئے اور انھیں اچھی طرح اندازہ ہو گیا کہ ان صوبوں میں بھی جہاں کی آبادی تقریباً تمام تر مسلمانوں پر مشتمل ہے، مداخلت سے بہت کچھ فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے، ایک طرف وہ عیسائی رعایا کی آزادی کے لیے بابِ عالی پر ہر ممکن طریقہ سے دباؤ ڈال رہے تھے اور دوسری طرف سلطنت کے اسلامی صوبوں پر قبضہ کرنے کے لیے صرف موقع کے منتظر تھے، ۱۸۲۹ء میں معاہدہ اورنہ کے رو سے یونان کی آزادی تسلیم کی گئی اور برطانیہ، روس اور فرانس نے اپنی متحدہ سرپرستی میں یونان کی خود مختار حکومت قائم کر دی، لیکن دوسرے ہی سال ۱۸۳۰ء میں فرانس نے الجزائر پر قبضہ کر لیا اور جب قبائل عرب نے اپنے ملک کے لیے ہتھیار اٹھائے تو حکومت فرانس کی پوری قوت ان کے مقابلہ میں صرف کر دی گئی اور چالیس سال تک فرانسیسی سپاہیوں نے الجزائر میں قتل و غارت گری کا بازار گرم رکھا، الجزائر کے بعد نگاہیں تونس کی طرف اٹھیں، یہ بھی سلطنت عثمانیہ کا ایک صوبہ تھا اور موقع کے لحاظ سے فرانس کے استعماری مقاصد کے لیے نہایت اہمیت رکھتا تھا لیکن وقت یہ تھی کہ اس پر قبضہ کرنے کے لیے ویسا خفیف عذر بھی نہ تھا جیسا الجزائر پر حملہ کے لیے ہاتھ آ گیا تھا، اس مشکل کا حل فرانس کی خوش قسمتی سے برلن کانگریس میں مل گیا، کانگریس ۱۳ جون ۱۸۷۸ء کو منعقد ہوئی مگر اس سے قبل ہی انگلستان اور بابِ عالی کے درمیان ایک خفیہ معاہدہ

سائپرس کے متعلق ہو گیا تھا، جس کی اطلاع اس وقت تک دوسرے دولِ عظمیٰ کو نہ تھی، چوں کہ اس کانگریس میں نہایت اہم مسائل پیش ہونے والے تھے اور اندیشہ تھا کہ سلطنت عثمانیہ کی تقسیم کا مسئلہ بھی سامنے آجائے گا، اس لیے مغربی حکومتوں کے نمائندے ایک دوسرے کو مشکوک نگاہوں سے دیکھتے تھے اور ہر ایک کو یہ بدگمانی تھی کہ ممکن ہے دوسرے نے بابِ عالی سے کوئی خفیہ معاہدہ پہلے سے کر رکھا ہو، اس بدگمانی کو دور کرنے کے لیے کانگریس کے افتتاح کے وقت یہ تجویز پیش کی گئی کہ ہر سفیر اس امر کا اعلان کرے کہ مسائل زیر بحث سے متعلق اس کی حکومت نے کوئی خفیہ معاہدہ پہلے سے نہیں کر رکھا ہے، بلکنس فیڈ اور سلسبری جو حکومتِ برطانیہ کی نمائندگی کر رہے تھے، اس تجویز سے نہایت سراسیمہ ہوئے لیکن انھیں اس کی مخالفت کرنے کی جرأت نہ ہوئی اور ان دونوں کو بھی دوسری حکومتوں کے نمائندوں کی طرح مذکورہ بالا اعلان کرنا پڑا، ابھی کانگریس کا اجلاس ختم بھی نہیں ہوا تھا کہ ۹ جولائی کو لندن کے ایک اخبار گلوب (Globe) میں معاہدہ سائپرس کا مسودہ شائع ہو گیا، واقعہ یہ تھا کہ ماروین (Marvin) نامی ایک سیاح کو جو مشرقی ممالک میں سیاحت کر چکا تھا اور مختلف مشرقی زبانوں سے واقف تھا، برطانیہ کی وزارتِ خارجہ کی طرف سے معاہدہ مذکور کا ترکی مسودہ ترجمہ کے لیے دیا گیا تھا، حالانکہ دفترِ وزارت میں وہ کسی عہدہ پر مامور نہ تھا، اس شخص نے ایک بڑی رقم کے عوض گلوب کے ہاتھ ترجمہ کی ایک نقل فروخت کر ڈالی، بہر حال معاہدہ سائپرس کی اشاعت سے برلن میں برطانوی سفارت پر گویا بجلی سی گر گئی اور اگرچہ لندن میں فوراً مسودہ کی صحت سے انکار کیا گیا تاہم برلن میں حقیقت حال زیادہ دنوں پوشیدہ نہ رہ سکی، برطانوی نمائندوں کی بددیانتی سے کانگریس میں اس قدر برہمی پھیلی کہ اس کے درہم برہم ہو جانیکا اندیشہ پیدا ہو گیا، پرنس گورچاکوف اور وینٹگٹن نے جو روس اور فرانس کی نمائندگی کر رہے تھے، علانیہ اپنے غصہ کا اظہار کیا، معاملہ نے نہایت نازک صورت اختیار کر لی تھی اور اس کی مزید بدنامی صرف بسمارک کی کوششوں سے رفع کی جاسکی، بسمارک نے ایماندار دلال کی حیثیت

سے فرانس اور برطانیہ کے درمیان مندرجہ ذیل مصالحت طے کرادی، جس کے بعد ویڈنگٹن کا سارا غصہ جاتا رہا، فرانسیسی اور برطانوی نمائندوں کے درمیان یہ طے پایا کہ (۱) انگلستان نے سائپرس کو جس طرح (خفیہ طریقہ سے) حاصل کر لیا ہے اس کی تلافی کے لیے فرانس کو اجازت دی جائے کہ وہ جس وقت کوئی مناسب موقع ہاتھ آئے تونس پر قبضہ کر لے، انگلستان کی طرف سے کوئی مخالفت نہ ہوگی۔ (۲) مصر میں جو مالیاتی انتظامات ہو رہے ہیں، ان میں فرانس کو بھی انگلستان کے برابر دخل دیا جائے۔

(۳) شام کے روسن کیتھولک عیسائیوں کے تحفظ کا جو دعویٰ فرانس زمانہ قدیم سے کرتا آیا ہے برطانیہ اسے تسلیم کر لے۔ (۱)

اس معاہدہ کے بعد فرانس کو انگلستان کی طرف سے اطمینان ہو گیا اور وہ صرف مناسب وقت کا منتظر رہا لیکن جب حملہ کے لیے کوئی معقول حیلہ نظر نہ آیا تو تونس کے فرانسیسی نمائندہ تھیوڈور روستان (Theodore Roustan) نے بے بنیاد سفارتی شکایات تصنیف کر کے والی تونس محمد الصادق کے سامنے ایسے بے ہودہ مطالبات پیش کیے جن کو تسلیم کر لینا گویا اس علاقہ کو فرانس کے حوالہ کر دینا تھا، اس کے بعد جو ہوا اسے اسٹینلی لین پول اپنی کتاب بربری قزاق میں یوں بیان کرتا ہے: ”ان باتوں کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طاقت ور حکومت نے جس پر مقابل کی مضبوط حکومتوں کی طرف سے کوئی روک نہ تھی ایک نہایت کمزور لیکن ایماندار مملکت کے خلاف خفیہ طور پر اپنی جارحانہ کارروائیاں شروع کر دیں اور بالآخر الجزائر کی سرحد سے متصل بعض قبائل کے ہنگاموں کو عذر قرار دے کر جو ایک مضحکہ خیز عذر تھا تونس پر حملہ کا فیصلہ کر لیا، بے فائدہ محمد الصادق نے روستان کو یقین دلایا کہ قبائل میں امن و امان قائم کر دیا گیا ہے، بے فائدہ اس نے

تمام حکومتوں اور خصوصاً انگلستان سے اپیل کی، لارڈ گرانویل (وزیر خارجہ انگلستان) نے حکومت فرانس کے اس بیان پر یقین کر لیا کہ ”الجزائر اور تونس کے درمیان سرحدی علاقہ میں جو فوجی نقل و حرکت عنقریب شروع ہونے والی ہے، اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ الجزائر کے علاقہ میں سرحدی قبائل کی جو یورشیں برابر ہوا کرتی ہیں، ان کا خاتمہ کر دیا جائے، بے (محمد اصادق) کی آزادی اور اس کے علاقہ کا استقلال کسی طرح خطرہ میں نہیں ہے۔“ (۱)

ان تصریحات کے باوجود اپریل ۱۸۸۱ء میں فرانسیسی فوجوں نے تونس پر حملہ کر دیا اور ۱۲ مئی کو محمد اصادق نے بالکل مجبور ہو کر معاہدہ قصر السعید پر دستخط کر دئے، اس معاہدہ کے رو سے تونس پر فرانسیسی تسلط قائم ہو گیا، اگرچہ حکومت نام کے لیے محمد اصادق کی رہی، محمد اصادق کے انتقال کے بعد سیدی علی بے حاکم مقرر ہوا، لیکن اس کی حیثیت بھی فرانسیسی محمیہ (Protectorate) کے ایک عہدہ دار سے زیادہ نہ تھی۔

قبائل نے معاہدہ قصر السعید کے بعد بھی ہتھیار نہیں ڈالے، تونس کے جنوبی صوبوں نے علانیہ بغاوت کر دی اور کچھ دنوں تک ان صوبوں میں ہر طرف بد امنی پھیلی رہی، اس کے استیصال میں فرانسیسی فوجوں نے اپنی سابق روایات کے مطابق پوری سرگرمی دکھائی، فاس پر بے دردی کے ساتھ گولہ باری کر کے اسے لورے لیا گیا، مکانات مع باشندوں کے جلادئے گئے، قتل و غارت گری کا بازار گرم ہو گیا اور جو کچھ اس سے قبل الجزائر میں ہو چکا تھا وہ سب تونس میں دہرایا جانے لگا، کچھ دنوں کے بعد بتدریج حالات رو بہ اصلاح ہونے لگے، خصوصاً جب روستاں وہاں سے واپس بلا لیا گیا تو امن و امان قائم کرنے میں نسبتاً زیادہ آسانی ہوتی گئی۔

فرانس نے تونس کے ساتھ جو معاملہ کیا، اس کے متعلق لین پول نے ایک فرانسیسی فاضل ہنری ڈی روشفورٹ (Henri de Rochfort) کا مندرجہ ذیل قول نقل

کر کے اصل حقیقت واضح کر دی ہے، روشفورٹ لکھتا ہے: ”ہم نے تونس کی مہم کو ایک معمولی قریب سے تشبیہ دی تھی یہ صحیح نہ تھا، تونس کا معاملہ مثل قزاقی کے ہے، جس کی شدت قتل کی وجہ سے اور بھی زیادہ ہو گئی ہے۔“ (۱)

’برلن کانگریس‘ میں سلطنت عثمانیہ کی حمایت کا مظاہرہ سب سے زیادہ جس طاقت نے کیا تھا وہ برطانیہ تھی، لیکن معاہدہ سائپرس کے انشا کے بعد تونس کے متعلق جو معاہدہ برطانیہ اور فرانس کے نمائندوں میں ہوا اور جس کی بنا پر تونس کو جو اس وقت تک دولت علیہ کی فرماں روائی میں داخل تھا فرانسیسی عسکریت کا شکار بنا کر آگ اور خون کی راہ سے حکومت فرانس کے قبضہ و اقتدار میں لایا گیا، وہ برطانیہ کی دوستی کی حقیقت واضح کرنے کے لیے بالکل کافی ہے، کانگریس میں سلطنت عثمانیہ کی تقسیم کا مسئلہ برطانیہ کے لیے نہایت تشویش ناک تھا، روس کے حوصلے بڑھے ہوئے تھے اور جنگ کے آخری ایام میں خود قسطنطنیہ اس کی زد میں آ گیا تھا، ایسی صورت میں برطانیہ کی مداخلت اور کانگریس کے اجلاس میں سلطنت عثمانیہ کے مقبوضات کے تحفظ پر زور دینا کچھ اس سبب سے نہ تھا کہ وہ دولت علیہ سے حقیقی ہمدردی رکھتا ہے بلکہ محض اس خوف سے تھا کہ اگر روس کو آگے بڑھنے سے روکا نہ گیا تو شرقی اونی میں اس کا تسلط قائم ہو جائے گا جو برطانوی مصالح کے لیے حد درجہ خطرناک ثابت ہوگا اتنا ہی نہیں بلکہ برطانیہ کے اس طرز عمل کا مقصود یہ بھی تھا کہ سلطنت عثمانیہ کی کمزوری سے جو فائدہ دوسری حکومتیں اٹھانا چاہتی ہیں اسے خود اپنے لیے محفوظ کر لے، چنانچہ عین اس وقت جب ’برلن کانگریس‘ میں برطانیہ کا وزیراعظم لارڈ میکسنس فیلڈ عثمانی مقبوضات کے تحفظ پر نہایت پر جوش تقریریں کر رہا تھا اور اپنی تک دوستی سے یورپین قوموں کا نشانہ ملامت بنا ہوا تھا، معاہدہ سائپرس پر کامل رازداری کے ساتھ باب عالی کے نمائندوں کے دستخط لیے جا رہے تھے اور پھر جب کانگریس کے اختتام سے قبل ہی یہ راز منظر عام پر آ گیا اور دوسری حکومتیں کو برطانیہ کی

بددیانتی پر پیش آیا تو سلطنت عثمانیہ ہی کے ایک دوسرے صوبہ (تونس) کو فرانس کے حوالہ کر کے جس کی برہمی سے ساری کانگریس اور اس کے ساتھ مشرقِ ادنیٰ کے تمام برطانوی مصالح کے درہم برہم ہوجانے کا اندیشہ تھا اس دوستی کا حق ادا کیا گیا، لیکن یہ حق سائپرس اور تونس کے معاہدوں کے بعد بھی پوری طرح ادا نہ ہوا، اس کے لیے کسی اور موقع کا انتظار تھا، خوش قسمتی سے مصر نے یہ موقع بہت جلد بہم پہنچا دیا۔

مصر: سلطان عبدالحمید ثانی کی تخت نشینی کے وقت مصر کا والی اسماعیل پاشا تھا، محمد علی پاشا کے جانشینوں میں وہ پہلا شخص تھا، جس نے خدیو مصر کا لقب حاصل کیا ہے، یہ لقب اسے سلطان عبدالعزیز نے ۱۸۶۷ء میں عطا کیا تھا، نیز اسماعیل کی درخواست پر سلطان کی طرف سے ولایتِ مصر کے قانون وراثت میں اس تبدیلی کی اجازت بھی دی گئی تھی کہ آئندہ ولایت کا حقدار باپ کے بعد بیٹا ہوا کرے، بجائے اس کے کہ حکومت خاندان کے سب سے بڑے فرد کو سپرد کی جائے جیسا کہ سلطنت عثمانیہ میں دستور تھا، اس اہم تبدیلی کے معاوضہ میں اسماعیل نے مصر کے سالانہ خراج کی رقم جو باپ عالی میں پیش کی جاتی تھی تین لاکھ چھتر ہزار پونڈ سے بڑھا کر سات لاکھ بیس ہزار پونڈ کر دی تھی، ۱۸۷۳ء میں ایک دوسرے فرمانِ سلطانی کے رو سے اسماعیل کو بعض اور حقوق تفویض ہوئے جن کی بنا پر اس کی حیثیت بہت کچھ ایک خود مختار فرماں روا کی ہو گئی۔

ترقی و اصلاحات: اسماعیل ایک روشن خیال فرماں روا تھا اور اس کے پیشِ نظر اصلاحات کا ایک وسیع نظام تھا، اس نے محصولِ درآمد و برآمد کا نظام از سر نو مرتب کیا، ایک ڈاک خانہ قائم کیا، قاہرہ، سویز اور اسکندریہ میں گیس، پانی کی کلیں اور دوسری اصلاحات جاری کیں، شکر سازی کو رواج دیا اور ریلوے اور تار میں توسیع کر کے نیز بندر گاہیں اور نہریں تعمیر کر کے تجارت اور زراعت کو فروغ دیا، اس نے تعلیم کو ترقی دی، لڑکیوں کے لیے مدرسے قائم کیے، جو مصر میں تعلیم نسواں کے پہلے مدارس تھے، فوجی افسروں کے لیے مختلف فنونِ حرب کا ایک مدرسہ اور اہل مصر کے لیے ایک طبیہ کالج قائم

کیا، ۱۸۶۳ء میں جب عنانِ حکومت اس کے ہاتھ میں آئی تھی مصر میں صرف (۱۸۵) پبلک اسکول تھے، لیکن اس نے اپنے عہد میں ان مدارس کی تعداد (۲۵۱۷) تک پہنچادی، ۱۸۶۹ء میں اس نے بڑے تزک و احتشام کے ساتھ نہر سوئز کا افتتاح کیا اور اس تقریب میں یورپ کے متعدد حکمرانوں کو شریک کر کے بلِ مصر کی نگاہوں میں بڑی عزت حاصل کی، لیکن یہی تقریب بعد میں اس کے زوال اور مصر کی غلامی کا باعث ہوئی، ۱۸۷۵ء تک مصر میں یہ دستور تھا کہ غیر ملکی باشندوں کے مقدمات دیوانی ان کے قنصلوں کی عدالتوں میں پیش ہوا کرتے تھے، اسماعیل نے اس دستور کو منسوخ کر کے مخلوط عدالتیں قائم کر دیں۔ (۱)

ملکی قرضہ کا بار: لیکن یہ اصلاحات اور ترقیاں مصر کے حق میں تباہ کن ثابت ہوئیں، سابق والی سعید پاشا کی وفات کے وقت مصر ایک نہایت خوش حال ملک تھا، کاشتکاروں کی حالت پہلے کی بہ نسبت کہیں بہتر تھی، وہ خاصے دولت مند تھے، مصر پر کسی ملکی قرضہ کا بار نہ تھا، لیکن اسماعیل پاشا کے آتے ہی نقشہ بدل گیا، ان اصلاحات میں نہ صرف خزانہ خالی ہو گیا بلکہ قرضہ لینے کی نوبت بھی آ گئی، ۱۸ نومبر ۱۸۷۶ء تک مصر کے ملکی قرضہ کی مقدار گیارہ کروڑ پینتیس لاکھ تہتر ہزار تین سو ایک پونڈ تک پہنچ گئی۔ (۲)

نہر سوئز کے حصوں کی فروخت: قرضہ کا بار ملک کے اندرونی مصارف کے علاوہ بیرونی فتوحات کی کوشش میں بھی بڑھتا گیا، سوڈان اور ابی سینا کی مہموں میں ہزاروں جانیں اور لاکھوں روپیے ضائع ہوئے، سوڈان کی مہم تو ایک حد تک کامیاب رہی اور دارفور پر قبضہ ہو گیا لیکن ابی سینا میں اسماعیل کی فوجوں کو سخت شکست ہوئی اور خود اس کا لڑکا دشمنوں کے ہاتھ میں گرفتار ہو گیا، ان غیر معمولی مصارف کے لیے ایک طرف قرضہ کی مقدار میں اضافہ ہوتا گیا اور دوسری طرف کاشت کاروں پر بیش از بیش محصول عاید کیے جانے لگے پھر بھی حکومت کے معمولی اخراجات کے لیے روپیہ کافی نہ ہوتا اور اسماعیل

کو مزید قرضوں سے چارہ نہ تھا، یورپ کے ساہوکاروں نے مصر کی ماں حالت دیکھ کر اپنا ہاتھ کھینچ لیا، برطانیہ کے لیے مصر پر اپنا تسلط قائم کرنے کا یہ ایک نہایت زریں موقع تھا، لارڈ ہلکینس فیلڈ نے جو اس وقت وزیراعظم تھا اپنے خفیہ گماشتوں کے ذریعہ نہر سوئز میں اسماعیل کے تمام حصے جن کی مجموعی تعداد ایک لاکھ چھ ہزار چھ سو دو تھی، خاموشی کے ساتھ انٹالیس لاکھ چھ ہزار پانچ سو بیاسی پونڈ میں خرید لیے (۱) اسماعیل اس معاملہ کے مہلک نتائج سے ناواقف نہ تھے لیکن اپنی فضول خرچیوں سے مجبور تھا اور نہر سوئز کے حصوں کو فروخت کر دینے کے علاوہ روپیہ حاصل کرنے کی اور کوئی صورت اس کی سمجھ میں نہ آتی تھی۔

نہر سوئز کی اہمیت: نہر سوئز کی تعمیر ایک فرانسیسی انجینئر ڈی لیسس (Delesse) کی تجویز سے ہوئی تھی، اسی نے اسماعیل کو نہر کی تجارتی اہمیت دکھا کر تعمیر پر آمادہ کیا تھا اول اول اس میں زیادہ تر فرانسیسی سرمایہ داروں کے حصے تھے، برطانیہ نے کوئی حصہ نہ لیا مگر جب ۱۸۶۹ء میں یہ نہر بن کر تیار ہوئی اور نہایت عظیم الشان پیمانہ پر اس کی رسم افتتاح ادا کی گئی تو برطانیہ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا، اس نہر کے کھل جانے سے مشرق کا بحری راستہ جو اس وقت تک اس امید سے ہو کر گذرتا تھا مسافت میں بہت کم ہو گیا اور اسی اعتبار سے اخراجات بھی بہت گھٹ گئے، علاوہ بریں اس سے خود مصر کی اہمیت حد درجہ بڑھ گئی اور وہ ملک جو اب تک بین الاقوامی اعتبار سے کوئی حیثیت نہ رکھتا تھا، دنیا کے اہم ترین تجارتی راستوں میں سے ایک کا مالک بن گیا، لیکن یہی چیز اس کی سیاسی بربادی کا باعث ہوئی چوں کہ نہر سوئز میں زیادہ تر اہل فرانس کے حصے تھے، اس لیے اس سے فائدہ اٹھانے کا حق بھی زیادہ تر فرانس ہی کو پہنچتا تھا، لیکن اپنے ایشیائی مقبوضات اور مقاصد کی بناء پر انگلستان کے لیے اس نہر پر تسلط قائم کرنا نہایت ضروری تھا، یہ عجیب بات ہے کہ برطانوی مدبرین نے شروع میں نہر سوئز کی تجویز سے کوئی دلچسپی نہیں لی اور

(۱) ہسٹورینس ہسٹری آف دی ورلڈ جلد ۴ ص ۳۵۷ (۱) ترکی ماضی، حال و مستقبل از ملٹر ڈاہ ص ۲۵

وہ اس کی تعمیر کو ایک ناممکن شے خیال کرتے رہے، مگر جب ۱۸۶۹ء میں ڈی لیمپس نے اسے بنا کر تیار کر دیا اور ساری دنیا نے اس تجویز کی کامیابی اپنی نظروں سے دیکھ لی تو برطانیہ کی بھی آنکھیں کھلیں، اس کی خوش قسمتی سے وزارت اس وقت لارڈ بیکنس فیلڈ کے ہاتھ میں تھی، جو اپنے ارادوں کی تکمیل میں دوسرے وزراء کی مخالفت کی زیادہ پروا نہیں کرتا تھا اس نے خفیہ طور پر اسماعیل سے معاملت شروع کر دی اور چونکہ اسماعیل کو روپیوں کی شدید ضرورت تھی اور کہیں سے قرض مل نہیں رہا تھا، اس لیے بیکنس فیلڈ کی کوششیں بالآخر کامیاب ہوئیں اور اسماعیل کے تمام حصے برطانیہ کے ہاتھ فروخت ہو گئے۔

مصر میں فرانسیسی اور برطانوی اقتدار: لیکن ان حصوں کی فروخت سے بھی اسماعیل کے اخراجات پورے نہ ہو سکے اور اسے مزید قرض کی ضرورت محسوس ہوئی، ادھر یورپ کے ساہوکاروں نے اپنی رقموں کی ادائیگی کے لیے شدید تقاضے شروع کیے، اسماعیل ان کو ادا کرنے سے بالکل قاصر تھا، اس کی یہ تدبیر کہ پرانے قرضوں کے ادا کرنے کے لیے سنگین شرح سود پر اور قرضے لیے جائیں، بقول ایلینسن فلپس ایک جرمہ لطیف کی حیثیت رکھتی تھی، جو مرض کی مزید ترقی کا باعث ہوا، اس کے سامنے اب صرف دو راہیں تھیں یا تو اپنے دیوالیہ ہونے کا اعلان کر دے یا یورپین حکومتوں کی مداخلت منظور کرے، جس کی وجہ سے نہ صرف مغربی ساہوکاروں کے بے ہنگام تقاضوں کی روک تھام کی امید تھی بلکہ یہ توقع بھی تھی کہ مزید قرضے مل سکیں گے، چنانچہ اسی مقصد کو پیش نظر رکھ کر اسماعیل نے دیوالیہ ہونے کا اعلان کرنے کے بجائے دوسری صورت اختیار کی اور حکومت برطانیہ سے ایک ماہر مالیات کی درخواست کی جو مصر کے صیغہ مالیات کا معاینہ کر کے اس کے متعلق صحیح رپورٹ پیش کر سکے، اس درخواست پر دسمبر ۱۸۷۵ء میں مسٹر اسٹیفن کیو (Stephen Cave) حکومت برطانیہ کی طرف سے مصر بھیجے گئے اور ان کی رپورٹ اپریل ۱۸۷۶ء میں شائع ہوئی، رپورٹ کا خلاصہ یہ تھا کہ مصر کی مالی ساکھ قائم رکھنے کے لیے یورپین حکومتوں کی مداخلت ضروری ہے، بغیر اس کے دیوالہ نکلنے سے مفر نہیں

اس کے بعد دوسرے تحقیقاتی کمیشن آن شروع ہوئے اور ان میں سے ہر ایک اسماعیل کو اور زیادہ یورپ کے قبضہ میں لاتا گیا، نومبر ۱۸۷۶ء میں برطانوی اور فرانسیسی حکومتوں کی طرف سے گوشن (Goschen) اور جوبرت (Joubert) کا مشن آیا، جس کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ مصر کا صیغہ مالیات مشترکہ طور پر فرانس اور انگلستان کی نگرانی میں آگیا پھر مئی ۱۸۷۸ء میں ایک اور تحقیقاتی کمیشن پہنچا، اس مشن کی تحقیقات کا نتیجہ یہ ہوا کہ فرانس اور انگلستان کی نگرانی صیغہ مالیات کے علاوہ خدیو مصر کی زمینداری پر بھی قائم کر دی گئی، اس وقت سے مصر گویا مالکان دستاویز کے ہاتھوں رہن ہو گیا اور ملک کے تمام ذرائع آمدنی اس سنگین قرض کی ادائیگی کی نذر ہونے لگے، جس کا ذمہ دار صرف اسماعیل تھا، چند دنوں کے بعد فرانس اور انگلستان کی مشترکہ نگرانی کی بجائے اسماعیل کو ایک ایسی وزارت قایم کرنے پر مجبور کیا گیا جس میں ان دونوں حکومتوں کے نمائندے بحیثیت رکن کے مقرر کیے گئے، چنانچہ ستمبر ۱۸۷۸ء میں نیو برپاش کی صدارت میں جو وزارت قایم ہوئی اس میں مالیات کا وزیر ریورس ولسن (Rivers Wilson) اور پبلک ورکس کا بلینیئرے (Blignieres) مقرر ہوا، یہ گیا ملک کو تمام تر برطانیہ اور فرانس کے اقتدار میں دے دینا تھا، اس سے سخت برہنہ پھیلی اور فوج نے عربی پاشا کی سرکردگی میں بغاوت کر دی، اسماعیل کے لیے بجز اس کے اور کوئی صورت نہیں رہی کہ برطانوی اور فرانسیسی وزرا کو برخاست کر کے اس یوروپین وزارت کا خاتمہ کر دے، برطانیہ اور فرانس کو سخت غصہ آیا اور انھوں نے باب عالی پر دباؤ ڈال کر اسماعیل کو خدیو کے عہدہ سے معزول کر دیا، ۲۶ جون ۱۸۷۹ء کو باب عالی کا ایک تار اسماعیل کو ملا جس میں اسے اطلاع دی گئی تھی کہ وہ معزول کیا گیا اور اس کی جگہ اس کا لڑکا توفیق خدیو مقرر کیا گیا۔

توفیق پاشا: عنان حکومت کو ہاتھ میں لینے سے پہلے توفیق، سید جمال الدین افغانی اور جامع ازہر کے ان مصلحین کے زیر اثر آچکا تھا جو مصر میں قومی تحریک کے بانی اور دستوری حکومت کے اولین محرک تھے اور اس نے سید جمال الدین افغانی کے توسط سے بار بار یہ

معاهدہ شیوخ ازہر سے کیا تھا کہ اگر کبھی اسے مصر کے تخت پر بیٹھنا نصیب ہوا تو وہ تمام تر دستوری اصولوں کے مطابق حکومت کرے گا، یہی تھی کہ توفیق کے تقرر کو اس جماعت نے ملک کی خوش نصیبی خیال کیا لیکن ان کی مسرت زیادہ دنوں تک قائم نہ رہ سکی اور تخت نشینی کے بعد بمشکل ایک مہینہ گزرا تھا کہ وہ اپنے وعدوں کو بھول گیا اور اپنے سابق دوستوں سے غداری کرنے لگا۔

توفیق کے سامنے دو قوتیں تھیں، جن کے اغراض و مقاصد ایک دوسرے کے بالکل مخالف تھے، ایک طرف اس کے اصلاح پسند دوستوں کی جماعت تھی جو اسے دستوری حکومت کے قدیم وعدے یاد دلارہے تھے، دوسری طرف یورپین قصلوں کی قوت تھی جو اسے دستوری حکومت سے روک رہے تھے اور اس بات پر زور دے رہے تھے کہ وہ اپنے اختیارات کے کسی حصہ سے بھی دست کش نہ ہوتا کہ وہ خود اس کے نام سے مصر پر حکومت کرتے رہیں، پہلی قوت سے متاثر ہو کر شروع میں تو اس نے اپنے وزیر شریف پاشا کے مشورہ کے مطابق دستوری حکومت کا قیام منظور کر لیا اور ایک فرمان کے ذریعہ اس کی اشاعت کی اجازت دے دی لیکن جب دوسری طرف سے زور پڑا تو اس فرمان پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا، اس واقعہ پر شریف پاشا نے استعفاء دے دیا اور توفیق نے قصلوں کی تجویز سے ریاض پاشا کو وزیر مقرر کیا جو یورپین حکومتوں کے زیر اثر تھا، توفیق نے اپنے دور حکومت کے پہلے ہی اہم معاملہ میں جو کمزوری دکھائی، وہ اس کی تمام آئندہ مشکلات کا سبب بن گئی، اگر اس نے اپنے وعدوں کے مطابق اس وقت ایک مجلس اعیان طلب کر لی ہوتی تو اس کی تمام رعایا اس کے ساتھ ہو جاتی اور وہ سازشیں وجود میں نہ آتیں جو دو سال تک ملک کو بے چینی میں مبتلا رکھنے کے بعد بالآخر ۱۸۸۲ء کے انقلاب کا باعث بنیں۔

دستوری حکومت کا اعلان: توفیق کی کمزوری کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت حقیقتاً یورپین سفیروں کے ہاتھ میں آگئی اور انگلستان اور فرانس نے اپنی مشترکہ نگرانی پھر قائم کر لی،

یوروپین عہدہ داروں کی ایک کثیر تعداد نے پہنچ کر ملک کو لوٹنا شروع کیا، اہل مصر میں سخت برہمی پھیلی، خصوصاً جب مصری فوج کی تعداد پچاس ہزار سے گھٹا کر صرف پندرہ ہزار کر دی گئی تو ان کے غصہ کی انتہا نہ رہی، توفیق اپنے یوروپین مشیروں کے ہاتھ میں ایسا بے بس تھا کہ ان کی مرضی کے خلاف کوئی بات کر نہیں سکتا تھا، اہل مصر کے لیے موجودہ نظام حکومت کے خلاف بغاوت ناگزیر ہو گئی اور مصری فوج نے احمد عربی پاشا کے زیر علم جس پر یہ عبارت لکھی ہوئی تھی: ”مصریوں کے لیے“، ستمبر ۱۸۸۱ء میں بغاوت کر دی اور دستوری حکومت کا مطالبہ پیش کیا، توفیق ملک کے اس متفقہ مطالبہ کو مسترد کرنے کی طاقت نہیں رکھتا تھا، اسے مجبوراً دستوری حکومت کا مطالبہ منظور کرنا پڑا، مصری فوج کی تعداد بھی جو یوروپین مشیروں کی رائے کے مطابق گھٹادی گئی تھی پھر بدستور سابق کر دی گئی، دستوری حکومت کا فرمان اہل مصر کے لیے ویسی ہی مسرت کا باعث ہوا جیسی مسرت قیدیوں کو مرثوہ ربائی سے پہنچ سکتی ہے، تمام ملک میں جشن کے شادیانے بجنے لگے اور توفیق کے خلاف جو شکایتیں قیام ہو گئی تھیں وہ یک قلم رفع ہو گئیں، اس دستوری حکومت میں یوروپین قنصلوں کے شدید اختلاف کے باوجود عربی پاشا وزیر جنگ مقرر ہوئے اور توفیق نے اس قانون پر دستخط کر دئے جس کے رو سے جدید نگہوں کے لیے مجلس اعیان کی منظوری لازمی قرار دی گئی۔

انگلستان اور فرانس کا طرز عمل: اہل مصر کی بیداری یوروپین حکومتوں کے مقاصد کے لیے نہایت مضرت تھی کیوں کہ انھوں نے بتدریج مصر پر اپنا تسلط قائم کرنا شروع کر دیا تھا، چنانچہ انگلستان اور فرانس نے ایک متفقہ مراسلہ مورخہ ۶ جنوری ۱۸۸۲ء توفیق پاشا کے پاس بھیجا جس میں اپنی سرپرستی کا یقین دلاتے ہوئے قومی جماعت کے خلاف پوری مدد کرنے کا وعدہ کیا لیکن اس مراسلہ کے مضمون نے مصریوں کو اور بھی برا فروختہ کر دیا، خصوصاً جب سلطان نے بھی انگلستان اور فرانس کے اس طرز عمل کے خلاف احتجاج کیا اور اپنے سفیروں کے ذریعہ جولینڈن اور پیرس میں مقیم تھے انھیں مطلع کیا کہ مصر سلطنت

عثمانیہ کا ایک صوبہ ہے، اس لیے حکومت مصر سے کوئی معاملات باب عالی کے توسط کے بغیر نہیں ہونی چاہیے، تو وطنی جماعت کے حوصلے اور بڑھ گئے، انگلستان اور فرانس نے اس کا یہ جواب دیا کہ یک متحدہ جنگی بیڑا اسکندر یہ کے سامنے لا کر کھڑا کر دیا اور یہ دھمکی دی کہ اگر عربی پاشا کو مصر سے نکال نہ دیا جائے گا اور ان کی وزارت تو زندہ دی جائے گی تو جنگی بیڑے کے ذریعہ یہ مطالبات پورے نہ کرائے جائیں گے، تو توفیق نے تودب کر یہ باتیں منظور کر لیں لیکن قومی جماعت پر اس دھمکی کا کوئی اثر نہ ہوا، برخلاف اس کے اس نے خود توفیق کو معزول کر دینے کی دھمکی دی اور اسے مجبور کر کے عربی پاشا کو پھر وزیر جنگ مقرر کرایا، اس کے بعد مصر کی حکومت عملاً عربی پاشا کے ہاتھ میں آ گئی۔

اس موقع پر فرانس کی تجویز سے مغربی حکومتوں کے سفرا کی ایک کانفرنس قسطنطنیہ میں منعقد ہوئی، جس میں حکومت مصر کے معاملات سے متعلق باب عالی کو مشورے دئے گئے اور ان مشوروں کے مطابق مداخلت کرنے کی درخواست کی گئی، سلطان نے اپنی سلطنت کے اندرونی معاملات میں غیر حکومتوں کی مداخلتوں پر عمل کرنے سے انکار کر دیا، بجائے اس کے اس نے توفیق اور قومی جماعت کی استدعا پر مصر کے لیے ایک کمشنر کا تقرر منظور کیا اور درویش پاشا کو مقرر کر کے روانہ کیا۔

درویش پاشا: درویش پاشا نے قاہرہ پہنچ کر حالات کا صحیح اندازہ کرنے کی کوشش کی، لیکن توفیق نے پچاس ہزار پونڈ نقد اور پچیس ہزار پونڈ کے جواہرات نذر کر کے اسے اپنا طرفدار بنایا (۱) نتیجہ یہ ہوا کہ جب شیوخ ازہر کا وفد اس سے ملنے آیا اور اس نے ملکی جذبات کی پوری ترجمانی کر کے درویش پاشا کے سامنے قوم کے مطالبات پیش کیے تو درویش پاشا نے یہ جواب دے کر وفد کو رخصت کر دیا کہ ”میں حکم دینے آیا ہوں، تم سے مشورہ کرنے کے لیے نہیں آیا۔“ شیوخ نہایت برہمی کی حالت میں واپس ہوئے اور جو برتاؤ ان کے ساتھ درویش پاشا نے کیا تھا اس کی خبر بہت جلد تمام ملک میں پھیل گئی،

ہر طرف احتجاجی جلسے و مظاہرے ہونے لگے اور حکومت کی مخالف کوششوں کے باوجود درویش پاشا کو ملک کے صحیح جذبات سے مطلع ہونا پڑا، معاملات پر قابو پانے کے لیے اس نے عربی پاشا کو بلا کر دریٹک منتقلو کی اور اس بات کی کوشش کرتا رہا کہ عربی پاشا بطور خود وزارت جنگ سے دست بردار ہو کر قسطنطنیہ روانہ ہو جائیں، لیکن عربی پاشا نے جواب دیا کہ ”چوں کہ اس وقت ملک کی حالت نازک ہے اور امن و امان کا ذمہ دار میں ہوں اس لیے جب تک مجھے باقاعدہ تحریری حکم نہ ملے گا میں اپنے عہدہ سے دست بردار نہیں ہو سکتا“، درویش پاشا کے لیے یہ جواب خواہ کتنا ہی غیر متوقع رہا، لیکن اس میں شبہ نہیں کہ توفیق اور اس کے یوروپین مشیروں کے لیے عربی پاشا کے خلاف ایک عمدہ موقع ہاتھ آگیا اور جس شورش کا مواد پہلے سے فراہم کر لیا گیا تھا اسے فوراً درویش پاشا کی موجودگی ہی میں برپا کر دیا گیا تاکہ باب عالی کے فرستادہ کمشنر پر عربی کے حسن انتظام کی حقیقت کھل جائے۔

اسکندر یہ کا بلوہ: اسکندر یہ میں اتفاق سے ایک مصری لڑکے اور ایک مالٹی کے درمیان ۱۱ جون کو جھگڑا ہو گیا، جس نے دفعہ بڑھ کر ایک سخت ہنگامہ کی شکل اختیار کر لی، تقریباً دو سو آدمی مارے گئے، جن میں انچاس یوروپین تھے، برطانوی قنصل کوکسن (Cookson) کو سخت چوٹ آئی اور اطالوی اور یونانی قنصل بھی کسی قدر زخمی ہوئے، ان کے علاوہ اسی (۸۰) نوے (۹۰) یوروپین اور زخمی ہوئے، یہ ہنگامہ ایک بجے دن سے لے کر پانچ بجے شام تک جاری رہا مگر اسکندر یہ کی پولیس جو وہاں کے گورنر عمر پاشا لطفی کے زیر حکم تھی، اسے فرو کرنے سے قاصر رہی اور جب تک فوجی دستہ پہنچ نہ گیا کشت و خون ہوتا رہا۔

حقیقت حال: اس ہنگامہ کی ذمہ داری حقیقتاً کن لوگوں پر عاید ہوتی ہے، اس کا اظہار مسٹر بلنٹ نے نہایت صفائی اور دیانت داری کے ساتھ کیا ہے، وہ لکھتے ہیں: ”چوں کہ اس معاملہ کی ذمہ داری جو مصر کی قومی تحریک کے لیے ایسا افسوس ناک تھا اس شخص پر عاید کی گئی ہے، جس کو اس سے سب سے زیادہ نقصان پہونچا یعنی عربی اور چوں کہ اس واقعہ نیز دوسرے عدالت کو جو اس سے کم غیر منصفانہ نہ تھے، ہماری وزارت خارجہ و بحریہ نے

یہ عذر پیش کر کے کہ مصر یقینی طور پر بد امنی کی حالت میں ہے، اسکندر یہ پر گولہ باری کرنے اور اس کے بعد کی جنگ کا حیلہ بنالیا تھا، اس لیے مناسب ہے کہ آگے بڑھنے سے پہلے ہم یہاں بتا دیں کہ اس پورے واقعہ کے جرم کی ذمہ داری صحیح طور پر کن لوگوں پر عاید ہوتی ہے، جب میں نے اس کی خبر لندن میں سنی تو میرا پہلا خیال یہ ہوا کہ یہ واقعہ اس سازش کا ایک جز ہے جو میں جانتا تھا کہ درویش پاشا کے ذریعہ سے وزارت خارجہ میں مرتب کی گئی ہے، تاکہ عربی کو اس کے جال میں پھانسا جائے لیکن اس کے متعلق پوری تفصیلات مجھے ٹرائی کے بعد معلوم ہوئیں اور اسی وقت میں اس قابل ہوا کہ قوم پروروں کے خلاف جو غلط الزامات لائے جاتے تھے کہ یہ ہنگامہ انہی کا تجویز اور پیدا کیا ہوا ہے، ان کی تردید کر سکوں، اس وقت ظاہر ہوا کہ حقیقت حال اس کے بالکل برعکس تھی جیسا کہ ہم لوگ جو اس وقت کے رازوں سے باخبر ہیں جانتے ہیں، یہ بلوہ اگرچہ اس کی ابتدا غالباً اتفاقی طور پر ہو گئی، چند ہفتے قبل سے درباری جماعت کے زیر تجویز تھا اور وہ اسے کسی مناسب موقع پر عربی کو بدنام کرنے کا ذریعہ بنانا چاہتی تھی کہ یہ شخص ملک میں امن و امان قائم رکھنے کی اہلیت نہیں رکھتا۔

اسکندر یہ کی صورت حال یہ تھی، مصر کے دوسرے شہروں کی بہ نسبت اسکندر یہ بڑی حد تک ایک یورپین شہر تھا جس میں اسلامی آبادی کے علاوہ یونانی، اطالوی اور مالٹی نوآبادیاں قائم تھیں، یہ سب لوگ تجارت کرتے تھے اور ان میں سے بہتیرے مہاجرینی پیشہ تھے، دونوں جماعتوں کے باہمی تعلقات کبھی بھی بہت اچھے نہ تھے اور پھر جنگی بیڑہ کے پہنچنے کے بعد جو علانیہ یورپین اغراض کے تحفظ کے لیے آیا تھا کشیدگی بہت بڑھ گئی تھی، امن قائم رکھنے کے لیے شہر کے گورنر کا بہت وفادار مضبوط اور سمجھ دار ہونا ضروری تھا، نیز جنگی بیڑہ کے لیے بھی بہت سوچ سمجھ کر کام کرنے کی ضرورت تھی، بد قسمتی سے گورنر عمر لطفی پاشا نیشلسٹ منسری کا بالکل مخالف تھا، وہ چرکس تھا، درباری پارٹی کا ممبر تھا اور سابق خدیو اسماعیل کا طرفدار تھا اور چرکسی سازش کے موقع پر اس نے مغرب کے

بدوؤں کو خود یو تو فینک کا حامی بنا کر اس کی بڑی مدد کی تھی، اس بنا پر اس نے بجائے دبانے کے مسلمان آبادی میں شورش کرنے والوں کو اور ابھار دیا تھا، دوسری طرف یونانی اپنی جماعت کے سردار امبراز سیناڈینو (Ambroise Sinadino) کی مدد سے جو ایک دولت مند سا ہوکار اور مصر میں روٹھس چائلڈز (Rothschilds) کا ایجنٹ بھی تھا، مسلح ہونے لگے تھے اور ماسیوں نے بھی جن کی تعداد زیادہ تھی انگریزی قنصل کو کسن (Cookson) کے اشارہ سے اپنے کو مسلح کر لیا تھا، لہذا یہ کہا جاسکتا ہے کہ مئی کے آخری ہفتہ میں بلوہ کے لیے تیاریاں ہو گئی تھیں۔ (۱)

اسکندریہ کی گولہ باری: اس بوہ کی تیاری جیسا کہ مندرجہ بالا بیان سے واضح ہوتا ہے درویش پاشا کے اسکندریہ پہنچنے (۸ جون) سے قبل ہو چکی تھی اور اس کا مقصد درویش پاشا پر یہ ظاہر کر دینا تھا کہ عربی پاشا ملک میں امن و امان قائم رکھنے کی اہمیت اور قوت نہیں رکھتا، مسٹر بلٹ کا خیال ہے کہ درویش پاشا اس سازش سے بے خبر نہ تھا اور اگر عربی پاشا اپنے عہدہ سے مستعفی ہو گئے تھے جیسا کہ درویش پاشا نے زور دیا تھا تو یہ بلوہ روک دیا جاتا، بہر حال جس مقصد سے یہ بلوہ کرایا گیا تھا نتیجہ اس کے برخلاف نکلا، اس کے ترتیب دینے والوں نے جس پیمانہ پر اسے کرانا چاہا تھا یہ اس سے بہت بڑھ گیا اور پھر مجبوراً اسے فرو کرنے کے لیے فوجی مدد منگانی پڑی، بجائے اس کے کہ عربی پاشا کی پوزیشن کو اس سے نقصان پہنچے اسکندریہ کی عیسائی آبادی انھیں اپنا محافظ سمجھنے لگی، فوج نے اس کے بعد اسکندریہ اور قاہرہ میں پوری طرح امن قائم کر لیا، جس کی وجہ سے عربی پاشا کا اثر و اقتدار اور زیادہ بڑھ گیا، یہ موقع عربی پاشا کے لیے بہت اچھا تھا، وہ اگر تہہ راہ قوت سے کام لیتے تو وطنی تحریک کے دشمنوں کو بھی قابو میں لاسکتے تھے اور عیسائیوں کو بھی مہمکن کر سکتے تھے لیکن انھوں نے اس قیمتی موقع سے فائدہ نہ اٹھایا اور چوں کہ یورپ کی سیاسی چالوں سے ناواقف تھے، اس لیے آسنی کے ساتھ میلٹ (Malet) اور کالوین

(Colvin) کے فریب میں آ گئے، جو ایک طرف تو ان سے امن قائم رکھنے کی تاکید کر رہے تھے اور دوسری طرف برطانوی جنگی بیڑہ کو اسکندریہ پر گولہ باری کرنے کے لیے آمادہ اور تیار کر رہے تھے (۱) برطانوی امیر البحر سمور (Seymour) کے لیے گولہ باری کا عذر پیدا کر لینا کوئی بڑی بات نہ تھی، گذشتہ بیڑہ میں اس کا ایک ملازم بھی مارا گیا تھا، اس نے قسم کھائی تھی کہ اس قیمتی جان کا خون بہا اسکندریہ والوں سے لے کر رہوں گا۔ عراقی پاشا کو بھی اب اصلی خطرہ کا احساس پیدا ہو گیا تھا اور انھوں نے اسکندریہ کی قلعہ بندی کا کام شروع کر دیا تھا، سمور نے ان کو قلعہ بندی کے کام سے روکنا چاہا لیکن عراقی پاشا نے انکار کر دیا، یہ عذر برطانوی امیر البحر کے لیے بہت کافی تھا اور اس نے فوراً ہی اسکندریہ پر گولہ باری شروع کر دی (۱۱ جولائی ۱۸۸۲ء) شہر کا ایک بڑا حصہ مسمار ہو گیا، مصری فوج کو قلعہ چھوڑ کر پسپا ہونا پڑا اور اسکندریہ پر انگریزی فوج کا قبضہ ہو گیا۔

جنگ آزادی: اسکندریہ کی گولہ باری مصر پر انگریزی قبضہ کا مقدمہ تھی، دو ماہ تک اہل مصر عراقی پاشا کی سرکردگی میں انگریز حملہ آوروں کا مقابلہ کرتے رہے لیکن بالآخر خود اپنوں نے غداری کی اور قل کبیر کی شکست نے قومی جماعت کے بازو توڑ دئے، مسٹر بلنٹ نے جو مصر کی وطنی تحریک میں شروع سے شریک تھے اور اس کی کامیابی کے لیے کسی امکانی کوشش سے باز نہ آئے، اس جنگ آزادی کے سچے واقعات اپنی کتاب ”مصر پر انگریزی قبضہ کی مخفی تاریخ“ کے سولہویں باب میں تفصیل کے ساتھ درج کر دئے ہیں، ہم اس کا خلاصہ اور اہم اقتباسات ذیل میں پیش کرتے ہیں، مسٹر بلنٹ لکھتے ہیں:

”اس جنگ کا کوئی صحیح بیان کسی انگریز مصنف کی کتابوں

میں نہیں ملے گا اور فرانسیسی بیانات میں تو سچائی اس سے بھی کم پائی جاتی

ہے، انگریزی فوجی دستہ کی سرپرستی میں غدو اور ترکی چر کسی حکومت کے

قاہرہ میں دو بارہ اقتدار حاصل کرنے کے بعد ایک سال یا اس سے

زیادہ عرصہ تک جس عہد درشت کا قیام رہا۔ اس نے کافی طور پر اہل مصر کی زبان بندی کر دی، جس کی وجہ سے وہ ان واقعات کو بیان نہ کر سکے جو خود یو کی غیر موجودگی کے زمانہ میں وہاں پیش آئے تھے اور گورابی کے مقدمہ کی شہرت سے عارضی طور پر کچھ روشنی ان واقعات پر پڑ گئی تاہم مکی پریس کے کسی جریدہ میں اتنی جرأت نہیں پائی گئی کہ وہ سرکاری بیان سے ہٹ کر ان واقعات کو بیان کر سکے پھر اس کے بعد جب فرانس کی سرپرستی میں قومی اخباروں میں کچھ ہمت پیدا ہوئی تو اس وقت تک چند غلط روایتیں مشہور ہو چکی تھیں، جو آج بھی بڑی حد تک مصر کے تعلیم یافتہ طبقہ پر اثر انداز ہیں۔

پہلی بات جسے واضح کر دینا ضروری ہے، کیوں کہ یہ پارلیمنٹ کی رپورٹوں (Blue Books) میں مسخ کر کے پیش کی گئی ہے اور تمام انگریز مصنفوں نے اسے نظر انداز کر دیا ہے، یہ ہے کہ انگریزی حملہ کے مقابلہ میں جو مدافعت مصر کی طرف سے پیش کی گئی وہ اصلاً ایک قومی مدافعت تھی، سرکاری بیان یہ ہے کہ صرف فوج نے گولہ باری کے وقت سیمور کے نام ممکن مطالبات کا ور پھر اولز لے (Wolseley) کے بری حمد کا مقابلہ کیا، یہ محض اُس سیاسی افسانہ کا تسلسل ہے جو وزارت خارجہ میں اس غرض سے مرتب کیا گیا تھا کہ مصر کی مالیات میں مداخلت کرنے کا عذر ہاتھ آجائے اور یہ افسانہ جھوٹ کی ایک حد درجہ مسخ شدہ صورت میں لارڈ ڈفرن کی افتتاحی تقریر میں پڑھا جاسکتا ہے، جو انھوں نے قسطنطنیہ کی یوروپین کانفرنس میں کی تھی، انگریزی سفیر (ڈفرن) کے بیان کے مطابق مصر گولہ باری سے قبل بد امنی کی حالت میں تھا، جہاں لوگوں کی جان و مال کا کوئی تحفظ نہ تھا اور قتل عام جاری

تھا اور اس کی ذمہ دار فوج تھی جو عربی پاشا اور دوسرے باغی افسروں کی سرکردگی میں کام کر رہی تھی اور جس کی وجہ سے حکومت کو چلانا اور امن و امان اور مالیاتی استواری قائم رکھنا ناممکن تھا، میں اس سے قبل کافی طور پر واضح کر چکا ہوں کہ یہ بیان سیاسی صورت حال کا کس قدر شدید مبالغہ آمیز نقشہ تھا نیز یہ کہ کس طرح رفتہ رفتہ اسے دروغ اور اختراعات کی بنیاد پر قائم کیا گیا تھا۔“ (۱)

مکی میں جنگی بیڑہ کے اسکندر یہ پہونچ جانے کے بعد اہل مصر کو اندازہ ہو گیا تھا کہ یورپین حکومتوں نے جو سلوک تونس کے ساتھ کیا ہے وہی ان کے ملک کے ساتھ بھی کیا جانے والا ہے، تونس پر قبضہ کرنے سے پہلے غلط طور پر مشہور کیا گیا تھا کہ وہاں بد امنی اور بغاوت پھیلی ہوئی ہے، جس سے یورپین باشندوں کی جان و مال خطرہ میں ہے اور ان کے تحفظ کے لیے مداخلت ضروری ہے، اس کے بعد یہ ظاہر کیا گیا کہ وہاں کے فرماں روا کو اس کی باغی رعایا سے بچانے کی ضرورت ہے اور اس عذر کی بنا پر اسے قبضہ میں کر لیا گیا پھر اسے مجبور کیا گیا کہ اپنے لیے ایک ’فوجی تحفظ‘ منظور کرے یعنی اپنے کو تمام تر حملہ آوروں کے حوالہ کر دے، یہ سب کچھ فرانس نے تونس میں کیا تھا اور اب بالکل یہی نقشہ انگریزوں نے مصر کے لیے تیار کیا تھا، قلعہ بندی کا کام روکنے کے لیے جب سیمور کا حکم نامہ عربی پاشا کے پاس پہنچا تو یہ نقشہ ہر مصری کی آنکھوں کے سامنے تھا اور کسی کی غیرت نے یہ گوارا نہیں کیا کہ جو تلوار وطن کی حفاظت کے لیے ہاتھ میں لی گئی ہے اسے حملہ آوروں کے خون سے رنگین کرنے سے پہلے خاموشی سے حوالہ کر دیا جائے، اس میں شبہ نہیں کہ ۱۰ جولائی کو جس فیصلہ کی بنا پر سیمور کے مطالبات مسترد کر دئے گئے تھے اس میں عربی پاشا کی رائے کو بہت کچھ دخل تھا، تاہم مجلس شوریٰ کے تمام ارکان اس امر پر متفق تھے کہ جنگ یا فرمان سلطانی کے بغیر سرزمین مصر کا کوئی حصہ کسی اجنبی کے

حوالہ کردینا خدیو کے قانونی اختیارات سے باہر تھا، خدیو کی خود بھی یہی رائے تھی، ہر شخص نے یہ رائے دی کہ قلعوں کا بچانا ضروری ہے، اس مجلس میں جو خاص طور پر اسی مسئلہ کے لیے منعقد کی گئی تھی، درویش پاشا بھی موجود تھا اور اس نے بھی دوسرے ارکان کی رائے سے اتفاق کیا، مسٹر بلنٹ لکھتے ہیں کہ کسی مسلمان کو بھی اس فیصلہ سے اختلاف کرنے کی جرأت نہیں ہوئی، اس متفقہ فیصلہ کی بنا پر خدیو نے عراقی پاشا کو جو زیر جنگ اور وزیر بحریہ تھا حکم دیا کہ جس وقت برطانوی بیڑہ گولہ باری شروع کرے، مصری توپخانوں سے اس کا جواب دیا جائے اور ۱۰ جولائی کو شام کے وقت نائب وزیر جنگ کو قاہرہ میں اطلاع دی گئی کہ تمام صوبوں میں اعلان کر دیا جائے کہ جنگ کا فیصلہ ہو چکا ہے اور اس کو ہدایت کی گئی کہ فوجیں تیار رکھے اور نئے دستوں کے لیے سپاہی بھرتی کرے۔ (۱)

خدیو کی وطن دشمنی: لیکن ان احکام کے باوجود توفیق پاشا انگریزوں سے جنگ کرنے کے لیے تیار نہ تھا، وہ خفیہ طور پر سیمور سے نامہ و پیام کا سلسلہ قائم کیے ہوئے تھا اور ۶ جولائی کو اسے انگریزوں کی طرف سے اطلاع دے دی گئی تھی کہ اسکندریہ پر گولہ باری ہو کر رہے گی نیز اس سے باصرہ کہا گیا تھا کہ وہ اپنی حفاظت کے لیے کسی انگریزی جہاز پر منتقل ہو جائے لیکن چون کہ وہ علانیہ اہل مصر سے غداری کرنا پسند نہیں کرتا تھا، اس لیے اس نے یہ دعوت قبول نہ کی اور مصر سے باہر جانے پر راضی نہ ہوا لیکن گولہ باری شروع ہونے سے پہلے وہ رملہ چلا گیا جو اسکندریہ سے آٹھ میل کے فاصلہ پر ہے اور وہاں بیٹھا ہوا امید و بیم کی حالت میں اس جنگ کے نتیجہ کا انتظار کرتا رہا، مصر میں عام طور پر یہ امید کی جاتی تھی کہ اسکندریہ کی توپیں انگریزی بیڑہ کو غرق کر دیں گی، گولہ باری کے روز توفیق رملہ میں تھا اور ہر نصف گھنٹہ کے بعد دوڑ کر اپنے محل کی چھت پر جاتا تھا کہ جنگ کا انجام معلوم کرے، شام تک اسے معلوم ہو گیا کہ قلعہ کی توپیں خاموش ہو گئیں اور انگریزی

بیڑہ اپنی جگہ پر قائم ہے، اس کے بعد اس کا تذبذب بھی جاتا رہا اور اس نے فیصلہ کر لیا کہ اپنے کوسمور کی حفاظت میں دیدے۔ (۱)

قومی حکومت: قاہرہ میں جس وقت یہ خبر پہنچی کہ توفیق انگریزوں کے زیر اثر آگیا، فوراً ایک مجلس عمومی منعقد کی گئی تاکہ صورت حال پر غور کر کے آئندہ کے لیے کوئی فیصلہ کیا جائے، اس مجلس میں نمایاں حصہ فوجی لوگوں سے زیادہ مذہبی اور ملکی عمائدین نے لیا، ملک کی ہر جماعت کے نمائندوں نے اس میں شرکت کی، یہاں تک کہ قبطیوں کا مذہبی پیشوا اور یہودیوں کا ربی بھی شریک ہوا، مجلس نے متفقہ طور پر یہ فیصلہ کیا کہ توفیق انگریزوں کے ہاتھ میں ہے، اس لیے قانوناً اس کے احکام قابل تعمیل نہیں ہو سکتے، چنانچہ انگریزوں کی حمایت اختیار کرنے کے بعد توفیق نے عراقی پاشا کو وزارت جنگ سے برخاست کرنے کا جو حکم صادر کیا تھا مجلس نے اس کے خلاف حکم صادر کیا اور عراقی پاشا کو ہدایت کی کہ وہ بدستور اپنے عہدہ پر قائم رہ کر ملک کی مدافعت کرتے رہیں، عراقی پاشا کی مدد کے لیے ایک 'مجلس مدافعت' مقرر کی گئی جس کے صدر یعقوب پاشا سامی، نائب ناظم جنگ مقرر ہوئے، ملکی انتظامات بدستور قائم رکھے گئے اور راغب پاشا اور دوسرے وزرا کی غیر حاضری کے باوجود جنھیں توفیق اور اس کے انگریز محافظین نے بحیرہ اسکندریہ میں روک رکھا تھا، حکومت کے تمام کام بغیر کسی ہرج یا نقصان کے انجام پاتے رہے، مسٹر بلنٹ لکھتے ہیں کہ دوران جنگ میں قومی حکومت کے انتظامات اتنے عمدہ تھے کہ مصر میں کبھی کسی حکومت نے اس سے بہتر طریقہ پر انتظامات نہیں کیے، پھر لکھتے ہیں کہ 'لارڈ ڈفرن کے اس قول سے زیادہ غلط بات کوئی نہیں ہو سکتی، جس کا ذکر انھوں نے قسطنطنیہ کی کانفرنس میں بار بار کیا کہ مصر میں عیسائیوں کا قتل عام روز ہوتا رہتا ہے۔' (۲)

کفر دوار: اسکندریہ کی گولہ باری کے بعد عراقی پاشا کو اپنی فوجیں قلعہ سے نکال لینی پڑیں، اب انھوں نے مدافعت کے لیے کفر دوار کا مقام منتخب کیا جو قاہرہ کی ریلوے

لائن پر واقع تھا اور بہت محفوظ اور مضبوط مقام تھا، یہ سیہمور کی توپوں کی زد سے باہر تھا، یہاں مصری فوجیں پانچ ہفتہ تک انگریزوں کا مقابلہ کرتی رہیں اور کبھی کبھی انھیں شکست دے کر اسکندریہ کے قریب تک بھگادیتی تھیں لیکن چونکہ مصر میں داخل ہونے کا تباہی بھی ایک راستہ نہ تھا اور برطانوی سیاست نے نہ صرف خدیو کو انگریزوں کا حامی بنالیا تھا بلکہ رشوت ستانی کے ذریعہ قبائل عرب کی ہمدردی اور مدد بھی حاصل کر لی تھی، اس لیے مصری فوجیں زیادہ دنوں تک مقابلہ نہ کر سکیں، عربی پاشا کی شکست کا سب سے بڑا سبب یہ ہوا کہ خود ان کے افسروں نے انگریزوں سے رشوت لے کر عین وقت پر غدا کی، اس جمال کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

اسماعیلیہ: ۱۶ اگست کو اونٹن لے ایک تازہ انگریزی فوج کے ساتھ اسکندریہ پہنچا اور یہ دیکھ کر کہ کفر دوار کی طرف سے آگے بڑھنا ممکن نہیں، اس نے نہر سویز کی جانب رخ کیا، یہ خطرہ قاہرہ کی مجلس حربی نے پہلے ہی محسوس کر لیا تھا اور ارکان مجلس کی یہ قطعی رائے تھی کہ سویز کی ناکہ بندی کر کے انگریزی فوج کا اقدام روک دیا جائے، اس درمیان میں ڈی لیسپس اسکندریہ پہنچ گیا تھا، وہاں اسے معلوم ہوا انگریز نہر سویز کی راہ سے مصر پر حملہ کرنا چاہتے ہیں چونکہ ایسا کرنے سے نہر کے ٹوٹنے کا اندیشہ تھا ڈی لیسپس پورٹ سعید پہنچا اور اس بات کی کوشش کرنے لگا کہ نہر پر جنگ نہ ہونے پائے، یہ اسی کی کوشش کا نتیجہ تھا کہ مجلس حربی کے فیصلہ کے باوجود عربی پاشا سویز کی ناکہ بندی کے لیے تیار نہ ہوئے، ڈی لیسپس نے انھیں یقین دلایا تھا کہ وہ اپنے اثر سے انگریزوں کو بھی نہر کے استعمال سے باز رکھے گا، عربی پاشا کا ڈی لیسپس کے وعدہ پر بھروسہ کر کے سویز کی ناکہ بندی سے ہاتھ اٹھالین فوجی نقطہ نظر سے ایک ایسی شدید غلطی تھی جس کی تلافی آخر وقت تک نہ ہو سکی، اونٹن لے نے ڈی لیسپس کے اس مذکر کی مطلق پروا نہ کی کہ نہر سویز کا علاقہ ایک غیر جانبدار علاقہ ہے جس میں جنگ نہ ہونی چاہیے اور عربی پاشا کی غفلت سے فائدہ اٹھا کر ۲۱ اگست کو انگریزی فوج اسماعیلیہ میں اتار دی، اسماعیلیہ پر قابض ہو جانے کے بعد قاہرہ

کا راستہ کھلا ہوا تھا، ادھر تل کبیر کی نامکمل خندقیں حائل تھیں، انگریزی فوج کی تعداد تیس ہزار سے زیادہ تھی، اس کے مقابلہ میں کفر دوار کی مصری فوج آٹھ ہزار سے زیادہ نہ تھی اور پورے مصر میں باقاعدہ فوج کا شمار تیرہ ہزار سے زیادہ نہ تھا، عین وقت پر جو سپاہی بھرتی کیے گئے تھے وہ بالکل نا تجربہ کار تھے اور صرف خندق وغیرہ کھودنے کے کام آ سکتے تھے۔ (۱)

پروفیسر پامر کی کی خفیہ مہم: لیکن حکومت برطانیہ نے محض فوجی دستوں پر قناعت نہیں کی اس نے اپنی کامیابی کو یقینی بنانے کے لیے پہلے ہی وہ خفیہ ذرائع اختیار کر لیے تھے، جو بقول مسٹر بلنٹ زمانہ حال کی جنگوں میں ہمیشہ استعمال کیے جاتے ہیں سیکن کبھی ان کا اعتراف نہیں کیا جاتا، نہر سویز کی راہ سے مصر پر حملہ کرنے کا فیصلہ برطانوی وزارت جنگ و بحریہ نے شروع سال ہی میں کر لیا تھا اور وسط جون میں یہ طے کر لیا گیا تھا کہ رشوت کے ذریعہ سے عرب قبائل خصوصاً مشرقی بدویوں کو ہموار کر لیا جائے، لیکن وقت یہ تھی کہ اس وقت بمشکل کوئی انگریز ایسا مل سکتا تھا جو عربی زبان بول سکتا ہو، اس مشکل میں لارڈ ناتھ بروک (North Brook) وزیر بحریہ کی نظرایہ ورڈ پامر (Edward Palmar) پر پڑی جو کیمبرج یونیورسٹی میں مشرقی زبانوں کے پروفیسر تھے، پروفیسر مذکور ایک زمانہ میں فلسطین کی مجلس تحقیق ارضی (Palistin Exploration Society) کے رکن بھی رہ چکے تھے اور اس وجہ سے نہر سویز کے مشرقی علاقوں سے جہاں کے عرب قبائل پر رشوت کا عمل کیا جانے والا تھا کچھ واقف تھے، چنانچہ ۲۴ جون کو لارڈ ناتھ بروک نے پامر کو اپنے ہاں ناشتہ پر مدعو کیا اور ان کے سپرد یہ خدمت کی کہ فوراً سویز کے مشرقی علاقوں میں جا کر بدوی قبائل کو انگریزی فوج کا حامی بنانے کی کوشش کریں، پانچ سو پونڈ تو ابتدائی اخراجات کے لیے ناتھ بروک نے اسی وقت دئے اور آئندہ کے لیے وعدہ کیا کہ بشرط کامیابی ایک بہت بڑی رقم انعام کے طور پر دی جائے گی، رواں گی سے قبل ۲۶ جون کو پامر صاحب مسٹر بلنٹ سے ملے اور ان سے یہ بیان کیا کہ میں اخبار اسٹینڈرڈ (Standard) کا نامہ نگار بن کر اسکندریہ جا رہا ہوں اور مجھے وطنی تحریک کے ساتھ بڑی

بہم ردی ہے اور میں اس اخبار میں اس تحریک کی حمایت میں مضامین لکھتا رہوں گا، پھر مسٹر بلنٹ سے خواہش کی کہ اپنے نیشنلسٹ مصری دوستوں کے نام تعارف کے خطوط دے دیجئے، پامر نے اپنے اصلی مشن کے متعلق ایک لفظ بھی نہ کہا، بہر حال مسٹر بلنٹ نے مصر کے چند ممتاز آدمیوں کے نام تعارف کے خطوط لکھ کر ان کے حوالہ کر دئے۔

پروفیسر پامر پہلے اسکندریہ پہنچے اور وہاں سیمور سے مل کر یافہ کے لیے روانہ ہو گئے، یافہ میں وہ برطانوی قنصل کے ہاں مقیم ہوئے، وہاں عربی پوشاک زیب تن کر کے بظہر پورے عرب بنے ہوئے قبائل تیاہ و طرامین کے شیوخ پر ڈورے ڈالنے کے لیے روانہ ہوئے، پامر کے روزنامچے کے بعض حصے شائع ہو گئے ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں اپنے مشن میں بہت کچھ کامیابی ہوئی، قبیلہ تیاہ کے شیخ نے جو ان علاقوں میں سب سے زیادہ اہم اور طاقتور قبیلہ تھ، انگریزوں کی حمایت کا وعدہ کیا، پروفیسر صاحب لکھتے ہیں کہ بیس ہزار پونڈ صرف کرنے سے چالیس ہزار عرب ہاتھ آجائیں گے، یہ روزنامچہ نہایت دلچسپ ہے اور ان خفیہ ذرائع پر کافی روشنی ڈالتا ہے جو حکومت برطانیہ نے مصر کی قومی تحریک کو فنا کرنے کے لیے استعمال کیے تھے، اس کے بعض حصے جو مسٹر بلنٹ نے اپنی کتاب میں نقل کیے ہیں کیمبرج یونیورسٹی کے فاضل پروفیسر کی سیرت کو بھی واضح اور نمایاں کرتے ہیں، پروفیسر موصوف دولت و شہرت کے خواب میں مدہوش ہیں، اپنی اہلیہ کو لکھتے ہیں کہ ”میرے اختیارات کی انتہا نہیں، جو چاہوں سو کروں، اگر میں ایک درجن گھوڑے بھی دیکھوں تو انھیں فوراً خرید سکتا ہوں، کل میں نے تیس اونٹ دیکھے اور تین سو ساٹھ پونڈ میں اسی وقت خرید لیے، میرے ماتحت ملازمین ہیں، کلرک ہیں، ترجمان ہیں اور یہ سب میرے اشاروں پر چلتے ہیں، مختصر یہ کہ میں اس سے زیادہ بلند مرتبہ تک پہنچ نہیں سکتا تھا، امیر البحر بہت عمدہ آدمی ہے، لوگوں کا بیان ہے کہ وہ اپنے افسروں کو کبھی نہیں بھولتا اور انہیں برابر ترقی دیتا رہتا ہے، اس نے مجھ سے کہا ہے کہ مجھے ”ستارہ ہند“ ضرور ملے گا۔“ (۱)

لیکن پامر کی یہ تمام امیدیں ایک خواب پریشاں ثابت ہوئیں، ۷ اگست کو وہ دو انگریز افسروں گل (Gill) اور کیرنگٹن (Charrington) کے ساتھ سویز سے روانہ ہوا، ان افسروں کا مقصد یہ تھا کہ مصر اور شام کے درمیان تار کا سلسلہ منقطع کر دیں، اس کے لیے انھوں نے ڈانگماٹ کا ایک بکس اپنے ساتھ لے لیا تھا، پامر نے اپنے سفر کا مقصد اونٹوں کی خریداری ظاہر کیا تھا، تینوں عربی لباس میں تھے، ابھی چند ہی میل سفر طے کیا ہوگا کہ قبیلہ حیوتیہ اور حونیہ کے بدوؤں کو معلوم ہوا کہ یہ عرب نما مسافر اپنے ساتھ قبیلہ تیاہ کے لیے ایک بڑی رقم لیے جارہے ہیں، ان بدوؤں نے حملہ کر کے ان کو گرفتار کر لیا اور ان کا سارا سامان لوٹ لیا، جس میں وہ رقم بھی تھی جو پامر حسب وعدہ قبیلہ تیاہ کے لیے لے جا رہا تھا اور آخر میں تینوں کو گولی مار دی، اس رقم کے متعلق تین ہزار پونڈ سے لے کر آٹھ ہزار پونڈ تک مختلف بیانات ہیں، قبیلہ مذکور میں تقسیم کرنے کے لیے پامر کو بیس ہزار پونڈ منظور ہوئے تھے اور وہ پوری رقم اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا، لیکن امیر البحر نے مخالفت کی جس کی وجہ سے اس رقم کا بڑا حصہ بدوؤں کے ہاتھ آنے سے بچ گیا، اس حادثہ کی خبر جب انگلستان پہنچی تو پارلیمنٹ میں اس کے متعلق حکومت سے سوالات کیے گئے، حکومت نے پوری سنجیدگی اور اپنی روایتی صداقت کے ساتھ اعلان کیا کہ پامر کے سفر کا مقصد اونٹوں کی خریداری کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔

پامر کے روزنامچے کی تصدیق گل کی ڈائری سے بھی ہوتی ہے، رشوت کے ذریعہ سے بدوی قبائل کو حامی بنانے کی جو خدمت نہر سویز کے مشرقی علاقوں میں پامر کو سپرد ہوئی تھی وہی نہر کے مغربی علاقوں میں کیپٹن گل سے متعلق تھی، وہ اپنی ڈائری میں اس کے متعلق واضح طور پر بیان کرتا ہے، ان تحریری شہادتوں کے بعد کوئی شبہ باقی نہیں رہ جاتا کہ تل کبیر کی جنگ سے پیشتر حکومت برطانیہ نے رشوت کے زہر سے مصریوں کی قوت کو بہت کچھ فنا کر دیا تھا۔ (۱)

خدایو کی غداری: اس باب میں پامراورگل سے زیادہ خود توفیق نے انگریزوں کو مدد پہنچائی، بدوی قبائل کا ایک ممتاز شیخ سعود التہاوی عربی پاشا کا معتمد علیہ تھا، سب سے زیادہ اسی نے غداری کا ثبوت دیا، توفیق نے اسے پانچ ہزار کراؤن (۱) کے عوض عربی پاشا کے لشکر میں بحیثیت ایک جاسوس کے مقرر کر رکھا تھا، اس کا اعتراف سعود التہاوی نے خود مسٹر بلنٹ سے ۱۸۸۷ء میں کیا (۲) توفیق نے صرف اتنا ہی نہیں کیا بلکہ رشوت کے ذریعہ اور ترقی کی امیدیں دلا کر عربی پاشا کے بہت سے فوجی افسروں کو غداری پر آمادہ کر لیا، عربی پاشا کی قوت کو سب سے زیادہ اسی چیز نے نقصان پہنچایا، توفیق کے جاسوس جن کا صدر خود اس کا ایڈی کا نگ عثمان بے رفعت تھا، افسروں میں بددی پھیلانے کی کوشش کرتے اور ان کی باہمی رقابتوں کو برا بھلا کرتے، وہ ان افسروں خصوصاً چرکسی نسل والوں سے کہتے کہ خدیو سے مقابلہ زیادہ دنوں تک نہیں کیا جاسکتا، بہتر یہ ہے کہ شکست سے پہلے ہی باز آ جاؤ اور اس کی خوشنودی حاصل کر کے انعام و اکرام کے مستحق بن جاؤ، ورنہ جب وقت گزر جائے گا اور میدان جنگ سے بھاگتے ہوئے گرفتار کیے جاؤ گے تو اس سزا سے مفر نہ ہوگا جو باغیوں کے لیے مقرر ہو چکی ہے، وہ یہ بھی سمجھاتے کہ اوٹز لے اور اس کے انگریز سپاہی حقیقتاً خدیو کے ملازم ہیں جو ملک کی موجودہ بغاوت فرو کرنے کے لیے بلائے گئے ہیں، علاوہ بریں خود سلطان بھی جس نے عربی پاشا کو باغی قرار دے دیا ہے، عنقریب خدیو کی مدد کے لیے فوج روانہ کرنے والا ہے، یہ دلائل چرکس افسروں پر کارگر ثابت ہوئے، دوسروں کے سامنے دلیلوں کے علاوہ نقد بھی پیش کیا گیا، بعض افسر جو فوجی قابلیت میں عربی پاشا سے بڑھے ہوئے تھے پہلے ہی سے بددل تھے کیوں کہ عربی پاشا نے ان کے مشورہ کے خلاف نہر سویز کی ناکہ بندی نہ ہونے دی تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انگریزی فوج اسماعیلیہ میں اتر آئی تھی اور اب اس کو آگے بڑھنے سے روکنا نہایت دشوار تھا۔

(۱) ایضاً ۳۱۲ (۲) کراؤن ایک انگریزی سکہ = پانچ شلنگ

وطنی جماعت کے غیر فوجی سرداروں کو قومی تحریک سے برگشتہ کرنے کے لیے توفیق نے سلطان پاشا کو مقرر کیا تھا جو پہلے اس تحریک کا ایک نہایت ممتاز لیڈر رہ چکا تھا لیکن اب کچھ دنوں سے تمام تر انگریزوں کا حامی اور حلیف تھا، اس کے اثر سے قاہرہ کے بہت سے سربراہ آورده اشخاص خدیو کے حامی ہو گئے۔

وطنی فوج کی بد قسمتی: ان کمزوریوں کے باوجود عربی پاشا کی فوج انگریزوں کا مقابلہ زیادہ دنوں تک کر سکتی تھی، اگر جنگ شروع ہونے سے پہلے ہی اسے بعض ناقابل تلافی نقصانات نہ پہنچ گئے ہوتے، جس وقت یہ معلوم ہو گیا کہ حملہ مشرق کی طرف سے ہوگا محمود فہمی جو عربی پاشا کے سب سے زیادہ لائق افسر اور ایک نہایت ہوشیار انجینئر تھے فوراً تل الکبیر روانہ کیے گئے تاکہ وہاں کی خندقوں کو مکمل کرادیں لیکن تل الکبیر پہنچنے سے قبل ہی راستہ میں ایک انگریزی دستہ نے ان کو گرفتار کر لیا، یہ واقعہ ایک عجیب و غریب اتفاق سے پیش آیا، اثنائے راہ میں محمود فہمی ایک گاؤں میں اتر گئے تھے، قریب ہی ایک ٹیلہ تھا، تفریح کے لیے یا بلندی سے گرد و پیش کے مقامات کا معائنہ کرنے کے لیے اس ٹیلہ پر چلے گئے، اتفاق سے بالکل تنہا تھے اور سادہ لباس پہنے ہوئے تھے اسی وقت ایک انگریزی دستہ بھی ادھر سے گزرا رہا تھا اس نے ان کو گرفتار کر لیا لیکن چونکہ یہ فوجی وردی میں نہ تھے اس لیے کرنل ٹالبت (Col. Talbot) جو اس دستہ کا افسر تھا ان کے رتبہ کے متعلق کوئی رائے قائم نہ کر سکا اور اپنے ساتھ انھیں انگریزی فوج کے مرکز پر لیتا گیا، وہاں پہونچ کر معلوم ہوا کہ قیدی کتنا قیمتی ہے، محمود فہمی کی گرفتاری سے تل الکبیر کی مدافعت کو اتنا شدید صدمہ پہنچا کہ اس کی تلافی نہ ہو سکی۔

معرکہ قصابین: تل الکبیر سے پہلے ہی قصابین کے مقام پر عربی پاشا کی فوج کے ایک دستہ سے جو آگے بڑھ کر دشمن کی نقل و حرکت معلوم کرنا چاہتا تھا اولزے کی فوج کا مقابلہ ہو گیا، انگریزوں کو آگے بڑھنے سے روکنے کا یہ بہترین اور آخری موقع تھا اور قریب تھا کہ اس میں مصری دستہ کا میاب ہو جائے، وہ اچانک انگریزی دستہ پر ٹوٹ پڑا

تھا، لڑائی دیر تک ہوتی رہی اور رن ایسے گھسان کا تھا کہ ڈیوک آف کنٹ (Duke of Connaught) جو اس معرکہ میں شریک تھا ایک بار گرفتار ہوتے ہوتے رہ گیا، اگر یہ شہزادہ گرفتار ہو گیا ہوتا تو بہت ممکن تھا کہ جنگ کا سارا نقشہ ہی بدل جاتا اور وطنی تحریک کامیاب ہو جاتی کیونکہ بقول مسٹر بلنٹ انگلستان کی رائے عامہ میں تبدیلی پیدا ہو چکی تھی اور ان کسانوں کے خلاف جنگ کرنے سے جو اپنے ملک کو قدیم مظالم سے آزاد کرانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے تھے اہل برطانیہ کو شرم محسوس ہونے لگی تھی لیکن اس معرکہ میں دومیصری، جنرل علی فہمی اور راشد پاشا بہت بری طرح زخمی ہو گئے اور پھر کوئی تجربہ کار افسر ان کا قائم مقام نہ ہو سکا، علاوہ بریں مصری فوج کے ایک دوسرے جنرل علی بے یوسف نے عین وقت پر دشمن سے مل کر شکست کو یقینی بنادیا۔

تل الکبیر: قصاصین کی ہزیمت کے بعد تل الکبیر کی مدافعت بہت کمزور ہو گئی، عربی پاشا کے بہترین جنرل گرفتار یا زخمی ہو چکے تھے، جو باقی رہ گئے تھے ان پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا تھا، توفیق کے جاسوسوں نے فوج میں ہر طرف رخنے پیدا کر دیئے تھے، بد قسمتی سے عربی پاشا کو اب بھی سعودی انتہاوی پر پورا اعتماد تھا اور اس نے یقین دلا رکھا تھا کہ اونٹوں کے آگے نہیں بڑھ رہا ہے، تل الکبیر میں جو فوج تھی وہ حد درجہ ناقص اور بے میل تھی، باقاعدہ پیدل فوج کی تعداد چھ سات ہزار سے زیادہ نہ تھی، سوار فوج دو ہزار تھی اور اتنے ہی توپچی تھے، بقیہ رنگروٹوں کی ایک بھڑکتی جن کے پاس تالہاس بھی نہ تھا کہ اپنا پورا جسم چھپا سکتے، یہ غریب سیدھے سادے فلاحین تھے جو اپنی خوشی سے آکر قومی فوج میں بھرتی ہو گئے تھے اور خندق وغیرہ کے کھودنے میں بڑی سرگرمی سے کام کر رہے تھے، لیکن لڑائی کے کام کے بالکل نہ تھے ان کی مجموعی تعداد بیس ہزار رہی ہوگی۔

دفعہ ۱۳ ستمبر کو علی الصباح انگریزی فوج نے حملہ کر دیا، خود عربی پاشا کے دو افسروں نے حملہ آوروں کی رہنمائی کی، یہ دونوں چند روز قبل خدیو کے آدمیوں سے رشوت قبول کر چکے تھے، ان میں سے ایک عبدالرحمن بے حسن تھا جو خندقوں کے باہر

مشرق سے آنے والی ریگستانی سڑک پر اپنے دستہ کے ساتھ تعینات کیا گیا تھا لیکن میں اس رات میں جس کی صبح کو انگریزی فوج حملہ آور ہوئی یہ اپنے آدمیوں کو متعینہ مقام سے ہٹا کر بائیں جانب کافی فاصلہ پر لیتا گیا تاکہ انگریزوں کے لیے راستہ کھلا رہے، دوسرا علی بے یوسف تھا جس کا نام اوپر آچکا ہے، یہ خندقوں کے ایک ایسے حصہ پر تعینات تھا جو نسبتاً بہت کمزور تھا، اس نے نہ صرف یہ کیا کہ اس رات کو اپنا پہرہ وہاں سے ہٹایا بلکہ اشارہ کے لیے لائین بھی گل کر دی، اس غداری کے صلہ میں اس کو ایک ہزار پونڈ جنگ سے قبل دے دئے گئے تھے اور دس ہزار کا وعدہ کیا گیا تھا لیکن تل الکبیر کے بعد جب حکومت پھر خدیو کے ہاتھ میں آئی تو بجائے اس 'مہودہ رقم' کے اس کے لیے صرف بارہ پونڈ ماہوار کی پنشن مقرر کر دی گئی جو اس کے انتقال تک اسے ملتی رہی۔ (۱)

سعود التہادی نے عربی پاشا کو کم از کم اس رات کے متعلق پورا اطمینان دلا رکھا تھا کہ انگریز حملہ آور نہ ہوں گے، اس بھروسہ پر خود عربی پاشا اور فوج کے سپاہی غافل سو رہے تھے، اچانک انگریزی فوج خندق کے اسی حصہ سے جس کو علی بے یوسف نے خالی کر دیا تھا ان کے سروں پر آنچنی، پہلے رنگروٹوں ہی سے مقابلہ ہوا جو دن بھر خندقوں میں کام کرنے کی وجہ سے تھک کر چور ہو گئے تھے اور اب ٹیٹھی نیند کے مزے لے رہے تھے، یہ غریب آنکھیں ملتے ہوئے اٹھے اور ابھی ہتھیار بھی نہ سنبھال سکے تھے کہ دشمن نے ان کا قتل عام شروع کر دیا، اتنے میں باقاعدہ فوجیں تیار ہو گئیں اور مقابلہ میں کچھ گرمی پیدا ہوئی، لیکن حملہ اس قدر اچانک تھا اور غنیم کی تعداد اس قدر زیادہ تھی کہ مصری زیادہ دیر تک میدان میں ٹھہر نہ سکے، جس مقام پر لڑائی ہو رہی تھی عربی پاشا کا خیمہ وہاں سے کسی قدر دور تھا، جب توپوں کی آواز سے ان کی آنکھ کھلی اور فوراً مسلح ہو کر وہ گھوڑے پر تیزی سے ادھر بڑھے تو دیکھا کہ شکست خوردہ سپاہیوں کی ایک ٹولی بھاگی ہوئی آرہی ہے، ان لوگوں نے بیان کیا کہ لڑائی حقیقتاً ختم ہو گئی اور اب مقابلہ بے سود ہے، سعود التہادی کے

بدوی سپاہی اپنے گھوڑے ادھر ادھر دوڑا رہے تھے، جس سے اور زیادہ خفشار پیدا تھا، عربی پاشا نے سپاہیوں کو مجتمع کرنے کی کوشش کی لیکن وہ اس قدر سراسیمہ تھے کہ کسی طرح قابو میں نہ آئے، مجبوراً عربی پاشا کو بھی میدان چھوڑنا پڑا، ایک گھنٹہ کے اندر جنگ کا خاتمہ ہو گیا، وطنی تحریک کا الاش تل الکبیر کے صحرائیں ذفن کر دیا گیا۔

عربی پاشا قاہرہ پہنچے لیکن توفیق کی سزائیں وہاں بھی اپنا کام سرچکی تھیں، سلطان کی طرف سے عربی پاشا کے باقی قمر ردئے جانے سے صورت حال اور بدتر ہو گئی تھی، یہ دیکھ کر کہ مدافعت اب بے سود ہے عربی پاشا نے عباسیہ جا کر بحیثیت ایک فوجی قیدی کے اپنی تلوار انگریزی جنرل کے حوالہ کر دی، جو الاش تل الکبیر میں ذفن کیا گیا تھا یہ اس کی تربت کا آخری پھول تھا۔

مصر پر انگریزوں کا قبضہ: توفیق برٹش سکینوں کے سایہ میں اسکندریہ سے قاہرہ آیا اور برطانیہ کی سرپرستی میں عنانِ حکومت ہاتھ میں لے، شریف پاشا نے وزارتِ قائم کی، نئے دور کا افتتاح یوں ہوا کہ وطنی تحریک کے علمبردار باغیوں کی حیثیت سے عدالت میں لائے گئے، عربی پاشا کے لیے سزائے موت تجویز ہوئی لیکن مسٹر ہلٹ نے ایک کثیر رقم اپنی جیب خاص سے خرچ کر کے اس مقدمہ کی پیروی جس انگریز بیرسٹر کے سپرد کی تھی اس نے صفائی میں ایسی شہادتیں پیش کیں کہ خدیو کو موت کی سزا منسوخ کر دینی پڑی، تاہم عربی پاشا تمام عمر کے لیے جلاوطن کر کے سیلون بھیج دئے گئے۔

انگریزوں نے جس آسانی کے ساتھ مصر پر قبضہ پالیا تھا، اس کے لحاظ سے توقع نہیں کی جاسکتی تھی کہ وہ ملک کی حکومت توفیق کے حوالہ کر کے خود واپس چلا جائیں گے، تل الکبیر کے بعد ہی انھوں نے مصر پر اپنا تسلط قائم کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور اب وہ مالیاتی امور کے انتظام میں بھی فرانس کو شریک کرنے پر تیار نہ تھے، توفیق ان کے ہاتھ میں کٹھ پتلی کی طرح کام کر رہا تھا اس نے ایک انگریز کالون (Colvin) کو اپنی حکومت کا تہا مشیر مال مقرر کیا، لارڈ ڈفرن جو اس وقت قسطنطنیہ میں برطانوی سفیر تھا،

بحیثیت ہائی کمشنر کے مصر آیا اور حکومت کے آئندہ انتظام کا خاکہ مرتب کر گیا، اس خاکہ کی تفصیلی خانہ پری سراپولین بیرنگ (Sir Evelyn Baring) کے سپرد ہوئی، جس نے جنوری ۱۸۸۲ء میں بحیثیت قنصل جنرل کے چارج لیا، یہی شخص ہے جو بعد میں لارڈ کرومر (Croumer) کے نام سے مشہور ہوا، اسی کے آنے کے بعد مصر گویا سلطنت برطانیہ کا ایک صوبہ بن گیا، ملک کے ہر معاملہ میں برٹش قنصل جنرل کی رائے فیصلہ کن تھی، مصری فوجیں انگریزی افسروں کے زیرِ کمان کر دی گئیں، انگریزی فوجیں جن کی تعداد چھ ہزار تھی، پورے ملک پر اپنا تسلط قائم کر چکی تھیں، برطانیہ نے اعلان کیا کہ مصر کی مالی حالت کے درست ہو جانے کے بعد انگریزی فوجیں واپس بلا لی جائیں گی، لیکن مالی حالت روز بروز زیادہ خراب ہوتی گئی اور حکومت برطانیہ کی فرض شناسی نے کسی طرح گوارا نہ کیا کہ غریب مصریوں کو اپنے سایہ عاطفت سے محروم کر دے۔

جرمنی کا فوجی اور اقتصادی اثر: دولت عثمانیہ کے انحطاط سے جس سلطنت نے اب تک فائدہ نہیں اٹھایا تھا وہ جرمنی کی سلطنت تھی، ۱۸۷۱ء تک تو جرمنی میں اتنی طاقت نہیں آئی تھی کہ وہ کسی دوسری مملکت پر دست درازی کا حوصلہ کر سکے، لیکن اتحاد کے بعد جب فرانس سے جنگ کی نوبت آئی اور اس میں اسے شاندار فتح نصیب ہوئی تو پھر توسیع سلطنت کا حوصلہ بھی پیدا ہوا اور اسی ملک کی طرف نگاہ اٹھی جسے یورپ کی دوسری حکومتیں بہت پہلے سے ٹکڑے ٹکڑے کر رہی تھیں، لیکن وقت یہ تھی کہ ان حکومتوں نے جرمنی کے لیے کوئی ایسا میدان نہیں چھوڑا تھا کہ اس پر فوجی تسلط قائم کیا جاسکے، تونس پر فرانس کا قبضہ تھا، مصر برطانیہ کے زیرِ نگین آچکا تھا اور طرابلس پر اٹلی کا حق یورپ کے سیاسی حلقوں میں تسلیم کیا جا چکا تھا، اگرچہ ابھی تک وہ بابِ عالی کی فرمان روائی سے خارج نہیں ہوا تھا اور عرب قبائل دولت عثمانیہ کے نمائندوں کی حیثیت سے اس پر حکمران تھے، بوسنیا اور ہزیگووینا کے صوبے جو برلن کانگریس میں عارضی طور پر آسٹریا کی نگرانی میں دے دیے گئے تھے، آسٹریا انہیں مستقل طور پر اپنی سلطنت میں شامل کرنے کی کوشش کر رہا تھا،

سب سے بڑھ کر روس کی ریشہ دوانیاں تھیں جن کا سلسلہ ایک صدی سے بلقان میں جاری تھا اور جن کا اصلی مقصد آبنائے باسفورس اور درونیاں پر قبضہ کر لینا تھا۔

ان حالات میں جرمنی کے لیے ایشیائے کوچک کے علاوہ کوئی دوسرا میدان باقی نہ رہ گیا تھا، خوش قسمتی سے جرمنی کو باب عالی میں اپنا اثر قائم کرنے کے لیے ایک اچھا موقع بھی ہاتھ آ گیا، روس اپنے بلقانی شاگردوں کی ناشکر گزاری سے دل برداشتہ ہو کر مشرق بعید کی طرف متوجہ ہو چکا تھا اور وہاں جاپان سے قوت آزمائی میں مصروف تھا، برطانیہ مصر میں غیر متوقع کامیابی حاصل کرنے کے بعد جس نے بحروم میں اس کے اقتدار کو حد درجہ غالب کر دیا تھا، دولت عثمانیہ کی دوستی سے بے پروا ہو گیا تھا اور جو باہمی تعلقات انیسویں صدی کے دوران میں استوار ہوئے تھے ان میں بہت کچھ کمزوری پیدا ہو گئی تھی، جرمنی نے اس موقع سے پورا فائدہ اٹھایا، باب عالی کی دعوت پر ایک جرمن فوجی مشن جنرل فان ڈر گولٹز (Vonder Goltz) کی سرکردگی میں عثمانی فوجوں کی تنظیم و اصلاح کے لیے قسطنطنیہ پہنچا، ساتھ ہی ساتھ جرمن تاجر کثیر تعداد میں آ گئے اور پھر جرمن بینکوں نے سلطنت عثمانیہ کے بڑے بڑے شہروں میں اپنی شاخیں کھول دیں، ۱۸۹۰ء میں قیصر ولیم ثانی جس نے حال ہی میں عتبات سلطنت ہاتھ میں لی تھی، ایک دوست کی حیثیت سے سلطان عبدالحمید خاں سے ملنے قسطنطنیہ آیا، قیصر کی آمد کے بعد سلطان نے جرمن تاجروں کے ساتھ مزید مراعات کرنی شروع کیں، یہ ترکی جرمن اتحاد کا پہلا قدم تھا۔

بغداد ریلوے: قیصر کے سفر قسطنطنیہ کے بعد سلطنت عثمانیہ میں جرمنی کی سرریاں ہر طرف پھیلنے لگیں لیکن سب سے زیادہ توجہ ایشیائے کوچک میں ریلوے لائن کی تعمیر پر تھی جدید رافع حمل و نقل کی عدم موجودگی کے باعث ایشیائے کوچک کے وسیع اور زرخیز صوبہ میں سفر اور تجارت کی دشواریاں بہت زیادہ تھیں، یہ صحیح ہے کہ اس سے قبل ایک انگریز کمپنی کو سرنا کے قریب ایک چھوٹی سی ریلوے لائن قائم کرنے کی اجازت دی گئی تھی، لیکن قسطنطنیہ سے ایشیائے کوچک میں جانے کے لیے کوئی لائن نہ تھی، اب ایک جرمن کمپنی

نے ایک ریلوے لائن حیدر پاشا سے جو استنبول کے مقابل واقع ہے، انکوره تک تعمیر کی اور ۱۸۹۶ء میں اسے جنوب مشرق کی طرف بڑھا کر سلجوقیوں کے قدیم پایہ تخت قونیہ تک پہنچا دیا، ان لائیوں کی تعمیر سے سفر اور تجارت کے لیے بڑی سہولت پیدا ہو گئی اور سلطان نے ان کو ایشیائے کوچک سے بڑھ کر مسوپونا میں بھی جاری کرنے کی خواہش ظاہر کی، جرمن سرمایہ دار جن کو سلطان کی سرپرستی حاصل تھی، اس کے لیے پہلے سے تیار تھے اور ٹھیکہ انہی کو دیا گیا، ۱۸۹۸ء میں قیصر ولیم دوبارہ قسطنطنیہ آیا جو تعلقات اس کی پہلی آمد سے قائم ہو گئے تھے وہ اور زیادہ مضبوط ہو گئے اور بغداد تک ریلوے لائن بنانے کی پہلی شاہی سند ایک جرمن کمپنی کو ۱۸۹۹ء میں عطا کی گئی، اس سند میں کئی بار ترمیمیں ہوئیں اور بالآخر ۱۹۰۳ء میں یہ آخری طور پر مکمل کر دی گئی اور تعمیر کا کام باقاعدہ شروع ہو گیا، ریلوے لائن قونیہ سے جنوب مشرق کی طرف تیزی کے ساتھ بڑھتی گئی، یہاں تک کہ جبل طور تک پہنچنے کے بعد پہاڑ کاٹنے کی وجہ سے کام کی رفتار سست ہو گئی اور بعض دشواریوں کے رفع کرنے میں اتنی دیر ہوئی کہ آخری سرنگ جنگ عظیم کے شروع ہونے تک مکمل نہ ہو سکی۔

بغداد اور ریلوے کی اہمیت: فرانس اور انگلستان کے پریس اور پارلیمنٹ میں بغداد اور ریلوے کی تعمیر سے ایک ہنگامہ برپا ہو گیا، اس کا سبب یہ تھا کہ جرمن ریلوے اسکیم کا مقصد محض ایشیائے کوچک میں اقتصادی تسلط قائم کرنا نہ تھا بلکہ اس کے پیش نظر مسوپونا میا اور خلیج فارس کی اقتصادی تسخیر بھی تھی، بغداد اور ریلوے کی تعمیر کے بعد وہ شاہراہ پھر کھل جاتی تھی جو تہذیب و تمدن کی ابتدا سے یورپ اور ایشیائے درمیان قائم تھی، لیکن کچھ مدت سے بند ہو گئی تھی، ”بغداد اور ریلوے“ کے جاری ہو جانے سے جرمن تجارت نہ صرف مشرق ادنیٰ کے بازاروں پر قابض ہو جاتے بلکہ جنوبی اور مشرقی ایشیائے تک بھی پہنچ سکتے تھے، ”بغداد اور ریلوے“ اسکیم نے انگریز تاجروں کی نظر میں نہر سویز کے راستہ کی اہمیت بھی کم کر دی کیوں کہ اس راستہ کے ذریعہ بہ نسبت نہر سویز کے راستہ کے جرمنی کے مسافر اور وہاں کی تجارتی اشیا بہت کم وقت میں خلیج فارس تک پہنچ سکتی تھیں، برطانیہ کے لیے اس سے بھی زیادہ تشویشناک

یہ چیز تھی کہ ممکن ہے آئندہ کسی زمانہ میں حکومت جرمنی ”جرمن ریلوے کمپنی“ کے اختیارات پر قابض ہو جائے تو اس وقت یہ اقتصادی چیز ایک سیاسی حربہ بن جائے گی، جس سے نہ صرف ہندوستان کا بازار بلکہ خود ہندوستان خطرہ میں پڑ جائے گا۔

اتحاد ثلاثہ: ”بغداد ریلوے“ کی تعمیر سے جو نزاع جرمنی اور فرانس و انگلستان کے درمیان پیدا ہو گئی تھی، روس مشرقی اقصیٰ کی مصروفیتوں کی وجہ سے ابتداءً اس سے علاحدہ تھا لیکن جب ۱۹۰۵ء میں اس نے جاپان کے مقابلہ میں شکست کھائی تو مجبوراً بلقان کی طرف پھر توجہ کرنی پڑی، اس درمیان میں یہاں کا نقشہ بدل چکا تھا، زار کو یہ دیکھ کر بہت اندیشہ ہوا کہ جرمنی کا اثر قسطنطنیہ میں روز بروز بڑھتا جا رہا ہے، اسے یہ خطرہ ہونے لگا کہ ممکن ہے آئندہ روسی جہازوں کے لیے درۂ دانیال کی گزرگاہ بند کر دی جائے، چوں کہ اس وقت پیرس اور لندن کی حکومتیں جرمنی کی مخالف تھیں اس لیے قدرۂ روس انہی کی جانب مائل ہوا اور مختلف عہد ناموں کی بنا پر جو ۱۹۰۴ء سے لے کر ۱۹۰۷ء تک مرتب ہوئے، تینوں حکومتوں کے درمیان ایک استحواق قائم ہو گیا جس کی بنیاد حقیقتاً یہ قرار پائی کہ جہاں تک ممکن ہو اسلامی سلطنتوں کے گلے سے کر کے ان پر قبضہ کر لیا جائے، چنانچہ ۱۹۰۴ء میں جو معاہدہ فرانس اور انگلستان کے درمیان ہوا اس میں فرانس کو اجازت دی گئی کہ وہ جس طرح چاہے مراکش پر قبضہ کر لے، اس کے معاوضہ میں فرانس ان تمام حقوق سے دست بردار ہو گیا جو بزعم خود اسے حکومت مصر کی نگرانی میں حاصل تھے اور مصر کی فرماں روائی تمام تر انگلستان کے سپرد کر دی، اس کے بعد فرانس کی وساطت سے انگلستان اور روس کا جھگڑا جو مدت سے ایران کی نسبت چلا آتا تھا، ۱۹۰۷ء میں یوں ختم ہوا کہ ایران کی سلطنت معاہدہ کے رو سے دو حصوں میں تقسیم کر دی گئی، جن میں سے ایک پر روس نے ور دوسرے پر انگلستان نے اپنا تسلط قائم کر لیا۔ (۱)

اندرونی اور بیرونی سازشیں: یورپین حکومتوں کی سرگرمیاں یہیں تک محدود نہ تھیں۔

انہوں نے نہ صرف سلطنت عثمانیہ کے متعدد صوبوں پر قبضہ کر لیا بلکہ جو صوبے اس کی فرماں روائی میں باقی رہ گئے تھے، ان کے اندر بھی ہر امکانی ذریعہ سے بد امنی اور بغاوت پھیلانے کی کوشش کی، ستم یہ تھا کہ اپنی ہی پیدا کی ہوئی شور و شوش کو عذر قرار دے کر یہ حکومتیں عیسائی رعایا کے حقوق کے تحفظ کی خاطر دولت علیہ کے اندرونی اور انتظامی معاملات میں مداخلت کرتیں اور جہاں تک بس میں ہوتا سلطنت کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتیں، بلقانی صوبوں کی بغاوت اور آزادی انہی حکومتوں کی حوصلہ افزائی اور پشت پناہی کی رہین منت تھی۔

اس میں شبہ نہیں کہ سلطان عبدالحمید کے استبداد نے سلطنت کے ہر طبقہ میں بیزاری پیدا کر دی تھی، خصوصاً دستوری حکومت کا اعلان کرنے کے بعد پارلیمنٹ کو برخاست اور دستور کو عملاً منسوخ کرنے سے تمام رعایا براہم تھی؛ لیکن یورپین حکومتوں اور بالخصوص روس اور آسٹریا نے اس عام برگشتگی کو خوب بھڑکایا، اگر ایک طرف ان کی فوجیں سلطنت عثمانیہ کی سرحدوں پر حملہ آور ہوتی رہیں تو دوسری طرف ان کے گماشتے عیسائی رعایا کو مسلسل بغاوت کے لیے آمادہ کرتے رہے، مسٹر نائٹ جو تیس سال تک ترکی میں رہ کر وہاں کے حالات کا پچشم خود مطالعہ کر چکے ہیں اپنی کتاب بیداری ترکی (Awakening of Turkey) میں لکھتے ہیں:

”ایک مقولہ ہے کہ ہر قوم کو وہی حکومت ملتی ہے جس کی وہ مستحق ہوتی ہے، یہ مقولہ صحیح ہو سکتا ہے اگر کوئی قوم اپنے حسب خواہش نظام حکومت قائم کرنے کی آزادی رکھتی ہو لیکن جہاں تک ترکی کا تعلق ہے، اس کے باشندوں کو کوئی موقع اس حکومت کے حاصل کرنے کا نہیں دیا گیا جس کے وہ مستحق تھے کیوں کہ ترکی کے طاقت ور دشمنوں کی غرض یہ تھی کہ استبدادی حکومت کی برائیاں قائم رکھی جائیں اور جب کبھی ترکوں نے اپنے اندرونی معاملات کو درست کرنے کی کوشش

کی، کوئی نہ کوئی مسیحی طاقت اس خوف سے کہ ممکن ہے ایک اصلاح شدہ ترکی ایک قومی ترکی ثابت ہو یا تو مسلح فوجوں کے ساتھ اس پر ٹوٹ پڑی یا مجوزہ اصلاحی تبدیلیوں کی راہ روک کر کھڑی ہو گئی۔ علاوہ بریں جو طاقتیں ترکی مقبوضات کو اپنی مملکت میں شامل کرنے کے درپے تھیں وہ اس بات کی نگرانی کرتی رہتی تھیں کہ ترکی کے حدود میں امن نہ رہنے پائے اور وہ اس غرض سے شورشیں برپا کرتی رہتی تھیں، وہ عیسائی کسانوں کو بغوت کے لیے ابھارتیں اور ہنگامے برپا کراتیں تاکہ مداخلت کرنے اور ان علاقوں کو اپنی سلطنت میں شامل کرنے کا حیلہ ہاتھ آئے، یہ طاقتیں اپنے مقصد کے حصول کے لیے کسی طریقہ کے اختیار کرنے میں تامل نہ کرتیں مثلاً بہترے فساد پھیلانے والوں (Agents Provocateurs) میں سے ایک درویش بھی تھا جو روس کا تنخواہ دار مخفی ایجنٹ تھا، چند سال ہوئے اس نے روس کی ہدایت کے مطابق ایشیائے کوچک میں کافروں کے خلاف جہاد کی تبلیغ کی اور مسلمانوں کو عیسائی باشندوں پر حملہ کرنے کے لیے براہیختہ کیا، اس قسم کے بہت سے واقعات پیش کیے جاسکتے ہیں جن سے دامنان ترکی کی دغا بازی اور ترکی کے ساتھ جو برتاؤ کیا گیا ہے اس کی ناانصافی ظاہر ہوتی ہے۔“ (۱)

مقدونیا کی بد امنی: ان شرانگیزیوں کے لیے سب سے زیادہ مناسب سرزمین مقدونیا کی تھی، مقدونیا سلطنت عثمانیہ کا وہ صوبہ تھا جس میں بلغاری، سروی، یونانی اور ترک سب ہی آباد تھے، چوں کہ بلغاریا، سرویا اور یونان کی آزادی ریاستیں بالکل سرحد پر واقع تھیں اس لیے ان میں سے ہر ایک مقدونیا کے اس حصہ کو جہاں اس کی ہم قوم آبادی

زیادہ تھی اپنے اندر شامل کر لینا چاہتی تھی، دولِ عظمیٰ کی طرح ان ریاستوں کو بھی یقین تھا کہ سلطنت عثمانیہ غنقریب فنا ہو جائے گی اور چوں کہ اس کے ترکہ کی تقسیم کے وقت مقدونیا کی سب سے زیادہ حقدار بھی تین ریاستیں تھیں، اس لیے ہر ایک اپنا حصہ پہلے ہی سے محفوظ کر لینا چاہتی تھی، پروپگنڈا اور ہنگامہ پروری کا نہایت کامیاب تجربہ اس سے قبل ہو چکا تھا، جس کی بنا پر پورا اطمینان تھا کہ یورپ کی بڑی طاقتیں اپنے چھوٹے بچوں کی حوصلہ افزائی میں مطلق دریغ نہ کریں گی، چنانچہ بلغاریہ، سربیا اور یونان نے اپنی ہم قوم آبادی کو بغوت پر آمادہ کرنے کے لیے مقدونیا میں پہلے خفیہ ایجنٹ بھیجنا شروع کیے اور بے دریغ دیکھ کر کھلی تدبیریں زیادہ کارگر ثابت نہیں ہوتیں مسلح جتھے روانہ کیے، ان جتھوں نے پورے صوبہ میں ایک قیامت برپا کر دی، قتل و خون کا بازار گرم ہو گیا، گاؤں کے گاؤں جلائے جانے لگے، ان غارت گروں نے عیسائیوں اور ترکوں کی تمیز بھی اٹھا دی تھی، وہ اپنے علاوہ تمام دوسرے فرقوں کے ساتھ یکساں مظالم کرتے تھے، چنانچہ اپریل ۱۹۰۸ء میں ایک بلغاری جتھے نے ایک یونانی پادری کو زندہ جلا دیا، مسٹر نائٹ لکھتے ہیں:

”اس واقعہ پر کسی نے کچھ نہیں کہا، اگر یہی چیز مسلمانوں نے کی ہوتی تو کیسا واویلا مچتا۔“ (۱)، اصل یہ ہے کہ یہ ریاستیں ایک دوسرے کے ساتھ بھی شدید عداوت رکھتی تھیں ان کے جتھے جس قدر ترکوں کو نقصان پہنچاتے تھے، اسی قدر آپس میں بھی قتل و خون کرتے رہتے تھے، یونانی جتھے مقدونیا کی بلغاری اور سروی آبادی کو فنا کر ڈالنا چاہتے تھے تاکہ مقدونیا کا زیادہ سے زیادہ حصہ یونان میں شامل کیا جاسکے، یہی جذبہ بلغاری اور سروی جتھوں کا تھا، بلغاری جتھوں کی سرگرمیاں سب سے بڑھی ہوئی تھیں، ان ہنگاموں سے بلغاریا کا اصلی مقصد یہ تھا کہ دولِ عظمیٰ کو مقدونیا کی جانب متوجہ کرے اور ان کی مداخلت سے پیش از پیش فائدہ اٹھانے کی کوشش کرے۔

مرزنگ پروگرام: دولِ عظمیٰ کو اسی دعوت کا انتظار تھا، انھوں نے آپس میں مشورہ کیا

اور تمام یورپ کی طرف سے روس اور آسٹریا کو نمائندہ مقرر کر کے مقدونیا کے لیے ایک نظام اصلاح مرتب کرنے کی خدمت سپرد کی، اس کام کے لیے اس سے بہتر انتخاب ممکن نہ تھا، چنانچہ ۱۹۰۳ء میں روس اور آسٹریا کی تیار کردہ اسکیم جو مرزنگ پر وگرام (Murzsteg Programme) کے نام سے مشہور ہے متفقہ طور پر منظور کی گئی اور مقدونیا کی اصلاح کا کام شروع ہوا، سلطان عبدالحمید کو بھی یورپ کی متحدہ قوت سے دب کر یہ مداخلت تسلیم کرنی پڑی، عثمانی فوجیں جس کشت و خون، آتش زنی اور غارت گری کے استیصال میں نہ کام ثابت ہوئی تھیں اسے ختم کرنے کا بیڑہ اب انہی حکومتوں نے اٹھایا جن کی شہ پار یہ قیامت برپا کی گئی تھی، مقدونیا کا صوبہ تین ولایتوں: اسکوب، سالونیکا اور مونستر پر مشتمل تھا، ان ولایتوں کے لیے ایک ترکی انسپکٹر جنرل (حسین حلمی پاشا) مقرر کیا گیا اور اس کی نگرانی کے لیے روس اور آسٹریا کے نمائندے مقرر ہوئے، امن و امان قائم رکھنے کی خدمت ایک بین الاقوامی پولیس کو تفویض ہوئی جس کا افسر اعلیٰ ایک یوروپین تھا، تینوں ولایتیں روس، آسٹریا، انگلستان، فرانس اور اٹلی کے درمیان اس طرح تقسیم کر دی گئیں کہ ہر حکومت اپنے حصہ کے امن و امان کی ذمہ دار قرار پائی لیکن مشترکہ امور کی نگرانی ایک مرکزی مجلس کے سپرد ہوئی۔

اس نظام کے جاری کرنے کے کچھ دنوں بعد دولِ عظمیٰ نے مقدونیا کی مالیت کی نگرانی کے لیے ایک بین الاقوامی کمیشن بھی مقرر کر دیا، یوں فوجی اور مالی دونوں شعبے دولتِ علیہ کے ہاتھ سے حقیقتاً نکل گئے لیکن مقدونیا کی حالت میں کوئی نمایاں فرق پیدا نہ ہوا، امن و امان قائم کرنے میں بین الاقوامی پولیس بھی ویسی ہی ناکام ثابت ہوئی جیسی عثمانی فوج اس سے پہلے ہو چکی تھی، یونانی اور بلغاری جتھوں کی غارت گری برابر جاری رہی، شیویل لکھتا ہے کہ نسلی جماعتوں کی باہمی عداوتیں خصوصاً یونانیوں اور بلغاریوں کی اور پھر اس سے کسی قدر کم سرویوں، مولاجیوں اور البانیوں کی دشمنیاں اس درجہ قابو سے باہر ہو گئی تھیں کہ عقل و خرد کو بالائے طاق رکھ دیا گیا تھا اور پوری آبادی اپنے کو ہلاک

کرنے پر تلی ہوئی تھی، جو ریاستیں مقدونیا کی سرحد پر واقع تھیں، وہ ان غارت گروں کی پوری طرح مدد کر رہی تھیں، جنہوں نے سلطان کے بعد مقدونیا کی وراثت پر قبضہ حاصل کرنے کے لیے یہ انوکھا طریقہ اختیار کیا تھا۔ (۱)

مقدونیا کی تقسیم کے منصوبے: ”مرزنگ پروگرام“ اور مالیاتی کمیشن کا تقرر ترکوں کی غیرت ملی کے لیے ایک سخت تازیانہ تھا، ان کے لیے سب سے زیادہ تکلیف دہ چیز یہ تھی کہ بین الاقوامی مداخلت کی باگ روس اور آسٹریا کے ہاتھوں میں دے دی گئی تھی جب کہ یہ دونوں سلطنتیں دولت عثمانیہ کی شدید ترین دشمن تھیں، چنانچہ ترکوں کا خیال تھا اور بقول مسٹر نائٹ غیر جانبدار اشخاص کے بیانات سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے کہ روس اور آسٹریا نے بالقصد اس پروگرام کو ناکام بنایا اور ان کے نمائندوں نے اس کا نفاذ ایسے طریقہ پر کیا کہ اس سے عیسائیوں میں ہنگامہ و فساد لی آگ بھڑکتی ہی گئی، اس سے غرض یہ تھی کہ یورپین ٹرکی کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کی تجویز آگے بڑھائی جائے (۲)، ۱۹۰۴ء کے بعد انگلستان، روس اور فرانس نے ’مردِ بیمار‘ کے مال کے حصے بخرے کرنے کا قطعی فیصلہ کر لیا تھا قی اور ۱۹۰۵ء کے آخر میں لارڈ لینس ڈاؤن (Lord Lansdowne) کے زیر قیادت دوسرے عظمیٰ کے متحدہ جنگی بیڑوں کا مظاہرہ ایک ایسا کھلا ہوا اشارہ تھا جسے ہر ترک سمجھ سکتا تھا، مسٹر بکسٹن (C.B. Buxton) جو ’بلقان کمیٹی‘ میں انگلستان کے نمائندہ تھے، اعتراف کرتے ہیں کہ ”ترکی حکومت کے دشمن خواہ ذاتی اغراض کی بناء پر یا نوع انسانی کی ہمدردی کے خیال سے پھر حملہ آور ہو رہے تھے، یہ گفتگو بھی تھی کہ مقدونیا کو تقسیم کر دیا جائے۔“ (۳)

جون ۱۹۰۸ء میں شاہ ایڈورڈ اور زار نکولس نے ریوال میں ملاقات کی اور مقدونیا میں امن قائم کرنے کے لیے ایک جدید پروگرام مرتب کیا، ترک مرزنگ پروگرام

(۱) شیویل ص ۴۳۶ (۲) نائٹ ص ۹۶ (۳) ”ترکی حالت انقلاب میں“ از چارلس بکسٹن ص ۲۴

کا نتیجہ دیکھ رہے تھے، ان میں اب کسی نے تجربہ کی برداشت کی طاقت نہ تھی، اس میں شبہ نہیں کہ انگلستان اور روس کی یہ متحدہ سرگرمی سلطنت عثمانیہ کے یوروپین صوبوں کے لیے مہلک ثابت ہوتی اگر نو جوان ترکوں نے عجلت سے کام لے کر علم انقلاب نہ بلند کر دیا ہوتا، جس سے نہ صرف سلطان عبدالحمید کی استبدادی حکومت کا خاتمہ ہو گیا بلکہ دولِ عظمیٰ کے سارے منصوبے بھی دفعۂ خاک میں مل گئے۔

عبدالحمید کا استبداد: عبدالحمید ایک استبداد پسند سلطان تھا اور اس کا استبداد مطلق العنانی کی حد تک پہنچا ہوا تھا، لیکن عنانِ حکومت کو ہاتھ میں لینے کے بعد ہی بلغاریا کے مسئلہ پر اسے دولِ عظمیٰ کے متفقہ مطالبہ کے سامنے سر جھکانا پڑا اور عین اس وقت جب یوروپین طاقتوں کے نمائندے قسطنطنیہ میں مجتمع ہو کر عیسائی رعایا کے لیے اصلاحات کی تجویزوں پر غور کر رہے تھے عبدالحمید نے مدحت پاشا کے تیار کردہ دستور کو جس کا نفاذ سلطان عبدالعزیز کے عہد میں نہ ہو سکا تھا منظور کر کے یہ اعلان کر دیا کہ آئندہ دولتِ عہدہ کی تمام رعایا بلا امتیاز مذہب و ملت قانون کی نگاہ میں یکساں خیال کی جائے گی، ساتھ ہی پارلیمنٹ کا افتتاح کر کے گویا دستوری حکومت قائم کر دی، عبدالحمید نے اس کارروائی سے یوروپین طاقتوں اور مدحت پاشا کی حزبِ الاصلاح (رفارم پارٹی) دونوں کے مطالبات بظہر پورے کر دئے مگر حقیقت یہ تھی کہ وہ دستوری حکومت کا شدید مخلف تھا، چنانچہ جب دستور کے اعلان کے بعد قسطنطنیہ کی کانفرنس منتشر ہو گئی تو چند ہی دنوں میں عبدالحمید نے عثمانی پارلیمنٹ کو بھی برخاست کر دیا اور دستور کے اصلی محرک اور مصنف مدحت پاشا کو جلاوطن کر دیا، مدحت پاشا جلاوطن کر دئے گئے لیکن ان کے پیدا کردہ خیالات قوم کے دلوں سے نہ نکل سکے، یہ دیکھ کر عبدالحمید نے مدحت پاشا کو الطاف خسروانہ کا یقین دلا کر واپس بلا لیا اور چند مہینے شام اور اس کے بعد سمرنا کی ولایت پر مامور کرنے کے بعد ان پر سلطان عبدالعزیز کے قتل میں شریک ہونے کا الزام لگایا اور عدالتِ عالیہ کو اس جرم کی تحقیقات کا حکم دیا، بقول خالدہ ادیب خانم تحقیقات کیا تھیں

مکروریا کا ایک نظر فریب منظر تھا، مدحت پاشا قتل کی سزا تجویز ہوئی لیکن عبدالحمید نے سزا میں تخفیف کر کے اسے جس دوام سے بدل دیا، یہ محض دکھانے کے لیے تھا، مدحت پاشا ٹکف میں قید کیے گئے اور چند دنوں بعد کچھ اور آدمیوں کے ساتھ وہیں قید خانے میں انھیں پھانسی دے دی گئی، مدحت پاشا سلطنت عثمانیہ کے آخری صدر اعظم تھے جنھیں موت کی سزا دی گئی۔

لیکن مدحت پاشا کی موت سے آزادی کے وہ خیالات فنا نہیں ہوئے جو دور تنظیمات سے ترکوں کے اندر پرورش پا رہے تھے، عبدالحمید ان خیالات سے بے خبر نہ تھا، وہ جانتا تھا کہ یورپ کی آزاد خیالی ترکی میں پھیلتی جا رہی ہے، اس نے سب سے پہلے انہی خیالات کی اشاعت روکنے کی کوشش کی، چونکہ یہ خیالات زیادہ تر مغربی تعلیم اور یورپ کے سفر کا نتیجہ ہوتے تھے، اس لیے عبدالحمید نے ان دونوں چیزوں پر سخت پابندیاں عاید کر دیں، مسٹر نائٹ لکھتے ہیں: ”عبدالحمید اپنی مسلمان رعایا کو جاہل رکھنا چاہتا تھا کہ بحیثیت بادشاہ اس کی اطاعت آنکھ بند کر کے ہوتی رہے، وہ جانتا تھا کہ جدید یورپ کی آزاد خیالی کا پودا ترکی میں نصب کر دیا گیا ہے اور اس نے عزم کر لیا تھا کہ اس پودے کو جڑ سے اکھاڑ دے گا یا کم سے کم اسے بڑھنے نہ دے گا، اس نے مغربی ترقی کے اثر سے ترکی کو الگ کرنے کی کوشش کی اور کسی حد تک اس میں کامیاب بھی ہوا، چند مستثنیات کے علاوہ اس کی رعایا کو غیر ملکوں میں سفر کرنے کی اجازت نہ تھی اور سلطنت کے اندر بھی لوگوں کی نقل و حرکت شبہ کی نظر سے دیکھی جاتی تھی (۱) عبدالحمید نے مدحت پاشا اور ان کے پیروؤں کی تصنیفات کو ممنوع قرار دے دیا تھا، جس کسی کے پاس تنظیمات کے متعلق کوئی کتاب پکڑی جاتی تھی اسے بہت سخت سزا ملتی تھی، ایسی کتابوں کا ایک صفحہ بھی پڑھ لینا بغاوت میں داخل تھا، آزادی، دستور، حب وطن اور اس قسم کے دوسرے الفاظ لغت کی کتابوں سے نکال ڈالے گئے۔“ (۲) عبدالحمید پر سازشوں کا

خوف اس قدر طاری رہتا تھا کہ اس کی احتیاطی تدبیریں بعض اوقات حد سے متجاوز ہو جاتی تھیں مثلاً اس خطرہ سے کہ ٹائپ رائٹر اور ٹیلی فون سازش کرنے والوں کے لیے کارآمد ہو سکتے ہیں، اس نے ترکی میں ان چیزوں کی درآمد ممنوع قرار دے دی تھی، پولیس کو مطلق آزادی نہ تھی، باہر سے چھپ کر جو چیز بھی ترکی میں آتی تھی اس پر نہایت سخت نظر رکھی جاتی تھی، اگر کسی شخص کے پاس ہربرٹ اسپنسر (Herbert Spencer) کی کوئی تصنیف پائی جاتی تو اسے قید کر لیا جاتا، نگرانی اتنی سخت تھی کہ تھیمز میں ہیملٹ (Hamlet) کا ڈراما کرنے کی اجازت نہیں دی گئی کیوں کہ اس میں ایک بادشاہ کے قتل کیے جانے کا واقعہ دکھایا گیا ہے۔ (۱)

فوج کی تعلیم: تاہم یورپ کے اثر سے عبدالحمید فوج کو محفوظ نہ رکھ سکا، وہ جانتا تھا کہ سلطنت کی بقا اس بات پر منحصر ہے کہ فوج کی تربیت اور تنظیم یورپ کے جدید اصولوں کے مطابق کی جائے، اس لیے مجبوراً اس نے فوجی مدارس قائم کیے جہاں یورپ کے ماہرین حرب ترک نوجوانوں کو تعلیم دیتے تھے، ہزاروں فوجی افسرانہی مدرسوں سے تعلیم حاصل کر کے نکلے اور اپنے ساتھ یورپ کے فوجی اصولوں کے علاوہ سیاسی خیالات بھی لائے، اعلیٰ تعلیم کے لیے عبدالحمید نے بہت سے فوجی افسروں کو جرمنی اور دوسرے مغربی ممالک میں بھی روانہ کیا، یہ افسر جب واپس ہوئے تو یک بنیادی انقلاب کی ضرورت کا احساس لے کر آئے، عبدالحمید ان جدید تعلیم یافتہ افسروں سے مطمئن نہ تھا بلکہ انھیں اپنے لیے خطرناک سمجھتا تھا، اسی لیے انھیں قسطنطنیہ میں نہیں رکھتا تھا بلکہ سلطنت کے مختلف صوبوں اور درواز مقامات میں بھیج دیتا تھا تاکہ ان کے خیالات سے دارالسلطنت متاثر نہ ہونے پائے۔

نظام جاسوسی: آزاد خیالی کی روک تھام کے لیے عبدالحمید نے جاسوسی کا ایک زبردست محکمہ قائم کیا تھا، جس کی سرگرمیوں ترکوں کا گلا گھونٹ رہی تھیں، کوئی گھر جاسوسوں کی دست برد سے محفوظ نہ تھا، ممنوع الاشاعت لٹریچر کی تلاش میں پولیس اکثر

تعلیم یافتہ ترکوں کے مکانات میں بے تامل داخل ہو جایا کرتی تھی، خاص اجازت کے بغیر کوئی جلسہ نہیں کیا جاسکتا تھا، اس میں اتنی سختی برتی جاتی تھی کہ تین چار دوستوں کا کسی قبوہ خانہ میں بیٹھ کر بات چیت کرنا بھی خطرہ سے خالی نہ تھا، کوئی ترک خود اپنے گھر میں بھی احباب کی ضیافت نہیں کر سکتا تھا، جب تک حکام بالا سے اجازت نہ حاصل کر لے اور اجازت کے بعد بھی اکثر کوئی پولیس کا سپاہی اس کے ہاں بھیج دیا جاتا تھا کہ مہمانوں کی گفتگو سنتا رہے اور اندازہ کرے کہ دعوت کسی سازش کے سلسلہ میں تو نہیں ہے، یہ ناخواندہ مہمان صحبت کا سارالطف خاک میں ملا دیتا تھا۔ (۱)

جولوگ اپنی خاندانی وجاہت، روشن خیالی، حب الوطنی یا شرافت نفس کی وجہ سے ممتاز تھے ان پر خاص طور سے نظر رکھی جاتی تھی، جاسوسی کی شدت نے ان کی زندگی دو بھر کر رکھی تھی، جاسوسی کا نظام اتنا وسیع تھا کہ اس پر اوسطاً بیس لاکھ پونڈ سالانہ خرچ ہوتا تھا، کوئی مقام، کوئی طبقہ، کوئی گھر جاسوسوں کی زد سے باہر نہ تھا، غضب یہ تھا کہ خود وزیر ایک دوسرے کی جاسوسی کرتے تھے، ملازمین اپنے آقا کے جاسوس تھے، بعض اوقات خود اپنے اعزہ اور رشتہ دار جاسوسی کرتے تھے، خاندان، فوج، بحریہ کوئی بھی اس کے مہلک اثرات سے محفوظ نہ تھا، اجتماعی زندگی کا سارا اعتماد جاتا رہا تھا، کوئی کسی پر بھروسہ نہیں کرتا تھا، ہر شخص دوسرے کو مشکوک نگاہوں سے دیکھتا تھا، تمام فضا خوف اور بے اعتمادی سے بھری ہوئی تھی، طرہ یہ تھا کہ خود ان جاسوسوں پر بھی جاسوس مقرر کیے گئے تھے، عبدالحمید کے جاسوس یورپ کے ہر پایہ تخت میں تھے، جاسوسوں کی یہ زبردست فوج جو سلطنت کے چپہ چپہ میں پھیلی ہوئی تھی، اپنی رپورٹیں سلطان کے پاس بھیجتی رہتی تھی اور ان رپورٹوں کی بنا پر ہزاروں آدمیوں کو قید، جلاوطنی اور قتل کی سزا ملتی تھی، جاسوس جن لوگوں کو نامزد کر دیتے تھے انھیں اکثر بغیر اس کے کہ عدالت میں صفائی پیش کرنے کا موقع دیا جائے سزا دے دی جاتی تھی، ملک کے بعض بہترین افراد اپنے گھروں سے

دفعۂ غائب ہو گئے اور پھر پتہ نہ چلا کہ کہاں گئے، یہ لوگ قصر سلطانی میں بلائے جاتے تھے اور وہاں خاموشی کے ساتھ قتل کر کے باسفورس میں ڈال دئے جاتے تھے، باسفورس کی مچھلیاں قصر سلطانی کے ان الوانِ نعمت کی منتظر رہا کرتی تھیں، جلاوطنی یا قید کی سزا تو معمولی جرائم کے لیے مقرر تھی مثلاً باب عالی کے طرز حکومت سے اختلاف کا اظہار یا کسی آزاد خیال غیر ملکی اخبار کار اپنے پاس رکھنا، لوگ باب عالی میں بلائے جاتے تھے اور انھیں اپنے دوستوں اور عزیزوں کے خلاف بیان دینے پر مجبور کیا جاتا تھا، دستوری حکومت کے اعلان کے بعد تقریباً ستر ہزار آدمی جو سلطنت کے دور دراز مقامات مثلاً طرابلس اور یمن اور غیر ممالک میں جلاوطن کر دئے گئے تھے، ترکی میں واپس آئے، جو قتل کر دئے گئے تھے یا جو قید کی حالت میں مر گئے ان کی صحیح تعداد معلوم نہیں۔ (۱)

اس نظام کی زد تقریباً تمام ترکوں اور خصوصاً تعلیم یافتہ ترکوں پر تھی، کیوں کہ عبدالحمید کو انہی کی طرف سے ہمیشہ خطرہ رہتا تھا، عیسائی رعایا اور دوسرے مسلمان نسبتاً آزاد تھے، عیسائیوں کو ایک بڑی آزادی یہ بھی حاصل تھی کہ سابق معاہدوں کی بنا پر حکومت ان کے تعلیمی نظام میں مداخلت نہیں کر سکتی تھی، برخلاف اس کے ترکوں کے مدارس کی نگرانی نہایت سختی سے ہوتی تھی، عبدالحمید نے اپنی رعایا میں سے ترکوں کے علاوہ دوسرے مسلمانوں کو اپنا حامی بنانے کی کوشش کی اور اس میں وہ کامیاب ہوا، اس نے کرہ، عرب اور البانی رئیسوں پر لطف و کرم کا مینہ برسایا اور انھیں اپنے مقربین میں داخل کر لیا، تہذیبیات کے متعلق جو کچھ لکھا گیا تھا وہ ترکی زبان میں تھا اور دوسرے مسلمانوں پر ان خیالات کا اثر نہیں ہوا تھا، اس لیے ان پر اس دور استبداد میں اتنی سختیاں نہیں ہوئیں جتنی ترکوں پر کی گئیں اور ابھی ان میں اس بات کے سمجھنے کی صلاحیت بھی نہیں تھی کہ یہ مرجعِ خسروانہ محض رشوت ہے جو انھیں اس لیے دی جاتی ہے کہ وہ ترقی نہ کر سکیں اور انھیں نئے خیالات کی ہوا نہ لگنے پائے۔ (۲)

عوام کی بیزاری: عوام میں بھی عبدالحمید کے استبداد سے بیزاری پھیلارہی تھی، دیہاتی ملاقوں کے سیدھے سادے ترک سلطان کو نہ صرف اپنا فرماں روا بلکہ مذہبی پیشوا بھی سمجھتے تھے اور اس کے احکام کی تعمیل کو اپنا اولین فرض خیال کرتے تھے لیکن باب عالی کی بد نظمیوں سے ان پر جو مظالم ہو رہے تھے ان سے خود سلطان کے خلاف برشتگی پیدا ہو گئی تھی ترک کسانوں کو بھی بڑے بڑے ٹیکس ادا کرنے پڑتے تھے، یہ غریب سال بھر کی جفاکشی اور کفایت شعاری سے جو سرمایہ جمع کرتے، اس کا بڑا حصہ ٹیکس جمع کرنے والوں کی نذر ہو جاتا، قانونی طور پر جو ٹیکس نافذ تھے وہ زیادہ سخت نہ تھے، لیکن باب عالی کے عمال کی سختیاں حد سے بڑھ گئی تھیں اور غریب کسانوں کا پیٹ نہ لبریز ہو چکا تھا اور امرارثوت دے کر کبھی کبھی ٹیکس سے بری ہو جاتے تھے اور ان کا بار بھی غریبوں ہی پر پڑتا تھا، کسان یہ بھی دیکھتے تھے کہ جو کثیر رقم ان سے ہجر وصول کی جاتی ہے، اس سے خود انھیں کوئی فائدہ نہیں ہوتا بلکہ بڑے بڑے عہدہ داروں کی جیبیں پر ہوتی ہیں مثلاً باب عالی میں ایک شعبہ نظرات نفعہ (پبلک ورکس) کا تھا جس کے سپرد سڑکوں اور نہروں کی تعمیر تھی لیکن یہ چیزیں بہت کم تعمیر ہوتی تھیں حالاں کہ ان کے لیے ٹیکس ہر سال ادا کیا جاتا تھا، ایک وزارت پولیس کی تھی لیکن جان و مال کے تحفظ کا کوئی معقول انتظام نہ تھا، وزارت عدل بھی تھی لیکن عدل و انصاف نہ تھا اور وزارت حرب کے باوجود فوجیں بھوکوں مر رہی تھیں۔

تاہم ان تمام شکایتوں کے باوجود ترک کسانوں کو جو عقیدت سلطان کی ذات سے تھی وہ کبھی بغاوت کی اجازت نہ دیتی، اگر عبدالحمید کے وزیرانے فوج کی زبوں حالی کا کچھ بھی خیال کیا ہوتا، فوج کا بڑا حصہ انہی کسانوں کے لڑکوں پر مشتمل تھا اور علاوہ البانی اور بعض دوسرے دستوں کے جو سلطان کی ذات کے تحفظ اور دارالسلطنت کو خوفزدہ رکھنے کے لیے قسطنطنیہ میں مقیم تھے اور جن کی نگہداشت عبدالحمید خود کرتا تھا، بقیہ تمام فوج کا انتظام حقیقتاً مقربین سلطانی کے ہاتھوں میں تھا جو سپاہیوں کی تکلیف و احتیاج سے قطعاً بے پروا ہو کر دولت کے ڈھیر لگا رہے تھے، غریب سپاہی ہر ختی کو پوری وفاداری اور صبر

کے ساتھ برداشت کر رہے تھے لیکن ایک چیز سے ان کے صبر کا پیمانہ بھی آخر کار چھٹک ہی گیا عثمانی فوج کا دستور تھا کہ سپاہیوں کو چار سال تک اپنے دستہ میں رہنا پڑتا تھا اس کے بعد وہ گھر واپس آ جاتے تھے اور پھر وقتاً فوقتاً معینہ دم معینہ پر فوجی تربیت کے لیے بلائے جاتے تھے، عبدالحمید کے زمانہ میں یہ قاعدہ ہو گیا کہ چار سال کی مقررہ مدت کے بعد بھی سپاہی کئی سال تک روک لیے جاتے تھے اور جن کو گھر واپس جانے کی اجازت بھی ملتی تھی وہ بھی جب چند دنوں کے بعد ٹریننگ کے لیے بلائے جاتے تو اکثر ان کو سلطنت کے دور دراز مقامات میں بھیج دیا جاتا، جہاں انھیں غیر معینہ مدت تک فوجی خدمت انجام دینی پڑتی، جو دستے یمن یا حجاز بھیجے جاتے ان کی حالت سب سے زیادہ خراب تھی، ذرائع حمل و نقل کی کمی سے رسد کی فراہمی کافی طور پر نہ ہو سکتی اور ان فوجوں کو خوراک اور لباس کی تکلیف کے علاوہ اکثر اسلحہ کی کمی کی شکایت بھی رہتی، ان حالات میں عربوں کی بغوت کو فرو کرنا آسان نہ تھا، ترکی دستوں کو اکثر شکستیں ہوتیں اور محض باب عالی کی نظم کی وجہ سے سینکڑوں ہزاروں سپاہی قتل ہو جاتے۔

مسٹر ٹائٹ لکھتے ہیں: ”ترکی میں فوجی خدمت کا بار تمام تر مسلمان آبادی پر ہے عیسائی اس وقت تک اس سے بالکل بری ہیں،“ اس کے عوض وہ صرف ایک خفیف ٹیکس دیتے ہیں، ترک سپاہی اپنی جفاکشی اور شجاعت کے لحاظ سے دنیا کے بہترین سپاہیوں میں ہے، وہ بڑی بڑی سختیوں کو بغیر شکایت کے برداشت کر لے گا، تاہم اس کی برداشت کی بھی ایک حد ہے، سابق دور حکومت میں ان اعلیٰ درجہ کی فوجوں کو جو قابل رحم حالت میں تھے قلعوں اور فوجی چوکیوں میں دیکھی اس کے بیان میں مبالغہ مشکل سے ہو سکتا ہے، ان فوجوں کو پورا راشن کبھی نہیں ملتا تھا، بعض اوقات ان پر فاقے گذرتے تھے، بلقان کی شدید سردیوں کے زمانہ میں بھی جب وہ سرحد کی حفاظت پر تعینات رہتیں انھیں کافی لباس میسر نہ تھا، اکثر ان کی وردیاں پرانی ہو کر چیتھڑے چیتھڑے ہو جاتی تھیں اور جو ملکی لباس بھی مل سکتا وہ اسی کو پہن کر بسر کر لیتیں، ان کی قلیل تنخواہ ہمیشہ بقائے میں پڑی رہتی،

وہ فوجی تربیت اور تنظیم سے بھی محروم تھیں یعنی یورپ کا بہترین فوجی جوہر افسوس ناک طریقہ پر ضائع ہو رہا تھا، خود افسروں کی تنخواہ بھی باقاعدہ نہ ملتی تھی، انھیں اتنی استطاعت نہ تھی کہ صاف ستھری زندگی کا سامان فراہم کر سکتے، نفرت انگیز نظام جاسوسی کی وجہ سے وہ ایک دوسرے سے بھی کشیدہ رہتے تھے، ان حالات میں وہ اپنے سپاہیوں کے اندر وہ بلند فوجی روح نہیں پیدا کر سکتے تھے جو پہلے ترکی فوج کا طرہ امتیاز تھی لیکن ان تمام باتوں کے باوجود جب لڑائی کا موقع آتا تھا تو یہ لوگ یاد رکھتے تھے کہ ہم ترک سپاہی ہیں اور خوب لڑتے تھے۔ (۱)

عام بیزارگی: مذکورہ بالا حالات نے سلطنت کے ہر حصہ میں بیزارگی پھیلا رکھی تھی اور انقلاب کے جذبات رعایا کے ہر طبقہ میں پرورش پا رہے تھے، ان جذبات کو دبانے اور فنا کرنے کے لیے عبدالحمید نے جو تدبیریں اختیار کیں وہ اپنے نتائج کے اعتبار سے الٹی ثابت ہوئیں، چونکہ تعلیم یافتہ اور روشن خیال ترک ہمیشہ جاسوسوں کی نظر میں رہتے تھے اور ان کے لیے ایک دوسرے سے آزادی کے ساتھ ملنا خطرہ سے خالی نہ تھا، اس لیے وہ اپنی زندگی کی بے لطفی دور کرنے کی غرض سے زیادہ تر فلسفہ، تاریخ، قانون اور دوسرے مضامین کی کتابیں جو مغربی ممالک سے پوشیدہ طور پر ترکی میں لائی جاتی تھیں پڑھتے رہتے تھے، یہ کتابیں ترک جلاوطن بہت خفیہ طور پر اپنے دوستوں اور ہم خیالوں کو بھیجا کرتے تھے، شروع میں اس ممنوع الاشاعت لٹریچر کی تعداد بہت قلیل تھی، اکثر ایک ہی کتاب یکے بعد دیگرے سیکڑوں اشخاص تک منتقل ہوتی رہتی، بعض پر جوش و جواں موٹی موٹی کتابوں کو اپنے ہاتھ سے نقل کر ڈالتے، سلطان نے آزاد خیالی کی روک تھام کے لیے ہزاروں آدمیوں کو قسطنطنیہ سے جلاوطن کر کے سلطنت کے مختلف صوبوں میں نظر بند کر دیا تھا مگر اس کی یہ تدبیر بھی غلط ثابت ہوئی، ان لوگوں نے صوبوں میں پہنچ کر روشن خیالی، حریت پسندی اور سیاسی بے اطمینانی پھیلانی شروع کی، جو لوگ غیر ملکوں میں جلاوطن

کیے گئے تھے اور پیرس یا یورپ کے دوسرے دارالحکومتوں میں رہتے تھے وہ براہ راست جدید خیالات کے زیر اثر آتے گئے اور یہی خیالات انھوں نے ترکی میں اپنے دوستوں کو پہنچانے شروع کیے، ان باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ پوری سلطنت میں سلطان کی حکومت کے خلاف ایک عام ناراضی پھیل گئی اور زمین روز بروز انقلاب کے لیے تیار ہوتی گئی۔

انجمن اتحاد و ترقی: مدحت پاشا کے قتل کے بعد دستوری حکومت کا از سر نو قائم کیا جانا ایک امر محال معلوم ہوتا تھا لیکن بہت سے محب وطن ترک جو یورپین ممالک میں جلا وطنی کی زندگی بسر کر رہے تھے، اس مقصد سے غافل نہ تھے، خصوصاً پیرس میں نوجوان ترکوں کی ایک سرگرم جماعت سلطنت عثمانیہ میں دستوری حکومت کی تحریک کو ترقی دینے کے لیے منظم کوشش کر رہی تھی، ۱۸۷۸ء سے لے کر جب کہ سلطان عبدالحمید نے دستور اسی کو معطل کر دیا تھا، ۱۸۹۱ء تک ترکوں کی کسی انجمن کا پتہ نہیں چلتا، اگرچہ ایسے اشخاص کی تعداد جو حکومت کے استبداد سے آزادی حاصل کرنی چاہتے تھے روز بروز بڑھتی جا رہی تھی، سب سے پہلے ۱۸۹۱ء میں جنیوا (Geneva) میں جو صدیوں سے کلیہ اور حکومت کے بانیوں کا مامن بنا ہوا تھا، ترک جلاوطنوں اور پناہ گزینوں کی ایک جماعت نے ایک انجمن کی بنیاد رکھی جو بعد میں عثمانی انجمن اتحاد و ترقی کے نام سے مشہور ہوئی، اس انجمن کا مقصد یہ تھا کہ ترکی حکومت اور سلطان پر دباؤ ڈال کر ملک میں اصلاحات جاری کرانے کی سعی کی جائے، شروع میں انجمن اپنے کو اتنا طاقتور نہیں محسوس کرتی تھی کہ اگر سلطان اپنی ضد پر قائم رہتا تو اسے تخت سے اتارنے کی تدبیریں اختیار کرتی، کچھ دنوں کے بعد انجمن کا صدر دفتر جنیوا سے پیرس کو منتقل کر دیا گیا اور اس کی شاخیں لندن اور دوسرے یورپین دارالحکومتوں میں قائم کر دی گئیں، سلطان نوجوان ترکوں کی ان سرگرمیوں سے بے خبر نہ تھا، عثمانی سفیر مقیم پیرس کو ہدایت کی گئی کہ وہ انجمن کی نقائص و حرکت پر نظر رکھے در قسطنطنیہ سے جاسوس روانہ کیے گئے کہ انجمن کے متعلق جو معلومات بھی فراہم کر سکیں ان سے براہ راست قصر یلڈیز کو مطلع کریں، خود ترکی میں

جاسوسی کا نظام اور بھی سخت کر دیا گیا، نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت کے دشمنوں کی تعداد بڑھتی گئی اور ملک کے بہترین اشخاص بھاگ بھاگ کر پیرس پہنچنے لگے اور نوجوان ترکوں کی جماعت میں شامل ہوتے گئے، انجمن ایک اخبار 'مشورت' اور متعدد چھوٹے چھوٹے رسالے پیرس سے شائع کرتی تھی، جنہوں سے اس کا دوسرا اخبار 'ہلال' نکلتا تھا، ان اخباروں اور رسالوں میں دور حمیدی کے مظالم کا ذکر ہوتا اور سلطان کو معزول کرنے کی تجویز پیش کی جاتی، نظام جاسوسی کی شدت کے باوجود یہ اخبارات اور رسالے خفیہ طور پر ترکی میں لائے جاتے اور کثرت سے لوگ ان کو پڑھتے، قسطنطنیہ میں انجمن کے ایجنٹ انقلابی اپیلیں رات کی تاریکی میں دیواروں پر چسپاں کر دیتے اور باغیانہ پوسٹر جن میں سلطان کی جان کی دھمکی ہوتی خود قریلیڈیز کی دیواروں پر چسپاں کر دے جاتے۔

غیر اسلامی انجمنوں سے مفاہمت: نوجوان ترک اپنے ممتاز پیش رو مدحت پاشا کی طرح یہ خوب سمجھتے تھے کہ سلطنت کو ٹکڑے ٹکڑے ہونے سے بچانے کے لیے نہایت ضروری ہے کہ اس کی تمام قوموں اور مذہبی فرقوں کو یکساں حقوق دے دے جائیں، چنانچہ انھوں نے آرمینی، بلغاری اور دوسری غیر مسلم انقلابی انجمنوں سے جو پیرس میں تھیں اتحاد عمل پیدا کرنے کی کوشش شروع کی، سب سے پہلے آرمینی کمیٹیوں نے تعاون کا ہاتھ بڑھایا اور فریقین کے درمیان ۱۹۰۳ء میں جو معاہدہ پیرس میں ہوا وہ آخر تک قائم رہا، مسٹر: سنٹ لکھتے ہیں: "نوجوان ترکوں اور آرمینی انقلابیوں کے درمیان مفاہمت کی راہ میں سیاسی دشواریاں بہت کم تھیں، یہ مسئلہ ایسا نہ تھا جیسا کہ مقدونیا میں یونانیوں اور سلاویوں کا مسئلہ جن کی ہم قوم خود مختار حکومتیں سرحد پر موجود تھیں جن کی مدد وہ حاصل کر سکتے تھے اور جن سے حمایت اور اگر اتفاق نے مساعدت کی تو الحاق کی امید بھی کر سکتے تھے، کیوں کہ آرمینیا اب صرف ایک جغرافیائی اصطلاح ہے اور قدیم آرمینیا، ترکی، روس اور ایران کے درمیان تقسیم ہو چکا ہے، ترکی آرمینیا میں، منوں سے بہت زیادہ مسلمانوں کی تعداد ہے اور ایک خود مختار آرمینی علاقہ پیدا کرنا جیسا کہ انقلابیوں کی

ایک جماعت کی خواہش تھی ظاہر ہے کہ ایک ناقابل عمل اسکیم تھی، چنانچہ ارمینوں میں جو لوگ زیادہ سمجھ دار تھے انھوں نے اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ ترکی حکومت کا واحد بدلہ روسی حکومت ہو سکتی ہے اور سرحد پار ان کے بھائیوں کے تجربہ نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ ان دونوں میں ترکی حکومت قابل ترجیح ہے، کیوں کہ اس کے ماتحت ان کو ایک حد تک نسلی خود مختاری اور مختلف رعایتیں حاصل تھیں، یہ سچ ہے کہ عبدالحمید کے استبداد سے یہ رعایتیں بہت محدود ہو گئی تھیں، لیکن حکومت روس جو ہمیشہ اپنی ماتحت قوموں کو روسی بنانے پر تلی رہتی تھی، ہرگز یہ مراعات انھیں نہ دیتی۔“ (۱)

اس کے بعد نو جوان ترک دوسری غیر اسلامی انقلابی کمیٹیوں کی طرف متوجہ ہوئے، ارمینوں کی طرح یہودیوں کا تعاون حاصل کرنے میں بھی انھیں زیادہ دشواری پیش نہیں آئی، کیوں کہ یہود کا بھی کوئی خاص وطن نہ تھا اور قومی اور وطنی آزادی کا مسئلہ ان کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتا تھا، لیکن مقدونیا کے بلغاریوں، سربوں اور یونانیوں کے ساتھ مفاہمت کرنے میں سخت مشکلوں کا سامنا کرنا پڑا، یہ قومیں بیرونی حکومتوں کی مدد پر اعتماد کرتی تھیں، نو جوان ترکوں نے انھیں سمجھایا کہ دولِ عظمیٰ جو ایک دوسرے کو حسد کی نگاہ سے دیکھتی ہیں اگر مقدونیا میں مداخلت پر آمادہ بھی ہوں تو بھی اس کی امید نہیں کہ وہاں کے عیسائیوں کے سیاسی حوصلے پورے ہو سکیں، بلکہ اندیشہ ہے کہ مقدونیا کے خلفشار کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کا بڑا حصہ سلطنت آسٹریا ہنگری اپنے اندر شامل کر لے گی، ایسی صورت میں مقدونیا کے عیسائیوں کے لیے مفید بھی ہے کہ سلطنت عثمانیہ سے علاحدہ ہونے کا خیال ترک کر کے نو جوان ترکوں کا ساتھ دیں جن کا مقصد سلطنت میں اتحاد پیدا کرنا اور ان کی تمام قوموں کو مساوی حقوق دینا ہے، چار سال کی مسلسل کوشش کے بعد بالآخر ۱۹۰۷ء میں مقدونیا کی انقلابی کمیٹیوں نے پیرس میں ایک پروگرام مرتب کیا، جو سب کے لیے قابل قبول تھا، اس وقت تک نو جوان ترکوں نے مقدونیا میں اپنی خفیہ

سوسائٹی قائم کر لی تھی اور ترکی فوج کے بڑے حصہ کو اپنا ہم خیال بنالیا تھا۔

پیرس کی انقلابی کانگریس: دسمبر ۱۹۰۷ء میں سلطنت عثمانیہ کے انقلابیوں کی ایک کانگریس احمد رضا بے کے زیر صدارت جو پیرس کی مرکزی انجمن کا صدر تھا پیرس میں منعقد ہوئی جس میں عثمانی انجمن اتحاد و ترقی، ارمنی، بلغاری، یہودی، عرب، البانی اور دوسری کمیٹیاں شرک ہوئیں اور تمام مندوبین نے مندرجہ ذیل امور کے قبول کرنے پر اتفاق کیا (۱) سلطان عبدالحمید معزول کر دئے جائیں۔

(۲) سلطنت عثمانیہ کی سالمیت کا تحفظ کیا جائے۔

(۳) قانون کی نگاہ میں تمام نسلوں اور مذہبوں کو کامل مساوات حاصل ہو۔

(۴) مدحت پاشا کے بنائے ہوئے دستور اساسی کی بنیاد پر دستوری حکومت

قائم کر دی جائے۔

مقدونیا کا انتخاب: اس کانگریس سے ایک سال قبل 'انجمن اتحاد و ترقی' نے اپنا صدر دفتر مقدونیا میں منتقل کر دیا تھا، مقدونیا کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنانے کے مختلف اسباب تھے، اول یہ کہ وہیں وہ قوتیں کام کر رہی تھیں جن سے سلطنت عثمانیہ کے جلد ٹکڑے ٹکڑے ہو جانے کا اندیشہ تھا، سیاسی ڈاکوؤں کے خون آشام جتھے جن کو ترکی کے دشمنوں سے برابر مدد مل رہی تھی، اس علاقہ کو بری طرح تباہ و برباد کر رہے تھے، اس کی وجہ سے مقدونیا کے داخلی معاملات میں دولِ عظمیٰ کو مداخلت کا موقع ہاتھ آگیا تھا اور یہ چیز ہر محبت وطن ترک کے لیے نہایت شرم ناک تھی، چنانچہ مقدونیا کے ملکی انتظامات کی نگرانی کے لیے ایک بین الاقوامی مالیاتی کمیشن کا تقرر اور ایک بین الاقوامی فوجی پولیس کی تشکیل جس کی تربیت اور کمان یورپین افسروں کے ہاتھ میں تھی، دولِ عظمیٰ نے سلطان پر فوجی طاقت کا دباؤ ڈال کر منظور کرائی تھی، نوجوان ترک اس مداخلت کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور اس کی وجہ سے حمیدی نظام حکومت کے خلاف ان کی بیزاری اور بھی شدید ہو گئی تھی، اس مداخلت کا ایک پہلو ترکوں کو خاص طور پر ناگوار تھا اور وہ 'مرزنگ' پروگرام تھا جس کے رو

سے دولِ عظمیٰ نے آسٹریا اور روس کو جو دولتِ علیہ کی شدید ترین دشمن سلطنتیں تھیں مقدونیا میں اپنا اصلاحی پروگرام جاری کرنے کا اختیار دے دیا تھا، اس پروگرام کا نتیجہ یہ ہوا کہ مقدونیا کی حالت روز بروز بدتر ہوتی گئی اور یہ عام طور پر محسوس کیا جانے لگا کہ جب تک نظامِ حکومت میں بنیادی اصلاح نہ کی جائے گی غیر ملکوں کی گرفت اور بھی سخت ہوتی جائے گی، یہاں تک کہ سلطنتِ عثمانیہ ایک روز اپنی آزادی بالکل کھو بیٹھے گی، چنانچہ تمام مقدونیا میں موجودہ حالات کے خلاف جو شدید بیزاری پھیلی ہوئی تھی، اس نے نوجوان ترکوں کی خفیہ سرگرمیوں کے لیے زمین تیار کر دی تھی۔

اس سلسلہ میں پہلا کام فوج کو اپنا ہم خیال بنانا تھا، مقدونیا کی فوجیں سلطنت کے دوسرے حصوں کی بہ نسبت بغاوت کے لیے زیادہ آمادہ تھیں، ان فوجوں کو نہ اچھا کپڑا ملتا تھا نہ اچھا کھانا، تنخواہیں بھی شاذ و نادر ہی ملتیں، سالہا سال سے یہ فوجیں عیسائی باغی جتھوں سے بے قاعدہ لڑائیوں میں مصروف تھیں، جو ایک قسم کا پولیس کا کام تھا اور فوجی سپاہیوں کو مرغوب خاطر نہ تھا، ان کی بے اطمینانی اس وجہ سے اور بھی زیادہ تھی کہ وہ دیکھتی تھیں کہ ان ہی کے بھائی جو بین الاقوامی پولیس میں تھے ان کی حالت کتنی بہتر تھی، ان کی فوجی تربیت بھی بہتر تھی، عمدہ کھانا اور عمدہ کپڑا بھی ملتا تھا اور ان کی تنخواہیں بھی باقاعدہ برابر ملتی تھیں، ان کو دیکھ کر مقدونیا کی فوج کے اراکوں اور سپاہیوں دونوں کو اپنی زبوں حالی کا احساس اور بھی زیادہ ہوتا تھا اور وہ خوب سمجھتے تھے کہ اس صورتِ حال کا ذمہ دار قصرِ یلڈیز ہے۔

نظامِ جاسوسی کی شدت بھی سلطنت کے اور حصوں کی بہ نسبت مقدونیا میں زیادہ تھی، جس سے وہاں کے نوجوان فوجی افسرجن کی تعلیم و تربیت یورپین اساتذہ کی نگرانی میں ہوئی تھی سخت بیزار تھے، انھیں قدرۃً نوجوان ترکوں کی تحریک سے ہمدردی پیدا ہو گئی، ان کی بیزاری کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ قسطنطنیہ سے قصرِ یلڈیز کے متوسلین جن میں مطلق فوجی قابلیت نہیں ہوتی تھی مقدونیا میں بھیجے جاتے تھے اور انھیں ان

افسروں کے اوپر کمان دی جاتی تھی جو مدارسِ حربیہ کے تعلیم یافتہ تھے، جنہوں نے سلطنت کی جنگوں میں نمایاں حصہ لیا تھا اور جو سالوں سے مقدونیا کے پہاڑوں میں باغی جتھوں سے لڑتے آئے تھے، وہ دیکھتے تھے کہ ترقی کا مدار حسنِ خدمت پر نہیں بلکہ قصرِ سلطانی کی سفارش گردیوں پر تھا۔

مذکورہ بالا حالات میں نوجوان ترکوں کو اپنی تحریک کے پھیلانے میں بڑی مدد ملی، انجمن کی غیر معمولی سرگرمیوں کے باعث تھوڑے ہی عرصہ میں انقلابی خیالات مقدونیا کی پوری فوج میں پھیل گئے، انجمن کے ارکان درویشوں اور سوداگروں کے بھیس میں فوجی دستوں میں جاتے اور بڑی ہوشیاری اور خاموشی کے ساتھ تحریک آزادی کی تبلیغ کرتے، سپاہیوں اور افسروں کو حکومت کی طرف سے جو شکایتیں تھیں ان کی وجہ سے یہ خفیہ کوششیں کامیاب ہوتی گئیں، اس کے بعد دوسری فوجوں میں بھی کام شروع کیا گیا، چوں کہ دارالسلطنت کی فوج سب سے زیادہ طاقتور اور وفادار تھی، اس لیے انجمن نے مقدونیا میں اپنی کامیابی کے بعد سب سے زیادہ کوشش اسی فوج کی ہمدردی حاصل کرنے میں کی، دسمبر ۱۹۰۷ء تک مقدونیا کی تقریباً پوری فوج نے دستوری حکومت کی حمایت کا حلف لے لیا تھا، ادرنہ اور قسطنطنیہ کی فوجوں نے بھی اس تحریک سے ہمدردی ظاہر کر دی تھی اس کے علاوہ ڈاکٹرِ ناظم بے کی کوششوں سے اناطولیہ کی فوج کا بڑا حصہ بھی نوجوان ترکوں کا طرفدار ہو گیا تھا۔

مقدونیا میں انجمن اتحادِ ترقی نے اپنی خفیہ سوسائٹی کا صدر دفتر سالونیکا میں قائم کیا، یہ شہر خفیہ سوسائٹیوں کے لیے خاص طور پر موزوں تھا، اس میں بہت سی نسلوں اور قوموں کے لوگ آباد تھے، جو مختلف زبانیں بولتے تھے، اس کی گھنی آبادی میں بھیس بدل کر جاسوسوں کی نظر سے بچتے رہنا آسان تھا، برخلاف اس کے جاسوسوں کے لیے سازشوں اور خفیہ سوسائٹیوں کا پتہ چلانا بہ نسبت اور شہروں کے یہاں زیادہ مشکل تھا، یہی وجہ تھی کہ ترکوں کی خفیہ سوسائٹی سے پہلے بھی وہاں اس قسم کی کئی سوسائٹیاں قائم تھیں،

چنانچہ بلغاری داخلی انجمن کا صدر دفتر وہاں ۱۸۹۵ء سے موجود تھا۔

انجمن کی احتیاطی تدبیر: جیسا کہ اوپر بیان ہوا قصر یلدرم انجمن اتحاد و ترقی کی سررمیوں سے باخبر تھا اور سلطان کے جاسوس اس کے ممبروں کا سراغ لگانے میں پوری طرح کوشاں تھے، یہی وجہ تھی کہ ممبروں کا داخلہ بڑی چھان بین اور انتہائی احتیاط کے ساتھ ہوتا تھا، جن لوگوں نے انجمن کے قواعد و ضوابط مرتب کیے تھے انھوں نے اطالوی خفیہ سوسائٹیوں کا طریقہ اختیار کیا تھا، جس میں ایک ممبر کا تعارف سوسائٹی کے صرف دو یا تین ممبروں سے کرایا جاتا تھا تاکہ اگر وہ کبھی غدار بھی ثابت ہو تو اس تعداد سے زیادہ کے نام نہ بتا سکے، تین ممبروں کی ایک خفیہ کاؤنسل پیرس میں تھی اور دس ممبروں کی سالونیکا میں، یہ کونسلیں مجلس عاملہ کا کام کرتی تھیں، ان دونوں کاؤنسلوں کے ممبروں کا انتخاب مخفی طریقہ کے ووٹ سے ہوتا تھا اور وہ اکثر تبدیل ہوتے رہتے تھے، مقدمہ دنیا میں انجمن اتحاد و ترقی کے ارکان کی تعداد پندرہ ہزار اور تمام ترکی میں اسی ہزار تک پہنچ گئی تھی، یہ لوگ ڈیڑھ ڈیڑھ سو آدمیوں کی جماعتوں میں تقسیم تھے، ان جماعتوں کی نقل و حرکت کی نگرانی و رہنمائی دو ایجنٹوں کے سپرد تھی جن میں سے ایک کا تعلق سالونیکا کی دس ممبروں والی خفیہ کونسل سے تھا اور دوسرا پہلے کی نگرانی کے لیے مقرر تھا، پھر یہ جماعتیں پانچ پانچ آدمیوں کی ٹولियों میں بٹی ہوئی تھیں اور کوئی ممبر اپنی ٹولی کے چار آدمیوں کے سوا کسی دوسرے ممبر سے واقف نہ تھا، اس احتیاط کا مقصد یہ تھا کہ اگر کوئی ممبر غداری بھی کرے تو چار آدمیوں سے زیادہ کے نام حکومت کو نہ بتا سکے، انجمن کے ممبروں میں ترکوں کے علاوہ یہودیوں اور یہودیوں کی بھی ایک بڑی تعداد تھی جس کی وجہ سے غداری کے اکثر مواقع پیش آئے ہوں گے، لیکن یہ ایک حیرت انگیز واقعہ ہے کہ کسی ممبر نے بھی دھوکا نہیں دیا، بکسن لکھتا ہے کہ ”وقفاً فوقاً حکومت کی طرف سے لوگوں کی گرفتاریاں عمل میں آتی رہتی تھیں، اس کے بعد قید اور قتل کی سزائیں دی جاتیں، شدید ایذاؤں کے ذریعہ ایسی شہادتیں حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی جن سے ممبروں کا سراغ لگ سکے لیکن کسی ایک

ممبر کی غداری کا ثبوت بھی نہیں ملتا۔“ (۱)

عورتوں کی خدمات: تحریک انقلاب کی ایک خاص خصوصیت یہ تھی کہ اس میں ترک عورتوں نے بھی بہت کچھ حصہ لیا، ان کے سپرد زیادہ تر پیغام رسانی اور کاغذات کو ایک ممبر کے پاس سے دوسرے ممبر کے پاس لے جانے کی خدمت تھی، انجمن کے ممبروں کی بیویاں ایک دوسرے سے مل کر یہ خدمت آسانی کے ساتھ انجام دیتی تھیں، ترکی میں عورتوں کو جو عزت و احترام حاصل تھا، اس کے لحاظ سے وہ تنہائی سے محفوظ و مامون تھیں اور کوئی غیر شخص خواہ وہ کسی رتبہ کا آدمی ہو بلا اجازت حرم میں داخل نہیں ہو سکتا تھا، کسی پولیس افسر کی مجال نہ تھی کہ بغیر کسی نہایت ہی اہم سبب کے وہ اس مقبول عام دستور کی خلاف ورزی کر سکے۔ (۲)

خفیہ جلسے اور نئے ممبروں کا داخلہ: عورتیں جلسوں کے انعقاد میں بھی مدد دیتی تھیں، ممبروں کو زبانی پیغامات کے ذریعہ اطلاع دی جاتی تھی، یہ جلسے نہایت خفیہ طور پر منعقد کیے جاتے تھے اور افشاے راز کے خوف سے اکثر جنگلوں میں ہوتے تھے، شریک ہونے والے نقاب پوش آتے، جب کوئی نیا ممبر انجمن میں داخل کیا جاتا تو پہلے اس سے قسم لی جاتی کہ وہ کسی حالت میں انجمن کا راز ظاہر نہ کرے گا، خواہ آئندہ وہ اپنی رائے بدل کر انجمن کی رکنیت سے علاحدہ بھی ہو جائے، اس کے بعد ایک شخص جس سے وہ ناواقف ہوتا اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر ایک مقام پر اسے لے جاتا اور وہاں اس کے سامنے انجمن کے اغراض اور ترکی کو موجودہ مظالم سے آزاد کرانے کے طریقے بیان کیے جاتے پھر اسے قرآن شریف (۳) کو ہاتھ میں لے کر اٹھائے راز اور وفاداری کی قسم کھانی پڑتی، قسم کے بعد وہ عارضی طور پر انجمن کا ممبر مقرر کیا جاتا اور ایک مدت تک اس کی وفاداری کا امتحان مختلف طریقوں سے لیا جاتا، اس کے پاس پر اسرار ذرائع سے ہدایتیں پہنچتی رہتیں،

(۱) ترکی حالت انقلاب میں ص ۴۸ (۲) بیداری ترکی از انٹ ص ۱۲۳ (۳) عیسائیوں اور

یہودیوں کو انجیل و تورات ہاتھ میں لے کر قسم کھانی پڑتی تھی۔

جن کی تعمیل اسے بے چون و چرا کرنی پڑتی، اگر ان امتحانات میں وہ پورا اترتا تو دوبارہ اسے ایک مخفی مقام پر لے جاتے اور وہاں وہ باقاعدہ طور پر چار ممبروں کی ایک ٹولی میں داخل کر دیا جاتا، لیکن اس کے بعد بھی اس کے ساتھیوں کی شخصیت اس پر ظاہر نہ کی جاتی، حلف دینے کا طریقہ یہ تھا کہ قرآن مجید پر ایک ریو الوار اور ایک تلوار رکھ کر ممبر کو متنبہ کر دیا جاتا کہ اس نے اپنا جسم و جان انجمن کے حوالہ کر دیا ہے اور اگر انجمن حکم دے تو اسے اپنے حقیقی بھائی کو بھی قتل کر دینا پڑے گا، اس کے بعد ممبر یہ حلف لیتا ”میں خدا اور حضرت محمد ﷺ کی قسم کھاتا ہوں کہ جب تک میرے جسم میں خون کا ایک قطرہ بھی باقی رہے گا میں قومیت، آزادی اور صداقت کے لیے جنگ کرتا رہوں گا“، حلف لینے کے بعد ممبر اپنی رکنیت کا ٹیکس ادا کرتا جس کی مقدار اس کی آمدنی کا دو فیصدی حصہ تھی، وہ ایک بندوق رکھنے کا عہد کرتا، نیز اس بات کا عہد کرتا کہ جس وقت اسے انجمن کے مقصد کے لیے لڑنے کی خاطر طلب کیا جائے گا، وہ فوراً اپنے بال بچوں، کاروبار اور دوستوں کو چھوڑ کر تیار ہو جائے گا، ممبروں سے جو ٹیکس وصول کیا جاتا وہ اور دوسرے عہدے اور رقبے جو انجمن کو حاصل ہوتے اسلحہ اور سامان جنگ کے خریدنے میں صرف کی جاتیں، اس کے بعد جو رقم بچتی وہ ان لوگوں کے اہل و عیال کی مدد کے لیے وقف کر دی جاتی جو دوران انقلاب میں مارے جائیں۔ (۱)

سالونیکا کمیٹی: سالونیکا میں صدر دفتر کے منتقل ہونے کے بعد انجمن کی شاخیں مقدونیا اور البانیا کے تقریباً ہر گاؤں میں قائم کر دی گئیں، انقلاب کے برپا ہونے سے پیشتر اس کی شاخیں ایشیائی ترکی کے تمام اہم شہروں میں قائم ہو چکی تھیں، مسٹرٹائٹ لکھتے ہیں کہ ”سالونیکا کمیٹی“ کے ممبروں میں سے بہتوں سے میں نے ملاقات کی ہے، وہ سب اعلیٰ اور متوسط طبقہ کے لوگ تھے، فوج کے نو جوان افسر تھے، جنہوں نے مدارسِ حربیہ میں تعلیم

(۱) ”مسائل مشرق وسطیٰ“، از انیکس ہملٹن، مطبوعہ لندن ۱۹۰۹ء، ص ۳۰-۳۱

پائی تھی اور بیرن فان ڈر گولٹز (Fonder Goltz) کے اعلیٰ نظام کے تربیت یافتہ تھے، وکلاء تھے، ڈاکٹر تھے اور چند علما تھے، اونچے درجہ کے افسروں اور ملازمت دیوانی کے اعلیٰ عہدہ داروں میں سے کوئی بھی اس کمیٹی کا ممبر نہ تھا، یہ تمام اشخاص جن میں سے اکثر متوسط عمر سے کم کے تھے جو خفیہ کمیٹی کے ممبر بنے تھے، اپنی شدید اور بے لوث وطن دوستی کے لیے ممتاز تھے، یہ ایسے لوگ تھے کہ جس غیر ملکی شخص کو بھی ان سے ملنے کا اتفاق ہوا وہ ان کا احترام اور تعریف و توصیف کرنے پر مجبور ہوا، یہ انقلاب نیچے سے نہیں شروع ہوا یعنی ذلیل شہری مخلوق یا جاہل کسانوں سے بلکہ اوپر سے آیا جو ترکی کا بہترین حصہ تھا۔“ (۱)

تحقیقاتی کمیشن: دسمبر ۱۹۰۷ء کی ”پیرس کانگریس“ کے برخاست ہونے کے بعد جب نوجوان ترک پارٹی کے اخبارات مشورت اور ہلال نے ”انجمن اتحاد و ترقی“ کی کامیابی کا ذکر کیا جو اسے اپنی تحریک کے پھیلانے میں حاصل ہوئی تھی تو سلطان نے معاملہ کی اہمیت کا اندازہ کر کے انسدادی تدبیریں فوراً اختیار کیں، چنانچہ مارچ ۱۹۰۸ء میں خفیہ پولیس نے مقدونیا اور ادرنہ کے فوجی دستوں کے بعض افسروں پر چھاپے مارے اور تفتیش کے لیے ایک خاص کمیشن قسطنطنیہ سے سالونیکا بھیجا گیا، اس کمیشن کی رپورٹ جب سلطان کے پاس پہنچی تو اسے اور زیادہ خطرہ ہوا اور فوراً ہی اس نے ایک دوسرا کمیشن سالونیکا بھیجا، ان کمیشنوں کی رپورٹ پر بہت سے فوجی افسر گرفتار کر لیے گئے۔

انقلاب میں عجلت: ”انجمن اتحاد و ترقی“ ابھی انقلاب کے اعلان کے لیے پوری طرح تیار نہ تھی، اس کا خیال تھا کہ انقلاب ۳۱ جولائی ۱۹۰۹ء کو شروع کیا جائے، جو سلطان عبدالحمید کی تخت نشینی کی سال گرہ کا دن تھا، لیکن ایک طرف تو قصر یدیز کی انسدادی سرگرمیاں روز بروز زیادہ شدید ہوتی جاتی تھیں اور دوسری طرف مقدونیا کی بڑھتی ہوئی طوائف الملوکی کے باعث بیرونی طاقتوں خصوصاً برطانیہ اور روس کی مداخلت کا خطرہ ہر لمحہ ترقی کر رہا تھا، ریوال میں شاہ ایڈورڈ ہفتم اور زار روس کی ملاقات کے بعد

سالونیکا کمیٹی کو یہ معلوم ہو گیا تھا کہ برطانیہ اور روس مل کر مقدونیا میں اصلاحات کی ایک اسکیم جاری کرنی چاہتے ہیں جس کا ایک مقصد یہ تھا کہ وہاں کے تمام جتنے خواہ کسی نسل و قوم کے ہوں تو زدے جائیں، برطانیہ اور روس کا تعاون کمیٹی کی نظر میں دولت عثمانیہ کی شکست و ریخت کا مقدمہ تھا، علاوہ بریں وہ یہ بھی دیکھ رہی تھی کہ مقدونیا میں اجنبی تسلط کے قائم ہو جانے سے اسے اپنی تحریک کو جاری رکھنا ناممکن ہو جائے گا، انہی دنوں یہ افواہ مشہور ہوئی کہ منیر پاشا ترکی سفیر متعینہ پیرس کے دوبارہ اتھنر جانے کی غرض یہ تھی کہ بلغاریا کے خلاف یونان سے اتحاد کر کے مقدونیا کے بعض حصے یونان کے حوالہ کر دے جائیں، اس افواہ سے نوجوان ترکوں میں سخت برہمی پھیلی۔

اعلان انقلاب: مذکورہ بالا وجوہ سے کمیٹی نے اعلان انقلاب میں مزید تاخیر اپنے مقصد کے لیے خطر نہ سمجھی، چنانچہ اس کی ہدایت کے بموجب ۵ جولائی ۱۹۰۸ء کو مسیحریازی بے نے دو سو آدمیوں کو ساتھ لے کر رنا کی پہاڑیوں پر سلطان عبدالحمید کے استبداد کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا اور حیرت انگیز سرعت کے ساتھ انقلاب کے شعلے ہر طرف پھیلنے لگے، جس وقت اس کی اطلاع قسطنطنیہ پہنچی سلطان نے فوراً شمس پاشا کے نام جو منستر کے فوجی دستہ کا کمانڈر تھا، حکم بھیجا کہ اس فتنہ کو جلد سے جلد فرو کر دیا جائے، شمس پاشا بغیوں کے مقابلہ میں روانہ ہونے کی تیاری کر رہا تھا کہ ۷ جولائی کو مقدونیا کی فوج کے ایک افسر نے جو ”انجمن اتحاد و ترقی“ کا ممبر تھا اس پر گولی چلائی اور پاشا اپنی گاڑی کے اندر ہی ٹھنڈا ہو گیا، ۸ جولائی کو ناظم بے نے سالونیکا کے اڑتالیس فوجی افسروں کو جن کے متعلق معلوم تھا کہ تحریک انقلاب کے حامی ہیں گرفتار کر لیا، دو ہی روز بعد انجمن کے ایک رکن نے اس کا جواب یوں دیا کہ حتیٰ بے کو جو ناظم بے کا دست راست تھا گولی مار کر ختم کر دیا، ۱۱ جولائی کو خود ناظم بے پر بھی قاتلانہ حملہ کیا گیا لیکن وہ صرف زخمی ہو کر بچ گیا۔

انقلاب کی رفتار جس قدر تیز ہوتی جاتی تھی اسی قدر اسے فرو کرنے میں

حکومت کی طرف سے سختی بھی بڑھتی جاتی تھی، یہ دیکھ کر ”سلاوینکی کمیٹی“ نے اپنے خفیہ اجلاسوں میں قصر یدیز کے ان آلہ کاروں کے قتل کے احکام صادر کرنا شروع کیے جو تحریک انقلاب کے لیے نہایت خطرناک نظر آتے تھے، ان میں وہ تمام لوگ شامل تھے جو جاسوسی کی خدمت انجام دیتے تھے، مقدونیا کی فوج کے بعض سپر افسر بھی تھے جن کا قتل کمیٹی کو ضروری معلوم ہوا، اس پالیسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ آخر میں لوگ بڑی سے بڑی تنخواہ پر بھی جاسوسی کا کام کرنے پر تیار نہ ہوتے، ہر جاسوس اپنے کو بندوق کا نشانہ سمجھتا تھا، یہ قتل علی الاعلان دن کی روشنی میں گنجان سڑکوں پر فوجی افسروں کے ہاتھوں سے ہوتے اور کوئی شخص بھی ان قاتلوں سے مزاحم نہ ہوتا، سلطان کے نہایت قابل اعتماد افسر جب اس بغاوت کو کچلنے کے لیے بھیجے جاتے تو وہ اپنے سپاہیوں سے باغیوں پر گولیاں چلوانے سے قاصر رہتے اور بعض اوقات خود بھی قتل کر دیے جاتے، بقول مسٹر ٹائٹ ”تاریخ میں پہلی بار بادشاہ کا نام اطاعت شعار عثمانی سپاہیوں کے دلوں میں احترام و اطاعت کا جذبہ پیدا کرنے میں ناکام ثابت ہوا۔“ (۱)

الطاف خسروانہ کا فریب: مقدونیا میں حکومت کا اقتدار اس حد تک زائل ہو چکا تھا کہ ”باب عالی“ کے کمشنروں کے لیے ان اشخاص کی گرفتاری دشوار ہو گئی جو بغاوت کے جرم میں نامزد کیے گئے تھے، چنانچہ اب فریب سے کام لینے کی کوشش کی گئی، انور بے اور دوسرے نوجوان افسروں کو جو مقدونیا کے اندرونی علاقوں میں تحریک انقلاب کو پھیلا رہے تھے، خوشامدانہ خطوط لکھ کر قصر یدیز آنے کی دعوت دی گئی اور ان سے نہ صرف معافی بلکہ انعام و اکرام اور عہدے کی ترقی کا وعدہ کیا گیا، انور بے اس وقت ولایات مقدونیا کے انسپکٹر جنرل کے اسٹاف کے ایک افسر تھے، سلطان ان کی اہم حیثیت سے واقف تھا، اس لیے انھیں خاص طور پر الطاف خسروانہ کا لالچ دیا گیا اور سلطان کی طرف سے یہ دعوت پیش کی گئی کہ اگر وہ باغیوں کا ساتھ چھوڑ کر فوراً قسطنطنیہ روانہ ہو جائیں

تو بلا تاخیر جنرل کے عہدہ پر مامور کر دئے جائیں گے، انور بے عبدالحمید کی چالوں سے خوب واقف تھے، وہ جانتے تھے کہ موجودہ صورت میں قسطنطنیہ جانے کے معنی یہ ہیں کہ اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھیں، بہت سے محبان وطن ترقی اور انعام و اکرام کے وعدوں پر اس سے پہلے بھی قصر یلدرم میں بلائے گئے تھے مگر پھر دنیا کو معلوم نہ ہو سکا کہ وہ کہاں اور کیوں کر غائب ہو گئے، وہ دیکھ چکے تھے کہ مدحت پاشا کے وقت سے الطاف خسروانہ کا یہ طریقہ دستوری حکومت کے حامیوں کو ہلک کرنے کے لیے استعمال ہوتا رہا ہے، چنانچہ انھوں نے بجائے قسطنطنیہ کے پہاڑوں کی راہ لی اور وہاں لوگوں کو علانیہ بغاوت کے لیے ابھارنا شروع کیا۔

”انجمن اتحاد و ترقی“ اب کھل کر میدان میں آگئی تھی، اس کی کوششوں سے مقدونیا اور ادرنہ کی فوجوں کا بڑا حصہ بغاوت میں شریک ہو گیا، یہ دیکھ کر باب عالی نے طے کیا کہ اناطولیہ کی قابل اعتماد فوج سے اڑتالیس دستے مقدونیا کی بغاوت فرو کرنے کے لیے روانہ کیے جائیں، چنانچہ ستائیس دستے سمرنا سے سمندر کی راہ سے سالونیکا بھیجے گئے، جہاں وہ ۱۶ جولائی کو اترے، ڈاکٹر ناظم بے اور ان کے ساتھیوں کی خفیہ سرگرمیوں سے یہ دستے ایشیائے کوچک سے روانہ ہونے کے قبل ہی انقلابی خیالات سے بڑی حد تک متاثر ہو چکے تھے، سمرنا میں آنے کے بعد انجمن کے ایجنٹوں نے فوراً ہی ان میں پہنچ کر اپنا کام شروع کر دیا، نتیجہ یہ ہوا کہ بعض دستوں نے سالونیکا پہنچ کر منسٹر جانے سے انکار کر دیا، بقیہ دستے مناسٹر روانہ کر دئے گئے، ان کے ساتھ وہ افسر جو سالونیکا کی خفیہ کمیٹی کے کارکن تھے شربت بیچنے والوں اور ملاؤں کے لباس میں مناسٹر گئے اور وہاں اپنی کوششوں سے تحریک انقلاب کے حامیوں کی تعداد روز بروز بڑھانے لگے، چنانچہ یہ بات جلد واضح ہو گئی کہ اناطولیہ کی فوج کے اکثر افسر اور سپاہی مقدونیا کے فوجی دستوں سے ہمدردی رکھتے ہیں اور ان پر گولی چلانے کے لیے ہرگز آمادہ نہ ہوں گے، نہ صرف یہ بلکہ اناطولیہ کے دستوں نے مناسٹر پہنچنے کے چند ہی دنوں بعد ”انجمن اتحاد و ترقی“ کی

وفاداری کا حلف بھی لے لیا۔

جولائی کے تیسرے ہفتہ کی حالت یہ تھی کہ مقدونیا میں سلطان کی فرماں روائی اب بھی برائے نام قائم تھی لیکن حکومت کا اقتدار کچھ بھی نہیں رہ گیا تھا، خاص فوجی مرکز مناسٹر میں فوج کی کمان مارشل عثمان فیضی پاشا کے ہاتھ میں تھی جو شمش پاشا کے قتل کے بعد اس بغاوت کو فرو کرنے کے لیے بھیجے گئے تھے لیکن وہ اپنے سپاہیوں کا رنگ دیکھ کر کوئی فیصلہ کن قدم بڑھانے میں تامل کرتے تھے، مقدونیا اور ادرنہ کے فوجی دستے نیز وہ دستے جو انطالیہ سے لائے گئے تھے یا تو انجمن کے طرفدار تھے یا حکومت کی وفاداری میں متزلزل، اس کی توقع نہ تھی کہ سپاہیوں کا بڑا حصہ قصریدیز کا اقتدار قائم رکھنے کے لیے اپنے ساتھیوں پر گولی چلائے گا، بلغاری کسان جن کو انجمن نے اسلحہ دے دئے تھے عام بغاوت میں حصہ لینے کے لیے صرف حکم کے منتظر تھے اور دس ہزار البانی جنگجو استبداد کے حامیوں پر حملہ آور ہونے کے لیے تیار تھے۔

مناسٹر پر قبضہ: سلطان نے دیکھا کہ سختی سے کام نہیں چلتا تو اب نرمی کا اظہار شروع کیا، چنانچہ ایک بڑی رقم قرض لے کر سالونیکا بھیجی گئی کہ فوج کی تنخواہ جو مدت سے ادا نہیں کی گئی تھی فوراً دے دی جائے اور مقدونیا کے وہ اڑتالیس فوجی افسر جو ۸ جولائی کو گرفتار کیے گئے تھے رہا کر دئے گئے، لیکن یہ تدبیر بھی بے اثر ثابت ہوئی، ۲۲ جولائی کو نیازی بے نے ایک ہزار آدمیوں کی جمعیت سے مناسٹر پر رات کی تاریکی میں دفعۃً قبضہ کر لیا اور عثمان پاشا کو گرفتار کر کے اوکریڈا میں نظر بند کر دیا، اس کے بعد سالونیکا کمیٹی نے عثمان پاشا کی طرف سے مندرجہ ذیل تاریخ سلطان کی خدمت میں روانہ کیا:

”میں فوج کے ہاتھ میں ہوں جس نے قسم کھائی ہے کہ

اگر دستور فوراً عطا نہ کیا گیا تو وہ قسطنطنیہ پر حملہ کر دے گی اور میں ادب

کے ساتھ یہ عرض کرتا ہوں کہ میرا مقصد فوج کی قیادت کرنے کا ہے۔“

سی روز ایک لاکھ البانیوں نے فیروزوویچ (Feerezorvich) کے مقام پر

جلسہ کر کے نوجوان ترکوں کی تحریک آزادی میں شریک ہونے کو باقاعدہ اعلان کیا اور اسکو ب سے براہ راست سلطان کے پاس یہ اطلاع بھیجی گئی کہ البانیوں نے دستوری حکومت کی حمایت کا حلف لے لیا ہے۔ (۱)

یلدیز کی سرانسیگی: ان خبروں کے پے در پے پہنچنے سے قصر یلدیز میں سرانسیگی کے آثار نمایاں ہونے لگے، ۲۲ جولائی کو سلطان نے فرید پاشا کو معزول کر کے اس کی جگہ کوچک سعید پاشا کو صدر اعظم مقرر کیا، اسی روز رات کو مجلس وزراء کا اجلاس ہوا جس میں بغاوت مقدونیا پر بہت دیر تک بحث ہوتی رہی، لیکن وزیر سلطان کے مزاج سے واقف ہونے کی وجہ سے اپنے اصلی خیالات کے اظہار سے گریز کرتے تھے، آخر دربار کا پران عرب نجومی ابوالہدی جو بہت ضعیف اور بیمار تھا پاکی میں لایا گیا، اس نے وہی کہا جسے زبان پر لاتے ہوئے وزیر اڈر رہے تھے یعنی تخت کو محفوظ رکھنے کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ بلاتاخیر دستوری حکومت کا اعلان کر دیا جائے، سلطان دوسرے کمرے میں بیٹھا ہوا تمام باتیں سن رہا تھا لیکن اب بھی خاموش تھا، ۲۳ جولائی کو علی الصبح مجلس برخواست ہوئی مگر اس وقت تک کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔

دستوری حکومت کا اعلان: اسی روز ”انجمن اتحاد و ترقی“ نے حلی پاشا کو جو ولایات مقدونیا کے انسپکٹر جنرل تھے یہ الٹی میٹم دیا کہ اگر چوبیس گھنٹے کے اندر دستوری حکومت کا اعلان نہ کر دیا گیا تو وہ قتل کر دئے جائیں گے، ساتھ ہی انجمن کی طرف سے بذریعہ تار سلطان کو بھی اطلاع دی گئی کہ اگر چوبیس گھنٹے کے اندر دستوری حکومت کا اعلان نہ کیا گیا تو انقلابی فوجیں قسطنطنیہ کی طرف روانہ ہو جائیں گی، ان اطلاعات کے پہنچنے پر معاملہ کی پوری اہمیت سلطان کے سامنے آگئی، اسے یقین ہو گیا کہ اب یہ شورش دبنے والی نہیں اور اگر انجمن کا مطالبہ منظور نہ کیا گیا تو خانہ جنگی شروع ہو جائے گی، جس کا نتیجہ خود اس کے حق میں بہت برا ہوگا، چنانچہ ۲۳ جولائی کو رات کے وقت جب مجلس وزراء کا اجلاس

پھر منعقد ہوا اور اس میں دستوری حکومت کے اعلیٰ پر سب نے اتفاق کیا تو سعید پاشا یہ عرض داشت لے کر سلطان کی خدمت میں حاضر ہوا، وہ سلطان کے مزاج سے اچھی طرح واقف تھا اور مجلس وزرا کی عرض داشت پیش کرتے وقت اپنی جان کے لیے ڈر رہا تھا، لیکن سلطان اب واقعات کی منطق سے قائل ہو چکا تھا، اس نے بلا تاویل اس درخواست پر اپنی منظوری تحریر کر دی۔

۲۴ جولائی کو علی الصبح بذریعہ تار ”انجمن اتحاد و ترقی“ کو اطلاع دی گئی کہ سلطان نے دستوری حکومت کا قیام منظور فرمایا، تھوڑی دیر میں پوری سلطنت میں یہ خبر پھیل گئی اور ہر طرف شادیانے بجنے لگے، خصوصاً مقدونیا میں مسرت کا ایک سمندر لہریں مارتا ہوا دکھائی دیتا تھا، انور بے نے اعلان کیا کہ ”استبدادی حکومت کا خاتمہ ہو گیا اور آج سے ہم سب بھائی بھائی ہیں، اب نہ کوئی بلغاری ہے نہ یونانی، نہ رومانی ہے نہ یہودی، نہ ترک اس نیل گوں آسمان کے نیچے، ہم سب برابر ہیں اور صرف عثمانی ہونے پر فخر کرتے ہیں۔“ دستوری حکومت کا اعلان ترکوں کے لیے خاص طور پر باعث مسرت تھا، سلطان عبدالحمید کے استبداد کی سختیاں زیادہ تر انہی کو جھیلنی پڑتی تھیں، عیسائی اور دوسری مسلمان قومیں نسبتاً آزاد تھیں، ترکوں پر ہر وقت ایک خوف طاری رہتا تھا، جس نے ان کی زندگی تلخ کر دی تھی، بکسٹن لکھتا ہے: ”بڑے سے بڑا ترک بھی جاسوسی کی زد سے محفوظ نہ تھا اور چھوٹے سے چھوٹا سخت گیری سے، تعلیم یافتہ طبقوں میں مشکل سے کوئی گھر ایسا تھا جہاں کسی فرد خاندان کی مشتبہ موت کا ماتم یا اس کی ناگہانی جلاوطنی کی یاد تازہ نہ رہی ہو، اب یہ تمام باتیں رخصت ہو گئیں، لوگ آزادی سے سانس لینے لگے، تیس برس کے بعد پہلی مرتبہ وہ کھل کر باتیں کر سکتے تھے، پڑھ سکتے تھے، اپنے دوستوں سے ملاقاتیں کر سکتے تھے، غیر ملکوں سے مل جل سکتے تھے اور ادھر ادھر سفر کر سکتے تھے، ایک نوجوان ترک نے مجھ سے بیان کیا کہ ”اب تک میں زندہ تھا ہی نہیں“ (۱)

لیکن اس جوشِ مسرت میں بھی ترکوں نے اپنی خلقی سنجیدگی اور متانت برابر قائم رکھی، مسٹر نائٹ جو اس انقلاب کے زمانہ میں قسطنطنیہ میں موجود تھے بیان کرتے ہیں: ”قسطنطنیہ نے اپنے انقلاب کی پذیرائی دانشمندانہ طریقہ پر کی، تمام پرانی بندشیں ٹوٹ چکی تھیں، لیکن آزادی نے مطلق العنانی کی صورت نہیں اختیار کی تھی، مطبوعات کا احتساب گواہ نہیں رہ گیا تھا، تاہم ترکی پریس اپنے لب و لہجہ میں بہ وقار اعتدال برت رہا تھا، دارالسلطنت میں بھیڑ کی بھیڑ سیاسی جلسوں میں شریک ہوتی تھی لیکن نہ کوئی نقص امن تھا نہ پولیس یا فوج کی ضرورت تھی، علاوہ اس موقع کے جب یونانیوں نے انتخابات کے دوران میں مظاہرے کیے، یہ لوگ اس وقت تک خوش نہیں رہ سکتے جب تک کوئی حقیقی یا خیالی شکایت شور و غل مچانے کے لیے انھیں حاصل نہ ہو۔“ (۱)

خط ہمایوں یکم اگست ۱۹۰۸ء: دستوری حکومت کے اعلان کے ایک ہفتہ بعد یکم اگست ۱۹۰۸ء کو سلطان عبدالحمید نے ایک فرمان شائع کیا، جس میں مندرجہ ذیل امور کی تصریح کی گئی۔

- (۱) تمام عثمانی رعایا کو بغیر کسی نسلی امتیاز کے ذاتی آزادی حاصل ہوگی اور حقوق اور ذمہ داریوں کے اعتبار سے سب برابر ہوں گے۔
- (۲) قانونی وجوہ کے بغیر کسی شخص سے نہ جواب طلب کیا جائے گا نہ اسے گرفتار یا قید کیا جائے گا نہ کسی طریقہ پر سزا دی جائے گی۔
- (۳) غیر معمولی عدالتیں بند کر دی جائیں گی اور عدالتِ مجاز کے شعبہ سے باہر کوئی شخص قانوناً طلب نہ کیا جائے گا۔
- (۴) قانونی صورت کے علاوہ کسی شخص کے مکان میں داخل ہونے یا اس کے مکان کی ٹکرنی کرنے کی اجازت نہ ہوگی۔

(۵) حکومت کے عہدہ دار بڑے ہوں یا چھوٹے کسی شخص کو قتل کی سزا نہ دیں

گئے، بجز اس صورت کے جس کی تصریح قانون نے کر دی ہو۔

(۶) سلطان کی تمام رعایا کو حق حاصل ہوگا کہ جہاں چاہے بود و باش اختیار کرے اور جس سے چاہے میل جوں رکھے۔

(۷) پولیس کا احتساب منسوخ کر دیا جائے گا، خطوط و اخبارات راستہ میں روکے نہ جائیں گے، پولیس کے جرائم کی تفتیش معمولی عدالتوں میں ہوگی۔

(۸) تعلیم بلا معاوضہ ہوگی۔

(۹) حکومت کے عہدہ دار قانون کے ذمہ دار ہوں گے اور خلاف قانون احکام کی تعمیل پر مجبور نہ کیے جائیں گے۔

(۱۰) شیخ الاسلام، وزیر جنگ اور وزیر بحریہ کے سوا تمام وزیروں کا انتخاب صدر اعظم کے ہاتھ میں ہوگا اور وہ منظوری کے لیے ان کے نام سلطان کی خدمت میں پیش کرے گا، صدر اعظم ہی سفارت خانہ کے عہدہ داروں، والیوں اور کنسل آف اسٹیٹ کے ممبروں کو بھی منتخب کرے گا اور اس انتخاب میں وزیر خارجہ، وزیر داخلہ اور پریزیڈنٹ کنسل آف اسٹیٹ کی منظوری حاصل کرے گا، جہاں تک کہ ان سے تعلق ہوگا۔

دفعہ (۱۱) میں وہ فرائض مذکور تھے جن کا تعلق صوبوں کے عہدہ داروں سے تھا دفعہ (۱۳) میزانیہ (بجٹ) سے متعلق تھا اور اس میں وعدہ کیا گیا تھا کہ بجٹ ہر سال کے شروع میں شائع کر دیا جائے گا۔

(۱۴) وزارتوں اور ولایتوں سے متعلق مروجہ قوانین پر نظر ثانی کرنے کے بعد موجودہ ضروریات کے لحاظ سے ان میں ترمیم کرنے کے لیے تجویزیں مرتب کی جائیں گی تاکہ جب عنقریب مجلس نائین کا اجلاس ہو تو وہ اس کے سامنے پیش کی جائیں۔

(۱۵) فوج کو ترقی دی جائے اور اسلحہ میں اصلاحات جاری کی جائیں۔ (۱)

ایک اعتراض: نوجوان ترکوں نے ”خط ہمایوں“ کی دفعہ (۱۰) پر یہ اعتراض کیا کہ

شیخ الاسلام وزیر جنگ اور وزیر بحریہ کا انتخاب سلطان نے اپنے ہاتھ میں رکھا، حالانکہ ۱۸۷۶ء کے دستور اساسی کے مطابق ان کا تقرر بھی صدر عظم کے حقوق میں داخل تھا، چنانچہ اسی بنا پر شیخ الاسلام جمال الدین آفندی نے ۲ اگست کو اپنے عہدہ سے استعفا دے دیا، اس کے بعد انجمن اتحاد و ترقی کے ممبروں کا ایک وفد صدر اعظم سعید پاشا کے پاس آیا اور اسے دفعہ زیر بحث کی خرابی کا ذمہ دار قرار دیتے ہوئے بتایا کہ جنگ و بحریہ کے محکمے جن کے افسران اعلیٰ کا تقرر سلطان نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے، اصلاح کے سب سے زیادہ محتاج ہیں، اس الزام کے بعد سعید پاشا نے صدارت سے علاحدہ ہو جانا منسب خیال کیا، اور ۵ اگست کو استعفا دے دیا، ساتھ ہی وزارت کے دوسرے ارکان بھی مستعفی ہو گئے، ۶ اگست کو سلطان نے کامل پاشا کو جو ایک معمر اور آزمودہ کار مدبر تھا اور اس سے قبل کئی بار صدر اعظم رہ چکا تھا، سعید پاشا کی جگہ مقرر کر کے ایک نئی وزارت قائم کرنے کا حکم دیا اور دوسرے وزیروں کی طرح وزیر جنگ اور وزیر بحریہ کے انتخاب کا اختیار بھی صدر اعظم ہی کو دے دیا، کامل پاشا نے اپنی کابینہ میں ایک یونانی اور ایک آرمینی وزیر کو بھی داخل کیا۔

نئی وزارت: نئی وزارت نے حکومت کے مختلف شعبوں میں اصلاحات کا کام شروع کر دیا اور اب ہر طرف ایک نئی روح محسوس کی جانے لگی، ان اصلاحات کا نتیجہ یہ ہوا کہ چند ہی دنوں میں حکومت کا اعتماد عیا کے دلوں میں قائم ہو گیا، ”انجمن اتحاد و ترقی“ کے ارکان میں بہت کم ایسے تھے جن کو نظم و نسق، فن سفارت (ڈپلومیسی) یا مالیات کا تجربہ تھا اور وہ اپنی اس کمی سے واقف بھی تھے، چنانچہ اس پر نظر رکھتے ہوئے انھوں نے حکومت کے سابق اعلیٰ عہدہ داروں کو اپنی جگہ پر برقرار رکھا اور ان کی لیاقت اور تجربہ سے فائدہ اٹھایا، البتہ ان عہدہ داروں کو جو دشت خواری میں مشہور تھے ہر طرف کر دیا، جو وہ برقرار رکھے گئے ان کی بھی سخت نگرانی کی جاتی تھی اور اگر وہ دستور اساسی کے خلاف کچھ بھی کرتے تو فوراً علاحدہ کر دئے جاتے تھے، جن کو یہ عہدہ دار حقیقتاً سلطنت کے خیر خواہ

تھے، اس لیے انجمن کو ان سے کام لینے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی، اس درمیان میں انجمن اپنے ارکان کی ایک جماعت کو انتظامی امور کی تعلیم دے کر حکومت کے مختلف محکموں کے لیے تیار کر رہی تھی، نوجوان ترکوں نے اپنی لیاقت کا سکہ بیرونی حکومتوں پر بھی بٹھادیا، انھوں نے دولِ عظمیٰ کو لکھا کہ مقدونیہ میں ان کی نگرانی کی اب مطلق ضرورت نہیں، چنانچہ یورپین افسرواپس بلا لیے گئے اور بین الاقوامی کمیشن برخواست کر دیا گیا۔

دستور اساسی کے اعلان اور پارلیمنٹ کے افتتاح کے درمیان چار مہینوں میں ”انجمن اتحاد و ترقی“ سلطنت کی حقیقی فرماں روا تھی، یہ جو احکام چاہتی سلطان سے صادر کراتی، فوجوں کی نقل و حرکت تمام تر اسی کے ہاتھ میں تھی، وزراء، صوبوں کے گورنر اور دوسرے اعلیٰ عہدہ دار اسی کے حکم سے مقرر یا معزول ہوتے تھے، مسٹر: نٹ لکھتے ہیں کہ ”انجمن کے ان نا تجربہ کار نوجوانوں نے ایک جدید نظام کو بروے کار لانے اور اپنے ملک کی ان کثیر التعداد خطرات سے حفاظت کرنے میں جن سے نئی حاصل کی ہوئی آزادی بربادی کی زد میں تھی ایسی دانشمندی، موقع شناسی، مہارت و فرست اور پیش بینی دکھائی کہ غیر ملکی اشخاص اس کا مشاہدہ کر کے حیرت زدہ رہ گئے، انھوں نے امن و امان کو مضبوطی کے ساتھ قائم رکھا اور اس چیز میں خود قوم کے شاندار ضبط نفس اور حسب وطن سے انھیں بڑی مدد ملی، اگرچہ وہ خود اور ان کے علاوہ ہزاروں آدمی استبداد اور اس کے کاسہ لیسوں کے مظالم اور غارت گری کا شکار رہ چکے تھے پھر بھی ان کی طرف سے انتقام کا کوئی جذبہ ظاہر نہیں ہوا، انھوں نے صرف ان لوگوں کو سزا نہیں دیں جن کے جرائم نہایت سخت تھے، انہی لوگوں کو برطرف کیا جنھوں نے اپنے افعال سے ظاہر کر دیا تھا کہ وہ دستور اساسی کے لیے خطرہ کا باعث ہیں، باقی سب کو صاف دلی سے معاف کر دیا، بیرونی طاقتوں سے ترکی کے تعلقات موقع شناسی اور مدبرانہ سیاست دانی کے ساتھ قیام کیے گئے، ان سے غلطیاں غیر معمولی طور پر کم ہو گئیں۔“ (۱)

انجمن اتحاد پر یورپ کا پہلا وار: لیکن نوجوان ترکوں کی صلح جوئی ان طاقتوں کی حرص و آرزو کم نہ کر سکی، جو دولت علیہ کی کمزوری سے فائدہ اٹھانے کے لیے ہر موقع پر تیار رہتی تھیں، دستوری اساسی کے اعلان کے بعد سلطنت کی تمام رعایا کو دستوری آزادی حاصل ہو گئی تھی مگر اس کے دوصوبے بوسنیا اور ہرزیگووینا جو تیس برس سے آسٹریا کی نگرانی میں تھے استبداد کی زنجیروں سے اب بھی رہا نہ ہوئے، حکومت آسٹریا ان صوبوں کو دستوری آزادی دینے پر راضی نہ ہوئی، چنانچہ جب ترکی پریس میں یہ تجویز پیش کی گئی کہ دستور کا نفاذ بوسنیا اور ہرزیگووینا میں بھی کر دیا جائے جو آسٹریا کی نگرانی کے باوجود سلطنت عثمانیہ کی فرماں روائی میں داخل ہیں تو آسٹریا کو سخت تشویش ہوئی اور اس نے یہ دیکھ کر کہ ترکی اس وقت مقابلہ کی قوت نہیں رکھتی اور ”انجمن اتحاد و ترقی“ ایک طاقتور سلطنت سے الجھ کر اپنے اقتدار کو خطرہ میں ڈالنا پسند نہ کرے گی، ۷ اکتوبر ۱۹۰۸ء کو دفعۃً ان صوبوں کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا، اس واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے مسٹر ٹائٹ لکھتے ہیں: ”یہ وہی پرانا قصہ تھا یعنی ایک رفعت پسند عیسائی حکومت اس خوف سے کہ ایک اصلاح شدہ ترکی کہیں ایک طاقتور ترکی نہ بن جائے، فریب کے ذریعہ سے اس کی راہ ترقی میں رکاوٹ پیدا کر رہی تھی، آسٹریا کے اس فعل نے رجعت پسندوں کو قدیم نظام حکومت کے ازسرنو قائم کرنے کا آخری موقع بہم پہنچایا اور انھوں نے اس موقع سے پور فائدہ اٹھایا“ (۱)

بوسنیا اور ہرزیگووینا کے الحاق سے دو ہی روز قبل مشرقی رومیلیا کے والی نے جو بلغاریا کا فرماں روا تھا، زار بلغاریا کا قدیم لقب اختیار کر لیا تھا، پھر ۱۲ اکتوبر کو کرینٹ نے بھی مملکت یونان سے اپنے الحاق کا اعلان کر دیا۔

انجمن کا سیاسی پروگرام: اس درمیان میں مجلس ملی (پارلیمنٹ) کے انتخابات کی تیاریاں ہو رہی تھیں، سلطنت کے ہر حصہ میں دستوری حکومت کے استقبال کے لیے انتہائی جوش و خروش کا اظہار کیا جا رہا تھا، انجمن اتحاد و ترقی نے ۲۳ دسمبر کو اپنا سیاسی پروگرام

شایع کیا جس کی پابندی انجمن کے امیدواروں پر جو منتخب ہو کر پارلیمنٹ میں جائیں عید کی گئی، اس پروگرام کی اہم دفعات حسب ذیل تھیں:

(۱) کاہینہ کو مجلس نائین (Chamber of Deputies) کا جواب دہ ہونا چاہیے۔

(۲) ترکی زبان بدستور سلطنت کی سرکاری زبان رہے گی۔

(۳) تمام قوموں کو مساوی حقوق حاصل ہوں گے۔

(۴) غیر مسلم بھی فوجی خدمت کے ذمہ دار ہوں گے۔

(۵) فوجی خدمت کی میعاد میں تخفیف کردی جائے گی۔

(۶) جن کسانوں کے پاس زمینیں نہیں ہیں انھیں زمینوں کے حاصل کرنے

میں مدد دی جائے گی مگر اس طرح کہ موجودہ زمینداروں کو نقصان نہ پہنچے۔

(۷) تعلیم بلا معاوضہ اور جبری ہوگی۔ (۱)

پارلیمنٹ کا افتتاح: ۱۰ دسمبر ۱۹۰۸ء کو سلطان عبدالحمید نے پارلیمنٹ کا افتتاح کیا اور اپنی تقریر میں دستور کے تحفظ کا وعدہ کیا، مجلس نائین میں عیسائی اور دوسری محکوم قوموں کے نمائندے بہت کافی تعداد میں منتخب ہو کر آئے تھے، ممبروں نے مجلس کی کارروائیوں اور اپنی تقریروں میں جس قابلیت کا ثبوت دیا، وہ انگلستان کے مدبروں کے لیے خلاف توقع ثابت ہوئی، سلطنت عثمانیہ کے باشندے ان کے خیال میں آئینی حکومت کے اہل نہ تھے، ترکی پارلیمنٹ نے اس غلط فہمی کو دور کر دیا۔

جوابی انقلاب: نوجوان ترکوں نے دستوری حکومت کو کامیاب بنانے کی انتہائی کوشش کی مگر تھوڑے ہی دنوں کے بعد رجعت پسندوں کی سازشیں رنگ لانے لگیں، انجمن اتحاد و ترقی نے پہلا کام یہ کیا تھا کہ جاسوسوں کی نبردست فوج کو جس پر بارہ لاکھ پونڈ سالانہ خرچ ہوتے تھے یک قلم برخاست کر دیا جس سے ہزاروں آدمی دفعۃً بے روزگار ہو گئے، یہ لوگ قدرتی طور پر انجمن کی مخالفت میں کوشاں تھے، علاوہ بریں نئی وزارت

نے مختلف شعبوں کی اصلاح کے سلسلہ میں سیکڑوں آدمیوں کو جو محض قصر یدیز کے زیر اثر مقرر کر دئے گئے تھے اور حقیقتاً بے ضرورت اور بے کار تھے نکال دیا تھا، انھوں نے بھی انجمن کی مخالفت پر کمر باندھ لی، ان کو رجعت پسند ملاؤں کی تائید حاصل تھی، ”جمعیت محمدیہ“ کے نام سے ایک نئی انجمن چند دنوں سے قائم کر لی گئی تھی، جس کا اثر مسلمانوں میں روز بروز زیادہ پھیلتا جا رہا تھا، یہ جمعیت اپنے کو دستوری حکومت کا حامی ظاہر کرتی تھی لیکن وہ تمام امور میں صرف شریعت اسلامی کا نفاذ چاہتی تھی اور اصولی شریعت کے خلاف کسی قانون کو گوارا نہیں کرتی تھی، یہ انجمن اتحاد و ترقی کی اس بن پر مخالف تھی کہ اس کے نزدیک انجمن کے ممبر جن میں فوج کے نوجوان افسر بھی شامل تھے، احکام قرآنی کے پابند نہ تھے اور اپنے غیر مذہبی طریقوں سے عوام کے لیے ایک بری مثال قائم کر رہے تھے، ایک طاقتور جماعت لبرل یونین کی تھی، جس میں مسلمان، عیسائی اور دوسرے فرقوں کے لوگ شامل تھے، اس کا مقصد یہ تھا کہ ہر فرقہ کو حکومت خود اختیاری کے حقوق دے دے جائیں کہ وہ جس طرح چاہے اپنے معاملات کا انتظام کرے، نوجوان ترک جن کا اصلی نصب العین اتحاد تھا، لبرل یونین کے نظریہ کو ملک کے لیے خطرناک سمجھتے تھے، ”انجمن اتحاد و ترقی“ کے مخالفوں میں ایک گروہ ایسے لوگوں کا بھی تھا، جن کو حقیقتاً مذہب سے سرد کار تھا نہ ملکی فلاح و بہبود سے بلکہ وہ دستوری حکومت کے اس وجہ سے دشمن تھے کہ اس میں ان کو رشوت ستانی اور مفت خوری کے وہ مواقع حاصل نہ تھے جن سے دور استبداد میں وہ پورا فائدہ اٹھا رہے تھے، نئی وزارت نے ایک غلطی یہ کی تھی کہ نہ صرف ان سیاسی قیدیوں کو رہا کر دیا تھا، جو سلطان کے حکم سے قید کیے گئے تھے بلکہ دوسرے شدید جرائم کے مجرموں کو بھی چھوڑ دیا تھا، یہ جرائم پیشہ گروہ رجعت پسندوں کے لیے ایک اچھا آلہ کار ثابت ہوا۔

غرض مخالف عناصر تیزی کے ساتھ جمع ہو رہے تھے، انجمن اتحاد و ترقی کو فوج پر پورا اتحاد تھا مگر رجعت پسندوں کی خفیہ کوششوں سے وہ بھی قدیم نظام حکومت کی حامی بن چکی تھی، انجمن کو اس کا علم اس وقت ہوا جب ۱۳ اپریل ۱۹۰۹ء کو قسطنطنیہ کے فوجی دستوں

میں دفعۂ بغاوت برپا ہو گئی، باغیوں میں کوئی لیڈر ایسا نہ تھا جو خاص شہرت یا اثر رکھتا ہو، سلطان عبدالحمید نے اس شورش میں بظاہر کوئی حصہ نہ لیا، تاہم ابتدا میں باغی کامیاب رہے، وزیروں، پارلیمنٹ کے ممبروں اور انجمن اتحاد و ترقی کے دوسرے ممبروں کو اپنی جان کی خاطر قسطنطنیہ سے بھاگنا پڑا، فوج نے پارلیمنٹ ہاؤس پر قبضہ کر لیا اور اپنے متعدد افسروں کو جو انجمن کے ممبر تھے قتل کر دیا، وزیر عدالت بھی قتل کر دیا گیا، وزیر بحریہ پر بھی گولی چلی مگر وہ زخمی ہو کر بچ گیا، اس کے علاوہ نو جوان ترکوں کی ایک بڑی تعداد ماری گئی، انجمن کے دشمنوں نے اس بغاوت کو گہرا اندہی رنگ دے دیا تھا، خالدہ ادیب خانم لکھتی ہیں کہ ”یہ بڑی خونریز اور ناپاک شورش تھی، بہت سے نو جوان محض اس لیے قتل کر دئے گئے کہ وہ کالر لگاتے تھے، کالر مذہب کی شدید مخالفت سمجھا جاتا تھا۔“

بغاوت کا استیصال: بغاوت کی خبر جب سالونیکا پہنچی تو انجمن اتحاد و ترقی نے فوراً محمود شوکت پاشا کو حوافج مقدونیا کے سپہ سالار تھے قسطنطنیہ کی طرف روانہ کیا، سان استیفانو کے مقام پر محمود شوکت کی ان وزیروں اور پارلیمنٹ کے ممبروں سے ملاقات ہوئی، جو قسطنطنیہ سے بھاگ کر آئے تھے، وہیں پارلیمنٹ کا اجلاس کیا گیا اور ممبروں نے متفقہ طور پر محمود شوکت پاشا کی یہ تجویزیں منظور کیں کہ فوجی قانون جاری کر دیا جائے، باغیوں کو سزائیں دی جائیں اور قسطنطنیہ کا فوجی دستہ توڑ دیا جائے، ۲۵ اپریل کو محمود شوکت پاشا اپنی فوج کے ساتھ قسطنطنیہ میں داخل ہوئے، پانچ گھنٹے کی سخت لڑائی کے بعد جس میں توپیں بھی چلیں، باغی فوج مغلوب ہوئی، بغاوت کے بانیوں کو سخت سزائیں ملیں، ان کے چالیس بڑے بڑے لیڈروں کو منظر عام پر پھانسی دے دی گئی۔

سلطان کی معزولی: ۲۷ اپریل کو مجلس ملی کا اجلاس منعقد ہوا اور سب سے پہلے اس کے سامنے یہ مسئلہ پیش ہوا کہ سلطان کے ساتھ کیا برتاؤ کرنا چاہیے، رائے عامہ کا فیصلہ یہ تھا کہ اس بغاوت میں درپردہ سلطان کی حمایت بھی شامل تھی، گو بظاہر اس نے باغیوں کو کسی طرح کی مدد نہیں دی تھی، شیخ الاسلام سے استفتا کیا گیا، اس نے معزولی کا فتویٰ دیا،

اس فتوے کے بعد مجلس ملی نے بالاتفاق سلطان کی معزولی کی تجویز منظور کر لی اور اپنے فیصلہ کی اطلاع دینے کے لیے ایک وفد قسریہ کو روانہ کیا، جو ابی انقلاب کی ناکامی کے بعد سلطان انجمن اتحاد و ترقی کے رحم و کرم پر تھا، اس نے مجلس ملی کے فیصلہ کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا اور خاموشی کے ساتھ تخت سے علاحدہ ہو گیا، دوسرے روز وہ سالونیکاروانہ کر دیا گیا اور وہاں ۱۹۱۸ء میں اپنی وفات تک نظر بند رہا، مجلس ملی نے اس کے بھائی شہزادہ محمد رشاد کو جو تیس سال سے نظر بندی کی زندگی بسر کر رہا تھا محمد خامس کے نام سے تخت پر بٹھایا۔



نوجوان ترک

دستوری حکومت کے پہلے دو مہینے عثمانی تاریخ میں یادگار رہیں گے، یہ وہ دور تھا جب سلطنت عثمانیہ کی تمام قومیں صرف ایک نصب العین رکھتی تھیں اور ان کے دل اتحاد و اخوت کے جذبات سے سرشار تھے، خالدہ ادیب خانم اپنے خطبات میں لکھتی ہیں: ”جس شخص نے ترکی کا وہ زمانہ دیکھا ہے اسے یاد کر کے بے چین ہو جاتا ہے، اس میں انقلاب فرانس کی سرمستیاں موجود تھیں مگر وہ خوریزیاں نہ تھیں، لوگ ایک دوسرے کے گلے کاٹنے کے بجائے فرط محبت سے گلے ملتے تھے“ (۱) لیکن اخوت و محبت کا یہ جوش جلد ٹھنڈا ہو گیا اور جب نوجوان ترکوں نے مختلف قوموں کو باہم متحد کر کے ایک عثمانی قوم کی تشکیل کرنی چاہی تو افتراق کے آثار پھر نمایاں ہونے لگے۔

اندرونی مخالفتیں، عیسائی: مخالفت سب سے پہلے عیسائیوں کی طرف سے شروع ہوئی، جدید دستور نے انھیں شہریت کے وہ تمام حقوق دے دیے تھے جو ترکوں کو حاصل تھے اور وہ ان حقوق سے پوری طرح فائدہ اٹھانا چاہتے تھے لیکن ان کی خواہش یہ تھی کہ شہریت کے ساتھ جو فرائض وابستہ ہیں ان سے بچتے رہیں، چنانچہ حکومت کی طرف سے فوجی خدمت عیسائیوں پر بھی عاید کی گئی جو صدیوں سے اس سے مستثنیٰ تھے تو ارباب کلیسا نے صدائے احتجاج بلند کی، ایک متحدہ قومیت کے نصب العین کو سامنے رکھ کر انجمن اتحاد و ترقی نے ابتدائی مدارس میں ترکی زبان کی تعلیم لازمی قرار دی تھی، پادریوں نے

اس پر ایک ہنگامہ برپا کر دیا کہ عیسائی بحیرہ ترک بنائے جا رہے ہیں، اصل یہ ہے کہ انقلاب کی سرمستیوں میں نوجوان ترک عیسائیوں کے حقیقی جذبات کا صحیح اندازہ نہ کر سکے، وہ اس جوش سے متاثر ہو گئے جو دفعۃً انقلاب کے انفسوں سے سلطنت کی تمام قوموں میں پھیل گیا تھا، انھوں نے یہ حقیقت نظر انداز کر دی کہ مقدونیا کی عیسائی رعایا میں قومیت کا جذبہ بڑی حد تک پیدا ہو چکا ہے اور یونانی، سربو، بلغاری ہر جماعت میں قومی حکومت قایم کرنے کا حوصلہ پوری طرح موجود ہے، مقدونیا کے سرحدی علاقے جو پہلے سلطنت عثمانیہ کے صوبے تھے اور بتدریج خود مختار ہوتے گئے تھے، ان قوموں کو دولت علیہ کے خلاف برابر ابھارتے رہتے تھے، نہ صرف یہ بلکہ یونان، سربو اور بلغاریا میں سے ہر ایک مقدونیا کے ان حصوں کو جن میں اس کے ہم قوم آباد تھے اپنی مملکت میں شامل کر لینا چاہتا تھا، انقلاب سے پہلے مقدونیا کی ساری بد امنی انہی حکومتوں کی سازشوں کا نتیجہ تھی، غرض دستوری حکومت کے قیام کے چند ہی ہفتوں بعد عیسائیوں نے ازسرنو شورش برپا کر دی اور بلقان کی خود مختار ریاستوں نے انھیں مدد پہنچانی شروع کی۔

غیر ترک مسلمان: عیسائیوں کے علاوہ غیر ترک مسلمان مثلاً عرب، البانی، کرد وغیرہ بھی انجمن اتحاد و ترقی کی حکومت کے خلاف تھے، ان میں بھی اپنی انفرادی قومیت کا قوی احساس موجود تھا اور وہ متحدہ عثمانی قومیت میں ضم ہونے کے لیے تیار نہ تھے، علاوہ بریں چونکہ سلطان سے انھیں بڑی بڑی رقبیں ملتی تھیں اور وہ محصلوں اور فوجی خدمتوں سے بری تھے، اس لیے نئی حکومت کی پالیسی جو سلطنت کی تمام قوموں کو ایک سطح پر رکھنے کا ہوتی تھی اور حقوق و فرائض میں کوئی تفریق جائز نہیں رکھتی تھی، ان کو نہایت گراں تھی، مخصوص رعایتوں اور شہانہ عطیوں کی وجہ سے ان کو جو وابستگی تھی وہ سلطان کی ذات سے تھی، چونکہ نئی حکومت نے سلطان کے اختیارات بہت محدود کر دیے تھے اس لیے یہ رعایتیں اور عطیے جاری نہیں رہ سکتے تھے، قدرتا یہ لوگ حکومت کے مخالف ہو گئے، ذاتی اغراض کی سطح سے بلند ہو کر متحدہ قومیت کے مسئلہ پر نظر کرنے کی اہلیت ان میں پیدا نہیں ہوئی تھی۔

ترک: خود ترکوں میں بھی ایک بڑی تعداد نئی حکومت کی مخالفت تھی، ان کا قدامت پسند طبقہ نو جوان ترکوں کی مغربی روش سے بیزار تھا، مذہبی جماعت کی ترجمانی جمعیۃ محمد کر رہی تھی، جاسوسوں کا گروہ جو انقلاب کے بعد بے روزگاری اور ذلت میں مبتلا ہو گیا تھا، انجمن اتحاد و ترقی کا دلی دشمن تھا اور یہ ہر اس جماعت کا ساتھ دینے کے لیے تیار تھا جو انجمن کی مخالفت میں قائم کی جائے، یہی حال ان سیکڑوں عہدہ داروں کا تھا جو دستوری حکومت کے قیام کے بعد بے کار محض ہونے کی وجہ سے برطرف کر دئے گئے تھے، جوابی انقلاب ان سب جماعتوں کی کوششوں کا نتیجہ تھا، محمود شوکت پاشا نے باغیوں کو سزائیں دے کر اس شورش کو فرو کر دیا تھا لیکن مخالفت کے عناصر اب بھی موجود تھے اور نئی حکومت کو گونا گوں دشواریاں پیش آرہی تھیں۔

بیرونی دشمن: اندرونی مخالفتوں اور سرحدی حکومتوں کی ریشہ دوانیوں کے علاوہ انجمن اتحاد و ترقی کو دولِ عظمیٰ کی مخالفت کا بھی سامنا کرنا پڑا، ان میں انگلستان کا طرزِ عمل سب سے زیادہ معاندانہ تھا، انگلستان کے اخباروں نے نئی حکومت کے خلاف زبردست پروپیگنڈا شروع کر دیا، حالاں کہ انقلاب سے پہلے تمام مغربی پریس عبد الحمید کی مخالفت اور دستوری حکومت کی تائید میں یک زبان تھا، خالدہ ادیب خانم نے آبرے ہر برٹ کی یہ رائے نقل کی ہے کہ انگلستان کی حریت پسند جماعت اصلاحات کو پسند کرتی ہے مگر اسے انقلاب سے نفرت ہے، وہ لکھتا ہے: ”نو جوان ترکوں کی مخالفت میں اتنی قوتیں جمع ہو گئی تھیں کہ اگر ان کے لیڈران بلند اصولوں پر جن کے وہ مدعی تھے استقلال کے ساتھ عمل بھی کرتے، تب بھی اس کا امکان نظر نہیں آتا تھا کہ وہ ترکی کی تجدید کی کوشش میں کامیاب ہوں گے، یورپ ترکی کو اپنے دستِ نگر کی حیثیت سے پسند کرتا تھا، مد مقابل کی حیثیت سے نہیں۔“ (۱)

روس اور آسٹریا کی اسکیم: مغربی حکومتوں کی روش سے آبرے ہر برٹ کی رائے کی

تقدیق پوری طرح ہوتی ہے، نوجوان ترکوں کے جوشِ عمل سے ان حکومتوں کو یہ خطرہ محسوس ہونے لگا تھا کہ سلطنت عثمانیہ میں کہیں اتنی قوت پھر نہ پیدا ہو جائے کہ اس کے حصے بخرے کرنے کے منصوبے یوں ہی رہ جائیں، چنانچہ ۱۵ ستمبر ۱۹۰۸ء کو روس اور آسٹریا کے وزراء نے مل کر ایک سکیم مرتب کی جس کے رو سے دردنیل اور آبنائے باسفورس روی منطقہ میں رکھے گئے اور بلغاریا روسی حلقہ اثر میں داخل کیا گیا، مقدونیا آسٹریا کے منطقہ میں رکھا گیا اور سرویا آسٹریا کے حلقہ اثر میں داخل کیا گیا، البانیا اطالوی منطقہ میں رکھا گیا اور یونان اطالوی حلقہ اثر میں داخل کیا گیا (۱)، اس سکیم کا عملی نتیجہ چند ہی دنوں کے بعد یہ ظاہر ہوا کہ ۵ اکتوبر کو پرنس فرڈیننڈ نے جو دولت عثمانیہ کے زیر سیادت اپنے ملک کا حکمران تھا کامل خود مختاری کا اعلان کر کے زار بلغاریا کا قدیم لقب اختیار کر لیا، اس کے دو روز بعد ۷ اکتوبر کو آسٹریا ہنگری نے بوسنیا اور ہرزیگووینا کے صوبے اپنی سلطنت میں شامل کر لیے پھر ۱۲ اکتوبر کو کریت کی مجلس ملی نے یونان سے الحاق کی قرارداد منظور کر کے اس کا اعلان کر دیا۔

بلغاریا: معاہدہ برلن کے رو سے بلغاریا دولت عثمانیہ کی ایک باج گزار مملکت تھی اور اس کے حکمرانوں کا تقرر سلطان کی نامزدگی سے عمل میں آتا تھا لیکن حقیقتاً بلغاریا کی خود مختاری ایک امر واقعہ بن چکی تھی اور ارباب اتحاد و ترقی کو امید نہ تھی کہ وہ اسے دوبارہ سلطنت عثمانیہ کے زیر نگین لاسکیں گے، انھوں نے حالات کا اندازہ کر کے یہی مناسب خیال کیا کہ معاوضہ لے کر حقوقِ سیدت سے دست بردار ہو جائیں، باب عالی کی طرف سے جس رقم کا مطالبہ کیا گیا بلغاریا اسے دینے پر راضی نہ تھا، لیکن روس نے جو بلغاریا کو اپنے سایہ عاطفت میں لے چکا تھا، اپنے مطالبہ کی رقم سے جو اس کے نزدیک بطور سابق تاوانِ جنگ سلطنت عثمانیہ کے ذمہ واجب الادا تھی، وہ رقم محسوب کر دی جس پر آ کر معاہدہ رک گیا تھا اور فریقین میں صلح کرا دی، چنانچہ اپریل ۱۹۰۹ء میں باب عالی اور

بلغاریا کے درمیان صلح نامہ پر دستخط ہو گئے اور سلطان نے بلغاریا کے کامل حقوق فرما دیے۔

بوسنیا و ہرزیگووینا: بوسنیا اور ہرزیگووینا کے صوبے برلن میں آسٹریا ہنگری کے سپرد کیے گئے تھے لیکن انھیں سلطنت میں شامل کرنے کی ممانعت کر دی گئی تھی، تیس برس سے عملاً وہ آسٹریا ہنگری کے زیر حکومت تھے جب تک عثمان سلطان عبدالحمید کے ہاتھ میں رہی، یورپ کی تمام وزارتیں اس کی سیاسی چالوں سے خائف رہتی تھیں، چنانچہ اتنے طویل قبضہ کے بعد بھی آسٹریا ہنگری نے ان صوبوں کو اپنی سلطنت میں شامل کرنے کی جرات نہیں کی، لیکن جب نوجوان ترک برسرِ اقتدار ہوئے اور خود ترکی کے اندر مخالفوں کا زور شروع ہوا تو آسٹریا ہنگری نے بھی موقع سے فائدہ اٹھا کر دونوں صوبوں کو بے تکلف اپنی سلطنت میں شامل کر لیا، باب عالی نے سخت احتجاج کیا لیکن چونکہ فوجی قوت کافی نہ تھی، اس لیے بالآخر صلح کر لینی پڑی، آسٹریا ہنگری نے بائیس لاکھ پونڈ نقد معاوضہ کے علاوہ نووی بازار کا علاقہ ترکوں کے حق میں واگذار کر دیا، جس پر ۱۸۷۸ء کے بعد سے اب تک اس کا فوجی قبضہ چلا آتا تھا۔

طرابلس: ان دست درازیوں کا سلسلہ یہیں تک ختم نہ ہوا، انیسویں صدی کا زمانہ یورپ کے صنعتی انقلاب کا زمانہ تھا اور صنعت و حرفت کی ترقی نے ملکی مصنوعات کے لیے نئے بازاروں کی ضرورت پیدا کر دی تھی، افریقہ کی ساحلی حکومتیں جو پہلے سلطنت عثمانیہ میں شامل تھیں لیکن بعد میں سلطنت کی کمزوری سے رفتہ رفتہ خود مختار ہوتی گئیں، اس مقصد کے لیے مغربی حکومتوں کی توجہ کا مرکز بن گئی تھیں، چنانچہ فرانس نے الجزائر اور تونس پر قبضہ کر لیا اور انگلستان نے مصر میں اپنا تسلط قائم کیا، ۱۹۰۴ء میں فرانس اور انگلستان کے درمیان ایک معاہدہ ہوا جس میں یہ طے پایا کہ انگلستان مصر پر بلا شرکت غیرے قابض رہے گا اور اس کے معاوضہ میں فرانس کو مراکش کی مملکت پر جو اس وقت تک آزاد تھی قبضہ کرنے میں مدد دے گا، اب افریقہ کی ساحلی حکومتوں میں صرف طرابلس

رہ گیا تھا جو مغربی طاقت کے بچہ میں نہیں آیا تھا، اس کی وجہ زیادہ تر یہ تھی کہ طرابلس ایک ریگستانی علاقہ تھا، جس میں کہیں کہیں نخلستان نظر آ جاتے تھے، اس کے ساحل پر کوئی بندرگاہ نہ تھی اور اس پر حکومت کرنے میں جو مصارف برداشت کرنے پڑتے ان کے معاوضہ کی کچھ زیادہ توقع نہ تھی یہی سبب تھا کہ فرانس اور انگلستان نے کبھی اس کی جانب توجہ نہیں کی، لیکن اٹلی جو نوآبادیات کے میدان میں ان دونوں سلطنتوں سے بہت پیچھے تھا اور ۱۸۸۱ء میں تونس پر فرانس کو قبضہ کرتے ہوئے دیکھ کر بیچ و تاب کھا کر رہ گیا تھا، اس کی نظر میں طرابلس ہی غنیمت معلوم ہوا، چنانچہ اطالوی وزارت خارجہ نے سلطان عبدالحمید کے عہد ہی میں یورپین حکومتوں سے یہ تسلیم کر لیا تھا کہ جب سلطنت عثمانیہ کے مقبوضات تقسیم ہونے لگیں گے تو طرابلس اٹلی کو دے دیا جائے گا، اس باب میں اٹلی نے متعدد معاہدوں کی بنا پر اپنا حق یہاں تک تسلیم کر لیا تھا کہ ۱۹۰۸ء کے انقلاب عثمانی کے وقت تمام یورپین طاقتوں نے یہ سمجھ رکھا تھا کہ اسے جس وقت موقع ملے گا وہ فوراً طرابلس پر قبضہ کر لے گا اور یورپ کی کوئی حکومت اعتراض نہ کرے گی۔ (۱)

بیسویں صدی کے آغاز میں طرابلس سلطنت عثمانیہ کا ایک صوبہ تھا اور براہ راست باب عالی کے زیر حکومت تھا، اس کو حکومت خود اختیاری کے حقوق کبھی حاصل نہ تھے جیسا کہ افریقہ کے دوسرے صوبوں نے حاصل کر لیے تھے، اس کی آبادی تمام تر مسلمانوں پر مشتمل تھی، شہر طرابلس اور دوسرے ساحلی مقامات پر ترک اور مور آباد تھے اور اندرونی علاقوں میں نیم آزاد عرب قبائل تھے، یہاں کے باشندوں نے حکومت کی تبدیلی کی کبھی خواہش نہیں کی اور اٹلی کو ان کی طرف سے کسی شکایت کا موقع نہیں ملا، لارڈ ایورسلے جس کے قلم سے ترکوں کی حمایت میں ایک لفظ بھی مشکل سے نکلتا ہے اعتراف کرتا ہے کہ ”طرابلس پر اٹلی کا حملہ تمام تر ایک جارحانہ فعل تھا، جس کی تحریک اس وجہ سے ہوئی کہ فرانس نے تونس پر قبضہ کر لیا تھا، جس پر جغرافیائی اور معاشیاتی دونوں

حیثیتوں سے اٹلی کا حق زیادہ مضبوط تھا، لیکن جمہوریہ فرانس اور برطانیہ عظمیٰ اٹلی کے اس فعل سے متفق ہو گئیں اور (یورپ کی) دونوں مرکزی سلطنتیں بھی اس وقت تک اٹلی کی حلیف تھیں۔“ (۱)

جنگ طرابلس: ۱۹۱۰ء کے اختتام تک حکومت اٹلی برابر یہ اعلان کرتی آئی تھی کہ وہ سلطنت عثمانیہ کے کسی حصہ کی خواہش مند نہیں ہے، جب یہ افواہ پھیلی کہ وہ طرابلس پر قبضہ کرنا چاہتی ہے تو اس کے وزیر خارجہ نے ۲ دسمبر ۱۹۱۰ء کو اطالوی پارلیمنٹ میں اس کی پرزور تردید کی اور کہا کہ ”ہم سلطنت عثمانیہ کی بقا و سلامتی کے خواہش مند ہیں اور ہم چاہتے ہیں کہ طرابلس ہمیشہ ترکوں کے قبضہ میں رہے۔“ لیکن اس اعلان پر دس مہینے بھی نہیں گزرے تھے کہ حکومت اٹلی نے دفعہ باب عالی کو الٹی میٹم دے دیا حالانکہ اس درمیان میں فریقین کے تعلقات میں مطلق کشیدگی نہیں پیدا ہوئی تھی اور جواب کا انتظار کیے بغیر پچاس ہزار فوج طرابلس پر حملہ کرنے کے لیے روانہ کر دی، اس کے جنگی جہازوں نے پر یوپیسا کے شہر پر گولہ باری شروع کر دی جو بحریڈریاٹک کے ساحل پر ترکوں کا مقبوضہ تھا اور بحرائحین کے متعدد جزیروں پر قبضہ کر لیا، ترکی جہازوں نے دردنیاں میں پناہ لی، اٹلی کے مقابلہ میں ترکی جہازوں کی حیرت انگیز شکست کا سبب یہ تھا کہ سلطان عبدالحمید نے اپنے عہد حکومت میں بحریہ کی طرف مطلق توجہ نہیں کی تھی اور چونکہ ۱۸۷۶ء کے بعد سے کسی بحری طاقت سے جنگ کی نوبت نہیں آئی تھی، اس لیے مدت سے ترکی جہاز شاخ زریں سے باہر بھی نہیں نکلے تھے، اگر عبدالحمید نے بحریہ کی طرف کچھ بھی توجہ کی ہوتی تو اٹلی کا طرابلس پر قابض ہو جانا قطعاً ناممکن تھا، کیونکہ سلطان عبدالعزیز نے عثمانی بیڑے کو اتنا طاقتور بنا دیا تھا کہ وہ اُس زمانہ میں یورپ میں تیسرے نمبر پر شمار ہوتا تھا، طرابلس کے فوجی دستے کی تعداد صرف بیس ہزار تھی، چونکہ سمندر پر اطالوی جہازوں کا قبضہ تھا، اس لیے جنگ شروع ہو جانے کے بعد بحری راستہ سے فوجی کمک بھی نہیں

پہنچائی جاسکتی تھی، بری راستہ مصر کا تھا جو اس وقت تک سطنت عثمانیہ کے زیر سیادت اور اس کا باج گذارتھا، لیکن مصر پر انگریزی تسلط قیام ہو چکا تھا اور حکومتِ برطانیہ نے ان سابق معاہدوں کی بنا پر جو طرابلس کی نسبت اٹلی سے ہو چکے تھے، مصر کی غیر جانبداری کا اعلان کر کے اس کی راہ سے ترکی فوجوں کو طرابلس جانے سے روک دیا، ان تمام مشکلات کے باوجود نو جوان ترکوں نے ایسی شجاعت سے حملہ آوروں کا مقابلہ کیا کہ وہ سراسیمہ ہو گئے، عرب قبائل جس جاں فروشی کے ساتھ وطن کی ایک ایک انچ زمین کے لیے آخر تک لڑتے رہے وہ ہمیشہ یادگار رہے گی، اگرچہ بیرونی امداد کی تمام راہیں مسدود تھیں، تاہم اعلانِ جنگ کے چند ہی دنوں بعد انور بے کسی طرح پوشیدہ طور پر طرابلس پہنچ گئے تھے اور انھوں نے اپنی حیرت، انگیز قابلیت سے پورے ملک کو فوجی کمپ بنا دیا تھا، الہلالِ کلکتہ نے ان کے عجیب و غریب کارناموں کی جو تفصیل بیان کی ہے، اس کا ایک ٹکڑا ذیل میں درج ہے۔

انور بے: انور بے نے طرابلس میں قدم رکھنے کے بعد اطراف و جوانب کے قبائل میں دعوتِ جہاد شروع کر دی اور چند دنوں کے بعد جنودِ الہی کی عظیم الشان صفیں اس کے یمن و یسار نیزے بلند کیے ہوئے چلی آ رہی تھیں، وہی تن تنہا فردِ مقدس دشمن کے بے شمار لشکر کے سامنے حریفانہ و مساویانہ آ کر کھڑا ہو گیا اور پھر پورے نو مہینوں کے اندر ایک دن بھی شکست و ہزیمت اس کے دامنِ عزت پر دھبہ نہ لگا سکی، تمام اہل عرب جن کو عثمانی خلافت کا قدیمی مخالف سمجھا جاتا تھا اوامرِ سلطانی کے آگے پوری اطاعت و فرماں برداری کے ساتھ جھک گئے اور آج عثمانی فوج کے مفہوم میں بلا کسی اختلاف و شبہ کے عربی افواج داخل ہیں، عربی فوج کے مرتب کرنے میں جو مشکلیں اجتماع کے بعد پیش آئیں وہ ابتدائی مشکلات سے کم نہ تھیں، سب سے پہلی مشکل مختلف قبائل کی عربی عصبيت اور ان کی باہمی بنص و مخالفت تھی، جو نسلاً بعد نسل قدیم سے چلی آتی ہے، انور بے نے تمام قبیلوں کو مختلف موثر اور دل میں اتر جانے والے طریقہ سے سمجھا کر (جو اس اعجازِ آفریں سحر بیان کا

وصف مخصوص ہے) ان میں باہم رشتہ داریاں قائم کر دیں اور اس طرح اس دعوت جہاد کی بدولت صدیوں کی عداوت اور دشمنیاں عہد اخوت و مودت سے بدل گئیں، دوسری مشکل قبائل کی بے نظمی اور اصول جنگ سے ناواقفیت تھی، غازی انور بے نے بغیر اس کے کہ ایک لمحہ بھی فکر و تردد میں ضائع کرتے فوراً تمام قبائل کو چند پلٹنوں میں تقسیم کر دیا اور ہر پلٹن کی تعلیم کے لیے ایک افسر مقرر کر کے شب و روز قواعد کرائی شروع کرادی، خود عربوں نے جب معلوم کر لیا کہ بغیر ان قواعد کے سیکھے ہم دشمنوں کے حملہ کا جواب نہ دے سکیں گے اور ان کی ابتدائی دست برد کا انتقام نہیں لیا جاسکے گا تو خود ان کے اندر جوش و غیرت نے ایک ایسی خارق عادت ذہانت اور قوت اخذ و تحصیل پیدا کر دی کہ مہینوں کی مشق ایک چوبیس گھنٹے کے اندر حاصل کرنے لگے، قبائل کی باہمی رقابت سے بھی اس موقع پر بڑی مدد ملی، انور بے نے اعلان کر دیا کہ جو قبیلہ پہلے قواعد جنگ کے امتحان میں کامیاب ثابت ہوگا، اس کو عزت و ناموری کے نشان کے طور پر ایک طلا کار اطلس کا علم دیا جائے گا، یہ سنتے ہی ہر قبیلہ مسابقت کی کوشش کرنے لگا اور شب و روز پورا وقت فوجی نقل و حرکت اور قواعد کے سیکھنے اور مشق میں صرف ہونے لگا، اسی اثنا میں جب اطالویوں کی براتوں نے ایک دو قدم آگے بڑھائے اور ہم کے گولے بکثرت آنے لگے تو قبیلہ حسانے ایک دم ہجوم کر کے ہلہ کر دیا اور سیکڑوں اطالویوں کو تلوار کے گھاٹ اتار کر بقیۃ السیف کو کوسوں دور بھگا دیا، انور بے نے اس کارنامہ کی بڑی قدر کی اور اس قبیلہ کو اپنا وضع کردہ نشان عزت (اطلسی علم) عطا فرمایا، دوسرے قبائل نے جب قبیلہ حسا کے خیموں پر اس طلا کار علم کو لہراتے دیکھا تو انور بے کے پاس دوڑے ہوئے آئے اور کہا کہ ہم کو بھی موقع دیا جائے کہ اس علم کے لینے کا استحقاق ثابت کریں، رات کے وقت جب اٹالین کمپ طرابلس پر قابض ہونے کی خوشی میں بکثرت شراب پی کر بدست پڑا تھا ایک عرب قبائل کے صحرائی نعروں کی گونج سے ایک زلزلہ عظیم محسوس ہوا چند لمحوں کے اندر بے تحاشا بھاگ گئے اور پورا اٹالین کمپ خالی ہو گیا، اطالویوں کے

جبیں ونامردی نے اہل عرب کو ان کے اولین حملہ ہی میں فتح و نصرت کی ایسی چاٹ لگا دی کہ اب میدان قتال ان کے لیے بچوں کا کھیل بن کر رہ گیا، بغیر کسی نقصان کے انھوں نے کھیلتے کودتے ایک پوری اٹالین پلٹن برباد کر دی اور بکثرت مال غنیمت ساتھ لیے ہوئے اور وطنی گیت گاتے ہوئے عثمانی کیمپ میں واپس آ کر اپنی فتوحات ڈھیر کر دیں، اس مال غنیمت میں آٹھ سو سے زیادہ تو بندوقیں تھیں اور اور قسم کی اشیاء اس کے علاوہ، ان بندوقوں کی لوٹ سے انور بے بہت خوش ہوئے، کیوں کہ عمدہ اسلحہ کی کمپ میں بہت کمی تھی، انور بے نے حکومت کے نام سے فوراً ان کا نیلام کر دیا اور وہ دو دو عثمانی گنی پرفروخت کر دی گئیں، اس خدمت کے صلہ میں ان کی آرزوے دلی کے مطابق طلا کاراطلسی علم ان کو عطا کیا گیا، اس کے بعد تو ہر قبیلہ اس علم کے لیے اٹھنے لگا اور دشمن پر برق ہلاکت بن کر گرنے لگا، ہر قبیلہ کی کوشش ہوتی کہ دوسروں سے زیادہ تعداد میں دشمنوں کو قتل کریں اور سب سے زیادہ مال غنیمت انور بے کے سامنے انبار کر سکیں، تاکہ شجاعت و وطن پرستی کا اعلیٰ سے اعلیٰ نشان اور تمغہ صرف ہمیں کو حاصل ہو، یہاں تک کہ تھوڑے ہی عرصہ کے اندر عثمانی کیمپ میں پندرہ ہزار سے زیادہ قیمتی اور جدید ایجاد کی بندوقیں جمع ہو گئیں۔“ (۱)

صلح نامہ لوزان: اطالوی اس صورت حال سے بدحواس ہو گئے، انھوں نے شجاعت کا جواب درندگی سے دینا شروع کیا اور ایسے مظالم کیے کہ خود یورپین نامہ نگاروں نے جوانالین فوج کے ساتھ طرابلس میں تھے ان کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی، لیکن جب اس سے بھی کام نہ چلا تو وہ زیادہ زور بحری جنگ پر دینے لگے، چنانچہ مئی ۱۹۱۲ء میں روڈس اور بعض دوسرے جزائر اٹکین پر قبضہ کر لیا، انھیں توقع تھی کہ ترک اب آسانی کے ساتھ صلح کے لیے راضی ہو جائیں گے، لیکن ترکوں نے صلح کرنے سے قطعی طور پر انکار کر دیا، وہ اس وقت تک جنگ کو جاری رکھنے کا عزم کر چکے تھے جب تک دشمنوں کو شکست دے کر بھاگ نہ دیں، لیکن بد قسمتی سے اس درمیان میں البانیا میں بغاوت برپا ہو گئی

اور پھر بلقان کے افق سے ایک متحدہ اور خوفناک جنگ کے بادل اٹھتے ہوئے دکھائی دینے لگے، ان حالات کے پیش نظر باب عالی نے بادل ناخواستہ صلح کی گفتگو شروع کی اور ۱۸/ اکتوبر ۱۹۱۲ء کو صلح نامہ لوزان پر محاربین کے دستخط ہو گئے، طرابلس پر اٹلی کا قبضہ تسلیم کر لیا گیا، اٹلی نے وعدہ کیا کہ بحر اٹھین کے مفتوحہ جزائر دولت علیہ کو واپس کر دے گا لیکن یہ وعدہ کبھی شرمندہ ایفانہ ہوا۔

بلقانی ریاستوں کا اتحاد: جس خطرہ کو محسوس کر کے ترکوں نے اٹلی سے صلح کی تھی وہ بہت جلد سامنے آ گیا، ریاستہائے بلقان نے تاریخ میں پہلی بار متحدہ ہو کر سلطنت عثمانیہ کے خلاف اعلان جنگ کر دیا، ”جنگ بلقان“ بقول خالدہ ادیب خانم ”گویا جنگ عظیم کی ایک مشق تھی، دونوں کی تیاری اور تحریک میں روس کے وزیر خارجہ اسولسکی کی عقل شیطانی کار فرما تھی۔“

بلقان کی مسیحی ریاستوں کو متحد کرنے کی کوشش ”صلح نامہ برلن“ کے بعد کئی باری جا چکی تھی، لیکن ان کی باہمی رقابتوں نے کبھی اسے کامیاب نہ ہونے دیا، ۱۸۸۵ء میں بلغاریا کی توسیع مملکت پر سربو یا کی آتش حسد اور بھی مشتعل ہو گئی تھی، جو میدان جنگ میں شکست کھانے کے بعد بدستور قائم رہی، ۱۸۹۱ء میں یونانی وزیر اعظم ٹریکوپس نے بلغاریا اور صوفیا جا کردونوں ریاستوں میں اتحاد کی پھر کوشش کی اور سربو یا میں اس کی تجویز پسند نہ کی گئی لیکن بلغاریا کا وزیر اعظم اسامبولوف باب عالی سے لڑنے پر آمادہ نہ ہوا جس کی وجہ سے یہ تحریک آگے نہ بڑھ سکی، ریاستہائے بلقان کے اتحاد میں اب سے بڑی رکاوٹ ان رقبہ بانہ اغراض سے پیدا ہو گئی تھی، جن کا تعلق مقدونیا سے تھا، مقدونیا میں بلغاری، سربو اور یونانی عیسائی کثرت سے آباد تھے، یہ ریاستیں مقدونیا کے ان حصوں پر قبضہ کر لین چاہتی تھیں، جہاں کے باشندے ان کے ہم قوم تھے، بلغاریا چاہتا تھا کہ مقدونیا میں حکومت خود اختیاری قائم کر دی جائے، اسے امید تھی کہ ایسا ہو جانے سے بالآخر مقدونیا کا بڑا حصہ اس کی مملکت میں شامل کیا جاسکے گا، سربو یا اور یونان مقدونیا کی تقسیم کے

خواہاں تھے کیوں کہ بلغاریا کے مقابلہ میں ان کو مقدونیا کے کسی بڑے حصہ کے ملنے کی توقع نہ تھی۔ (۱)

نوجوان ترکوں نے دستوری حکومت قائم کرنے کے بعد سلطنت کی تمام قوموں کو مساوی حقوق دے دئے تھے، انھوں نے ترک و عرب، یونانی و بلغاری، سری و البانی مسلمان و عیسائی کی تفریق مٹا دی چاہی اور ان سب کے بجائے ایک متحدہ عثمانی قومیت پیدا کرنے کی کوشش کی، انقلاب سے پہلے انجمن اتحاد و ترقی کا یہ نصب العین عیسائی رعایا کی نگاہوں کو بھی خیرہ کر رہا تھا اور سلطان عبدالحمید کے استبداد کو ختم کر کے جب دستوری حکومت کا اعلان کیا گیا تو عیسائیوں نے ترکوں سے بھی زیادہ جوش و سرور کے ساتھ اس کا استقبال کیا، لیکن تھوڑے ہی دنوں میں ظاہر ہو گیا کہ ان کی اصلی غرض و غایت کیا ہے، وہ حقوق کے لینے کے لیے تو سب سے پہلے بڑھے مگر جب فرائض کی انجام دہی کا وقت آیا جو حقوق کے ساتھ لازمی طور پر وابستہ تھے تو گریز کرنے لگے، چنانچہ نئی حکومت نے فوجی خدمت جب عیسائیوں پر بھی عاید کی جس سے اب تک وہ بری تھے تو انھوں نے اسے جبر و تشدد سے تعبیر کیا اور مسیحی طاقتوں کو مدد کے لیے پکارنا شروع کیا۔

روس کی سازشیں: سلطنت عثمانیہ کے خلاف ہر اقدام کے لیے روس ہمیشہ تیار رہتا تھا مقدونیا کی روش اور بقیانی ریاستوں کے حوصلوں نے اس کے۔ یہ ایک امید افزا موقع بہم پہنچایا، اس کا وزیر خراجہ اسوولسکی اس بات پر زور دے رہا تھا کہ روس بلقان میں پیش قدمی کر کے آبنائے باسفورس اور قسطنطنیہ پر قبضہ کر لے مگر اس کے لیے برطانیہ اور فرانس کی رضامندی ضروری تھی۔ چنانچہ برطانیہ کو راضی کرنے کے لیے اس نے ۱۹۰۷ء میں جاپان سے صلح کر لی، اسی سال افغانستان، تبت اور ایران کے بارے میں بھی روس اور برطانیہ کے درمیان ایک معاہدہ ہو گیا جس میں یہ طے پایا کہ افغانستان اور تبت سے کوئی تعرض نہ کیا جائے ورا ایران کو دوداروں میں تقسیم کر کے ایک میں روس اور دوسرے میں برطانیہ کا

اثر تسلیم کر لیا گیا، اس کے علاوہ روس اس بات پر بھی راضی ہو گیا کہ برطانیہ کی دوستی کی خاطر جرمنی کو ہر طرف سے گھیر لے گا لیکن ان سب کے باوجود وہ آبنائے باسفورس کے قبضہ پر برطانیہ کو راضی نہ کر سکا، ادھر سے مایوس ہو کر اسودلسکی نے آسٹریا کو اپنا طرفدار بنانے کی کوشش کی اور ۱۹۰۸ء میں آسٹریا کے وزیر خارجہ کاونت ارنیٹھال سے ملاقات کر کے یہ تجویز پیش کی کہ اگر آسٹریا روس کو آبنائے باسفورس پر قبضہ کر لینے دیں تو روس آسٹریا کا قبضہ بونیا اور نووی بازاری پر تسلیم کر لے گا، آرنیٹھال نے یہ تجویز اس شرط پر منظور کر لی کہ بلغاریا اور رومانیہ کو بھی باسفورس میں حقوق دئے جائیں، اٹلی سے طرابلس پر سودا ہو گیا، اسودلسکی کی یہ تجویزیں ابھی یوروپین وزارتوں میں زیر غور تھیں کہ آسٹریا نے بونیا اور ہرزگووینا پر اٹلی نے طرابلس پر قبضہ کر لیا، اس کے معنی یہ تھے کہ یہ حکومتیں آبنائے باسفورس پر روسی قبضہ کی مخالفت نہ کریں گی لیکن چونکہ برطانیہ اور فرانس کی منظوری کے بغیر یہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا تھا اور یہ دونوں کسی طرح راضی نہیں ہوتے تھے، اس لیے اسودلسکی نے اب یہ تدبیر سوچ لی کہ بلقانی ریاستوں کو متحد کر کے ترکوں کو بلقان سے نکال دے اور پھر خود آبنائے باسفورس اور قسطنطنیہ پر قبضہ کر لے (۱) چنانچہ اسی کی کوشش سے مارچ ۱۹۱۲ء میں سرویا اور بلغاریا میں ترکی کے خلاف ایک معاہدہ ہوا، اسودلسکی نے اس معاہدہ کی اطلاع فرانسیسی وزیر خارجہ موسیو پوانکارے کو دی اور لکھا کہ ابھی یہ کسی پر ظاہر نہ کیا جائے، بلغاریا کو اٹھارہ کروڑ فرانک سامان جنگ فراہم کرنے کے لیے قرض دیا گیا (۲) اس معاہدہ کی ایک خفیہ دفعہ کے رو سے یہ طے پایا کہ اگر مقدونیا کا کوئی حصہ فتح ہو جائے تو جو علاقے ان دونوں ریاستوں سے متصل واقع ہیں وہ ان میں شامل کر دئے جائیں اور درمیانی عمارتوں کی تقسیم روس کے فیصلہ پر چھوڑ دی جائے (۳) روس ہی کی وساطت سے مئی ۱۹۱۲ء میں یونان اور بلغاریا کے درمیان بھی ایک معاہدہ ہو گیا، یہ سرویا اور بلغاریا کے معاہدہ سے ایک خاص امر میں مختلف تھا یعنی اس میں مقدونیا

کی تقسیم کا کوئی ذکر نہ تھا (۱) پھر ستمبر ۱۹۱۲ء میں سرویا اور مونٹی نگرو کے درمیان بھی ایک معاہدہ ہوا جس میں طے پایا کہ فریقین ترکی سے علاحدہ علاحدہ جنگ کریں اور کسی ترکی شہریا گاؤں پر سرویا اور مونٹی نگرو کی فوجیں متحدہ طور پر قابض نہ ہوں۔

البانیا کی بغاوت: ان معاہدوں کے بعد اتحادی چاہتے تھے کہ جنگ جلد شروع کر دیں، طرابلس کی جنگ جاری تھی اور وہ اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے، دوسری طرف البانیا کی بغاوت سے مقدونیا کی تقسیم کا مسئلہ جو اس اتحاد کی اصلی غرض و غایت تھی بہت مشکل ہوتا نظر آ رہا تھا، البانیا کا مطالبہ حکومت خود اختیاری تھا، وہ سقوطی، یانینا، مناسٹر اور تو صوہ کی ولایتوں کو متحد کر کے دولت علیہ کے زیر سیادت ایک خود مختار مملکت قائم کرنا چاہتا تھا، ابتدا میں انجمن اتحاد و ترقی نے البانیا کی بغاوت کی طرف زیادہ توجہ نہیں کی، لیکن جب سلطنت کی فوج نے بھی جو البانیا میں تھی باغیوں کا ساتھ دینا شروع کیا اور جون ۱۹۱۲ء میں مناسٹر کے فوجی دستہ نے علانیہ بغاوت کر دی اور موجودہ وزارت کے توڑ دینے کا مطالبہ کیا تو البانیا کا مسئلہ اپنی پوری اہمیت کے ساتھ حکومت کے سامنے آیا، نتیجہ یہ ہوا کہ جولائی میں محمود شوکت پاشا نے استعفا دے دیا اور ان کی جگہ ناظم پاشا جو انجمن اتحاد و ترقی کا شدید مخالف تھا وزیر جنگ مقرر ہوا، اگست میں علمی پاشا صدر اعظم کو بھی استعفا دینا پڑا، باغیوں کی یہ کامیابی دیکھ کر بلقانی ریاستوں کو یہ خطرہ ہوا کہ ممکن ہے البانیا ایک خود مختار مملکت تسلیم کر لی جائے اور سقوطی، یانینا، مناسٹر اور تو صوہ کی ولایتیں اس میں شامل کر دی جائیں، اگر ایسا ہوا تو ان ریاستوں میں سے ہر ایک کو اس علاقہ سے محروم ہونا پڑے گا جس کی وہ خصوصیت کے ساتھ خواہش مند تھی، چنانچہ اس خوف سے کہ کہیں یہ موقع ہاتھ سے نکل نہ جائے انھوں نے عجلت کی اور ۱۸ اکتوبر ۱۹۱۲ء کو شاہ نکولس والی مونٹی نگرو نے باب عالی کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔

ترکی کی اندرونی حالت: ترکی کی اندرونی حالت اس وقت بہت نازک تھی، قدامت پسند

گروہ نوجوان ترکوں کی انتہا پسندی کا مخالف تھا، خود حکمران جماعت میں پھوٹ پڑ گئی تھی، فوج کے اس حصہ کو جو قدامت پسند تھا غلبہ حاصل ہو گیا تھا، محمود شوکت پاشا کے استعفا دینے کے بعد فوج کی تنظیم بوڑھے افسروں کے ہاتھ میں چلی گئی تھی جو قابلیت میں نوجوان ترکوں سے بہت کم تھے، کامل پاشا صدر اعظم تھا اور اسے انگلستان کی حمایت پر اس قدر بھروسہ تھا کہ وہ بلقان کے خطرہ کو زیادہ اہم نہیں خیال کرتا تھا، اسے یقین تھا کہ انگلستان بلقان پر حملہ نہ ہونے دے گا، اسی یقین کی بنا پر اس نے ۱۹۱۲ء میں ۶۷ ہزار تربیت یافتہ فوج کو جو بلقان کی سرحد پر جمع تھی منتشر کر دیا لیکن جب جنگ کے چھڑ جانے میں کسی شبہ کی گنجائش نہ رہی تو یوروپین حکومتوں سے مداخلت کی درخواست کی گئی، چنانچہ ستمبر میں روس اور آسٹریا نے دولِ عظمیٰ کی طرف سے ایک احتجاجی نوٹ اتحادیوں کے پاس بھیجا، ظاہر ہے کہ اسوولسکی کی سازشوں کے بعد اس احتجاج کا اثر کیا ہو سکتا تھا، یہ دیکھ کر کہ دولتِ عہد اپنی کمزوری محسوس کر رہی ہے پہلے سوئی ٹکرو اور پھر دوسری ریاستوں نے اعلانِ جنگ کر دیا، ترکی کے پاس ایک لاکھ فوج تھی اور وہ بھی زیادہ تر نئے رنگروٹوں کی، بلغاریا کی فوج ایک لاکھ اسی ہزار تھی، سرویا کی اسی ہزار، یونان کی پچاس ہزار (۱)، ان ریاستوں نے سلطنتِ عثمانیہ سے علاحدہ ہونے کے بعد اپنی تنظیم یوروپین حکومتوں کے طرز پر کر لی تھی اور ان کی فوجیں یورپ کے فوجی نظام کے مطابق تربیت یافتہ تھیں، برخلاف اس کے نوجوان ترک ملک کی اصلاح کافی صورت پر نہ کر سکے تھے، جس کا ایک سبب تو یہ تھا کہ انھیں عنانِ حکومت ہاتھ میں لیے ہوئے صرف چار ہی سال گزرے تھے اور دوسری بڑی وجہ قدامت پسند گروہ کی مخالفت تھی، نئے قانون کے مطابق ترکی فوج میں عیسائی اور یہودی بھی بھرتی کیے گئے تھے، ان کی فوجی خدمت جس سے وہ اب تک بالکل بری تھے نہایت شاق تھی، چنانچہ جب لڑائی شروع ہوئی تو انہی عیسائی اور یہودی سپاہیوں نے دھوکا دیا اور سب سے پہلے میدان سے بھاگ کھڑے ہوئے، ایک تو

عثمانی فوجوں کی تعداد اتحادیوں کے مقابلہ میں یوں ہی کم تھی، دوسرے عیسائیوں اور یہودیوں کی غداری سے اور زیادہ نقصان پہنچا۔

جنگ بلقان: اتحادیوں نے جنگ کا مقصد سلطنت عثمانیہ کے عیسائی صوبوں کی اصلاح حال ظاہر کیا تھا مگر حقیقتاً ان کے پیش نظر ذاتی اغراض تھیں، چنانچہ یونان کریٹ اور بحر ائجیئن کے دوسرے جزیروں پر قبضہ کرنے کے علاوہ خود بڑا عظیم پر بھی اپنی سرحدوں کی توسیع کا خواہش مند تھا، بلغاریا کو اس بلغاریا عظمیٰ کی آرزو تھی، جس کا نقشہ 'صلح' نامہ سان اسٹیفانو' میں مرتب کیا گیا تھا، سرویا ان تمام علاقوں کو اپنے اندر شامل کر لینا چاہتا تھا جو اسٹیفن ڈوشن (Stephan Dushan) کے زمانہ میں اس کی قدیم سلطنت کے جزو تھے، وہ یہ بھی چاہتا تھا کہ اس کی مملکت کے حدود بحر ائجیئن اور بحر ایڈریاتک کے ساحلوں تک پہنچ جائیں، مونٹی نگو کی نظر البانیا کے ایک حصہ پر تھی۔ (۱)

۱۸ اکتوبر کو مونٹی نگو نے اعلان جنگ کر دیا تھا، بقیہ ریاستوں نے بھی ۱۸ اکتوبر کو اعلان کر کے اسی روز اپنی فوجیں عثمانی مقبوضات کی طرف روانہ کیں، حملہ کا سب سے زیادہ زور بلغاریا کی طرف سے تھا، جس کا مقصد خود قسطنطنیہ پر قبضہ کرنا تھا، چنانچہ ۱۸ اکتوبر کو بلغاریائی فوجیں تھریس میں داخل ہوئیں اور ۲۲ اکتوبر کو قرق کلیسہ اور ۲۸ کو لولوبرگاس کے معرکوں میں ترکوں کو شکست دی، عثمانی فوج نے شتلمجہ کے حصار میں پناہ لی جو قسطنطنیہ سے تقریباً بیس میل کے فاصلہ پر واقع ہے، بلغاریوں نے شتلمجہ پر کئی حملے کیے مگر نقصان اٹھا کر پسپا ہونا پڑا، وسط نومبر تک ادرنہ کے سوا تھریس کے اور تمام حصوں پر ان کا قبضہ ہو گیا۔

اس درمیان میں سرویا، مونٹی نگو اور یونان نے بھی متعدد فتوحات حاصل کر لی تھیں، سرویا کی فوجیں سرحد کو عبور کر کے قدیم سرویا میں داخل ہوئیں، کمانووو (Koumanaovo) کے میدان میں ۲۳ اکتوبر کو ترکوں سے مقابلہ ہوا۔ دروز تک

جنگ جاری رہی، آخر میں ترکوں کو شکست ہوئی، سروی فوجوں نے اسکوبہ پر قبضہ کر لیا جو ان کی قرون وسطیٰ کی سلطنت کا پایہ تخت تھا، اس کے بعد وہ مقدونیا میں بڑھتی ہوئی مناسٹر تک پہنچ گئیں، دوسری طرف مونٹی نگر و کی فوجوں نے سقوٹری کے زبردست قلعہ کا محاصرہ کر لیا، یونانیوں کی فتوحات کا بھی یہی حال تھا، وہ بھی قریب قریب ہر معرکہ میں کامیاب رہے، ۸ نومبر کو یونانی فوجوں نے سالونیکا پر قبضہ کر لیا، مگر ان کی بحری فتوحات زیادہ اہم تھیں، آخر نومبر تک بحر ائجیئن کے تقریباً تمام عثمانی جزائر پر یونان کا قبضہ ہو گیا تھا ترکی بحریہ کی کمزوری بری فوجوں کی حالت سے بھی زیادہ افسوسناک ثابت ہوئی۔

عثمانی شکست کے اسباب: ترکوں کی ان حیرت انگیز شکستوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لارڈ ایورسلے لکھتا ہے:

”عثمانی فوجوں کی بد نظمی اور اتاری کے منجملہ اور اسباب کے ایک سبب یہ بھی تھا کہ سامانِ رسد کا انتظام مطلق نہ تھا، تین تین چار چار روز تک فوجوں کا بغیر غذا کے رہ جانا کوئی استثنائی واقعہ نہ تھا بلکہ عموماً ایسا ہی ہوتا تھا، دوسرا سبب یہ تھا کہ یورپ کی اس جنگ میں عثمانی فوجوں میں بڑی تعداد دیہاتی عیسائیوں کی تھی جو پہلی بار جبری طور پر بھرتی کیے گئے تھے، ان کی ہمدردی تمام تر دشمن کے ساتھ تھی اور اس میں شبہ نہیں کہ ترکی صفوں کے ٹوٹنے کے وقت فوج کا انتشار اور فرار زیادہ تر انہی کے بھاگنے کی وجہ سے ہوتا تھا جو لوگ باقی رہ جاتے تھے، وہ اپنے

گھروں کو بھاگ جاتے تھے۔ (۱)
خالدہ اویب خانم اپنے سوانح میں لکھتی ہیں:

”بد نظمی کے لحاظ سے جنگ بلقان سے بڑھ کر کوئی جنگ نہیں ہوئی ہے، حفظانِ صحت کا کوئی انتظام نہ تھا اور خطوطِ مدافعت کے

پیچھے انتظامات کی اتری نہایت افسوس ناک تھی، بھیڑیں گاڑیوں میں
بھوکی مر رہی تھیں اور آٹا گوداموں میں سڑ رہا تھا، لیکن نصف میل سے کم
ہی فاصلہ پر لوگ فاقے سے جان دے رہے تھے، جب ترک پناہ
گزیں قتل عام سے بھاگ کر سرا سیمہ قسطنطنیہ پہنچے جب باہر سے آنے
والوں اور فوج میں ہیضہ پھیلا، جب آبادی کی آبادی مسجدوں کے صحن
میں سردی کی شدت سے دم توڑتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی تو قسطنطنیہ

کی مصیبت کا منظر اتنا ہولناک تھا کہ خیالی معلوم ہوتا تھا۔“ (۱)

یورپ کا پاس عہدہ: آغاز جنگ میں دولِ عظمیٰ نے اعلان کیا تھا کہ خواہ کوئی فریق بھی
کامیاب ہو بلقان کی موجودہ حالت برقرار رکھی جائے گی، اس اعلان کا سبب یہ تھا کہ
نہیں ترکی کی کامیابی کا قومی اندیشہ تھا اور جس طرح ۱۸۹۷ء میں انھوں نے ایک ایسے ہی
علان سے یونان کی پشت پناہی کی تھی اور ترکوں کو یونانی فتوحات سے دست بردار ہونا
پڑا تھا، اسی طرح ریاستہائے بلقان کا تحفظ بھی پہلے ہی سے کر لیا گیا تھا، لیکن جب خلاف
توقع عثمانی فوجوں کو تقریباً ہر معرکہ میں شکست ہوئی اور دشمن حیرت انگیز طور پر کامیاب
ہونے لگے تو انہی زبانوں نے جو یہ اعلان کر چکی تھیں اب اس کے خلاف آواز اٹھائی اور
یہ کہا جانے لگا کہ بلقانیوں کو ان کی فتوحات سے محروم کر دینا ہر گز قرین انصاف نہیں،
مسٹر اسکوتھ، وزیر اعظم برطانیہ نے دولِ عظمیٰ کی ترجمانی کرتے ہوئے فرمایا: ”مشرقی
یورپ کے نقشہ کو از سر نو مرتب کرنا ضروری ہے اور فاتحین کو ان ثمرات سے محروم نہیں کرنا
چاہیے جو اتنی گراں قیمت پر انھیں حاصل ہوئے ہیں“ (۲)، بقول خالدہ خانم: ”یورپ
کے اخباروں نے بھی وہ لہجہ اختیار کیا گویا یہ قرونِ وسطیٰ کی صلیبی جنگ تھی جس میں صلیب
ہلال پر غالب آئی۔“

عارضی صلح: دولِ عظمیٰ کی تحریک پر ۳ دسمبر کو ترکی اور بلغاریا اور سربیا کے درمیان ایک

(۱) سوانح خالدہ ادیب خانم (Memories of Khāida Edib) مطبوعہ لندن ص ۳۳۳ (۲) طرس ۵۰۴

عارضی صلح ہو گئی، یونان اور مونٹی نیگرو سے جنگ جاری رہی، اب تک جنگ کا نتیجہ یہ تھا کہ ترک مقدونیا اور تقریباً تمام تھریس اور اپالوس سے خارج ہو چکے تھے، قسطنطنیہ کے علاوہ یورپ میں صرف ادرنہ، یانینا اور سقوطری پر ان کا قبضہ باقی رہ گیا تھا، لیکن یہ تینوں شہر بھی دشمن کے محاصرہ میں تھے۔

صلح کانفرنس، لندن: ۱۶ دسمبر ۱۹۱۲ء کو لندن میں ”صلح کانفرنس“ کا اجلاس شروع ہوا، ادرنہ کے مسئلہ پر سب سے زیادہ مشکل پیش آئی اور یہی مسئلہ کانفرنس کی ناکامی کا باعث ہوا، بغیر ایا نے مستقل صلح کے لیے ادرنہ کے حصول کو ایک لازمی شرط قرار دیا تھا، باب عالی اس پر راضی نہ تھا لیکن جب ۱۷ جنوری ۱۹۱۳ء کو دولِ عظمیٰ کی طرف سے ایک نوٹ باب عالی میں بھیجا گیا اور اس میں یہ مشورہ دیا گیا کہ ادرنہ ریاستہائے بلقان کے حوالہ کر دیا جائے اور جزائر آتھین کا مسئلہ دولِ عظمیٰ کے فیصلہ پر چھوڑ دیا جائے تو صدرِ اعظمِ کامل پاشا نے جو انگلستان کا دوست تھا ترکی کی کمزوریوں کا لحاظ کرتے ہوئے اس مشورہ کو قبول کرنے پر آمادگی ظاہر کی، قریب تھا کہ مجلسِ وزرا کا مل پاشا کی اس تحریک سے متفق ہو کر دولِ عظمیٰ کے نوٹ کا جواب روانہ کر دے اور ترکی کے قتلِ نامہ پر خود اسی کی مہر ثبت کر دی جائے کیوں کہ ادرنہ سے دست برداری حقیقتاً قسطنطنیہ کی دست برداری کا مقدمہ ہوتی لیکن عین وقت پر ایک غیبی ہاتھ نمودار ہوا جس نے مجلسِ وزرا کی یادداشت کو جو دولِ عظمیٰ کے پاس جانے کے لیے مرتب ہو چکی تھی ٹکڑے ٹکڑے کر کے خود موجودہ وزارت کا خاتمہ کر دیا، اس کے بعد جو وزارت قائم ہوئی اس نے ادرنہ کو حوالہ کرنے سے قطعاً انکار کر دیا جس کے بعد ہی صلح کانفرنس بھی برخاست ہو گئی۔

انقلاب وزارت: یہ انقلاب وزارت اسی بطلِ حریت کا رہن منت تھا جس نے ۱۹۰۸ء میں ملک کو عبدالحمید کے استبداد سے نجات دلا کر دستوری حکومت قائم کر دی تھی، انور بے طرابلس کی مہم سے فارغ ہو کر قسطنطنیہ پہنچ چکے تھے، اسی خاموشی اور جرأت کے ساتھ جو ۱۹۰۸ء کے انقلاب میں اس درجہ کامیاب ثابت ہوئی تھی، وہ چند جاں فروشوں کو

لے کر دفعۃً ایوان وزارت میں داخل ہوئے، ان کے ہاتھ میں ایک کاغذ تھا جس پر افسران جنگ اور عام پبلک کے دستخط تھے اور اس میں تبدیل وزارت یا انکار صلح پر زور دیا گیا تھا، فوج کا جو حصہ وزارت کے ہاتھ میں تھا، اسے پہلے ہی کسی بہانہ سے قسطنطنیہ سے باہر بھیج دیا گیا تھا اور جس قدر فوج شہر میں تھی وہ سب قومی جماعت کے ساتھ تھی، جس کی سیادت انور بے کر رہے تھے، وزراء ان حالات سے بے خبر اپنے کام میں مشغول تھے کہ انور بے اندر داخل ہوئے، ناظم پاشا وزیر جنگ کے ایڈی کا نگ نے اس جماعت کو روکنے کی کوشش کی اور پستول چلائی، معاً دوسری طرف سے بھی گولی چلی اور ناظم پاشا گر کر وہیں ٹھنڈا ہو گیا، بہت جلد انور بے نے وزارت خانہ پر قبضہ کر لیا، کامل پاشا کو استعفاء دینا پڑا، اس کی جگہ محمود شوکت پاشا صدر اعظم مقرر ہوئے۔

استقلال البانیا: لندن کانفرنس کے سامنے منجملہ اور اہم مسائل کے ایک مسئلہ استقلال البانیا کا بھی تھا، سربو کو جو غیر معمولی کامیابی جنگ میں ہوئی تو اس نے بحر ایڈریاٹک کا رخ کرنا چاہا، کیوں کہ اب تک اس کے پاس کوئی بندرگاہ نہ تھی لیکن بحر ایڈریاٹک تک پہنچنے کے لیے سربو صرف ایک ہی راہ سے جاسکتا تھا یعنی البانیا کی طرف سے، چنانچہ نومبر ۱۹۱۲ء کے آخر میں سربو فوجوں نے الیسو (Allesio) اور دورازو (Durrazzo) پر قبضہ کر لیا جو البانیا کے ساحل پر واقع تھے، دولِ عظمیٰ نے جس وقت یہ خبر سنی فوراً احتجاج کیا، سب سے زیادہ مخالفت اٹلی اور آسٹریا کی طرف سے ہوئی، کیوں کہ یہی دونوں حکومتیں اپنے کو بحر ایڈریاٹک کا تنہا مالک قرار دیتی تھیں، سربو کو باضابطہ طور پر متنبہ کر دیا گیا کہ بحر ایڈریاٹک کی کسی بندرگاہ پر قبضہ کرنے کی اجازت نہ دی جائے گی لیکن سربو دولِ عظمیٰ کی مخالفت کے باوجود بڑھتا چلا گیا، اسے امید تھی کہ دولِ عظمیٰ کا اتحاد قائم نہ رہے گا اور کم از کم روس بالآخر اس کا طرفدار ہو جائے گا (۱)، مغربی حکومتوں کے احتجاج کے علاوہ خود اہل البانیا میں سربو کے اس اقدام کے خلاف سخت شورش برپا

ہو گئی، انھوں نے فوراً ولونا میں ایک مجلس منعقد کر کے سلطنت عثمانیہ سے اپنی کامل آزادی کا اعلان کر دیا، ان کو خطرہ تھا کہ اگر ایسا نہ کیا گیا تو البانیا کا بھی وہی حشر ہوگا جو بلقان کے دوسرے عثمانی مقبوضات کا ہونے والا ہے، اس اعلان سے دولِ عظمیٰ کے ہاتھ اور مضبوط ہو گئے اور انھوں نے لندن کانفرنس میں نہ صرف یہ کہ سرویا کو مجبور کر کے البانی بندرگاہوں سے دست بردار کرایا بلکہ البانیا کا استقلال بھی باضابطہ طور پر تسلیم کر لیا، البانیا ایک خود مختار ریاست قرار دی گئی جس کے فرماں روا کا انتخاب دولِ عظمیٰ کے فیصلہ پر رکھا گیا، اس فرماں روا کی مدد کے لیے ایک بین الاقوامی کمیشن کا تقرر طے ہوا، سرحدوں کی تعیین بھی ایک خاص کمیشن کے سپرد کی گئی، کانفرنس دراصل جس مقصد کے لیے منعقد کی گئی تھی وہ تو ریاستہائے بلقان کی فاتحانہ سرستیوں اور نوجوان ترکوں کی غیرت قومی کے باعث پورا نہ ہونے کا لیکن اس میں اتنا ضرور ہوا کہ البانیا کا استقلال بین الاقوامی طور پر تسلیم کر لیا گیا اور دولت عثمانیہ کا ایک اور صوبہ اس کے قبضہ سے نکل کر دولِ عظمیٰ کے سایہٴ عاطفت میں آ گیا۔

اعادہٴ جنگ: ترکی انقلاب وزارت کے بعد عارضی صلح کا خاتمہ ہو گیا اور جنگ از سر نو شروع کر دی گئی، ۴ فروری ۱۹۱۳ء کو بلغاری فوجوں نے ادرنہ پر پھر حملہ کیا، اب کی بار پچاس ہزار سر وی فوج بھی ان کے ساتھ تھی، اسی روز بولیر کے قریب ترکوں اور بلغاریوں کا مقابلہ ہوا، جس میں ترکوں کو شکست ہوئی اور بولیر کا اہم قلعہ ان کے ہاتھ سے نکل گیا، اس درمیان میں یونانیوں نے بھی لڑائی شروع کر دی تھی، انھوں نے ایک فوج اپائرس روانہ کی اور ۶ مارچ کو یانینا کے قلعہ پر جواب تک ناقابلِ تسخیر سمجھا جاتا تھا قبضہ کر لیا، ۱۰ مارچ کو جزیرہٴ ساموس بھی یونانیوں کے ہاتھ میں چلا گیا۔

سقوطِ ادرنہ: ۲۶ مارچ کو ادرنہ کے فوجی دستہ کو بھی تقریباً پانچ ماہ کے شدید محاصرہ کے بعد ہتھیار ڈال دینے پڑے، اس محاصرہ میں بلغاریوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگادیا تھا اور اپنی پوری قوت کے ساتھ بار بار حملہ آور ہوئے تھے لیکن ہر بار انھیں کشتوں کی ایک بڑی

تعداد چھوڑ کر پسپا ہونا پڑتا تھا، اب کی بار ان کی کامیابی محض سروی افواج کی مدد سے ہوئی مگر اس کامیابی نے بلغاریا کے لیے ایک نئی دقت پیدا کر دی، جنگ بلقان میں رومانیہ نے اب تک کسی فریق کا ساتھ نہیں دیا تھا، بلغاریا کی فتوحات کو دیکھ کر اس کے دل میں رشک کا جذبہ پیدا ہوا اور اپنی غیر جانبداری کے معاوضہ میں بلغاریا سے سلسٹریا کے قلعہ کا مطالبہ کیا تاکہ صلح نامہ برلن میں اس کے ساتھ جو نا انصافی برتی گئی تھی اس کی کچھ تلافی ہو جائے، یہ معاملہ ابھی فیصلہ نہیں ہوا تھا کہ ۱۹ اپریل ۱۹۱۳ء کو ترکوں اور بلغاریوں کے درمیان بولیر میں عارضی طور پر صلح ہو گئی۔

سقوط طری: اس عارضی صلح میں مونٹی نیگرو و شریک نہ تھا کیوں کہ شاہ نکولس دولِ عظمیٰ کی مخالفت کے باوجود سقوط طری کے محاصرہ پر قائم تھا اور اسے فتح کرنے سے پہلے کسی صلح کے لیے آمادہ نہ تھا، دولِ عظمیٰ نے اسے متنبہ کر دیا تھا کہ اگر اس نے قلعہ فتح بھی کر لیا تو بھی اس پر قابض نہ رہنے پائے گا، اس لیے کہ پہلے سے طے ہو چکا ہے کہ یہ شہر البانیا کی جدید خود مختار ریاست میں شامل کر دیا جائے گا، تاہم نکولس نے کچھ پروا نہ کی اور محاصرہ جاری رکھا، مجبور ہو کر روس کے علاوہ تمام دولِ عظمیٰ نے ایک متحدہ جنگی بیڑا مونٹی نیگرو کے ساحلی علاقہ کی ناکہ بندی کے لیے روانہ کیا، یہ بیڑا برطانوی امیر البحر برنی (Burney) کی سرکردگی میں ۴ اپریل کو انتی داری کے سامنے نمودار ہوا، پھر بھی نکولس نے محاصرہ بدستور جاری رکھا، بالآخر ۲۲ اپریل کو فاقہ کشی سے تنگ آ کر محصورین نے ہتھیار ڈال دئے، اسد پاشا ترکی دستہ اور باقی ماندہ سامان جنگ کو لے کر شہر سے نکل گیا اور ۲۶ اپریل کو مونٹی نیگرو کا ولی عہد شہزادہ ڈانیلو (Danilo) فاتحانہ طور پر اس میں داخل ہوا لیکن مونٹی نیگرو کی یہ فتح مندی چند روز ثابت ہوئی، دولِ عظمیٰ نے شاہ نکولس کو مجبور کیا کہ شہر ان کے حوالہ کر دے، چنانچہ ۴ مئی کو نکولس نے سر ایڈورڈ گرے وزیر خارجہ برطانیہ کو بذریعہ تار اطلاع دی کہ میں بالکل مجبور ہو کر سقوط طری سے دست بردار ہوتا ہوں اور اسے دولِ عظمیٰ کے ہاتھ میں دیتا ہوں، اس کے بعد بین الاقوامی فوجیں جنگی بیڑے سے اتر کر سقوط طری

میں داخل ہو گئیں، سقوطی کے شہر اور اس کے چاروں طرف چھ میل کے فاصلہ تک ایک عارضی حکومت قائم کر دی گئی، جس کا صدر امیر البحر برنی مقرر ہوا۔

صلح نامہ لندن، ۳۰ مئی ۱۹۱۳ء: بولیر کی عارضی صلح کے بعد لندن کانفرنس کے دوبارہ منعقد کرنے کی تحریک پھر شروع ہوئی، ریاستہائے بلقان نے دولِ عظمیٰ کے تمام شرائط وساطت منظور کر لیے مگر اپنے لیے یہ حق محفوظ رکھا کہ تھریس اور البانیا کی سرحدوں نیز جزائر آتھین کے مستقبل کے مسئلہ پر وہ کانفرنس میں بحث و مباحثہ کریں گی، دولِ عظمیٰ نے اپنی وساطت کے لیے یہ شرائط پیش کیے تھے (۱) یورپ میں ترکی کی جدید سرحد کے لیے اینوس (Ainos) جو بحر آتھین پر واقع ہے اور میڈیا (Midia) جو بحر اسود پر واقع ہے، ان دونوں کا درمیانی خط مستقیم بنیاد قرار دیا جائے۔ (۲) جزائر آتھین کا مسئلہ اور جدید البانیا کی سرحد کی تعیین دولِ عظمیٰ کے فیصلہ پر چھوڑ دی جائے۔ (۳) تمام مالی معاملات بشمول تاوان جنگ ایک بین الاقوامی مالی کمیشن کے سپرد کر دئے جائیں، چنانچہ یہ کمیشن ۹ جون کو پیرس میں بیٹھا اور اس میں محاربین کے نمائندے شریک ہوئے۔ (۱)

۳۰ مئی ۱۹۱۳ء کو 'صلح نامہ لندن' پر فریقین کے دستخط ہو گئے، اس کے رو سے یورپین ترکی کے تمام علاقے بہ استثنائے البانیا جو خط اینوس و میڈیا کے مغرب میں واقع تھے، ریاستہائے بلقان کو دے دئے گئے، البانیا کی سرحدوں نیز اس کے متعلق تمام دوسرے مسائل کا فیصلہ دولِ عظمیٰ پر چھوڑ دیا گیا، کریٹ کے علاوہ اور تمام جزائر آتھین کی قسمت کا فیصلہ بھی دولِ عظمیٰ ہی پر چھوڑا گیا، باب عالی نے کریٹ کا الحاق یونان سے منظور کر لیا، مالی معاملات کا تصفیہ پیرس کے بین الاقوامی کمیشن کے سپرد کر دیا گیا اور حکومتی اختیارات، قومیت اور تجارت کے مسائل کا مخصوص معاہدوں سے طے ہونا قرار پایا۔ (۲)

اتحاد میں افتراق: دولِ یورپ نے لندن کانفرنس کی کامیابی پر ایک دوسرے کو مبارک باد دی، لیکن خود اتحادیوں کے اندر جو افتراق پیدا ہو رہا تھا، اس کی طرف کوئی توجہ نہیں کی،

یہ افتراق مالی غنیمت کی تقسیم پر ظاہر ہوا، کریٹ، جزائر ایجین، اپازرس، تھریس اور مقدونیا جو دولت عثمانیہ کے ہاتھ سے نکل کر اتحادیوں کے قبضہ میں آچکے تھے، ان کی تقسیم کا مسئلہ نہایت دشوار تھا اور لندن کانفرنس کے اختتام سے قبل ہی باہمی جنگ کے آثار نمودار ہونے لگے تھے، اتحادی فتح کے نشہ میں سرشار تھے اور ان میں سے ہر ایک مال غنیمت کا سب سے زیادہ حقدار اپنے ہی کو سمجھتا تھا، جنگ سے پہلے سرویا اور بلغاریا کے درمیان جو معاہدہ ہوا تھا، اس کے رو سے مقدونیا کا ایک چھوٹا سا حصہ سرویا کو ملنا چاہیے تھا، لیکن جنگ میں سروی افواج نے جو خلاف توقع فتوحات مقدونیا میں حاصل کیں، ان کے لحاظ سے سرویا معاہدہ مذکورہ پر قانع رہنے کے لیے تیار نہ تھا، واقعہ یہ ہے کہ اتحادیوں کو گمان بھی نہ تھا کہ وہ ترکوں کے مقابلہ میں اس درجہ کامیاب رہیں گے، یہی سبب تھا کہ مال غنیمت کی تقسیم سے متعلق انھوں نے جنگ سے پہلے کسی خاص معاہدہ کی ضرورت نہ سمجھی، لیکن تعجب یہ ہے کہ لندن کانفرنس میں بھی اس مسئلہ پر توجہ نہیں کی گئی اور گویا اسے تلوار کے فیصلہ پر چھوڑ دیا گیا، مقدونیہ میں ترکوں سے جو لڑائیاں ہوئیں وہ زیادہ تر سرویا اور یونان کی فوجوں سے ہوئیں، بلغاری فوجیں تھریس میں لڑتی رہیں، چنانچہ مقدونیا کے بیشتر علاقوں پر سرویا اور یونان ہی کا قبضہ تھا، اس بن پران دونوں ریاستوں کا دعویٰ یہ تھا کہ مقدونیا ان ہی کے قبضہ میں رہنے دیا جائے اور بلغاریہ اپنا حصہ تھریس میں پورا کر لے، بلغاریا اس پر راضی نہ تھا، وہ مقدونیا پر قبضہ رکھنے کے لیے اس وجہ سے مصر تھا کہ اس میں بلغاری آبادی کثرت سے تھی، علاوہ بریں وہ بیسیوں برس سے مقدونیا کے عیسائیوں میں بلغاری قومیت کا جذبہ ابھار رہا تھا، سرویا کی طرف سے یہ کہا جاتا تھا کہ چون کہ دولِ عظمیٰ کے فیصلہ کے مطابق البانیا ایک خود مختار ریاست بنادی گئی ہے، جس سے علاوہ اور نقصانات کے سب سے بڑا نقصان سرویا کو یہ پہنچا کہ اسے ساحل ایڈریاتک پر کوئی بندرگاہ نہ مل سکی اور دورازو پر قبضہ پانے کے بعد بھی اس سے دست بردار ہونا پڑا، حالانکہ سرویا کا شریک جنگ ہونا دراصل اسی مقصد سے تھا کہ ایڈریاتک کی کوئی بندرگاہ حاصل

ہو جائے، اس لیے اس کی تلافی صرف اس صورت میں ہو سکتی ہے کہ مقدونیا میں اسے زیادہ حصہ دیا جائے، علاوہ ان فتوحات کے جو سروی افواج نے مقدونیا میں حاصل کی تھیں، سرویہ کی طرف سے ایک دلیل یہ بھی پیش کی جاتی تھی کہ تھریس پر جس میں ادرنہ بھی شامل تھا، بلغاریہ کا قبضہ ہو جانے کی وجہ سے ریاستہائے بلقان کا توازن قوت درہم برہم ہو جائے گا، جس کا اثر زیادہ تر سرویہ پر پڑے گا، اس لیے ضرورت ہے کہ توازن کو قائم رکھنے کے لیے سرویہ کو بلغاریہ سے زیادہ حصہ مقدونیا میں دیا جائے۔

بلغاریہ اور یونان کا معاملہ بھی ایسا ہی پیچیدہ تھا، سالونیکا اور مقدونیا کے جنوبی نصف پر یونان کا قبضہ تھا، بلغاریہ سالونیکا کو لینے کے لیے اڑا ہوا تھا، چنانچہ ”صلح نامہ“ لندن کی تکمیل سے قبل ہی سالونیکا کے مسئلہ پر بلغاریوں اور یونانیوں میں تلواریں چل گئی تھیں، ۲۲ مئی کو بلغاریہ فوجوں نے یونانی دستوں پر حملہ کر دیا تھا، نیز بلغاریہ تو بچپوں نے ایک یونانی جہاز پر بھی گولہ باری کر دی تھی، لیکن چونکہ لندن کانفرنس کا اجلاس ہو رہا تھا، اس لیے اس وقت یہ جنگ زیادہ نہیں بڑھی۔

ایک پیچیدگی رومانیہ نے بھی پیدا کر دی تھی، رومانیہ جنگ میں تو شریک نہ تھا اور اس لیے مال غنیمت کے کسی حصہ کا حق نہ رکھتا تھا، لیکن چونکہ اس کی غیر جانبداری سے اتحادیوں کو بالواسطہ سہولت پہنچی تھی اور انھوں نے بالخصوص بلغاریہ نے حیرت انگیز فتوحات حاصل کر کے اپنی طاقت بہ نسبت پہلے کے بہت زیادہ بڑھائی تھی، اس لیے توازن قوت کو برقرار رکھنے کے لیے رومانیہ کو بھی کچھ ملنا ضروری تھا، چنانچہ رومانیہ نے بلغاریہ سے یہ مطالبہ کیا کہ سلسٹر یا کا قلعہ نیز علاقہ دو بروجا کا ایک حصہ جس پر بلغاریہ کا قبضہ تھا، اسے دے دیا جائے، بلغاریہ اس وقت دولت علیہ سے جنگ کرنے میں اپنی پوری طاقت صرف کر رہا تھا، وہ رومانیہ سے لڑائی مول لینے کے لیے تیار نہ تھا، لہذا مجبوراً اس نے رومانیہ کے مطالبات منظور کرائے اور مئی ۱۹۱۳ء میں معاہدہ پر دستخط کر کے سلسٹر یا اور دو بروجا کا وہ علاقہ رومانیہ کے لیے نامزد کر دیا۔

آغاز جنگ، جون ۱۹۱۳ء: رومانیہ سے یوں دبِ صلح کرنے کا یہ نتیجہ ہوا کہ بلغاریہ، مقدونیا کے معاملہ میں زیادہ سخت ہو گیا، یونان سے جو مراسلت اس مسئلہ میں ہو رہی تھی وہ موقوف کر دی گئی اور سرویا کے ساتھ بھی معاملات کچھ زیادہ نہ بڑھے، بلغاریہ کو اپنی قوت پر اتنا غور تھا کہ اس نے حریفوں کی فوجی طاقت کی کچھ پروا نہ کی، اس کا وزیر اعظم گیٹشوف (M. Gueshoff) صلح کا خواہش مند تھا لیکن وزارت کا بڑا حصہ جنگ پر آمادہ تھا، چنانچہ گیٹشوف کو استعفادے کر علاحدہ ہو جانا پڑا، شاہ فرڈیننڈ جو ایک نہایت عیار اور سازشی فرماں روا تھا، اس پارٹی کا طرفدار تھا، جو جنگ چاہتی تھی، بلغاریہ کے سابق حلیفوں کے ساتھ جو غریب اور غداری برتی گئی اس کا ذمہ دار زیادہ تر وہی تھا۔ (۱)

بلغاریہ کے مرزِ عمل سے یونان اور سرویا کو جب اس بات کا یقین ہو گیا کہ جنگ بالآخر چھڑ کر رہے گی تو ۲ جون کو انھوں نے آپس میں ایک معاہدہ اتھد کر لیا، جس میں رومانیہ بھی شریک ہو گیا، حالانکہ وہ اس سے قبل بلغاریہ سے سلسلہٴ یورپ اور دو بروجا کے متعلق صلح کر چکا تھا، چنانچہ جنگ بلقان کے اتحادیوں میں اب جوڑائی چھڑی اس میں بلغاریہ کے مقابل یونان، سرویا اور رومانیہ کی ریاستیں تھیں، بعد میں مونٹی نگرو بھی اتحادیوں کے ساتھ ہو گیا۔

جنگ تقسیم: ۲۹ جون ۱۹۱۲ء کو آدھی رات کے وقت مقدونیا کی بلغاریہ فوج نے دفعۃً بغیر کسی اطلاع یا اعلان جنگ کے یونانی اور سروی دستوں پر حملہ کر دیا اور دوسرے روز ایک لاکھ بلغاریہ فوج اس سروی فوج کے مقابلہ میں جو اس سے قریب تھی آگے بڑھی، سروی فوج اس ناگہانی حملہ سے پہلے تو پسپا ہوئی، لیکن یکم جولائی کو مونٹی نگرو کی مدد سے اس نے جم کر مقابلہ کیا اور ۲ جولائی کو بلغاریہ فوج کو شکست دے کر اس کی بہت سی توپیں چھین لیں، ۴ جولائی کو پھر مقابلہ ہوا اور بلغاریہ کو پھر شکست ہوئی، ۸ جولائی کو سروی فوج نے اسٹیپ (Istib) پر قبضہ کر لیا اور اب بلغاریہ پسپا ہو کر اپنی سرحد کی طرف روانہ

ہوئے، اس درمیان میں یونانی فوج بھی جس کا مرکز سالونیکا تھا، بلغاری فوج کے مقابلہ کے لیے بڑھی، کلکٹیش (Kiltich) کے میدان میں جنگ ہوئی اور بلغاری بری طرح ہارے، اس کے بعد متعدد لڑائیاں اور ہوائیں اور ہر ایک میں بلغاریوں کو شکست کھا کر پیچھے ہٹنا پڑا بلغاری فوجوں کے لیے اب صرف اپنی سرحد کی راہ کھلی رہ گئی تھی، واپسی میں انھوں نے مقدونیا کی یونانی آبادی پر ہولناک مظالم توڑے، یونانیوں نے بھی آگے بڑھ کر ویسا ہی انتقام لیا (۱) بلغاریوں کو صرف یونان اور سرویا کی فوجوں سے لڑنا نہیں پڑا، ۱۹ جولائی کو رومانیہ بھی جنگ میں شریک ہو گیا اور سلسلہ یہاں پر قبضہ کر کے صوفیا کی طرف بڑھا۔

فتح اور نہ: بلغاریا کی اس نازک حالت سے ترکوں نے بھی فائدہ اٹھایا، ۱۵ جولائی کو انور پاشا تھریس میں داخل ہوئے اور ۲۰ کو آسانی کے ساتھ اور نہ پر قبضہ کر لیا، اس کے بعد ڈیلوٹیکا اور قرق کلیہ بھی انھوں نے دوبارہ فتح کر لیے۔

عارضی صلح: جنگ تقسیم صرف ایک ماہ تک جاری رہی لیکن اس قلیل مدت میں بلغاریا کی حالت نہایت نازک ہو گئی، اس کی فوجوں کو ہر معرکہ میں شکست ہوئی، دشمن کی فوجیں ہر طرف سے بڑھتی ہوئی آرہی تھیں، بالآخر اسے مجبور ہو کر دولِ عظمیٰ سے صلح کی درخواست کرنی پڑی، ۳۱ جولائی کو فریقین ایک عارضی صلح پر راضی ہوئے اور یہ طے پایا کہ بخارسٹ میں ایک کانفرنس منعقد کی جائے جس میں ریاستہائے بلقان کے نمائندے شریک ہوں، لیکن دولِ عظمیٰ کے نمائندے شرکت نہ کریں۔

صلح نامہ بخارسٹ: بخارسٹ میں صلح کانفرنس کا اجلاس فوراً شروع کر دیا گیا اور اس سرعت کے ساتھ معاملات فیصلہ ہوئے کہ ۱۰ اگست ۱۹۱۳ء کو حاربین نے صلح نامہ پر دستخط کر دئے، سب سے زیادہ نقصان بلغاریہ کو برداشت کرنا پڑا، جس پر جنگ تقسیم کی تمام تر ذمہ داری عاید ہوتی تھی، اس نے یہ جنگ دراصل مقدونیا پر قبضہ کرنے کے لیے چھیڑی تھی، کانفرنس نے مقدونیا ہی سے اس کو تقریباً کلیہً محروم کر دیا، مقدونیا یونان اور سرویا

کے درمیان تقسیم کر دیا گیا، سر دیا کو وسطی مقدونیا ملا، جس میں اوکریڈا اور مناسٹر، قوصوہ اور نووی بازار کا نصف شرقی شامل تھا، اس کا نصف غربی مونٹی نیکرو کو دیا گیا، یونان کے حصہ میں اپازرس، جنوبی مقدونیا، سالونیکا اور مشرق میں دریائے مستا (Mista) تک ساحلی علاقہ آیا جس میں کوالا بھی شامل تھا، رومانیانے دو بروجا کا ایک بڑا حصہ مع قلعہ سلسٹر یا کے پایا۔

دولت عثمانیہ کے ساتھ کوئی معاہدہ ۲۹ ستمبر تک نہ ہوسکا، ۲۹ ستمبر کو بالآخر باب عالی اور بلغاریا کے درمیان بھی صلح ہو گئی، تھریس کا بڑا حصہ ترکوں کو واپس مل گیا، اس میں ادرنہ، وسیونیٹا اور قرق کلیہ کے اہم شہر شامل تھے، یورپ میں دولت علیہ کی کائنات بس اسی قدر اور رہ گئی، باقی سارا علاقہ ریاستہائے بلقان میں تقسیم ہو گیا، بلغاریوں نے اس جنگ میں جو نقصانات برداشت کیے تھے ان کے معاوضہ میں انھیں تھریس کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا ہاتھ آیا جس کا ایک حصہ بحر ائجین کے ساحل پر تو ضرور تھا لیکن اس میں کوئی اہم بندرگاہ نہ تھی، لارڈا اور سلے اس موقع پر بلغاریا کے متعلق لکھتا ہے: ”کمینہ عداری اور حد سے زیادہ غرور کا اس سے زیادہ مہلک انتقام کبھی نہیں لیا گیا۔“ (۱)

جنگ کے نتائج: بلقان کی دونوں جنگوں میں اخراجات کا تخمینہ تقریباً (۲۳۵۰۰۰۰۰۰) پونڈ کیا جاتا ہے اور کشتوں اور زخمیوں کی تعداد (۳۴۸۰۰۰) دونوں مدوں میں سب سے زیادہ نقصان بلغاریا کا ہوا، اس کے (۱۴۰۰۰۰) آدمی مارے گئے ور (۹۰۰۰۰۰۰) پونڈ صرف ہوئے، ترکوں کے مقتولوں اور زخمیوں کا شمار (۱۰۰۰۰۰) اور مصارف کا تخمینہ (۸۰۰۰۰۰۰) پونڈ تھا، سر دیا کا (۷۰۰۰) آدمی اور (۵۰۰۰۰۰۰) پونڈ اور یونان جو نتیجہ کے اعتبار سے سب سے زیادہ فائدہ میں رہا سب سے زیادہ سستا چھوٹا یعنی صرف (۳۰۰۰۰) آدمی اور (۲۵۰۰۰۰۰) پونڈ۔

علاقہ اور آپ دی کے لحاظ سے نقصان صرف ترکی کا ہوا، جنگ سے پہلے اس کی یورپین آبادی کا تخمینہ (۶۱۳۰۲۰۰) تھا اور اس کا رقبہ (۶۵۳۵۰) مربع میل تھا، جنگ

کے اختتام پر (۴۲۳۹۲۰۰) آبادی، اس کی حکومت سے نکل گئی اور اس کے قبضہ میں صرف (۱۰۸۸۲) مربع میل اور باقی رہ گئے، مال غنیمت میں سب سے بڑا حصہ یونان کے ہاتھ آیا، یونان کی آبادی پہلے (۲۶۶۶۰۰۰) تھی، اب بڑھ کر (۴۳۶۳۰۰۰) ہو گئی اور اس کا رقبہ (۲۵۰۰۱۴) مربع میل سے (۴۱۹۳۳) مربع میل تک پہنچ گیا، سرویا کی آبادی پہلے تیس لاکھ سے کسی قدر کم تھی، ”صلح نامہ بخارست“ کے رو سے پینتالیس لاکھ ہو گئی اور رقبہ (۱۸۶۵۰) سے بڑھ کر (۳۳۸۹۱) مربع میل ہو گیا، رومانیہ نے اپنی آبادی میں جو پہلے بھی ریاستہائے بلقان میں سب سے زیادہ تھی (۲۸۶۰۰۰) کا اضافہ اور کیا اور اپنی مملکت میں (۲۶۸۷) مربع میل بلغاریا کے مقبوضات سے لے کر ملائے، بلغاریا کا نفع بقدر (۱۲۵۴۹۰۰) آبادی میں اور (۹۶۶۳) مربع میل توسیع مملکت میں رہا، مونٹی نیکو کی آبادی (۲۵۰۰۰۰) سے بڑھ کر (۴۸۰۰۰۰) تک پہنچ گئی اور اس کا رقبہ (۳۴۷۴) مربع میل سے (۵۶۰۳) مربع میل ہو گیا۔ (۱)

خالدہ ادیب خانم نے اپنے خطبات میں جنگ بلقان کے نتائج اور اثرات پر حسب ذیل روشنی ڈالی ہے۔

(۱) ترکوں کی شکست سے مغربی حکومتوں کے خیالات میں بہت بڑا تغیر واقع ہوا (الف) روس ترکوں کے ہارنے سے خوش ہوا مگر ان کا اس بری طرح ہارنا اس کی مصلحتوں کے خلاف تھا، جنگ بلقان کے آغاز کے وقت اسوولسکی نے لکھا تھا: ”ترکوں کی کامل شکست سے اتحاد میں خلل پڑنے کا اندیشہ ہے۔“ وہ ترکی سلطنت کا خاتمہ بلقان کی ریاستوں کے ہاتھ سے نہیں بلکہ مغربی حکومتوں کے ہاتھ سے چاہتا تھا۔

(ب) بلغاریا والوں کی قابلیت اور منچلے پن سے بھی روس کو اندیشہ پیدا ہو گیا، اس کی اور فرانس کی نظر عنایت اب سرویا کی طرف زیادہ ہو گئی اور وہی آسٹریا کی سلطنت کا وارث قرار دیا گیا، بلغاریا کی طرف سے شبہ تھا کہ وہ آسٹریا سے ساز باز رکھتا ہے۔

(ج) فرانس اور انگلستان کو ترکی کی تباہی کا یقین ہو گیا، اس کی اہمیت ان کے نظر میں فوجی قوت کی وجہ سے تھی، اب انھیں اس سے مدد ملنے کی امید نہیں رہی اور انھوں نے یہ خیال چھوڑ دیا کہ اس سے بین الاقوامی ریاست کے کھیل میں درے کا کام لیں۔

(۲) ترکوں پر اس شکست کے جو اثرات ہوئے وہ اس سے بھی زیادہ گہرے تھے۔

(الف) شکست کی بڑی وجہ یہ تھیں، کامل پاشا کا ضعف جو بڑھاپے میں پیدا ہو گیا تھا، اس کی خود بینی، اس کا مغرب کی حکومتوں پر آنکھ بند کر کے بھروسہ کرنا جس کی وجہ سے اس نے اپنی آزمودہ کار فوج کو منتشر کر دیا، پرانے طرز کے افسروں کی عدم نااہلی اور بے تدبیری، نتیجہ یہ ہوا کہ یہ پرانے لوگ سپاہی اور مدبر دونوں کی حیثیت سے بے وقعت ہو گئے۔

(ب) شکست کی مصیبت تو تھی ہی، اس پر طرہ یہ ہوا کہ بلقانیوں نے مسلمانوں کی آبادی کو جو جنگ میں شریک نہ تھی اور جس میں زیادہ تر عورتیں، بچے اور بوڑھے تھے قتل کرنا شروع کیا اور یہ لوگ بھاگ بھاگ کر ترکی میں پناہ لینے لگے، اسیران جنگ کو قتل کرنا، ان کو فاقوں مارنا، ان کے ہاتھ پیر کاٹنا، عام باشندوں کو اذیت پہنچانا اور ان کا خون بہانا، ان سب چیزوں کی ابتداء مانہ حال کی لڑائی میں بلقانیوں نے مسلمانوں کے مقابلہ میں کی۔

(ج) مغرب ان ہولناک مظالم کو چپ چاپ دیکھتا رہا مگر جب بلقان کی ریاستوں نے ایک دوسرے کی عیسائی رعایا کے ساتھ بھی یہی حرکتیں شروع کیں تو مغرب سے مخالفت کی آواز اٹھی، دوسری جنگ بلقان کے بعد کارپینگی نے ایک بین الاقوامی کمیشن تحقیقات کے لیے بھیجا۔

جب ترک عورتوں نے استنبول کے یونیورسٹی ہال میں جمع ہو کر یورپ کی بادشاہ بیگموں سے اپیل کی تھی کہ انسانی ہمدردی کی خاطر بلقان کی مسلم آبادی کی حمایت کریں تو جو بے تک نہیں ملتا تھا، ترکوں نے دیکھا کہ مسلمانوں کی فریاد سے یہ بے اعتنائی

اور عیسائیوں کو اسی حال میں دیکھ کر یہ جوش و خروش تو ان پر بہت برا اثر ہوا، مقدونیا سے ہزار ہا مسلمان بھاگ کر اناطولیہ میں آتے تھے اور اپنی مظلومی کی داستان سناتے تھے اس کی وجہ سے اناطولیہ میں مسلمانوں اور عیسائیوں کے تعلقات جواب تک بہت اچھے تھے بہت خراب ہو گئے۔

دوم ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اس مصیبت میں سلطنت کی مسلمان رعایا میں باہمی ہمدردی اور محبت بڑھ جاتی، مگر ایسا نہیں ہوا، دوسرے ملکوں کے مسلمان بھائیوں کے ہم بے حد احسان مند ہیں، ہندوستان کے مسلمانوں نے ہر ممکن طریقہ سے مدد دی اور ہمدردی کا اظہار کیا مگر سلطنت کے اندر مسلمانوں میں تفریق کار حجان اور بھی قوی ہو گیا۔



جنگ عظیم

جنگ بلقان کے بعد نوجوان ترکوں نے اس بات کی پوری کوشش کی کہ اب جہاں تک ممکن ہو ملک کو جنگ کے مصائب سے دور رکھیں، ۱۹۰۸ء کے انقلاب کے بعد ہی سے ترکی پر حملے شروع ہو گئے تھے اور بوسنیا اور ہرزیگووینا کے نکل جانے کے علاوہ طرابلس اور بلقان کی جنگوں میں جو شدید نقصانات برداشت کرنے پڑے اور جن قیمتی مقبوضات سے دست بردار ہو جانا پڑا ان کی تلافی کا بظاہر کوئی امکان نہ تھا، نوجوان ترکوں نے ملک کی حاست کا اچھی طرح اندازہ کر لیا تھا اور اب وہ کسی جنگ میں حصہ لینے کے لیے تیار نہ تھے، یہی وجہ تھی کہ انھوں نے ترکی کے سب سے بڑے اور سب سے قدیم دشمن روس سے بھی مصالحت کرنے کی کوشش کی اور ۱۹۱۴ء میں اس غرض سے ایک مہم لیویڈیا میں زار کے پاس بھیجی، چنانچہ قسطنطنیہ میں ترکوں اور روسیوں کی ایک متحدہ انجمن بھی قائم ہو گئی اور ترکی اخباروں میں یہ بحث ہونے لگی کہ آبنائے باسفورس روسی جہازوں کے لیے کھول دیا جائے، اسی طرح فرانس اور انگلستان سے بھی دوستانہ تعلقات جو طرابلس اور بلقان کی جنگوں میں کشیدہ ہو گئے تھے دوبارہ قائم کرنے کی کوشش کی گئی، نوجوان ترکوں نے یونان سے بھی مصالحت کرنی چاہی اور ان کی طرف سے یہ تجویز پیش کی گئی کہ ”یونان کی مسلم ترکی رعایا کا مبادلہ ترکی کی یونانی رعایا سے کر لیا جائے تاکہ مقدونیا میں یونان اور ترکی کی مخالفت کا خاتمہ ہو جائے“ (۱) غرض جنگ بلقان کے بعد

(۱) ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش ص ۹۷

نوجوان ترکوں نے وہ سب کچھ کیا جو دوسری حکومتوں کی آویزش سے بچنے کے لیے ضروری تھا ورنہ اگر چند مہینوں کے بعد جنگ عظیم چھڑ نہ گئی ہوتی اور ترکی کو بھی بدرجہ مجبوری اس میں شامل نہ ہو جانا پڑتا تو بہت ممکن تھا کہ وہ تمام توقعات پوری ہو جائیں جو ۱۹۰۸ء کے انقلاب کے ساتھ قائم کر لی گئی تھیں۔

جنگ عظیم کی شرکت: اگست ۱۹۱۴ء میں جنگ عظیم چھڑ گئی، سلطنت عثمانیہ اس میں کسی فریق کا ساتھ دینے کے لیے مطلق آمادہ نہ تھی لیکن بعض ناگزیر اسباب سے مجبور ہو کر اسے کچھ دنوں کے بعد شرکت کرنی پڑی، وہ اسباب حسب ذیل تھے:

(۱) سلطنت عثمانیہ ان پابندیوں سے تنگ آ گئی تھی جو مراعات خصوصی (Capitulations) کے پردہ میں یوروپین حکومتوں نے اس پر عاید کر رکھی تھیں، یہ مراعات گزشتہ صدیوں میں سلاطین نے یوروپین باشندوں کو عطا کی تھیں، جن کے رو سے ان باشندوں کو بعض مخصوص عدالتی اور تجارتی حقوق حاصل تھے مثلاً یوروپین باشندوں کو جو سلطنت عثمانیہ میں قیام پذیر ہو گئے تھے، یہ حق حاصل تھا کہ وہ اپنے مقدمات اپنے ہم قوم حکام کے سامنے لے جائیں اور اپنے وطنی قوانین کے مطابق ان کا فیصلہ کرائیں، بشرطیکہ فریقین مقدمہ ایک ہی قوم کے ہوں، ۱۹۳۵ء کے بعد سے یوروپین ممالک کے سفیروں کو اپنے ہم قوم افراد پر دیوانی کے معاملات میں مکمل اختیارات دے دئے گئے تھے، یہاں تک کہ غیر ملکی باشندے اپنی خواہش کے باوجود عثمانی عدالتوں میں اپنے معاملات پیش نہیں کر سکتے تھے، تجارتی مراعات کی وجہ سے ترکوں کو بڑی دشواریوں کا سامنا تھا، بیرونی تاجر جہاں اور جس طرح چاہتے تھے اپنا کاروبار پھیلا دیتے تھے، وہ عثمانی قانون کے دائرہ سے باہر تھے، ان کے متعدد بینک بھی سلطنت کے مختلف حصوں میں کھلے ہوئے تھے، ان مراعات کے لحاظ سے یوروپین حکومتوں کو اپنے خاص ڈاک خانے قائم کرنے کا بھی حق حاصل تھا اور ان کے ڈاک خانے تمام سلطنت میں پھیلے ہوئے تھے، یہ ڈاک خانے چونکہ عثمانی حکام کی نگرانی سے بالکل آزاد تھے اس لیے ان

کے ذریعہ سے ممنوع اشیاء کی آمد و رفت بلا کسی روک ٹوک کے ہوتی رہتی تھی اور یہ عیسائی رعایا میں باغیانہ خیالات کے پھیلنے کا بھی ایک مستقل ذریعہ تھے، نو جوان ترکوں نے سلطان کی مطلق اعزانی سے آزادی حاصل کرنے کے بعد مراعات کے پھندے کو بھی اپنے گلے سے نکال دینا چاہا اور جنگ عظیم کے اعلان کے بعد جب انگلستان اور فرانس کی طرف سے ترکی کے غیر جانبدار رہنے کی خواہش کی گئی تو اس کے معاوضہ میں اتحادیوں کے سامنے مراعات کی منسوخی کا مسئلہ پیش کیا، لیکن اتحادی اس کے لیے تیار نہ ہوئے، وہ ترکی کو اس کی غیر جانبداری کا یہ معاوضہ دینا نہیں چاہتے تھے، نو جوان ترکوں کا اعتدال پسند عنصر اور ملک کی رائے عامہ اتحادیوں کی طرف مائل تھی لیکن جنگ بلقان کے بعد اتحادی ترکی کی فوجی قوت کو حقیر سمجھنے لگے تھے اور باوجود اس کے کہ بلقان کی ریاستوں کو اپنا طرفدار بنانے کے لیے وہ انتہائی کوشش کر رہے تھے، انھوں نے ترکی کو ساتھ لینے کی مطلق پروا نہ کی، ان کے اس طرز عمل کی وجہ بقول خالدہ خانم یہ بھی تھی کہ ”روس نے جو اتحادیوں میں شریک غالب کی حیثیت رکھتا تھا لڑائی چھیڑی ہی اس غرض سے تھی کہ ترکی کے حصے بخرے کر لیے جائیں۔“

(۲) ترکی کو سب سے زیادہ خطرہ روس کی طرف سے تھا، روس کی نگاہیں مدت سے قسطنطنیہ پر لگی ہوئی تھیں اور نو جوان ترک جانتے تھے کہ روس کی حمایت حاصل کرنے کے لیے انگلستان بے تکلف قسطنطنیہ کو پیش کر دے گا، سلطنت عثمانیہ کی تقسیم کے متعلق اتحادیوں کی باہمی مفاہمت خواہ ۱۹۱۵ء میں ہوئی جیسا کہ عام طور پر بیان کیا جاتا ہے یا ۱۹۱۴ء میں جیسا کہ نو جوان ترک سمجھ رہے تھے، اس میں شبہ نہیں کہ ترکی کی جانب سے اتحادیوں کی بے اعتنائی کا اصلی سبب یہی مسئلہ تھا، علاوہ بریں نو جوان ترک خوب سمجھتے تھے کہ اگر جنگ میں اتحادیوں کو فتح ہوئی تو روس سلطنت عثمانیہ کے حصے بخرے کرنے سے باز نہ رہے گا اور دولت علیہ کے استقلال کے وہ تمام دعوے طاق پر دھرے رہ جائیں گے جو غیر جانبداری کے معاوضہ میں اتحادیوں کی طرف سے کیے جا رہے تھے، اس بنا پر ترکی

کے لیے کوئی چارہ نہ تھا، بجز اس کے کہ اس فریق کا ساتھ دے جو روس کا مخالف ہو۔

(۳) سلطنت عثمانیہ کی عیسائی رعایا کی حمایت میں اتحادیوں نے ہمیشہ جس متعصبانہ ذہنیت کا ثبوت دیا تھا اور جس طرح علانیہ وہ عیسائیوں کی اقتصادی اور سیاسی برتری کو مسلم اکثریت کے مقابلہ میں قائم کرنے کی کوشش کر رہے تھے، اس نے بھی نوجوان ترکوں کو مخالف فریق کی جانب مائل ہونے پر مجبور کیا، برخلاف اس کے جرمنی سے انھیں اس قسم کی کوئی شکایت نہ تھی، برطانیہ نے جنگ کریمیا کے وقت سے دولت عثمانیہ کے ساتھ جو دوستانہ تعلقات قائم کیے تھے، ۱۹۰۷ء میں ان پر ایک کاری ضرب پڑ چکی تھی اور اس سال برطانیہ اور روس کے درمیان جو معاہدہ ہوا تھا اس نے اسلامی ممالک کو پہلے سے بھی زیادہ روس کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا، ۱۹۰۸ء کے انقلاب میں حکومت برطانیہ کا رویہ بہت ہی خشک رہا اور جنگ بلقان میں نہ صرف حکومت بلکہ برطانوی قوم بھی ترکوں کی مخالف رہی۔

(۴) نوجوان ترکوں کی ایک بااثر جماعت جس میں زیادہ تر فوج کے افسر تھے، جرمنی سے اتحاد کرنے کی حامی تھی، اس کی وجہ یہ تھی کہ جرمنی روس کا مخالف تھا اور روس سلطنت عثمانیہ کا قدیم دشمن تھا، جرمنی بھی ترکی کی حمایت کو اپنے لیے نہایت قیمتی خیال کرتا تھا اور سلطان عبدالحمید خاں کے زہ نہ ہی سے باب عالی میں اپنا رسوخ و اقتدار بڑھا رہا تھا، نوجوان ترکوں کے فوجی عنصر پر جرمن عسکریت کا اثر پوری طرح غالب تھا، خصوصاً انور پاشا جو فوجی پارٹی کے رکن اعظم تھے جرمنی کی حمایت میں سب سے زیادہ سرگرم تھے، یہ انہی کی کوشش کا نتیجہ تھا کہ ۲۸ اگست ۱۹۱۴ء کو جرمنی اور سلطنت عثمانیہ کے درمیان قسطنطنیہ میں ایک معاہدہ ہو گیا اور بیرون فان وائگن ہائم (Baron von wangenhem) اور صدر اعظم سعید حلیم پاشا نے اپنی حکومتوں کی طرف سے اس پر دستخط کر دیے، اس معاہدہ سے ظاہر ہے کہ ترک صرف روس کے مقابلہ میں جرمنی کی حمایت چاہتے تھے اور فرانس اور انگلستان کے خلاف کسی مدد کے طالب نہ تھے کیوں کہ

انھوں نے اس وقت تک فرانس یا انگلستان سے جنگ کرنے کا قصد بھی نہیں کیا تھا، چنانچہ صدر اعظم نے جرمنی اور اتحادیوں سے جنگ چھڑ جانے کے بعد بھی اس بات کا اعلان کر دیا تھا کہ جہاں تک انگلستان اور فرانس کا تعلق ہے ترکی غیر جانبدار رہے گا (۱) لیکن یہ معاہدہ بھی خفیہ تھا اور اس کا علم صرف تین آدمیوں کو تھا یعنی انور پاشا (وزیر حرب) طلعت پاشا (وزیر داخلہ) اور سعید پاشا (صدر اعظم) کو، جب مجلس وزرا کو اس کی اطلاع دی گئی تو اعتدال پسند فریق نے اس کی مخالفت کی، یہاں تک کہ بعض نے استعفا دے دیا استعفا دینے والوں میں جاوید بے بھی تھے، جو انجمن اتحاد و ترقی کے ایک نہایت ممتاز رکن اور وزیر مال تھے، اس معاہدہ کی پہلی دفعہ یہ تھی کہ فریقین آسٹریا ہنگری اور سرویا کی موجودہ لڑائی میں بالکل غیر جانبدار رہیں گے، لیکن چونکہ روس کی طرف سے خطرہ تھا کہ وہ سرویا کی حمایت کے لیے اٹھ کھڑا ہوگا اور ایسی صورت میں جرمنی اپنے سابق معاہدہ کے رو سے مجبور ہوگا کہ آسٹریا ہنگری کی مدد کرے، اس لیے معاہدہ کی دوسری دفعہ یہ رکھی گئی کہ اگر روس نے مداخلت کی اور جرمنی کو آسٹریا ہنگری کا ساتھ دینا پڑا تو ترکی پر بھی یہ ذمہ داری عاید ہوگی، معاہدہ کی چوتھی دفعہ یہ تھی کہ اگر روس نے ترکی مقبوضات پر حملہ کیا تو جرمنی ان کی مدافعت میں مدد دے گا اور اگر ضرورت ہوئی تو اپنی فوجوں سے کام لے گا، جوں ہی جرمنی نے روس کے خلاف اعلان جنگ کیا اس معاہدہ کی دوسری دفعہ ترکی پر عاید ہوگئی اور اسے بھی جرمنی اور آسٹریا ہنگری کا ساتھ دینا پڑا۔

(۵) لیکن ابھی تک فرانس اور انگلستان کے معاملہ میں ترکی نے پوری غیر جانبداری کا ثبوت دیا تھا، اس غیر جانبداری کی شکست خود حکومت برطانیہ کے ہاتھ سے عمل میں آئی، ترکی کے دو جنگی جہاز انگلستان کے ایک کارخانہ میں تعمیر ہو رہے تھے اور جنگ شروع ہونے سے قبل یہ تیار بھی ہو گئے تھے، چنانچہ ترکی بحریہ کے افسر اور جہاز راں ان کو لانے کے لیے انگلستان پہنچ گئے تھے لیکن جب جرمنی نے جنگ کا اعلان کیا تو

(۱) ترک اور یورپ از گاسٹون گیلرڈ (Gaston Gaillard) مطبوعہ لندن ص ۳۰-۲۹

حکومت برطانیہ نے ان جہازوں کو ضبط کر لیا، حالانکہ ان کی قیمت ادا کی جا چکی تھی اور اس وقت تک برطانیہ اور ترکی کے درمیان جنگ نہیں چھڑی تھی، چونکہ ان جہازوں کی قیمت زیادہ تر ترکوں کے چندوں سے فراہم کی گئی تھی، اس لیے ان کی ضبطی سے عوام میں برطانیہ کے خلاف ایک شورش پیدا ہو گئی، اس واقعہ کے بعد ہی جرمنی کے دو جنگی جہاز گو بن (Goeben) اور برسلا (Breslaw) دردنیاں اپنے آپ اور ترکی نے ان دونوں کو فوراً خرید لیا مگر ان کی کمان ابھی تک جرمن بحری افسروں کے ہاتھ میں تھی، اتحادیوں نے باضابطہ طور پر اعلان کر دیا تھا کہ اگر یہ جہاز آبنائے باسفورس سے نکلے تو بلا خیال اس کے کہ ان پر جرمن نشان ہے یا نہیں یا ان کے جہاز راں ترک ہیں انھیں دشمن کا جہاز سمجھا جائے گا، چنانچہ یہی ہوا کہ جب گو بن اور برسلا بحر اسود میں داخل ہوئے تو روسی جہازوں نے ان پر گولہ باری کی، مجبوراً دھڑ سے بھی جواب دیا گیا، اس پر ۴ نومبر کو روس نے اور ۵ نومبر کو انگلستان اور فرانس نے ترکی سے اعلان جنگ کر دیا، اسی روز برطانیہ نے جزیرہ سائپرس کو جو ۱۸۷۸ء کے معاہدہ کے رو سے اس کے قبضہ میں تھا باقاعدہ طور پر اپنی سلطنت میں شامل کر لیا، ۱۷ دسمبر ۱۹۱۳ء کو برطانیہ نے مصر پر اپنا تحمیہ (Protectorate) قائم کرنے کا بھی اعلان کیا اور خدیو عباس حلمی کے بجائے جو اس وقت قسطنطنیہ میں مقیم تھا اور ترکوں کا ہمدرد ہونے کی وجہ سے تخت سے علاحدہ کیے جانے کا مستحق قرار دیا گیا، سابق خدیو اسماعیل پاشا کے ایک لڑکے شہزادہ حسین کامل کو سلطان مصر کے خطاب سے تخت پر بٹھایا، مصر پر محمیہ قائم کرنے کے لیے چونکہ فرانس اور روس کو راضی رکھنا ضروری تھا اس لیے باہم یہ مفاہمت ہوئی کہ جنگ کے خاتمہ پر برطانیہ روس کو قسطنطنیہ آبنائے باسفورس اور دردنیاں پر قبضہ کرنے دے گا اور فرانس کو شام پر۔ (۱)

دردنیاں کی مہم: جنگ عظیم میں ترکی کی شرکت نے اتحادیوں (برطانیہ، فرانس، روس) کے لیے سخت دشواریاں پیدا کر دیں، جنگ بلقان کی شکستوں کے باوجود ترکوں کی فوجی

قابلیت اور جس بازی کا تجربہ انھیں بارہا ہو چکا تھا اور اب جرمنی سے اسلحہ اور دیگر سامان جنگ کی مدد پہنچنے سے ترکی فوجوں کی قوت میں بہت کچھ اضافہ ہو گیا تھا، لیکن سب سے زیادہ جو چیز اتحادیوں کے لیے باعث تشویش ثابت ہوئی وہ یہ تھی کہ ترکی نے آبنائے باسفورس اور دردانیال کو غنیم کے جہازوں کے لیے بند کر دیا، جس کی وجہ سے برطانیہ اور فرانس کا تعلق روس سے منقطع ہو گیا، روس ایک غیر صنعتی ملک تھا اور چند ہی دنوں میں یہ ظاہر ہو گیا کہ جب تک انگلستان اور فرانس کے کارخانوں سے کافی سامان جنگ اسے برابر فراہم نہ ہوتا رہے وہ زیادہ مدت تک جدید طرز کی جنگ کو جاری نہیں رکھ سکتا (۱) صورت حال اب یہ تھی کہ یا تو اتحادی دردانیال اور آبنائے باسفورس کا بند توڑیں یا روس کو غنیم کے رحم و کرم پر چھوڑیں، چنانچہ ۱۹ فروری ۱۹۱۵ء کو برطانیہ اور فرانس کے جنگی جہازوں نے دردانیال کے بیرونی قلعوں پر گولہ باری شروع کی، تجویز یہ تھی کہ یہ جہاز دردانیال میں بحیرہ داخل ہو کر براہ راست قسطنطنیہ پہنچیں اور دارالسلطنت پر قبضہ کر کے ترکی کا خاتمہ کر دیں، یہ تجویز مسٹر ونسن چرچل برطانوی وزیر بحریہ کے دماغ کی آج تھی، جس سے بقول لارڈ ایورسلے بحری جنگ کے بہترین ماہروں کو کبھی بھی پورا اتفاق نہ تھا (۲)، بہر حال اس مہم میں سخت ناکامی ہوئی اور حملہ آوروں کے متعدد جہاز غرق ہو گئے اس کے بعد ۵۷ سے ۷۷ مارچ تک دشمنوں کے متحدہ جنگی بیڑے نے دردانیال پر دوبارہ حملہ کیا، ترکوں نے دردانیال کے قلعوں کو اس طرح مستحکم کیا تھا کہ اتحادی بیڑے کی تمام کوششیں بے کار ثابت ہوئیں، اتنا ہی نہیں بلکہ ترکی قلعوں کے گولوں سے اتحادیوں کے تقریباً پچاس ہزار سپاہی ہلاک ہوئے اور ان کے جنگی جہازوں کی ایک بڑی تعداد غرق ہو گئی اور بہتیرے جہاز بری طرح زخمی ہوئے۔

معرکہ گیلی پولی: ان شکستوں کے بعد اور اتنا نقصان اٹھا کر اتحادیوں کو معلوم ہو گیا کہ یہ مہم صرف جہازوں کے ذریعہ کامیاب نہیں ہو سکتی، چنانچہ اب برطانیہ اور فرانس کے

ماہرین حرب نے ایک دوسری تدبیر سوچی، وہ یہ کہ زیادہ زور بری حملہ پر دیا جائے اور بری فوجوں کی مدد سے یہ مہم سر کی جائے یعنی جزیرہ نماے گیلی پولی کے مغربی اور جنوبی ساحلوں پر فوجیں اتار کر دردنیاں کے قلعوں پر پشت کی جانب سے حملہ کیا جائے، اس کے لیے بڑی بڑی تیاریاں ہوئیں، برطانیہ، فرانس، آسٹریلیا اور ہندوستان کے بہترین سپاہی بلائے گئے، مئی ۱۹۱۵ء میں اٹلی بھی اتحادیوں کے ساتھ جنگ میں شریک ہو گیا اور اس کے فوجی دستے بھی اس مہم کی شرکت کے لیے پہنچے، معلوم ہوتا تھا کہ جنگ کا فیصلہ اسی معرکہ پر مبنی ہے، ۲۵ اپریل کو برطانیہ اور آسٹریلیا اور ہندوستان کی فوجیں ہزاروں چیمیں تلف کر کے بمشکل تمام آبنائے گیلی پولی کے یوروپین ساحل پر اتریں اور اسی طرح شدید نقصان اٹھانے کے بعد ایک فرانسیسی فوج آبنائے کے ایشیائی ساحل پر اتری پھر بھی مئی کے آخر تک بجز اس کے کہ حملہ آوروں کے چالیس ہزار آدمی مارے گئے اور کچھ حاصل نہ ہوا (۱)، ایشیائی ساحل پر جو فوج اتری تھی اسے بہت جلد بھاگنا پڑا، اب سارا زور گیلی پولی کے مغربی ساحل پر تھا، گیلی پولی میں ترکی فوجوں کی کمان جرمن جنرل لیمان سائڈرس کے ہاتھ میں تھی، اتحادی فوجوں نے پوری قوت کے ساتھ چارز بردست حملے کیے، پہلا حملہ ۱۸ مئی سے ۲۴ مئی تک قائم رہا، دوسرا ۲۶ مئی سے ۸ مئی تک، تیسرا ۲۱ جون کو ہوا اور چوتھا ۲۸ جولائی کو، اتحادی فوجیں اری برون کے مقام پر اتریں جو چناق بیر کی پہاڑی کے دامن میں واقع ہے اور وہاں سے چناق کی طرف بڑھنا شروع کیا، چناق بیر کی پہاڑی اس محاذ کی کٹختی تھی، مصطفیٰ کمال اس وقت وادی میڈوس میں اپنے دستے کے ساتھ خیمہ زن تھے، جس وقت ان کو معلوم ہوا کہ اتحادی چناق بیر کی طرف بڑھ رہے ہیں وہ فوراً پہاڑی پر قبضہ کرنے کے لیے روانہ ہو گئے اور وہاں پہنچتے ہی آسٹریلین فوج کے دستے پر جو بڑھتا ہوا چلا آ رہا تھا گولہ باری شروع کر دی، تمام دن دونوں طرف سے گولی باری ہوتی رہی اور اتحادی فوج پہاڑی کے دو تہائی حصہ تک پہنچ کر رک گئی،

رات میں بھی مصطفیٰ کمال نے گولہ باری جاری رکھی، وہ چاہتے تھے کہ اتحادی فوج کو ہٹا کر ساحل تک بھگادیں لیکن اس میں کامیابی نہیں ہوئی، چناق بیر کی پہاڑی حقیقتاً دردانیال کی کٹی تھی اور دردانیال پر قبضہ کرنا گویا قسطنطنیہ پر قابض ہو جانا تھا، جب فریقین میں سے کوئی بھی اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوا تو دونوں نے خندقیں کھود کھود کر حملہ و حفاظت کی تدبیریں شروع کیں، چند ہفتے اسی حالت میں گزر گئے اور دونوں فریق اپنی اپنی جگہ پر قایم رہے، اب گرمی زیادہ پڑنے لگی تھی، پانی کا فراہم ہونا دشوار ہو رہا تھا، اٹاشیں پڑی سڑ رہی تھیں اور سپاہیوں میں ہیضہ پھیل رہا تھا، اخیر جولائی تک یہ بات واضح ہو گئی کہ اتحادی فوج ایک بڑے حملہ کی تیاری کر رہی ہے، اس حملہ کے لیے مصر سے تازہ دم فوجیں اور سامان حرب کی ایک کثیر مقدار لائی جا رہی تھی، مقصد یہ تھا کہ خوجہ چسن کی چوٹی پر قبضہ کر لیا جائے، جو چناق بیر کے شمال میں واقع تھی اور مصطفیٰ کمال کی خندقوں کی زد سے باہر تھی، اس چوٹی پر قابض ہو جانے کے معنی یہ تھے کہ ترکوں کے حملہ سے محفوظ ہو کر دردانیال پر قبضہ ہو جاتا، ایک ہفتہ سے روز رات کو اتحادی فوجیں آ کر خندقوں میں چھپتی جا رہی تھیں، ۲۲ اگست کی تاریک رات میں حملہ شروع ہوا، یہ حملہ تمام سابق حملوں سے زیادہ شدید تھا، اس میں ”کچنر آرمی“ بھی شامل تھی جو اتحادیوں کی سب سے زیادہ مضبوط فوج سمجھی جاتی تھی، جنگی جہاز الزبتھ اور دوسرے سینکڑوں بڑے بڑے جہاز دوسری طرف سے حملہ آور ہوئے، لیکن عین اس وقت جب اتحادی بیڑا فتح کی آخری منزل کے قریب تھا ترکی اور جرمن جہازوں نے الزبتھ اور دوسرے اتحادی جہازوں کی ایک بہت بڑی تعداد غرق کر دی، البتہ کچنر آرمی آری برون کی چوٹی کی طرف بڑھنے میں کسی قدر کامیاب ہوئی، اتحادی جہازوں نے پھر گولہ باری شروع کی، ترکی فوجوں کا شیرازہ منتشر ہو چکا تھا لیکن آری برون پر قبضہ کرنا نہایت ضروری تھا، ورنہ اس کے بعد اتحادی الفنز اپر قابض ہو جاتے اور پھر گیلی پولی پر قبضہ کر لین آسان تھا، اس نازک گھڑی میں ترکی فوجوں نے وطن کی مدافعت میں جیسی جان بازی دکھائی اس کی مثال خود ان کی

تاریخ میں بھی کم ملتی ہے، اتحادی سارا زور آری جہوں کی چوٹی پر قبضہ کرنے کے لیے گارہے تھے، ترکی فوجوں کے سپہ سالار اعظم جنرل سنڈرس نے اس محاذ کی کمان مصطفیٰ کمال کو دے دی، لڑائی کا سلسلہ کئی روز تک جاری رہا، آخر کار اتحادی ہزاروں ایشیائی میدان میں چھوڑ کر پسپا ہوئے، اتنی زبردست شکست انھیں اب تک پیش نہ آئی تھی، اس معرکہ میں مصطفیٰ کمال کی غیر معمولی فوجی قابلیت کا سکہ تمام دنیا پر بیٹھ گیا، ۷ اکتوبر ۱۹۱۵ء کو سر آئن ہیملٹن (Sir Ian Hemilton) نے اتحادی فوجوں کی کمال سرسی سی منرو (Sir C. C. Munro) کو سپرد کی، لیکن یہ سپہ سالار بھی حالات کو بہتر بنانے میں ویب ہی ناکام ثابت ہوا جیسا اس کا پیشہ و ہو چکا تھا، اتحادی، ہرین حرب کو مجبوراً فیصلہ کرنا پڑا کہ گیلی پولی کی مہم سر نہیں ہو سکتی، نومبر میں لارڈ کچنر گیلی پولی آئے مگر وہ بھی اس فیصلہ میں کوئی ترمیم نہ کر سکے، چنانچہ دسمبر کے آخری ہفتہ کی تاریک راتوں میں جبکہ موسم کی شدت اپنے شباب پر تھی اتحادی فوجوں نے نہایت خاموشی کے ساتھ بھاگنا شروع کیا اور جنوری ۱۹۱۶ء کے پہلے ہفتہ تک تمام فوجیں نکل گئیں، اس مہم میں اتحادیوں کے مقتولین اور مجروحین کی تعداد ایک لاکھ بارہ ہزار تھی (۱) ترکوں کو بھی بہت زیادہ نقصان پہنچا، لیکن دنیا نے دیکھ لیا کہ یورپ کا ”مرد بیمار“ اپنے انتہائی ضعف کی حالت میں بھی کتنی حیرت انگیز طاقت کا مالک ہے۔

ایشیائے کوچک: دوسرے محاذوں پر ترکی فوجوں کو ایسی شاندار کامیابی حاصل نہ ہو سکی، اعلان جنگ کے بعد فوراً ہی ترکی فوجیں بحر اسود میں روسی جہازوں پر حملہ آور ہوئیں اور اس کے بعد قارص اور تفلس کی طرف بڑھیں، لیکن روس نے ایشیائے کوچک میں ولایت آرمینیا پر حملہ کر کے بائزید، کوپری کوئی، اردہان اور ساری کمیشن پر قبضہ کر لیا، ترکوں نے دلیری سے مقابلہ کیا، لیکن آرمینیوں کی غداری کے باعث انھیں ۲۱ اور ۲۲ دسمبر ۱۹۱۴ء کو پسپا ہونا پڑا (۲)، ۱۹ مئی ۱۹۱۵ء کو وان پر بھی روسیوں کا قبضہ ہو گیا، پھر دوسرے سال،

(۱) لارڈ ایورسلے ص ۳۸۰ (۲) ”ترک اور یورپ“ از گیلارڈ ص ۳۴

ارض روم، موش، بطلس، طرابزون اور ارزنجان بھی ترکوں کے ہاتھ سے نکل گئے، اس طرح جولائی ۱۹۱۶ء تک ارض روم، وان، طرابزون اور بطلس کے صوبوں پر روسی فوجیں قابض ہو گئیں ۱۹ جنوری ۱۹۱۵ء کو ترکوں نے تبریز فتح کر لیا تھا، لیکن ان شکستوں کی وجہ سے وہ زیادہ دنوں تک تبریز پر قابض نہ رہ سکے اور ایرانیوں نے پھر اس پر قبضہ کر لیا۔

عراق: عراق میں بھی ترکی فوجوں کی حالت کچھ زیادہ بہتر نہ تھی، ۸ نومبر ۱۹۱۴ء کو انگریزی فوج ایک ہندوستانی پلٹن کے ساتھ شط العرب میں اتری اور ۱۷ نومبر کو سیمان کی لڑائی میں کامیاب ہونے کے بعد ۲۲ نومبر کو بصرہ اور ۵ دسمبر ۱۹۱۴ء کو کارنا پر قابض ہو گئی، جو جلد اور فرات کے سنگم پر واقع ہے، دوسرے سال ۲۹ ستمبر ۱۹۱۵ء کو اس نے قط العمارہ بھی فتح کر لیا، اس کے بعد انگریزوں نے بغداد کی طرف بڑھنے کا قصد کیا، لیکن اس درمیان میں تازہ ترکی دستے عراق پہنچ گئے تھے اور انگریزی سپہ سالار جنرل ٹاؤنسنڈ (Townsend) کو بہت زیادہ نقصان اٹھانے کے بعد پیچھے ہٹنا پڑا، ترکی فوج نے تعاقب کیا اور جنرل ٹاؤنسنڈ نے قط العمارہ میں پناہ لی، ۵ ستمبر ۱۹۱۵ء کو ترکوں نے قط العمارہ کا محاصرہ شروع کیا اور ساڑھے چار مہینے تک محاصرہ جاری رہا، آخر مجبور ہو کر ۲۹ اپریل ۱۹۱۶ء کو جنرل ٹاؤنسنڈ نے ہتھیار ڈال دئے اور وہ مع اپنی فوج کے قید کر لیا گیا، وہ قسطنطنیہ لے جا کر نظر بند کر دیا گیا، جہاں اسے ہر طرح کی آزادی حاصل تھی، بجز اس کے کہ وہ حدود شہر کے باہر نہیں جاسکتا تھا، اس کی نظر بندی جنگ کے اختتام تک قائم رہی، قط العمارہ کی کامیابی نے عراق میں ترکوں کی سابق شکستوں کی ایک حد تک تلافی کر دی، لیکن اس کے بعد جنرل ماڈ (Maude) نے پھر حملہ کی تیاری شروع کی اور ۲۳ فروری ۱۹۱۷ء کو انگریز دوبارہ قط العمارہ پر قابض ہو گئے، ترک لڑتے ہوئے پیچھے ہٹے، دوسرا معرکہ بغداد میں پیش آیا اور ۱۱ مارچ ۱۹۱۷ء کو بغداد بھی ترکوں کے ہاتھ سے نکل گیا، ۱۹ مارچ کو انگریزی سپہ سالار نے عراق کے باشندوں کے نام ایک اعلان شایع کیا اور انھیں اطمینان دلایا کہ انگریز ان پر حکومت کرنے کی غرض سے نہیں بلکہ انھیں

آزاد کرنے کے لیے عراق میں آئے ہیں (۱) اہل عراق کو اس آزادی کا جو تجربہ ہوا اسے وہ کبھی نہ بھوئیں گے۔

عرب کی بغاوت :- انگریزوں نے ترکوں کے خلاف سازش کا ایک زبردست جال پھیلا رکھا تھا، بغداد کی شکست سے تقریباً ایک سال قبل ۱۰ جون ۱۹۱۶ء کو شریف حسین نے عرب میں ترکوں کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور ۱۳ جون کو مکہ معظمہ اور مکہ جو اہل کو جدہ پر قبضہ کر لیا، کنٹرل لارنس کی برسوں کی خفیہ کوششیں بار آور ہوئیں، حکومت برطانیہ نے عربوں کی سرپرستی فرمائی اور انھیں ترکی حکومت سے آزادی حاصل کرنے میں پوری مدد دی، اکتوبر ۱۹۱۶ء میں شریف حسین نے اپنے شاہ جاز ہونے کا اعلان کیا اور ۱۶ دسمبر کو حکومت برطانیہ نے اس کی مستقل بادشاہت کو باضابطہ طور پر تسلیم کر لیا، اس کا لڑکا امیر فیصل عربی فوجوں کو لے کر ترکوں کے مقابلہ میں شام کی طرف بڑھا، کنٹرل لارنس اور دوسرے انگریز افسر اس کے ساتھ تھے، شام میں ترکوں کی شکست کا ایک بڑا سبب عربوں کی بغاوت اور ان کا انگریزوں سے مل جانا تھا، برطانیہ نے شریف حسین کو اسلحہ اور روپیہ سے خوب مدد دی، ایسے نازک وقت میں عربوں کا یہ فعل نہ صرف فوجی حیثیت سے دولت عثمانیہ کے لیے مضرت ثابت ہوا بلکہ اس کا اخلاقی اثر بھی برا پڑا، چنانچہ ”پان اسلامزم“ کی تحریک کو جسے دنیاے اسلام کی ہمدردی حاصل کرنے کیلئے نوجوان ترکوں نے جنگ شروع کرنے کے بعد پھر جاری کر دیا تھا اس سے سخت نقصان پہنچا، ترکی کے ساتھ اسلامی دنیا کی ہمدردی کا ایک بڑا سبب یہ تھا کہ اس کا سلطان حریم شریفین کا خادم بھی تھا، اگرچہ خلافت کی بنیاد تمام تر اسی خدمت پر نہ تھی تاہم خلافت جب سے دولت عثمانیہ میں آئی حریم کی خدمت کا شرف بھی برابر اسے حاصل رہا، اب چونکہ مکہ معظمہ پر شریف حسین کا قبضہ تھا اور مدینہ منورہ بھی باغیوں سے گھرا ہوا تھا، اس لیے سلطان کی خلافت کا مسئلہ معرض بحث میں آگیا اور ”پان اسلامزم“ کی تحریک جو خلافت ہی پر قائم تھی کمزور ہو گئی۔

مصر: مصر میں بھی ترکوں کو زیادہ کامیابی حاصل نہ ہو سکی، فروری ۱۹۱۵ء میں جمال پاشا نے نہر سوئز کو عبور کرنے کی کوشش کی، لیکن اس وقت تک انگریزوں نے نہ صرف ہندوستان بلکہ آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے فوجی دستے بھی اس محاذ پر مڑا لیے تھے، برطانوی اور فرانسیسی جنگی جہاز پہلے سے نہر کی حفاظت کے لیے موجود تھے، اگر ترکوں نے اعلان جنگ کے بعد ہی سوئز کو عبور کرنے کی کوشش کی، ہوتی تو وہ آسانی سے کامیاب ہو جاتے، لیکن تین ماہ کی تاخیر نے انگریزوں کو مدافعت کا کافی موقع دے دیا اور جمال پاشا کو شکست کھا کر پسپا ہونا پڑا، دوسرے سال جولائی میں ترکوں نے مصر پر حملہ کرنے کی پھر کوشش کی لیکن نہر سوئز کے قریب رومانی کی جنگ میں انھیں شکست ہوئی، اس کے بعد امیر فیصل کی فوج انگریزی دستوں کے ساتھ شام کی طرف بڑھی، جس کی وجہ سے ترکوں کو مصر کا خیال ترک کر دینا پڑا۔

بالٹوئیک انقلاب مارچ ۱۹۱۷ء: ۱۳ مارچ ۱۹۱۷ء کو روس میں ”بالٹوئیک انقلاب“ برپا ہوا اور ۱۶ اپریل ۱۹۱۷ء کو امریکہ نے اتحادیوں کے ساتھ جنگ میں شریک ہونے کا اعلان کیا، روسی انقلاب سے اتحادیوں کی قوت کو جو نقصان پہنچا، اس کی تلافی امریکہ نے کر دی، لیکن یہ انقلاب ترکوں کے لیے بہت مفید ثابت ہوا، انھوں نے ان تمام علاقوں کو جس پر روسی فوجوں کا قبضہ ہو چکا تھا واپس لے لیا اور اس کے بعد خود روسی علاقوں میں بڑھنے کی تیاری شروع کی، چنانچہ انور پاشا ایک فوج لے کر کوہ قاف سے محاذ پر پہنچ گئے۔

شام و فلسطین: یہ وہ زمانہ تھا جب اتحادی فوجیں شام اور فلسطین پر حملہ کرنے کی تیاری کر رہی تھیں، شام میں ترکی فوجوں کی کمان جمال پاشا کے ہاتھ میں تھی جو مصر کے محاذ سے واپس آ چکے تھے، مارچ اور اپریل ۱۹۱۷ء میں انگریزی فوج پوری قوت کے ساتھ غزہ پر حملہ آور ہوئی، لیکن دو ماہ کی مسلسل کوشش کے بعد بھی آگے نہ بڑھ سکی، اس کے بعد ہی انور پاشا ایک فوج کے ساتھ کوہ قاف کی طرف روانہ ہو گئے، جس کی وجہ سے شام کے محاذ پر ترکوں کی قوت کمزور ہو گئی اور انگریزی فوج آگے بڑھنے لگی، چنانچہ

۳۱ اکتوبر ۱۹۱۷ء کو انگریزوں نے بیرشہ پر قبضہ کر لیا اور ایک ہی ہفتہ کے بعد ۷ نومبر کو غزہ بھی فتح ہو گیا، غزہ کی تسخیر نے شام کا راستہ صاف کر دیا اور انگریزی فوج شام اور فلسطین کے تمام اہم مقامات پر یکے بعد دیگرے قابض ہوتی گئی، چنانچہ ۹ دسمبر ۱۹۱۷ء کو یروشلم نے ہتھیار ڈال دئے اور جنرل البنی ایک فاتح کی حیثیت سے بیت المقدس میں داخل ہوا، لیکن اس مقام کا اتنا احترام ٹھوکر کھا کہ پیدل داخل ہوا، بیت المقدس کی فتح سے تمام مسیحی یورپ میں مسرت و شادمانی کی ایک لہر دوڑ گئی، صدیوں کی پیہم کوشش کے بعد صیہبی علم اس ارض پاک پر ایک بار پھر لہرانے لگا، ستمبر ۱۹۱۸ء میں جنرل البنی (Allenby) عکہ اور حیفہ پر قابض ہو گیا، اس کے بعد ۲۸ ستمبر کو عربی فوج انگریزی فوج سے آملی اور کیم اکتوبر ۱۹۱۸ء کو امیر فیصل اور جنرل البنی دمشق میں داخل ہوئے، ۶ اکتوبر کو فرانیسی بیڑہ بیروت کی بندرگاہ میں پہنچا اور دوسرے روز بیروت بھی اتحادیوں کے قبضہ میں آ گیا، پھر ۱۳ اکتوبر کو طرابلس، ۱۵ اکتوبر کو حلب کا آخری مورچہ بھی اتحادیوں نے فتح کر لیا یعنی اکتوبر ۱۹۱۸ء کے آخر تک حجاز، شام، لبنان اور عراق عرب کے تمام علاقے ترکوں کے ہاتھ سے نکل کر اتحادیوں کے تسلط میں آ گئے۔

صلح نامہ مدرس: شام ترکی فوجوں کا آخری محاذ تھا، حلب کے معرکہ کے بعد ترکوں کی قطعی شکست میں کوئی شبہ باقی نہ رہا، جنگ کے آغاز میں ترکی نے دس لاکھ سے زیادہ فوج میدان میں بھیجی تھی، چار سال کے اندر چار لاکھ ستائیس ہزار سپاہی مارے گئے، چار لاکھ زخمی ہوئے اور ایک لاکھ تیرہ ہزار قید کر لیے گئے یا مفقود الغیر پائے گئے (۱)، مال کا جو نقصان ہوا اس کا اندازہ بھی مشکل ہے، تاہم ترکی نے جو کچھ کر دکھایا، اس نے دنیا کو حیرت میں ڈال دیا، یورپ کو ترکوں کی فوجی قوت سے اتنی توقع نہ تھی، اتحادی سمجھ رہے تھے کہ چند مہینوں کے اندر ترکی کا خاتمہ کر دیں گے اور اس کے حصے بخرے کر کے آپس میں تقسیم کر لیں گے، اسی وجہ سے انھوں نے دردنیاں کے حمد پر اپنی پوری قوت

صرف کردی تھی اور یہی اس جنگ کا سب سے اہم مورچہ تھا، تاہم ترکوں نے جس ہیرت انگیز سرفروشی کے ساتھ درانیال کو دشمنوں کے حملہ سے محفوظ رکھا وہ تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا، لیکن شام کی پیہم شکستوں کے بعد یہ ظاہر ہو گیا کہ ترک جنگ کو جاری نہیں رکھ سکتے، حلب کی جنگ سے تقریباً ایک ماہ قبل ۳۰ ستمبر کو بلغاریا نے جو ترکی اور جرمنی کا حریف تھا، اتحادیوں کے سامنے بغیر کسی شرط کے ہتھیار ڈال دئے تھے اور خود جرمنی بھی میدان جنگ سے علاحدہ ہو رہا تھا، ایسی صورت میں جبکہ اس کے حلیفوں کی قوت بھی بالکل ٹوٹ چکی تھی، ترکی کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ اتحادیوں سے صلح کی خواہش کرے، صلح کی گفتگو کے لیے رؤف بے وزیر، عریہ، رشاد حکمت بے نائب وزیر خارجہ اور سعد اللہ بے تھرڈ آرمی کے جنرل اسٹاف کے صدر روانہ کیے گئے، ۳۰ اکتوبر ۱۹۱۸ء کو ترکوں اور اتحادیوں کے درمیان مدرس کے مقام پر عارضی صلح کے شرائط طے ہو گئے اور صلح نامہ پر فریقین نے دستخط کر دئے، اس درمیان میں انور پاشا، جمال پاشا اور طلعت پاشا نیز انجمن اتحاد و ترقی کے بہت سے ممبر یہ دیکھ کر کہ وہ ملک کو اب کسی طرح بچ نہیں سکتے اور نہ ان شرائط پر راضی ہو سکتے جو اتحادیوں کی طرف سے عاید کی جائیں گی، ترکی سے باہر چلے گئے اور حکومت کی ذمہ داری ایسے لوگوں کے ہاتھ میں چھوڑ گئے جو اس نازک وقت میں کسی طرح اس کے اہل نہ تھے، یوں ۱۹۱۸ء میں انجمن اتحاد و ترقی کا خاتمہ ہو گیا اور اس کے لیڈروں نے ملک سے روپوش ہو کر خود انجمن کے اقتدار کو ہمیشہ کے لیے مٹا ڈالا۔

عارضی صلح کے بعد اتحادی فوجوں نے قسطنطنیہ، ملیشیا اور چناق پر قبضہ کر لیا، ترکی فوجیں یہ سمجھ کر کہ یہ قبضہ عارضی ہے اور صلح نامہ پر دستخط ہونے کے بعد ختم ہو جائے گا منتشر ہونے لگیں، لیکن چند ہی مہینوں کے بعد انھیں معلوم ہو گیا کہ وہ دھوکے میں ہیں، کیونکہ جب اتحادیوں نے یہ دیکھا کہ ترکی کی فوجی قوت ٹوٹ چکی ہے اور تمام ملک میں اتری پھیلی ہوئی ہے تو ان خفیہ معاہدوں کی تکمیل کا حوصلہ پیدا ہوا جو باہم دوران جنگ میں کیے گئے تھے، پروفیسر ٹوائن بی (Toynbee) نے اپنی کتاب ”ترکی“ میں لکھا ہے

کہ ”جس طرح بھوکے بھڑیئے شکار کی تاک میں خیمہ گاہ کے گرد چکر کاٹتے ہیں اسی طرح اتحادی طاقتیں اس فکر میں تھیں کہ موقع پا کر ترکی پر ٹوٹ پڑیں کیوں کہ ترکی فطرتاً ایک زرخیز ملک ہے اور شہنشاہیت حریص واقع ہوئی ہے“ (۱)، وہ خفیہ معاہدے ذیل تھے:

خفیہ معاہدے: پہلا معاہدہ جو ”معاہدہ قسطنطنیہ کے نام سے مشہور ہے ۱۸ مارچ ۱۹۱۵ء کو برطانیہ، فرانس اور روس کے درمیان ہوا تھا، یہ خاص طور پر قسطنطنیہ، آبنائے باسفورس اور دردنایال سے متعلق تھا، طے یہ پایا تھا کہ روس، قسطنطنیہ، باسفورس کے دونوں ساحلوں اور بحیرہ مارہور اور دردنایال کے مغربی ساحل پر قبضہ کر لے، لیکن اس شرط کے ساتھ کہ قسطنطنیہ کی بندرگاہ اتحادیوں کے تجارتی جہازوں کے لیے کھلی رہے، دوسری دفعہ یہ تھی کہ ایران کا نام نہاد ناقابل مداخلت خطہ (Neutral zone) جس کی تصریح ۱۹۰۷ء کے معاہدہ روس و انگلستان میں ہو چکی تھی اور جوتیل کے چشموں کی وجہ سے ایک نہایت قیمتی خطہ تھا برطانیہ کے حلقہ اثر میں رکھا جائے، تیسری دفعہ کے مطابق یہ طے ہوا کہ مسلمانوں کے مقدس مقامات دولت عثمانیہ سے نکال کر ایک خود مختار اسلامی حکومت کو دے دیے جائیں، آخری دفعہ میں روس نے وعدہ کیا کہ اگر ضرورت ہوگی تو دردنایال کے حملہ میں حکومت روس اتحادیوں کی مدد کرے گی۔

دوسرا معاہدہ ”لندن کا خفیہ معاہدہ“ تھا، جس پر ۲۶ اپریل ۱۹۱۵ء کو اٹلی، فرانس، برطانیہ اور روس کے نمائندوں نے دستخط کیے تھے، یہ معاہدہ اٹلی کو جنگ میں شریک کرنے کی غرض سے کیا گیا تھا اور اس میں ایشیائی ترکی کی تقسیم کے وقت اٹلی کو بعض خاص علاقے دینے کا وعدہ کیا گیا تھا، مثلاً اعدایہ کا صوبہ اور اس سے متصل بحر روم کے ساحلی علاقہ کا ایک ”معقول“ حصہ۔

تیسرا ”معاہدہ سائیکس پیکو“ (Sykas Picot Agreement) جس پر ۱۶ مئی ۱۹۱۶ء کو دستخط ہوئے تھے، برطانیہ، فرانس اور روس کے درمیان ہوا تھا اور اس میں

سلطنت عثمانیہ کی تقسیم کی تجویزیں مرتب کر لی گئی تھیں اس میں سب سے پہلے عربوں کو دولت علیہ سے باغی کرنے کی تجویز پیش کی گئی تھی اور یہ طے پایا تھا کہ عربوں کی ایک مستقل خود مختار حکومت یا عرب مملکتوں کی ایک وفاقی حکومت قائم کر دی جائے پھر فرانس اور انگلستان کے حلقہ ہائے اثر طے کر لیے گئے تھے اور بعض علاقوں پر قابض ہونے کی اجازت روس کو دے دی گئی تھی، ہندو گاہوں اور ریلوے کے متعلق بعض مخصوص حقوق بھی باہم طے کر لیے گئے تھے۔

چونکہ اٹلی اس وقت تک جنگ میں اتحادیوں کے ساتھ شریک ہو چکا تھا، اس لیے اس نے ”معاهدہ سائیکس پیکو“ کے متعلق فوائد میں بھی شریک ہونے کا مطالبہ کیا اور برطانیہ اور فرانس کو بادل ناخواستہ سلطنت عثمانیہ کی کاغذی تقسیم میں اسے بھی شریک کرنا پڑا، چنانچہ ۱۷ اپریل ۱۹۱۷ء کو انگلستان، فرانس اور اٹلی کے درمیان ”سین ژان مارین“ (St. Jean de maurunno) کا معاہدہ طے ہوا، جس میں ایشیائے کوچک کے مغربی علاقوں پر اٹلی کا حلقہ اثر تسلیم کیا گیا، اس خطہ میں سمرنا بھی شامل تھا، لیکن اس معاہدہ کے قطعی طور پر مکمل ہونے کے لیے روس کے دستخط بھی ضروری تھے اور چونکہ اسی زمانہ میں ”بالٹویک انقلاب“ کے رونما ہو جانے سے روس کی شہنشاہی حکومت کا خاتمہ ہو گیا اور اس کے دستخط حاصل نہ ہو سکے، اس لیے یہ معاہدہ نامکمل رہ گیا اور قانوناً قابل نفاذ قرار پایا، ”صلح کانفرنس“ میں جب انگلستان اور فرانس نے مغربی ایشیائے کوچک اور سمرنا میں یونانیوں کو تسلط دینا چاہا اور اٹلی نے اس معاہدہ کو پیش کر کے اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی تو معاہدہ کے نامکمل ہونے کا یہی قانونی عذر پیش کیا گیا تھا۔ (۱)

اندرونی حالت: ۳۰ اکتوبر ۱۹۲۸ء کو جب دول متحدہ نے التوائے جنگ کا اعلان کیا تو ترکوں کو یک گونہ اطمینان نصیب ہوا اور وہ تقریباً ان تمام شرائط صلح کو تسلیم کرنے کے لیے تیار تھے جو اتحادیوں کی طرف سے پیش کی جائیں، وجہ یہ تھی کہ ترکی کی اندرونی حالت

اس وقت نہایت درجہ نازک تھی، انجمن اتحاد و ترقی کے لیڈر ملک سے رخصت ہو چکے تھے، کوئی اور منظم پارٹی موجود نہ تھی جو انجمن اتحاد کی جگہ لیتی، حکومت پھر سلطان کے ہاتھ میں آگئی تھی، اس نے موجودہ پارلیمنٹ کو برخاست کر دیا مگر نئے انتخابات کا حکم نہیں دیا، حکومت نہ م کے لیے تو سلطان کے ہاتھ میں تھی مگر اصلی فرماں روائی اتحادیوں کو حاصل تھی جن کی فوجیں قسطنطنیہ پر قابض تھیں، التوائے جنگ کے اصولی شرائط یہ تھے کہ دردنیاں اور آبنائے باسفورس بالکل آزاد رہیں گے اور اصول قومیت اور خود اختیاری کا ہر طرح لحاظ رکھا جائے گا، دفعہ ۷ کے رو سے دول متحدہ کے حدود بھی مقرر کر دئے گئے تھے تاکہ جن صوبوں میں ترکی کی اکثریت ہے ان میں مداخلت نہ کی جائے، دفعہ ۲ کے لحاظ سے مذکورہ بالا صوبوں میں اتحادی اسی وقت مداخلت کرنے کے مجاز تھے، جب ترکوں کی صرف سے اتحادیوں کے حقوق پر ناجائز حملہ کیا جائے یا آرمینیا کے علاقہ میں فتنہ و فساد رفع کرنے کی ضرورت محسوس کی جائے لیکن اتحادیوں نے ان شرائط کی خلاف ورزی کی اور بغیر کسی معقول عذر کے قسطنطنیہ، تھریس اور اناطولیہ کے ایک بڑے حصہ پر اپنا تسلط قائم کر لیا، ترکوں میں اس وقت صدائے احتجاج بلند کرنے کی بھی طاقت نہ تھی، اتحادیوں نے التوائے جنگ کے ان اصولی شرائط کی تو خلاف ورزی کی لیکن جو دفعات ان کے مفید مطلب اور ترکی کو بالکل بے دست و پا بنادینے والی تھیں ان پر نہایت شد و مد کے ساتھ عمل درآمد شروع کر دیا، مثلاً ترکی فوجوں کی تحفیف اور سامان حرب کا حوالہ کر دینا۔

ترک دس سال سے برابر میدان جنگ میں دشمنوں کا مقابلہ کر رہے تھے، جس کی وجہ سے بقول خالدہ خانم ”ملک کے جسم میں خون کا ایک قطرہ بھی باقی نہیں رہا تھا“، وہ ہر قیمت پر صلح کرنے کے لیے تیار تھے لیکن انھیں دول متحدہ کے خفیہ معاہدوں کی خبر نہ تھی، جس سے اندازہ ہو جاتا کہ صلح کے لیے انھیں کتنی گراں قیمت ادا کرنی پڑے گی، تاہم عارضی صلح سے قبل ہی ۵ جنوری ۱۹۱۸ء کو لائڈ جارج وزیر اعظم برطانیہ نے اپنی ایک تقریر میں اعلان کر دیا تھا کہ وہ علاقے جہاں ترکوں کی اکثریت ہے اور دارالسلطنت

قسطنطنیہ ترکی کے قبضہ میں رہنے دیا جائے گا، اس کے یہ معنی تھے کہ ترکی کو اپنے دو تہائی مقبوضات سے ہاتھ دھونا پڑے گا، جنگ کے خاتمہ پر ترک اس کو بھی غنیمت سمجھتے تھے اور وہ یہ توقع کر رہے تھے کہ آئندہ غیروں کی مداخلت سے محفوظ رہ کر اپنی نئی زندگی کی تشکیل کر سکیں گے، لیکن لائڈ جارج کا یہ اعلان جس میں قسطنطنیہ کو ترکوں کے لیے چھوڑ دینے کا وعدہ کیا گیا تھا، ترکوں کے ساتھ ہمدردی پر مبنی نہ تھا، واقعہ یہ تھا کہ قسطنطنیہ اور دردنیاں و بناے باسنورس پر معاہدہ لندن کے مطابق روس کا حق تسلیم کر لیا گیا تھا لیکن جب ۱۹۱۷ء میں ’’بالٹویک انقلاب‘‘ برپا ہوا اور حکومت روس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے تو جہاں تک روس کے خفیہ معاہدہ کا تعلق تھا تو وہ معاہدہ کالعدم ہو گیا، اب سوال یہ پیدا ہوا کہ قسطنطنیہ، دردنیاں اور آبنائے باسنورس کے علاقوں کا حقدار کون ہے، اس مسئلہ کے متعلق اتحادیوں میں اختلاف شروع ہوا، بالآخر انھوں نے یہ سوچا کہ اگر ان علاقوں کو ترکی کے نام نہاد تصرف میں رکھا جائے تو آپس کی نا اتفاقی کا خطرہ دور ہو جائے گا، علاوہ بریں امریکہ نے جنگ میں شرکت اس شرط پر کی تھی کہ دوران جنگ کے تمام خفیہ معاہدات منسوخ کر دئے جائیں گے، چوں کہ انگلستان اور فرانس کو اس وقت امریکہ کی مدد کی سخت ضرورت تھی، اس لیے اس شرط کو منظور کر لیا تھا، پریسڈنٹ ولسن نے کہا تھا کہ ’’جتنے تک جنگ میں شریک ہیں ان کی نئی تقسیم مدعی ریاستوں کے مطالبات کے اعتبار سے نہیں بلکہ رعایا کے مفاد کے لحاظ سے کی جائے۔‘‘ ایک اور موقع پر اس نے کہا تھا: ’’ہمارا فیصلہ بے لاگ ہوگا، اس میں یہ تفریق نہیں کی جائے گی کہ جن کے ساتھ ہم چاہیں انصاف کریں اور جن کے ساتھ نہ چاہیں نہ کریں، انصاف ایسا ہونا چاہئے جس میں کسی کی رعایت نہ کی جائے، جس کا معیار صرف یہ ہو کہ قوموں کے حقوق میں مساوات برتی جائے‘‘، خالدہ خانم اس پر تبصرہ کرتی ہوئی لکھتی ہیں: ’’پرانے مدبروں میں صرف یہی ایک شخص تھا جس نے یہ اندازہ لگایا تھا کہ نوع انسانی امن کی آرزو مند ہے، ان الفاظ میں جو شکسپر کا سا زور بیان اور انجیل کی سی سادگی رکھتے تھے اس نے اپنے چودہ اصولوں کا اعلان کیا،

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دس احکام کی طرح پریسیڈنٹ ولسن کے چودہ اصول بھی یادگار رہیں گے مگر فرق یہ تھا کہ حضرت موسیٰ اپنے احکام کو نافذ کرنے کی قوت رکھتے تھے اور ولسن اس سے محروم تھا، وہ دنیا کی بزم شوریٰ میں ایک بھولے بھٹکے مسافر کی طرح آٹکلا اور تھوڑی دیر بیٹھ کر چلا گیا، صلح کی شرطیں انہی پرانے طرز کے مدبروں نے طے کیں، یہ بڑے قابل لوگ تھے اور جنگ سے پہلے حب وطن کے جو معنی سمجھ جاتے تھے ان کے لحاظ سے محبت وطن بھی تھی مگر سب کے سب اتنے بے بصیرت تھے کہ خدا کی نشانیوں کو جو نور کے حرفوں میں دیوار پر نظر آرہی تھیں نہیں دیکھ سکے، اتنے بے حس تھے کہ جذبات کی نئی لہروں کو جو جمہور کے دلوں میں اٹھ رہی تھیں نہیں سمجھ سکے، اتنے نا فہم تھے کہ انھوں نے جنگ عظیم کے بعد بھی یہ سبق نہیں سیکھا کہ جو محبت وطن اپنے ملک کی سلامتی چاہتا ہے اسے اپنے ہمسایہ ملکوں میں بھی امن وامان کی فضا پیدا کرنی چاہیے۔ (۱)

کیپٹن ہیرلڈ آرم اسٹرانگ جو عارضی صلح کے زمانہ میں برٹش ہائی کمشنر کے ساتھ قسطنطنیہ میں مقیم تھا، بیان کرتا ہے کہ اس وقت انگریز ترکوں کے سخت مخالف تھے اور ان کے خلاف بڑا شور و غل مچا رہے تھے، ہر طرف سے یہی آواز اٹھ رہی تھی کہ قسطنطنیہ اور اباصوفیہ پر بمبکی تلسا پھر قائم کر دیا جائے اور ترکوں کو یورپ سے نکال دیا جائے، جو لوگ مذہبی جذبات سے متاثر نہ تھے ان میں بھی جنگ کی پیدا کردہ نفرت کا جذبہ غالب تھا، اس بات پر سب کا اتفاق تھا کہ ترکی کا خاتمہ کر دیا جائے اور مسٹر لنڈ جارج اس خیال کے سب سے بڑے علم بردار تھے۔ (۲)

صلح کانفرنس کی بے پروائی: ۱۸ جنوری ۱۹۱۹ء کو پیرس میں صلح کانفرنس کا اجلاس شروع ہوا، لیکن اتحادی یورپین مسئلہ کا تصفیہ کرنے میں اس قدر منہمک ہوئے کہ انھیں ترکی کے معاملات کی جانب توجہ کرنے کی فرصت نہیں ہوئی، وہ سمجھ رہے تھے کہ ترکی (۱) 'ترکی میں شرق و مغرب کی کشمکش' از خالدہ ادیب خانم ص ۱۵-۱۱۳ (۲) 'ترکی دروزہ میں'

کے معاملات آسانی سے ملتوی کیے جاسکتے ہیں، چنانچہ وہ انہی گتھیوں کے سلجھانے میں الجھے رہے جو ان کے سابق خفیہ معاہدوں سے پیدا ہو گئی تھیں، نتیجہ یہ ہوا کہ ترکی کے مسائل اور زیادہ پیچیدہ ہوتے گئے اور صلح کانفرنس کے لیے مزید دشواریاں پیش آنے لگیں۔

عدالیہ پراٹلی کا قبضہ: سب سے پہلے ان کی آنکھیں اس وقت کھیں جب ۲۹ مارچ ۱۹۱۹ء کو اطالوی فوجیں مشرقی اناطولیہ کے ساحل پر عدالیہ میں اتریں اور انگلستان اور فرانس کے احتجاج کے باوجود اس علاقہ پر تیزی کے ساتھ قابض ہونے لگیں، اس احتجاج کے جواب میں اٹلی نے معاہدہ سین ژان دی مارین کا حوالہ دیا، جس کے رو سے سمرنا اور عدالیہ کے علاقہ پر اس کا حق تسلیم کر لیا گیا تھا، اٹلی نے عدالیہ پر قبضہ کرنے کے بعد سمرنا کا مطالبہ کرنا شروع کیا، لیکن چونکہ معاہدہ مذکورہ پر روس کے دستخط نہ ہو سکے تھے، اس لیے انگلستان اور فرانس نے اسے ناقابل نفوذ قرار دیا، اس پراٹلی کا نمائندہ سائنز آر لینڈو (Signor orlando) ”صلح کانفرنس“ سے ملاحدہ ہو گیا۔

سمرنا پر یونانی قبضہ: آر لینڈو کے یوں چلے جانے سے اتحادیوں اور خصوصاً یونان کو یہ اندیشہ ہوا کہ ممکن ہے اٹلی اتحادیوں کی اجازت کے بغیر ہی سمرنا پر قبضہ کر لے اور معاہدہ ژان دی مارین کے ناقابل نفاذ ہونے کی پروا نہ کرے، صلح کانفرنس میں یونان نمائندہ کاوینزیلیوس (وزیر اعظم) تھا، جولائی ۱۹۱۹ء میں جارج پر غیر معمولی اثر رکھتا تھا، اس نے اس موقع پر سیکڑوں جھوٹے تار کانفرنس میں پیش کیے، جن سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ سمرنا کے علاقہ میں ترک قتل عام برپا کیے ہوئے ہیں اور اس کے ماتحتوں نے غلط نقشے مرتب کر کے یہ ثابت کرنے کے لیے کانفرنس کے سامنے رکھے کہ سمرنا کے شہر اور علاقہ میں یونانی آبادی ترکوں سے بہت زیادہ ہے (۱)، اتحادیوں نے وینزیلیوس کے بیانات کو باور کر لیا اور مسٹر لائیڈ جارج، پریسڈنٹ ولسن اور کلیمنٹو کے دستخط سے حکم نافذ ہوا کہ یونانی فوجیں سمرنا پر قبضہ کر لیں، مسٹر ٹوائن بی لکھتے ہیں کہ اتحادیوں کے اس فیصلہ کے اصلی مقصد

دو تھے، اول یہ کہ یونان کو موقع دیا جائے کہ ایشیائے کوچک میں اپنی قدیم سلطنت کو دوبارہ قائم کرنے کا حوصلہ پورا کرے، دوسرا مقصد یہ تھا کہ اطالوی ناجائز طور پر اس علاقہ پر قابض نہ ہو جائیں جس سے بین الاقوامی پیچیدگیوں کے بڑھ جانے کا اندیشہ ہے، لیکن وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ اس علاقہ میں ترکوں کی طرف سے نقص امن ہو رہا ہے، جس کے باعث یونانی باشندے اور دوسری اقلیتیں سخت خطرے میں ہیں، لیکن سمرنا پر یونانی قبضہ کے متعلق اتحادیوں کا جو کمیشن تحقیق حالات کے لیے مقرر ہوا تھا، اس کی رپورٹ نے اس بیان کی تکذیب کر دی، یہ رپورٹ ۱۲ اکتوبر ۱۹۱۹ء کو پیش کی گئی، اس کا ابتدائی حصہ حسب ذیل تھا۔

”تحقیقات سے ثابت ہو گیا کہ عارضی صلح کے بعد سے

ولایت ایدین کے عیسائیوں کی حالت قابل اطمینان رہی ہے اور ان کی سلامتی خطرہ میں نہ تھی، اگر سمرنا پر قبضہ کا حکم صلح کانفرنس نے غلط اطلاع کی بنا پر دیا تو اس کی ذمہ داری سب سے پہلے ان اشخاص یا حکومتوں پر عاید ہوتی ہے، جنہوں نے بے پروائی کے ساتھ ایسی اطلاع بہم پہنچائی لہذا یہ ظاہر ہے کہ اس قبضہ کے لیے معلق کوئی وجہ جواز نہ تھی اور اس سے عارضی صلح کی ان شرائط کی خلاف ورزی واقع ہوئی جو دول متحدہ اور ترکی کے درمیان طے ہوئی تھیں۔“ (۱)

سمرنا کا قتل عام: بہر حال ۱۵ مئی ۱۹۱۹ء کو یونانی فوجیں برطانوی، فرانسیسی اور امریکن جنگی جہازوں کے ساتھ سمرنا پہنچیں اور شہر اور مضافات کے تمام اہم مقامات پر قبضہ کرنے لگیں، آرم اسٹرائٹ لکھتا ہے: ”انھوں نے ساحل پر اترنے کے بعد فوراً ہی قتل عام شروع کر دیا، بندرگاہ کے قریب جو برطانوی جنگی جہاز لنگر انداز تھا اس کے افسروں اور آدمیوں کو حکم تھا کہ بالکل خاموش رہیں، حالانکہ چند ہی گز کے فاصلہ پر یونانی فوجیں

قتل و غارت گری کا بازار گرم کیے ہوئی تھیں... سمرنا کے بعد یونانی آگے بڑھے، مکانوں میں آگ لگاتے، لوٹ مار کرتے اور عورتوں کی عصمت دری کرتے ہوئے جیسا کہ بلقان کی قومیں جنگ کی حالت میں کرتی ہیں۔ (۱) ٹوائینی یونانی فوج کے سمرنا میں داخل ہونے کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے: ”۱۵ مئی ۱۹۱۹ء کو مغربی اناطولیہ پر ایک بلائے ناگہانی نازل ہوگئی جیسے کوہِ آتش فشاں پھٹتا ہے اور لوگ حیران رہ جاتے ہیں کہ یہ کیا ہو گیا، جنگ یورپ کے ختم ہونے کے چھ مہینے بعد ایک روز دفعۃً سمرنا کی گلیوں میں شہر کے لوگوں اور نہتے سپاہیوں کا قتل عام شروع ہو گیا، محلے کے محلے اور گاؤں کے گاؤں لوٹ لیے گئے، عقبی خطہ کی زرخیز وادیوں میں آگ کے شعلے بھڑکنے لگے اور خون کی ندیاں بہ گئیں، ایک فوجی دیوار کھڑی ہوگئی جس نے قسطنطنیہ اور سمرنا کی بندرگاہوں کو اندرونِ ملک سے جدا کر کے تجارت کو تباہ کر دیا، لڑائی کے دوران میں مکان، پل اور سرنگیں مسمار کر دی گئیں، ملک کے باشندے تلوار کے گھاٹ اتارے گئے اور جو بچ رہے وہ یا تو زبردستی فوج میں بھرتی کر لیے گئے یا جلد وطن کر دیے گئے، غرض قتل و غارت کا یہ سیلاب سمرنا سے شروع ہوا اور دور دور تک پھیلتا چلا گیا۔“

وطنی تحریک: ترکوں کا شیرازہ ملت اس وقت بالکل منتشر ہو رہا تھا، لیکن خودداری اور وطنیت کا جذبہ ابھی فنا نہیں ہوا تھا، یونانیوں کے جواب میں ان کی طرف سے جو رد عمل ہوا اس کے متعلق یہ بات خاص طور پر قابلِ لحاظ ہے کہ ”اس کا آغاز حکومت کی طرف سے نہیں بلکہ خود جمہور کی طرف سے ہوا، جس میں کسان، پہاڑی لوگ اور عورتیں تک شامل تھیں،“ بہت سے فوجی افسر قسطنطنیہ سے بھاگ کر تھریس پہنچے اور انھوں نے چھوٹے چھوٹے جتھے بنا کر لڑنا شروع کیا، یونانیوں کی فوج اس وقت اسی ہزار سے زیادہ پہنچ چکی تھیں، یہ فوج اب اسی علاقہ تک محدود نہ رہی، جہاں تک کانفرنس نے اجازت دی تھی بلکہ اس نے اور بھی آگے قدم بڑھانے شروع کیے، سمرنا باقاعدہ طور پر یونانی حکومت کا

مرکز قرار دیا گیا، یونانی تسلط کی خبر سرعت کے ساتھ تمام ترکی علاقوں میں پھیل گئی، ہر طرف احتجاج کے جلسے کیے گئے اور سارے ملک میں دفعۃً ایک وطنی تحریک کی لہر دوڑ گئی، یہ تحریک عام طور پر مصطفیٰ کمال پاشا کے نام سے منسوب کی جاتی ہے اور کوئی شبہ نہیں کہ وہی اس کے روح رواں تھے، لیکن یونانیوں کے قتل و غارت کا جو سیلاب سمرنا سے شروع ہو کر تیزی کے ساتھ بڑھ رہا تھا اس نے ہر ترک کے دل میں وطن کی حفاظت کا جذبہ مشتعل کر دیا تھا اور سرفروشنوں کی جماعت اس سیلاب کو روکنے کے لیے ایک آہنی دیوار کی طرح قائم ہو گئی تھی۔

اسی تحریک سے ترکوں کی تاریخ کا جمہوری دور شروع ہوتا ہے، سلطنت نام کے لیے تو ۱۹۲۳ء تک قائم رہی لیکن حقیقتاً ۱۹۱۸ء میں اتحادی طاقتیں اس کا گلا گھونٹ چکی تھیں، ترکی سلطنت فنا ہو گئی، لیکن ترک قوم زندہ تھی، صلح نامہ مدرس کے بعد سے اعلان جمہوریہ تک اس نے وطن کو دشمنوں کی آہنی گرفت سے آزاد کرانے میں جیسے حیرت انگیز ثبات و عزم کی مثال پیش کی، وہ قوموں کی تاریخ میں مشکل سے ملے گی، ان کارناموں کی تفصیل آئندہ جلد میں بیان کی گئی ہے۔

نظام حکومت

سلطنت عثمانیہ کے بانی جب اول اول ایشیائے کوچک میں آئے تو ان کی حیثیت ایک خانہ بدوش قوم سے زیادہ نہ تھی، لیکن وہ اپنے اندر شجاعت اور تنظیم کی قوت رکھتے تھے، جو خانہ بدوش قوموں میں فطرت کے تغیرات و حوادث کا مقابلہ کرنے کے لیے خلقتی طور پر پائی جاتی ہے، ایسی قوموں کی زندگی نہایت باقاعدہ اور منظم ہوتی ہے، ان کی تمام نقل و حرکت میں شدید فوجی ضبط پایا جاتا ہے، یہ قومیں جب زرعی اور تجارتی آبادیوں کی طرف بڑھتی ہیں تو اپنی اعلیٰ تنظیم کی وجہ سے ناقابل مزاحمت ہو جاتی ہیں اور اپنے سے زیادہ متمدن لیکن کم جفاکش قوموں کو شکست دے کر سلطنت قائم کر لیتی ہیں، باوجود اس کے کہ انھیں حکمرانی کا تجربہ پہلے سے نہیں ہوتا، وہ اپنی سابق زندگی کے تجربات سے اس نئی زندگی میں بھی کام لیتی ہیں، وہ اب بھی ”راعی“ ہوتی ہیں البتہ رعایا کی نوعیت بدل جاتی ہے۔

یہی صورت حال عثمانی ترکوں کی تھی، انھوں نے ایشیائے کوچک میں داخل ہو کر ایک سلطنت کی بنیاد رکھی جو تین صدیوں کے اندر دنیا کی وسیع ترین اور سب سے زیادہ طاقتور سلطنت ہو گئی، اس کی رعایا میں کرد، البانی، یونانی، ایرانی، عرب، سلاوی اور جرمن ہر قوم کے باشندے شامل تھے، لیکن جو چیز ان ترکوں کو دوسری خانہ بدوش قوموں سے ممتاز کرتی ہے وہ ان کی سلطنت کی پائیداری ہے، خانہ بدوش قوموں کی حکومت ڈیڑھ دو سو برس سے زیادہ نہیں چلتی، عثمانی ترکوں نے جس سلطنت کی بنیاد لی، وہ

چھ سو سال سے زیادہ قدیم رہی اور آج بھی ایک مختصر مگر طاقتور جمہوریہ کی شکل میں موجود ہے، سلطنت کے اتنی مدت تک قائم رہنے کا باعث محض عثمانیوں کی فطری جنگجوئی نہیں ہے کیوں کہ یہ جوہر تو بعض دوسری قوموں میں بھی پایا جاتا ہے بلکہ اس کا اصلی سبب ان کا حیرت انگیز نظام حکومت ہے، جو اپنے زمانہ میں دنیا کا بہترین نظام سمجھا جاتا تھا، اس کے متعلق پروفیسر لی بائر (Lybyer) اپنی محققانہ تالیف ”عثمانی نظام سلطنت در عہد سلیمان ذی شان“ میں لکھتے ہیں:

”دنیا میں عثمانی نظام حکومت سے زیادہ دلیرانہ تجربہ اتنے بڑے پیمانہ پر شاید نہیں کیا گیا ہے، جو نظریہ اس سے قریب ترین مشابہت رکھتا ہے وہ افلاطون کی جمہوریہ میں پایا جاتا ہے اور جو نظام عمداً اس کی نظیر ہے وہ مصر کا مملوک نظام ہے، لیکن عثمانی نظام اول الذکر کی اشرافی یونانی حد بندیوں میں محدود نہ تھا اور آخر الذکر کو مغلوب کر کے یہ اس سے زیادہ عرصہ تک قائم رہا، ریاستہائے متحدہ امریکہ میں ایسے لوگ ہوئے ہیں جو پہلے جنگل میں لکڑیاں کاٹا کرتے تھے اور پھر ترقی کر کے صدارت کی کرسی پر پہنچ گئے، لیکن انھوں نے یہ مرتبہ صرف اپنی کوشش سے حاصل کیا نہ کہ کسی ایسے نظام کے سلسلہ مدارج کے ذریعہ جو انھیں ترقی دینے کے لیے باقاعدہ مرتب کیا گیا ہو، کلیسائے روم اب بھی ایک کسان کو تعلیم و تربیت دے کر پوپ بنا سکتا ہے، لیکن اس نے کبھی اپنے امیدواروں کو تقریباً بلا استثنا انہی خاندانوں سے منتخب نہیں کیا جو ایک مخالف مذہب کے پیرو ہوں، عثمانی نظام عمداً غلاموں کو لیتا تھا اور انھیں سلطنت کی وزارتوں پر مامور کر دیتا تھا، وہ بھیڑوں کی چراگاہوں اور کھیتی باڑی کے کام سے چھڑا کر لڑکوں کو لاتا تھا اور انھیں درباری امیر اور شہزادیوں کے شوہر بنا دیتا تھا، وہ ایسے نوجوان

کو لیتا تھا جن کے آباء و اجداد صدیوں سے عیسائی ہوتے اور انھیں سب سے بڑی اسلامی سلطنت کے حکمران اور ناقابل تسخیر فوجوں کے سپاہی اور جنرل بنادیتا تھا، جن کی سب سے بڑی خوشی اس میں تھی کہ صلیب کو شکست دے کر ہلال کو سر بلند کریں، وہ اپنے نوآموزوں سے کبھی یہ سوال نہیں کرتا تھا کہ ”تمہارا باپ کون تھا“، یا تم کیا جانتے ہو، یہ بھی نہیں کہ ”تم ہماری زبان بول سکتے ہو؟“ بلکہ وہ ان کے چہروں اور جسموں کو غور سے دیکھنے کے بعد ان سے کہتا تھا: ”تم ایک سپاہی بنو گے اور اگر لیاقت کا ثبوت دو گے تو ایک جنرل ہو جاؤ گے“ یا ”تم یک عالم و فاضل اور معزز شخص ہو گے اور اگر تمہارے اندر قابیلیت موجود ہے تو گورنر اور وزیر اعظم بھی بن جاؤ گے۔“ (۱)

ادارہ حکومت: نظام سلطنت دو بڑے اداروں پر مشتمل تھا، ایک ادارہ حکومت اور دوسرا ادارہ اسلامیہ، ادارہ حکومت میں سلطان، اس کا خاندان، حکومت کے انتظامی افسر، مستقل سوار اور پیدل فوج اور نو جوانوں کی ایک کثیر تعداد جو مستقل فوج، دربار اور حکومت کے لیے زیر تعلیم رہا کرتی تھی شامل تھی، انہی کے ہاتھوں میں تلوار، قلم اور حکومت کی باگ تھی، یہی پوری سلطنت کا انتظام کرتے تھے، البتہ وہ امور جو قانون شرع کے ماتحت تھے شرعی عدالتوں کے سپرد کردئے گئے تھے اور وہ معاملات جو سلطنت کی غیر مسلم رعایا اور غیر ملکی باشندوں کے جماعتی نظام سے تعلق رکھتے تھے انہی کے ہاتھوں میں چھوڑ دئے گئے تھے، اس ادارہ کی بنیادی خصوصیات یہ تھیں کہ چند مستثنیات کے علاوہ اس کے ارکان وہی لوگ تھے جو عیسائی والہین کی اولاد تھے اور اس کا ہر رکن سلطان کے غلام کی حیثیت سے ادارہ میں داخل ہوتا تھا اور تمام عمر سلطان کا غلام رہتا تھا خواہ جاہ و

(1) The Government of the ottaman Empire in the time of

ثروت اور اقتدار و عظمت کے کتنے ہی بلند مرتبہ پر پہنچ جائے۔

داخلہ کا طریقہ: جو لوگ اس ادارہ میں داخل کیے جاتے تھے وہ چار طریقوں سے آتے تھے، ۱- یا وہ جنگ میں گرفتار کیے جاتے تھے، ۲- یا خریدے جاتے تھے، ۳- یا بطور ہدیہ کے بھیجے جاتے تھے، ۴- یا خراج میں حاصل کیے جاتے تھے، پروفیسر لی بائر لکھتے ہیں کہ اس ادارہ میں داخل ہونے کے لیے غلامی کے دروازہ سے آنا ضروری تھا اور یہ دروازہ صرف دس سے بیس سال تک کے عیسائی لڑکوں کے لیے کھلا ہوا تھا، بعض مغربی مورخین کا یہ بیان صحیح نہیں کہ عموماً آٹھ سال کے لڑکے لیے جاتے تھے، تحقیق یہ ہے کہ جو چودہ ست اٹھارہ سال تک کے لڑکوں کو ترجیح دی جاتی تھی اور صرف غیر معمولی صورتوں میں بارہ سال سے کم یا بیس سال سے زیادہ کے لڑکے لیے جاتے تھے (۱)، یورپین مورخین صرف خراجی لڑکوں کا ذکر کرتے ہیں، لیکن پروفیسر موصوف نے ثابت کیا ہے کہ سالانہ بھرتی میں خراجی لڑکوں کی تعداد نصف سے کم ہوتی تھی، سلیمان اعظم کے عہد میں جب یہ نظام مکمل ہو چکا تھا سالانہ بھرتی کا اوسط سات آٹھ ہزار تھا، جس میں خراجی لڑکوں کی تعداد تین ہزار سے زیادہ نہ تھی۔

خراجی لڑکوں کی بھرتی کا طریقہ جسے ”دو شرمہ“ کہتے تھے، یہ تھا کہ عموماً ہر چار سال کے بعد اور اگر ضرورت ہوئی تو اس سے پہلے بھی عہدہ داروں کی ایک جماعت جو لڑکوں کے پرکھنے میں بہت مہارت رکھتی تھی، حکومت کی طرف سے ان علاقوں میں بھیجی جاتی تھی جہاں سے خراج آتا تھا، سلیمان اعظم کے زمانہ میں پورا جزیرہ نماے بلقان، ہندری ایشیائے کوچک کا مغربی ساحل اور بحر اسود کے جنوبی اور مشرقی سواحل خراجی لڑکے فراہم کرتے تھے، مگر سب سے زیادہ مضبوط اور ہونہار نوجوان البانی اور جنوب کی سلاوی قوموں سے آتے تھے۔

(1) The Government of the ottaman Empire in the time of

جو والدین اپنے لڑکوں کو دینا نہیں چاہتے تھے وہ بچپن ہی میں ان کی شادی کر دیتے تھے کیوں کہ ایسے لڑکے نہیں لیے جاتے تھے، دولت مند اشخاص بھرتی کرنے والے افسروں کو کچھ دے دلا کر بھی اپنے لڑکوں کو بچا لیتے تھے، برخلاف اس کے بہت سے والدین خوشی کے ساتھ اپنے لڑکوں کو بھیجنا چاہتے تھے، وہ جانتے تھے کہ اس طرح یہ لڑکے افلاس کی مصیبت سے نجات پا جائیں گے، اپنی استعداد اور اہلیت کے مطابق اعلیٰ درجہ کی تربیت حاصل کریں گے اور ترقی کر کے بڑی بڑی جگہوں پر پہنچ جائیں گے، پروفیسر لی بائر کا بیان ہے کہ بعض والدین اس طریقہ کو بجائے بار کے رعایت سمجھنے لگے تھے اور ترک ان پر رشک کرتے تھے، کیوں کہ مسلمانوں کے لڑکے اس ادارہ میں داخل نہیں ہو سکتے تھے، اس قاعدہ کی پابندی سے بچنے کے لیے ترک بعض اوقات میسائیوں کو روپیے دے کر اس بات پر راضی کر لیتے تھے کہ وہ ان کے لڑکوں کو اپنا بنا کر بھرتی کرادیں۔ (۱)

ادارہ حکومت کا تعلیمی نظام: اپنے وسیع ترین مفہوم میں ادارہ حکومت ایک مدرسہ تھا جس میں طلبہ تمام عمر کے لیے داخل کیے جاتے تھے، اس مدرسہ میں ان کی شخصیت کے تمام پہلوؤں کا لحاظ رکھا جاتا تھا اور جسم و دماغ دونوں کی تربیت یکساں توجہ سے ہوتی تھی، البتہ یہ چیز خاص طور پر پیش نظر رہتی تھی کہ یہ مدرسہ دراصل فن جنگ اور فن حکومت کی تعلیم کا ہے، طلبہ سخت ضابطوں کے اندر رکھے جاتے تھے، انھیں بتدریج ترقی دی جاتی تھی اور حسب لیاقت انعامات اور اعزازات ملتے رہتے تھے، مدرسہ کے قواعد کی خلاف ورزی کرنے پر سخت سزائیں بھی دی جاتی تھیں، دماغی تربیت اگرچہ ایک حد تک سب کو دی جاتی تھی لیکن جو طالب العلم استعداد کے لحاظ سے بہترین ہوتے انھیں مشرقی زبانوں اور اسلامی و عثمانی قوانین کا ایک مشکل نصاب جس میں اخلاقیات اور دینیات دونوں کی تعلیم شامل ہوتی پڑھایا جاتا تھا، پروفیسر لی بائر اس نظام تعلیم کے متعلق لکھتے ہیں:

”افلاطون سلطان کے وسیع خاندان کی تعلیم و تربیت دیکھ کر خوش ہو جاتا، گو اس خاندان کی کم اصلی اس کی طبیعت کو متغیر کر دیتی، اسے یہ بات پسند آتی کہ تعلیم عمر بھر جاری رہتی تھی، جسم و ذہن کی یکساں احتیاط کے ساتھ تربیت ہوتی تھی، صمرانوں اور سپاہیوں میں تفریق کی جاتی تھی (اگرچہ یہ تفریق مکمل نہ تھی) یہ لوگ ایک حد تک گھریار کی پابندیوں سے آزاد رکھے جاتے تھے، فردی ساری زندگی اس نظام کے شدید ضوابط کی پابند ہوتی تھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ حکومت دانشمندوں کے ہاتھ میں تھی، یہ تو غالباً بھی معلوم نہ ہو سکے گا کہ عثمانی نظام کے بنی افلاطون کے خیالات سے واقف تھے یا نہیں، لیکن اس کے منصوبہ کو جہاں تک عملاً پورا کرنا ممکن تھ انھوں نے کر دکھایا، بعض حیثیتوں سے انھوں نے افلاطون سے بہتر نظام قائم کیا، مثلاً یہ کہ توارث کی بے اعتباریوں کو دور کیا، نظم و نسق کے لیے شخصی اقتدار بہم پہنچایا، توازن قواء کے ذریعہ استقلال و پائیداری کا تحفظ کیا اور اپنے اس نظام کو ایک وسیع سلطنت کے قابل بنا دیا۔“ (۱)

وہ تمام لڑکے جو بھرتی کیے جاتے تھے خواہ مذکورہ بالا طریقوں میں سے کسی طریقہ سے لائے گئے ہوں، پہلے امتحان کے لیے ماہر افسروں کے سامنے پیش ہوتے تھے جو انھیں استعداد کے لحاظ سے دو مختلف جماعتوں میں تقسیم کر دیتے، جسمانی حیثیت اور ذہنی قابلیت کے اعتبار سے جو معیار کے مطابق ثابت ہوتے وہ اعلیٰ تربیت کے لیے منتخب کر لیے جاتے، باقی زیادہ تر جسمانی تربیت کے لیے علاحدہ رکھے جاتے۔

جو امیدوار اعلیٰ تربیت کے لیے منتخب کیے جاتے تھے، ان میں سے کچھ صوبوں کے گورنروں اور دارالسلطنت کے اعلیٰ عہدہ داروں کے پاس بھیج دئے جاتے تھے اور

(۱) لی بانرٹس اے۔

وہاں ان کی تربیت غالباً اسی طرح ہوتی تھی جس طرح ان امیدواروں کی جو سلطان کے ساتھ رہتے تھے، ان میں سے منتخب ترین جن کی سالانہ تعداد غالباً دو سو یا کل بارہ سے پندرہ سو تک ہوتی تھی اور نہ، غلطہ اور استنبول کے شاہی محلوں میں بھیج دئے جاتے تھے، انھیں تعلیم و تربیت کا ایک سخت نصاب پورا کرنا پڑتا تھا جو بارہ سال میں ختم ہوتا تھا، ان کو عربی فارسی کی ادبی تعلیم دی جاتی تھی اور اسی کے ساتھ ورزش، فنونِ حرب، شہسواری اور کوئی دستکاری بھی سکھائی جاتی تھی، انہی میں سے حکومت کے انتظامی شعبہ کے لیے امیدوار چنے جاتے تھے اور عملی تعلیم کی غرض سے قصر سلطانی کی چھوٹی چھوٹی خدمتوں پر مقرر کر دئے جاتے تھے، اپنی لیاقت کی وجہ سے جتنا قریب وہ سلطان کی ذات سے ہوتے جاتے تھے اتنی ہی بڑی جگہ انھیں مدتِ تعلیم پوری کرنے کے بعد ملتی تھی، یہ مدت عموماً پچیس سال کی عمر تک پوری ہو جاتی، اس وقت ہر امیدوار مدرسہ سے باہر نکل آتا اور حسب لیاقت اسے کوئی بڑا عہدہ دے دیا جاتا، یہی لوگ ترقی کر کے شہروں کے گورنر، صوبوں کے والی، فوجوں کے کمانڈر اور سلطنت کے وزیر بن جاتے تھے اور انہی میں سے بعض صدرا عظم کے عہدہ پر بھی فائز ہوتے تھے، سلیمان اعظم کا مشہور وزیر ابراہیم تقریباً براہِ راست صدرا عظم بنادیا گیا تھا، لیکن وہ پہلا شخص تھا جس نے ترقی کے قاعدہ کو توڑا اور اسی مثال سے آئندہ بہت سی خرابیاں پیدا ہوئیں، انتظامی شعبہ کے لیے انتخاب کرنے کے بعد ان فارغ التحصیل امیدواروں کی اکثریت باضابطہ سوارفوج میں جسے ”باب عالی کے سپاہی“ کہتے تھے داخل کر دی جاتی تھی، ان کو رخصت کرنے کی ایک خاص تقریب ہوا کرتی تھی، ہر امیدوار کو بلا کر سلطان بہ نفس نفیس اس کی تعریف و تحسین کرتا اور اس کی نئی خدمت کے لیے حوصلہ افزائی فرماتا، وہ ہر ایک کو ایک زردوزی کا کوٹ اور اپنے خوبصورت گھوڑوں میں سے ایک گھوڑا عطا کرتا، اکثر کچھ نقد بھی دیتا، یہ نوجوان ان تمام تحائف کو لے کر جو انھوں نے اپنے دورانِ قیام میں پائے تھے، ایک جلوس کے ساتھ محل کے بڑے پھاٹک تک جاتے اور وہاں گھوڑے پر سوار ہو کر ہمیشہ کے لیے اس مدرسہ سے

رخصت ہو جاتے۔ (۱)

دوسری جماعت کے امیدواروں کی تربیت زیادہ تر جسمانی، صنعتی اور فوجی ہوتی تھی اور انھیں ترکی زبان اور اسلامی اصول زبانی سکھائے جاتے تھے، ان کا منتخب حصہ بنی چری بنایا جاتا تھا، پہلے ان کو اناطولیہ کے اندرونی علاقوں میں بھیج دیا جاتا تھا کہ ترکی زبان اور ترکی طرز معاشرت سے واقفیت حاصل کر لیں اور کھیتوں میں کام کرنے سے ان کے جسم خوب مضبوط ہو جائیں، دو تین سال کے بعد ان کے معائنہ کے لیے قسطنطنیہ سے افسر آتے تھے، اگر وہ ترکی زبان کافی سیکھ چکے ہوتے تھے اور ان کے جسم توانا ہو جاتے تھے تو انھیں ترقی دے کر قسطنطنیہ بھیج دیا جاتا تھا، وہاں سے کچھ جہازوں پر کام کرنے کے لیے روانہ کر دئے جاتے، کچھ شاہی محلوں میں باغبان (بوستانچی) مقرر کر دئے جاتے اور کچھ پبلک عمارتوں میں کام پر لگا دئے جاتے، انھیں لکھنا پڑھنا سیکھنے کی اجازت تھی، لیکن وہ اس پر مجبور نہیں کیے جاتے، امیدواری کے اس دوسرے درجہ میں کچھ دنوں کام کرنے کے بعد جیسے جیسے وہ تیار ہوتے جاتے انفرادی انتخاب سے بنی چری کے دستوں میں بغرض تعلیم بھیج دئے جاتے اور جب فن حرب میں انھیں مہارت حاصل ہو جاتی تو کمسن بنی چری کی حیثیت سے شامل کر لیے جاتے۔

بنیادی اصول: سلطنت عثمانیہ کی قوت اس کے ادارہ حکومت کے زبردست نظام پر قائم تھی، اس نظام کے خاص اصول یہ تھے امیدواروں کا عمدہ انتخاب، تعلیم و تربیت کی سخت نگرانی، شدید ضبط و تادیب اور پر جوش مقابلہ، ہر امیدوار اپنی کوشش سے ترقی کر کے اونچے درجہ پر پہنچ سکتا تھا۔ یہاں تک کہ وہ ایک روز صدر اعظم بھی بن سکتا تھا، ترقی صرف قابلیت پر منحصر تھی، اس کلیہ میں واحد استثناء شاہی خاندان تھا، اسی ایک صورت میں نسل کا امتیاز تسلیم کیا جاتا تھا یعنی زمام حکومت کو ہاتھ میں لینے کے لیے عثمان کا جانشین ہونا کافی سمجھا جاتا تھا، جوڑ کے اس نظام میں داخل کیے جاتے تھے انھیں عیسائی مذہب ترک

کرنے پر مجبور نہیں کیا جاتا تھا لیکن اسلامی ماحول کے اثر سے وہ خود بخود برضا و رغبت مسلمان ہو جاتے تھے (۱)، اس پورے نظام کا مرکزی اصول یہ تھا کہ اس میں سلطان کی آزاد مسلمان رعایا جس کے والدین مسلمان تھے داخل نہیں ہو سکتی تھی اور ادارہ حکومت صرف عیسائی غلاموں کے لیے مخصوص تھا، ان غلاموں کے لڑکے آزاد مسلمانوں کے طبقہ میں شامل ہو جاتے تھے اور ادارہ حکومت سے خارج سمجھے جاتے تھے، اس اصول کا مقصد یہ تھا کہ سلطنت کے کام جن لوگوں کو سپرد کیے جائیں ان کا انتخاب محض قابلیت کی بنا پر ہو اور انھیں سخت ضوابط و قواعد کے ماتحت تعلیم دی جائے اور جب وہ اقتدار و حکومت کی ان بلند جگہوں پر پہنچ جائیں جو انھوں نے اپنی لیاقت سے حاصل کی ہوں تو اس وقت کوئی موروثی حکمران طبقہ جو شاہی خاندان کی جگہ لے سکے قائم نہ کر سکیں، لیکن سلیمان کے بعد اس اصول کی بندش ڈھیلی ہو گئی، ارکان حکومت نے سلطان پر دباؤ ڈال کر یہ اجازت حاصل کر لی کہ ان کے لڑکوں کا تقرر ان کی جگہوں پر ہو سکتا ہے، اس کے بعد دوسرے مسلمانوں نے بھی جو سابق عیسائی غلاموں کی اولاد نہیں تھے، فوجی اور ملکی ملازمتوں میں اپنے مسادی حقوق تسلیم کرالیے، اسی وقت سے نظام حکومت میں زوال شروع ہوا اور سلطنت روز بروز کمزور ہوتی گئی، یہاں تک کہ نہ وہ یورپین طاقتوں کا مقابلہ کرنے کے قابل رہی اور نہ اپنی عیسائی رعایا پر قبور کھسکی۔

ارکان ادارہ کے حقوق: ادارہ حکومت کا ہر فرد سلطان کا غلام تھا، خواہ وہ سلطنت کے اونچے سے اونچے عہدہ پر فائز ہو، قلی (غلام) کا لقب اعزاز و امتیاز کا نشان تھا اور سلطان قلی کا احترام ہر جگہ کیا جاتا تھا، تمام ارکان ادارہ کا چند مخصوص مراعات و حقوق حاصل تھے مثلاً وہ ہر قسم کے ٹیکس سے بری تھے اور سلطان کے علاوہ صرف اپنے افسروں اور اپنی عدالتوں کے جواب دہ تھے، سلطان انھیں ضروریات زندگی کی تمام فکروں سے آزاد کر دیتا تھا اور ان میں سے اکثروں کو اتنا کچھ عطا کرتا تھا کہ وہ عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتے

تھے، سب کو شاہی خزانہ سے تنخواہیں ملا کرتی تھیں، بعض اونچے عہدہ داروں کو بڑی بڑی جاگیریں بھی دی جاتی تھیں، مدت تک اس ادارہ کے ارکان معمولی اسلامی عدالتوں کے ماتحت رہے، لیکن چونکہ ان عدالتوں کے قاضی ادارہ اسلامیہ سے تعلق رکھتے تھے اس لیے سلطان کے رعایت یافتہ قلی ان کے سامنے اپنے مقدمات لے جانے میں تامل کرتے تھے اور اسے اپنے مرتبہ کے خلاف سمجھتے تھے، چنانچہ بائزید ثانی نے یہ حکم دیا کہ ان تمام لوگوں کے مقدمات جو ادارہ حکومت سے وابستہ ہوں خود ان کے افسروں کی عدالتوں میں پیش ہوا کریں، اس وقت سے ان کے لیے جداگانہ عدالتیں قائم کر دی گئیں۔

سلطان: ادارہ حکومت کا صدر اعلیٰ سلطان تھا، جہاں تک اس ادارہ کا تعلق تھا اس کے اختیارات کی کوئی حد نہ تھی، وہ اس کے تمام ارکان کی جان و مال کا مالک تھا، اس کے اقتدار کی یہ مطلقیت ادارہ کے لیے بڑی تقویت کا باعث تھی، لیکن اسی میں ایک بڑے خطرہ کا امکان بھی مضمر تھا، چونکہ اس پورے نظام کا مرکز سلطان کی ذات تھی، اس لیے یہ ضروری تھا کہ اسے عمدہ طریقہ پر چلانے کے لیے سلطان میں طاقت کے علاوہ عقل و فہم، تدبیر و سیاست، عدل و انصاف اور رعایا پروری کے اوصاف بھی اعلیٰ درجہ پر پائے جائیں اور ان سب سے زیادہ ضروری وصف ملکہ حکمرانی کا تھا جو عثمان سے لے کر سلیمان اعظم تک تمام سلاطین میں بدرجہ غایت پایا جاتا تھا، جب تک مضبوط اشخاص تخت پر آتے رہے نظام سلطنت کی کامیابی حیرت انگیز رہی، جب سے عنان حکومت کمزور آدمیوں کے ہاتھوں میں آنا شروع ہوئی اس نظام کا شیرازہ بھی منتشر ہونے لگا، سلیمان اعظم کے بعد جتنے سلاطین آئے وہ بہ استثنائے چند سب کے سب اس ملکہ حکمرانی سے محروم تھے اور یہی اصلی سبب دولت عثمانیہ کے زوال کا تھا، ادارہ حکومت کے تمام عہدے صرف قابلیت کی بنا پر دیے جاتے تھے لیکن اس ادارہ کا افسر اعلیٰ وراثت کے حق سے مقرر ہوتا تھا، سولہویں صدی عیسوی تک عثمانی شہزادے مختلف صوبوں کے گورنر بنا دیے جاتے تھے اور اس طرح وہ حکمرانی کی تربیت حاصل کرتے تھے، مگر جب سے سلیمان اعظم کی محبوب ملکہ

خرم سلطان نے شہزادوں کو محل میں بند رکھ کر تعلیم دینے کا طریقہ جاری کرایا، سلطنت کے آئندہ وارث اس ضروری تربیت سے محروم ہو گئے، ان کی زندگی اب زیادہ تر محل کی دلچسپیوں میں گزرنے لگی، نتیجہ یہ ہوا کہ ان میں حکومت کا بارگراں اٹھانے کی اہلیت باقی نہ رہی، سلیم ثانی کے بعد جو آٹھ سلاطین یکے بعد دیگرے تخت نشین ہوئے ان میں سے پانچ تو کسی فوجی مہم میں بھی شریک نہ ہوئے، حالانکہ اس سے پہلے سلاطین فوج کی کمان خود کرتے تھے۔

سلطان بظاہر ایک مطلق العنان فرماں روا تھا، لیکن اس کی مطلق العنانی ادارہ حکومت تک محدود تھی، اس کے باہر شریعت، ملکی قوانین اور قومی رسم و رواج سے اس کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے، سلطنت میں چار طرح کے قانون جاری تھے۔

۱- شریعت ۲- قانون یعنی عثمانی سلطانوں کے تحریری فرامین ۳- عادت یا قومی اور ملکی رواج جو قدیم سے چلا آتا تھا اور ۴- عرف یعنی موجودہ سلطان کا ”ادارہ“ یا فرمان، شریعت کے قوانین سلطان سے بالاتر تھے اور وہ ان میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا تھا، اپنے پیشروؤں کے بنائے ہوئے آئین و دستور کی پابندی اگرچہ اس کے لیے لازمی نہ تھی، تاہم وہ اتنے مفید اور کارآمد تھے کہ انھیں بالکل ترک نہیں کیا جاسکتا تھا، سلیمان اعظم ”قانونی“ کے لقب سے مشہور ہے، لیکن اس نے جتنے نئے قانون اور فرمان جاری کیے، ان سے زیادہ پرانے آئین و دستور کو مرتب اور منضبط کیا، قومی رسم و رواج کا لحاظ رکھنا بھی ضروری تھا، کیونکہ ترک اپنے قدیم رواجوں کے شدت سے پابند تھے اور ان میں کسی طرح کی مداخلت گوارا نہیں کرتے تھے۔

لارنٹ اپنی تاریخ ترکی میں جو انیسویں صدی کے وسط میں لکھی گئی ہے، سلطان کی حیثیت کے متعلق بیان کرتا ہے:

”ترکی کا نظم و نسق اس شاہی حکومت سے زیادہ مشابہت رکھتا ہے، جسے مونٹسکو (Montesquieu) ”حکومت شخصی بذریعہ

قوانین منضبط“ سے تعبیر کرتا ہے، بہ نسبت اس حکومت کے جو عام طور پر مطلق العنانی سے مراد لی جاتی ہے یعنی ایسی حکومت جہاں ایک شخص بغیر کسی قانون اور قاعدہ کے اپنی خود پسندی اور تکون مزاجی کے لحاظ سے سب پر حکمرانی کرتا ہے، نہ صرف یہ کہ ترکی میں قانون کا وجود پایا جاتا ہے بلکہ قانون ہی وہاں سب سے بڑا اور تنہا حاکم ہے، بادشاہ اسی کے ذریعہ اور اسی کے نام سے حکومت کرتا ہے اور اس کو جو اقتدار حاصل ہے وہ اس لیے نہیں دیا گیا تھا کہ اسے جس طرح چاہے استعمال کرے بلکہ اس لیے کہ اہل ملک کے مفاد کا تحفظ کرے جن کا وہ سردار ہے، چنانچہ ترکی میں بادشاہ محض قانون کا محافظ ہے اور وہ تمام لوازم جو اس کے منصب سے متعلق ہیں صرف اس پر مشتمل ہیں کہ قانون کو خود اپنی ذات سے لے کر نیچے تمام اشخاص تک ہر ایک کی زد سے بچائے اور یہ حق محض سلطان کے ساتھ مخصوص نہیں، نبی کریم ﷺ کی مشہور حدیث کے رو سے کہ ”قانون کی برخلاف ورزی کو روکو“ یہی حق سلطان کی ادنیٰ سے ادنیٰ رعایا کو بھی حاصل ہے اور یہ حدیث ترکی میں قانون یا بالفاظ دیگر ”سین و دستور کی حفاظت“ انفرادی طور پر تمام باشندوں کے سپرد کرتی ہے۔“ (۱)

قانون کی پاسداری کا اندازہ ایک عجیب و غریب واقعہ سے ہو سکتا ہے، ۱۷۵۵ء میں باب عالی کی عمارت آتش زدگی سے برباد ہو گئی، جب وہ دوبارہ تعمیر کی جانے لگی تو اس خیال سے کہ آئندہ اس قسم کا حادثہ پیش نہ آئے، یہ طے کیا گیا کہ جو مکانات اس سے متصل ہیں ان کو خرید کر منہدم کر دیا جائے اور عمارت کے چاروں طرف

(۱) ترکی از جارج لارپنٹ مطبوعہ لندن ۱۸۵۴ء جلد دوم ص ۶۵ (Turkey by Sir George

کافی جگہ چھوڑ دی جائے، جن لوگوں کے مکانات باب عالی سے ملے ہوئے تھے وہ سب انھیں فروخت کر دینے پر راضی ہو گئے، مگر ایک بوڑھی عورت اپنا مکان چھوڑنے پر کسی طرح آمادہ نہ ہوئی، اس نے کہا کہ اس مکان میں کئی پشتوں سے میرا خاندان رہتا آیا ہے اور میری نگاہوں میں اس کی جو قیمت ہے وہ بڑی سے بڑی رقم سے بھی ادا نہ ہو سکے گی، حکام نے اسے بہت کچھ لالچ دیا، ڈرایا دھمکایا بھی مگر وہ کسی طرح رضا مند نہ ہوئی، مجبوراً اس کا مکان بدستور رہنے دیا گیا، حکومت زبردستی اس پر قبضہ نہ کر سکی، سلطان اپنے تمام اختیارات کے باوجود یہ نہ کر سکا کہ بوڑھیا کو مکان کی قیمت دلوا کر اسے منہدم کر دیتا (۱) نوشیرواں کے محل اور بوڑھیا کے جھونپڑے کا واقعہ تو ساری دنیا میں مشہور ہے، مگر سلطنت عثمانیہ کے مطلق العزن فرماں روا کا یہ عدل بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا۔

سلطان کی یک نمایاں حیثیت یہ تھی کہ وہ ایک جنگجو قوم کا سردار تھا، قدیم ترک سلاطین فوج کی سادہ زندگی بسر کرتے تھے، وہ فوج کی کمان خود کرتے تھے اور سپاہیوں کی قوم کے سپہ سالار سمجھے جاتے تھے، ترکوں کا بے چوں و چرا احکام سلطانی کی تعمیل کرنا سلطان کی اسی حیثیت کی بنا پر تھا، اس قوم کی ایک خاص خصوصیت نظم و ضبط کا فطری ملکہ ہے، چنانچہ دولت عثمانیہ کی تاریخ میں انقلابات کے شذوذ نا در واقع ہونے کا بڑا سبب یہی قومی خصوصیت ہے، بعض سلاطین تخت سے اتارے گئے اور بعض قتل بھی کر دئے گئے، مگر ہمیشہ یہ نتیجہ تھائی چری کی بغاوت کا جو ترک نہ تھے یا محل کی سازش کا جس کے تمام عہدہ دار ادارہ حکومت سے تعلق رکھتے تھے اور عیسائی والدین کی اولاد تھے، ۱۹۰۸ء کے دستوری انقلاب کے علاوہ کوئی عام تحریک کبھی سلطان کے خلاف رونما نہیں ہوئی، نیز یہ واقعہ بھی کم تعجب خیز نہیں کہ باغیوں نے کبھی خاندان عثمان کے علاوہ کسی دوسرے خاندان کے فرد کو تخت پر بٹھانے کی کوشش نہیں کی۔

لیکن خاندان شاہی سے ایسی راسخ وفاداری کے باوجود ترک طبقہ امرا کو تسلیم

نہیں کرتے، شاہی خاندان سے متعلق ہونا کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا تھا اور نہ ایسے لوگوں کو مخصوص حقوق یا رعایات حاصل تھیں، سلطان کے بہت سے اعزہ ایک حد تک گمنامی کی زندگی بسر کرتے تھے، شہزادوں اور شہزادیوں کی فہرست شائع کرنے کی سخت ممانعت تھی اور سلطان محمد فاتح نے تو صاف الفاظ میں یہ اعلان کر دیا تھا کہ شہزادیوں کی اولاد فوج کے اونچے عہدوں پر مقرر نہیں ہو سکتی۔ (۱)

قانون وراثت: ابتدائی صدیوں میں خاندان شاہی کا قانون وراثت یہ تھا کہ بیٹا باپ کا جانشین ہوتا تھا، بھائی اسی وقت تخت پر بیٹھتا جب سابق سلطان کا کوئی لڑکا اس کی وفات کے وقت موجود نہ ہوتا، چونکہ تعداد ازواج کی وجہ سے اکثر مختلف ماؤں سے متعدد لڑکے ہوتے تھے اس لیے تاج و تخت کی خاطر ان میں سخت کشمکش ہوتی اور عموماً وہی لڑکا تخت نشین ہوتا تھا جو اپنے بھائیوں کو قتل کر دیتا تھا، محمد فاتح نے اس دستور کو کوئی شکل دے کر اور بھی مستحکم کر دیا تھا، چنانچہ اس خیال سے کہ سلطنت فتنہ کی آگ سے محفوظ رہے شہزادوں کا قتل جاری رہا، لیکن سلیمان اعظم کے وقت سے بجائے قتل کے شہزادے محل میں نظر بند رکھے جانے لگے، ۱۶۱۷ء میں جب سلطان احمد کا انتقال ہوا تو اس کے تمام لڑکے نو عمر تھے اور کوئی بھی زمام حکومت کو ہاتھ میں لینے کے قابل نہ تھا، دیوان نے صورت حال کے تقاضے سے قانون وراثت کو بدل دیا اور بجائے اس کے کہ مرحوم سلطان کے کسی لڑکے کو تخت نشین کرتے اس کے بھائی مصطفیٰ کو تخت پر بٹھایا اور اب یہ قانون بنادیا گیا کہ تخت کا وارث آل عثمان کا وہ شہزادہ ہوگا جو عمر میں سب سے بڑا ہو، چنانچہ اس وقت سے برابر اسی قانون پر عمل درآمد ہوتا رہا اور سلطان احمد کے بعد صرف دو سلاطین ایسے ہوئے جو اپنے باپ کی جگہ تخت پر بیٹھے: محمد رابع اور عبدالجید۔

دیوان: سلطان کی مجلس شوریٰ جسے دیوان کہتے تھے، مندرجہ ذیل ارکان پر مشتمل تھی:

(۱) ترکی یورپ میں از اوڈیسی لیس، مطبوعہ لندن ۱۹۰۰ء ص ۱۱۹ Turkey in Europe by

صدر اعظم اور اس کے ماتحت وزراء، شیخ الاسلام، قاضی عسکر اناطولیہ، قاضی عسکر رومیلیا، بیلر بے اناطولیہ، بیلر بے رومیلیا، آغائے یمنی چری، قبودان پاشا یعنی عثمانی امیر البحر، دفتر دار اور نشا نجی، یہ سب حکومت کے مختلف شعبوں کے افسر اعلیٰ تھے، دیوان سلطنت کی نہ صرف سب سے بڑی انتظامی مجلس تھا بلکہ عدالت العالیہ بھی تھی، شیخ الاسلام اور دونوں قاضیوں کی شرکت اسی حیثیت سے تھی، اس کا اجلاس رمضان شریف کے علاوہ تمام سال ہفتے میں چار دن ہوا کرتا تھا، شروع میں سلطان خود اس کی صدارت کرتا تھا، لیکن سلیمان نے یہ طریقہ ترک کر دیا، البتہ وہ مجلس کی کارروائی کی نگرانی متصل کمرہ میں ایک جالی دار کھڑکی کے پیچھے بیٹھ کر کیا کرتا تھا، بعد کے سلاطین کو یہ زحمت بھی گوارا نہ ہوئی اور انھوں نے دیوان کا سارا کام صدر اعظم کے سپرد کر دیا، چنانچہ اب اس کی صدارت مستقل طور پر وہی کرنے لگا اور بحیثیت نمایندہ سلطان اسے تقریباً تمام ملکی، فوجی اور عدالتی اختیارات حاصل ہو گئے۔

وزرا: شروع میں صدر اعظم کے ماتحت تین وزیر ہوتے تھے، کیا بے، رئیس آفندی اور چاوش باشی، کیا بے وزیر جنگ اور وزیر داخلہ کی خدمات انجام دیتا تھا اور صدر اعظم کی غیر موجودگی میں اس کا قائم مقام ہوتا تھا، رئیس آفندی جس کا پورا لقب رئیس الکتاب تھا بیک وقت چیف سکریٹری اور وزیر خارجہ دونوں کا منصب رکھتا تھا، چاوش باشی سلطنت کا میر دربار اور وزیر پولیس تھا۔

دفتر دار اور نشا نجی: دفتر دار اور نشا نجی سلطنت کی مالیات کے ذمہ دار تھے اور درجہ میں وزرا کے برابر تھے، دفتر دار وزیر مالیات تھا، نشا نجی تمام سرکاری کاغذات تیار کرتا تھا اور جس کاغذ پر ضرورت ہوتی، سلطان کا طغرائیت کرتا تھا، اس کے ماتحت متعدد عہدہ دار تھے جو حکومت کی ہر کارروائی کی روداد مرتب کرتے تھے۔

بیلر بے: قاضی عسکر کی طرح بیلر بے بھی ابتداءً صرف دو ہوتے تھے، ایک ایشیائی مقبوضات کے لیے اور دوسرا یورپی، لیکن بعد میں ان کی تعداد بڑھا دی گئی اور یہ سلطنت

کے صوبوں کے والی یا گورنر جنرل مقرر کر دئے گئے، پیلر بے اپنے صوبہ کے تمام ملکی اور فوجی عہدہ داروں کا افسر اعلیٰ ہوتا تھا، صوبے پہلے ایالت کہے جاتے تھے، بعد کو ان کا نام ولایت ہو گیا، ایالتیں ضلعوں میں تقسیم تھیں جن کو سنجق یا لوا کہتے تھے، دونوں کے معنی جھنڈے کے ہیں، ان ضلعوں کے حاکم سنجق بے یا میرلوا کہے جاتے تھے، ہر صوبہ کی ایک مجلس شوریٰ تھی جس کا صدر وہاں کا والی ہوتا تھا، اس مجلس میں ضلعوں کے معزز اشخاص کی ایک تعداد بھی ہوتی تھی جن کو مقامی باشندے اپنے نمائندوں کی حیثیت سے انتخاب کر کے بھیجتے تھے، مقصد یہ تھا کہ ضلع کے انتظام میں وہاں کے لوگوں کو بھی کسی حد تک شریک کیا جائے، نیز یہ کہ جہاں تک ممکن ہو والی کے استبداد کی روک تھام ہوتی رہے، ہر صوبہ کی مجلس ایک چھوٹے پیمانہ پر مرکزی حکومت کے دیوان کا شنی تھی، اس کے ارکان بھی صوبہ کی حکومت کے مختلف شعبوں کے افسر اعلیٰ تھے۔

بنی چری: سلطنت کی طاقت کا دار و مدار بہت کچھ اس کے فوجی نظام پر تھا، بنی چری مستقل پیدل فوج تھی، جس کی حیرت انگیز شجاعت اور نظم و ضبط نے تین سو برس تک یورپین سلطنتوں کو لرزہ بر اندام رکھا، دولت عثمانیہ کی تمام فتوحات زیادہ تر اسی فوج کے زور بازو کا نتیجہ تھیں، سولہویں صدی عیسوی تک اس میں صرف عیسائی لڑکے بھرتی کیے جاتے تھے، چونکہ وہ نو عمری ہی میں اپنے گھروں سے علاحدہ کر دئے جاتے تھے، اس لیے ان کے دل والدین یا وطن کی محبت سے نا آشنا رہتے اور ان کی ساری توقعات سلطان کی ذات سے وابستہ ہو جاتیں، وہ اس کے غلام ہوتے اور اسی کی بے چوں و چرا اطاعت کرنے سے ان کے لیے ترقی کی راہیں کھلتیں، انھیں شادی کرنے کی اجازت نہ تھی، لیکن سلیمان اعظم کے عہد کے آخری حصہ میں بنی چری کے لڑکے بھی اس فوج میں داخل کیے جانے لگے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ تجدد کا قانون جو اس فوج کے لیے لازمی قرار دیا گیا تھا، پہلے ہی ٹوٹ چکا تھا، یہ ایک ایسی بدعت تھی جو بالآخر اس نظام کے لیے مہلک ثابت ہوئی، سلیمان ہی کے عہد میں کچھ مسلمان لڑکے بھی اس میں داخل کر لیے گئے تھے، کبھی

کبھی اس فوج کا کوئی اعلیٰ افسر ایسا بھی ہوتا تھا جس کے والدین عیسائی نہیں بلکہ مسلمان ہوتے، لیکن جیسا کہ پروفیسر لی بائر نے لکھا ہے، یہ سب استثنائی مثالیں تھیں اور ان کا مجموعی اثر بہت ہی کم تھا۔ (۱)

سلیمان کے بعد بنی چری کا نظام برہم ہونے لگا، انھوں نے ۱۵۷۴ء میں مراد ثالث سے یہ رعایت حاصل کر لی کہ ان کے لڑکے بھی بنی چری دستوں میں داخل کیے جاسکتے ہیں، پھر ۱۵۸۳ء میں جب جنگ ایران کے لیے کافی سپاہی فراہم نہ ہو سکے تو عثمان پاشا نے مجبوراً مسلمانوں کو بھی اس فوج میں بھرتی کرنا شروع کیا، ان بے قاعدگیوں میں جتنی ترقی ہوتی گئی اتنی ہی عیسائی لڑکوں کی بھرتی کم ہوتی گئی، سلطان قلی کو جو مراعات حاصل تھیں، ان کو دیکھ کر ترک کسان بھی اپنے عیسائی ہمسایوں کو راضی کر کے اپنے لڑکوں کو عیسائی بنا کر بھرتی کر دیتے اور بھرتی کرنے والے افسر یا تو دھوکا کھا جاتے یا رشوت لے کر چشم پوشی کر لیتے تھے، اس طرح سترہویں صدی کے وسط سے اس فوج کی ابتدائی نوعیت بالکل بدل گئی تھی، اس کی تعداد میں بھی روز بروز اضافہ ہوتا گیا، سلیمان کے عہد میں اس کا شمار بارہ سے پندرہ ہزار تک تھا، ۱۶۸۳ء کی مہم ویانا میں یہ تعداد ستر ہزار تک پہنچ گئی تھی، تعداد کے اضافہ کے ساتھ اس فوج کی سرکشی بھی بڑھتی گئی، اپنی طاقت کا احساس اسے شروع سے تھا، لیکن جب تک مضبوط سلاطین تحت نشین رہے انھوں نے اسے قابو میں رکھا، سلیمان کے بعد جب عثمان حکومت کمزور ہاتھوں میں آئی اور بنی چری کی تنظیم میں بے عنوانیاں شروع ہوئیں تو اس نے سراٹھایا اور خود سلطنت کے لیے ایک مستقل خطرہ بن گئی، پروفیسر جرمانس لکھتے ہیں:

”اس مخصوص فوج میں کسی باہر والے کو علاوہ اس صورت کے جب کہ اس میں کوئی خاص خصوصیت ہو شرکت کی اجازت نہ تھی، اگرچہ جاں نثاری افواج اپنی ترکیب کے لحاظ سے مخلوط تھیں، لیکن ان کی

حلقہ ہندی اور ریشہ اتحاد مستحکم تھے، البتہ سولہویں صدی کے آخر میں وہ بازگیر اور مسخرے بھی جواپنے کرتوں سے شاہی محفلوں میں سلطان کی خوشنودی حاصل کر لیتے اس میں بھرتی کیے جانے لگے، اس کے بعد سے تو جاں نثاریوں کی ہارکوں میں ہر قسم کے غیر معتبر بیرونی لوگ داخل ہونے لگے، جس نے اس فوج کی روایتی یکجہتی اور شیرازہ بندی کو صدمہ پہنچایا اور ان کی جو خاص شان تھی اسے مٹا دیا، اب یہ لوگ شادیاں کر کے ہارکوں کے باہر رہنے اور امن و امان کے زمانہ میں کوئی نہ کوئی کاروبار بھی کرنے لگے، غرض کہ وہی فوج جس کی بسالت اور ہیبت کی کسی زمانہ میں دھاک بیٹھی ہوئی تھی، اب اس کی حیثیت صرف ایک شورش پسند اور شورہ پشت انبوہ کثیر کی سی ہو گئی، جس سے ملک کے امن و امان کے لیے اندیشہ پیدا ہو چلا، لڑائی کے کام کے تو یہ لوگ بالکل رہے ہی نہیں، در جب کئی مرتبہ ان کی جدید تنظیم کی کوشش کی گئی، لیکن ناکامی ہوئی تو آخر کار ۱۸۲۶ء میں اس فوج کو بالکل ہی توڑ ڈالا گیا۔“ (۱)

باب عالی کے سپاہی: جس طرح نئی چری سلطنت کی مستقل پیدل فوج تھی، اسی طرح ”باب عالی کے سپاہی“ مستقل سوار فوج تھی، ادارہ حکومت میں جو عیسائی لڑکے داخل کیے جاتے تھے، ان میں سے کچھ اعلیٰ تربیت کے لیے منتخب کر لیے جاتے تھے، انہی میں سے جو اپنی ذہنی قابلیت کے لحاظ سے بہترین ثابت ہوتے وہ حکومت کے انتظامی شعبہ کے لیے چن لیے جاتے، جو باقی رہ جاتے ان کا بڑا حصہ باضابطہ سوار فوج میں جسے ”باب عالی کے سپاہی“ کہتے تھے داخل کر دیا جاتا، فوج میں وہی امیدوار لیے جاتے تھے جن پر سلطان کو پورا اعتماد ہوتا، اس کا نظم و ضبط بھی ویسا ہی سخت تھا جیسا نئی چری کا، لیکن سلیمان کے بعد اس میں بھی وہی بے عنوانیاں ہونے لگیں جو نئی چری کے نظام میں

(۱) ”ترکوں کی اسلامی خدمات از ڈاکٹر جولیس جرمانس، مطبوعہ انجمن اردو پریس اورنگ آباد ص ۳۱

ہو رہی تھیں، سلطنت کی ان دونوں فوجوں کا شیرازہ ساتھ ساتھ منتشر ہو رہا تھا۔

جاگیریں سپاہی: نئی چری اور باب عالی کے سپاہی کے علاوہ ایک جاگیری سوار فوج بھی تھی جو ان دونوں سے زیادہ قدیم تھی، اس کو ”سپاہی“ کہتے تھے، صوبوں میں قدیم موروثی جاگیرداروں کا ایک حکمران طبقہ تھا، یہ وہ لوگ تھے جن کے آباؤ اجداد نے سطلانی علم کے نیچے فتوحات حاصل کی تھیں اور اس کے صلہ میں انھیں مفتوحہ علاقوں میں جاگیریں دی گئی تھیں، آمدنی کے لحاظ سے ان جاگیروں کی دو قسمیں تھیں، بڑی جاگیروں کو زعامت اور چھوٹی کو تہار کہتے تھے، ہر جاگیردار کو سواروں کی ایک معین تعداد ملے کر سلطان کی طلب پر جنگ میں شریک ہونا پڑتا تھا، جن کے مصارف وہ جاگیر کی آمدنی سے ادا کرتا تھا، صدیوں تک عثمانی افواج کا بڑا حصہ انہی جاگیریں ”سپاہیوں“ پر مشتمل تھا، سلطنت کے عروج کے زمانہ میں جاگیریں سواروں کی تعداد غالباً دوا لاکھ سے زیادہ تھی (۱) اس نظام کا مقصد یہ تھا کہ مسلمان سواروں کی ایک فوج صوبوں کی بغاوت فرو کرنے اور بیرونی جنگوں پر روانہ کیے جانے کے لیے ہر وقت تیار رہے اور سلطنت پر کوئی مالی بار بھی نہ پڑنے پائے، فوجی مہموں سے فارغ ہو کر جاگیردار اپنا وقت شکار اور فوجی کھیلوں میں صرف کرتے تھے، جن صوبوں میں ان کی جاگیریں واقع تھیں وہاں کے انتظام میں وہ کوئی حصہ نہ لیتے مگر خود اپنے علاقوں میں وہ خود مختار تھے، وہاں نہ سختی بے کا حکم چلتا تھا نہ والی کا، صرف فوجی معاملات میں وہ حکومت کے ان عہدہ داروں کی اطاعت کرتے تھے، باقی تمام امور میں وہ بالکل آزاد تھے، سولہویں صدی کے بعد اس جاگیری فوج کا نظم بھی پرانگندہ ہونے لگا، مراد ثالث کے عہد میں قصر شاہی کے مقربین کی نگاہیں ان جاگیروں پر پڑنی شروع ہوئیں، زیادہ زمانہ نہیں گذرا تھا کہ انھوں نے ”سپاہیوں کے رجسٹر میں اپنے نوکروں اور غلاموں کے نام لکھ والیے اور بہت سی بڑی بڑی جاگیریں غلاموں اور خوجہ سراؤں کے قبضہ میں چلی گئیں، ان میں سے اکثر ”سپاہی“ کے فرائض انجام دینے

کی مطلق اہلیت نہیں رکھتے تھے، یہ جاگیروں سے دور بیٹھ کر صرف ان کی آمدنی سے فائدہ اٹھانا جانتے تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ ”سپاہیوں“ کا ضبط مفقود ہوتا گیا اور اٹھارہویں صدی میں ان کی فوجی اہمیت باقی نہیں رہ گئی، اس درمیان میں حکومت کی طرف سے جب کبھی اصدا حات کی کوشش کی گئی، جاگیرداروں نے ہمیشہ مخالفت کی، بالآخر محمود عثمانی نے یہ دیکھ کر کہ ان کی بد نظمی سے سلطنت کو بجائے فائدہ کے نقصان پہنچ رہا ہے، ان کی جاگیریں ضبط کر لیں اور جو حقوق انھیں حاصل تھے وہ سلب کر لیے، یوں دولت عثمانیہ کی اس قدیم فوج کا استیصال بھی بنی چری کی طرح اسی مصلح کے ہاتھ سے عمل میں آیا۔ (۱)

جاگیری ”سپاہی“ اصلاً مسلمان ہونے کی وجہ سے ادارہ حکومت سے خارج تھے، ان کا تعلق ادارہ اسلامیہ سے تھا، لیکن اس فوج کے تمام افسر ادارہ حکومت میں شامل تھے، یہ عیسائی والدین کی اولاد ہوتے اور سلطان کے غلام کی حیثیت سے اس ادارہ میں داخل کیے جاتے تھے، یہاں فوجی تربیت پانے کے بعد یہ ”سپاہیوں“ کے افسر بنا کر بھیجے جاتے تھے۔

قپودان پاشا: قپودان پاشا عثمانی امیر البحر تھا، اس کے ماتحت سلطنت کے مستقل بیڑے کے علاوہ جس کا صدر مقام استنبول تھا وہ جاگیری بیڑا بھی تھا جسے بحرائین کے ساحلی علاقوں کے بعض نے وہاں کی جاگیروں کے معاوضہ میں فراہم کرتے تھے، ان ساحلی علاقوں میں قپودان پاشا کو وہی اختیارات حاصل تھے جو سلطنت کے دوسرے حصوں میں بیلر بے رکھتے تھے، عثمانی بحریہ کے تمام افسر اور جہاز راں عیسائی والدین کی اولاد اور سلطان کے غلام تھے، ادارہ حکومت کی حیرت انگیز تربیت نے انھیں ایسا بنا دیا تھا کہ سولہویں صدی میں سرایورپ ان کے کارناموں سے ہیبت زدہ رہتا تھا، امیر البحر میں خیر الدین پاشا، حسن پاشا، طورغوت، پیانے، پیری رئیس اور سیدی علی کے نام نہ صرف عثمانی تاریخ بلکہ یورپ کی بحری تاریخ میں بھی ہمیشہ یادگار رہیں گے، انھوں نے

اپنی فتوحات سے سلطنت عثمانیہ کی وسعت میں بہت کچھ اضافہ کیا، بحری فتوحات کے علاوہ ان میں سے بعض نے علمی کارنامے بھی دکھائے مثلاً پیری رئیس نے بحر روم اور بحر اربعین کا ایک نقشہ تیار کیا، جس میں بحری رعوں، مختلف مقامات کی گہرائیوں اور بندرگاہوں کے متعلق ضروری معلومات درج کیں، اسی طرح سیدی علی جس کا جہاز بادِ مخالفت کی وجہ سے ہندوستان کے ساحل پر پہنچ گیا تھا، جب خشکی کے راستہ سے خراسان، بلوچستان اور ایران ہوتا ہوا ترکی واپس آیا تو اس نے اپنے سفر کی سرگذشت لکھ کر مفید معلومات بہم پہنچائیں، اس کے علاوہ اس نے اصطراب کے استعمال پر بھی ایک کتاب لکھی اور ایک دوسری کتاب ”محیط“ نامی لکھی جس میں ہندوستان کے سمندروں کا حال بیان کیا۔ (۱)

بری فوجوں کی طرح سلطنت عثمانیہ کی بحری طاقت میں بھی سولہویں صدی کے آخر سے زوال شروع ہوا اور وہ روز بروز کمزور ہوتی گئی، اس کی اصلی وجہ ادارہ حکومت کے بنیادی اصول کی خلاف ورزی تھی، جس نے ہر شعبہ کو صدمہ پہنچایا یعنی یہ ادارہ اب نہ عیسائی لڑکوں کے لیے مخصوص رہا اور نہ فوجی اور ملکی مازمتوں پر انہی امیدواروں کا تقرر کیا جاتا جو اس ادارہ کی تعلیم و تربیت کا نصاب معیار کے مطابق پورا کر چکے ہوتے، تین سو برس کے بعد سلطان عبدالعزیز خاں نے اپنے شوقِ تعمیرات کے سلسلہ میں عثمانی بیڑے کی تعمیر پر بھی شاہانہ توجہ کی اور اسے اتنا طاقتور بنادیا کہ یورپ کے بہترین بیڑوں میں شمار ہونے لگا مگر سلطان عبدالحمید خاں کے زمانہ میں ان جہازوں کو شاخِ زریں سے نکلنے کی بھی نوبت نہیں آئی اور وہ وہیں پڑے پڑے زنگ آلود ہوتے رہے۔

ادارہ اسلامیہ: ادارہ اسلامیہ میں سلطنت کے وہ تمام مسلمان شامل تھے، جو ادارہ حکومت کے باہر تھے اور جو کسی حیثیت سے عام سطح سے بلند تھے، سلطان اس ادارہ کا بھی صدر تھا، دونوں کا بنیادی فرق یہ تھا کہ ادارہ حکومت کے ارکان تقریباً بلا استثناء عیسائی خاندانوں سے لیے جاتے تھے اور ادارہ اسلامیہ کے ارکان تمام تر مسلمان خاندانوں کے

(۱) ترکوں کی اسلامی خدمات از ڈاکٹر جو مائس ص ۳۳

افراد ہوتے تھے، ادارہ اسلامیہ کا بھی ایک تدریجی نظام تعلیم تھا، جماعت علما میں شامل ہونے کے لیے جو اس ادارہ کا حکمران طبقہ تھا، اس کے تعلیمی نظام سے گذرنا ضروری تھا، اس ادارہ کی خاص جماعتیں مدرسین، مفتیوں اور قاضیوں کی تھیں، انہی کے ہاتھوں میں سلطنت کے علوم، مذہب اور قانون کا نظام تھا۔

تعلیمی نظام: تعلیم کا ذوق یوں تو سلاطین عثمانیہ کو شروع ہی سے تھا لیکن محمد فاتح اپنے تمام پیشروؤں سے بڑھ گیا، اسی نے ”سلسلہ علما“ کو قائم کر کے سلطنت کے مفتیوں اور قاضیوں کی تعلیم و ترقی کا ضابطہ مرتب کیا، مکاتب و مدارس سلطنت کے ہر حصہ میں کثرت سے قائم تھے، یہ مسجدوں سے متعلق ہوتے تھے اور ان کے اخراجات وقف کی آمدنی سے پورے کیے جاتے، مکاتب یعنی ابتدائی اسکولوں میں تعلیم مفت تھی اور اکثر طلبہ کے قیام و طعام کا انتظام بھی وقف ہی کی آمدنی سے ہوتا تھا، اعلیٰ تعلیم کے مدارس میں بھی طلبہ کو جزوی طور پر امداد دی جاتی تھی، نصاب تعلیم کی تفصیل آئندہ باب میں بیان کی گئی ہے، ان تمام لوگوں کو جو ادارہ اسلامیہ میں کوئی سرکاری عہدہ چاہتے تھے، کسی مدرسہ سے فارغ التحصیل ہونا لازمی تھا، جب تک وہ زیر تعلیم رہتے انھیں ”سوفتہ“ کہا جاتا، نصاب پورا کرنے کے بعد دانشمند کی سند مل جاتی تھی، ایسے طلبہ کو جو مکاتب کی معلمی یا مساجد کی امامت وغیرہ کے عہدوں پر قناعت کر لیتے یہ سند کافی تھی، لیکن جو مفتی یا قاضی بننے کا حوصلہ رکھتے تھے انھیں قانون کا ایک اعلیٰ نصاب پورا کرنا پڑتا تھا، مفتی اعظم خود ان کا امتحان لیتا تھا اور اگر وہ کامیاب ہوتے تو انھیں ملازم کی سند دی جاتی تھی، اسی جماعت سے اونچے درجہ کے مدرس بھی مقرر کیے جاتے تھے۔

مفتی: مفتیوں کی جماعت علما میں خاص اہمیت رکھتی تھی، ہر بڑے شہر کے قاضی کے ساتھ ایک مفتی مقرر ہوتا تھا، اس کے علاوہ بیلر بے اور سنخ بے کے ساتھ بھی مفتی ہوا کرتے تھے، وہ مدت العمر کے لیے مقرر کیے جاتے تھے، انھیں خود معاملات میں دخل دینے کا حق حاصل نہ تھا بلکہ جب کبھی کوئی قاضی بے یا عام آدمی ان سے استفتا کرتا تو ان

کا فرض تھا کہ مذہب حنفی کے مطابق فتویٰ دیں، عام طور پر تو مفتی کا درجہ قاضی کے بعد تھا مگر قسطنطنیہ میں یہ نہ تھا جہاں سلطان اور افسران حکومت کو اکثر نہایت اہم معاملات میں فتویٰ لینے پڑتے تھے، اسی وجہ سے قسطنطنیہ کے مفتی کا درجہ جو مفتی اعظم کہا جاتا تھا، قاضیوں سے بھی بڑھ گیا، محمد ثانی نے اسے شیخ الاسلام کا لقب بھی عطا کیا جو اب اس کا عام لقب ہو گیا، مفتی اعظم اپنی جماعت سے نہیں منتخب ہوتا تھا بلکہ سلطان اسے عموماً قاضیوں میں سے مقرر کرتا تھا، اسے سلطنت کے تمام دوسرے مفتیوں کو مقرر کرنے اور ترقی دینے کا حق حاصل تھا۔

سلیمان نے مفتی اعظم کو عہد کا صدر مقرر کیا اور اس حیثیت سے اس کا درجہ حکومت کے تمام عہدہ داروں سے اونچا ہو گیا، بجز اس کے کہ دیوان میں اس کی جگہ صدر اعظم کے بعد تھی، اپنے منصب کی اہمیت کے لحاظ سے وہ قریب قریب سلطان کا ہمسر ہو گیا کیونکہ وہی قانون شریعت کا شارح اور وکیل تھا اور شریعت سلطان سے بلند تر چیز تھی، بایزید ثانی کا معمول تھا کہ مفتی اعظم کے استقبال کے لیے کھڑا ہو جاتا تھا اور اسے اپنے سے اونچی جگہ بیٹھنے کو دیتا تھا۔ (۱)

سلطان سلیم اور مفتی جمالی کا واقعہ مشہور ہے، سلیم جب مصر کی مہم سے واپس آیا تو اس نے چاہا کہ سلطنت میں اسلامی رنگ پیدا کرنے کے لیے تمام عیسائیوں کو مسلمان کر لے، خواہ اس میں جبری سے کام لینا پڑے مگر اتنا اہم کام شرعی فتوے کے بغیر ممکن نہ تھا اور شیخ الاسلام جمالی آفندی نے اس بنا پر فتویٰ دینے سے انکار کر دیا کہ سلطان محمد فاتح نے عیسائی رعایا کو مذہبی آزادی عطا کی تھی اور اس معاہدہ کی پابندی قانون شریعت کے لحاظ سے ضروری تھی، انھوں نے تین بڑھے نی چری بھی جن کی عمر سو سال سے زیادہ تھی بطور گواہ اس معاہدہ کے ثبوت میں پیش کیے، یہ تینوں محمد فاتح کے علم کے نیچے لڑ چکے تھے مجبوراً سلیم کو یہ خیال ترک کر دینا پڑا، خالدہ خانم اس واقعہ پر تبصرہ

کرتی ہوئی لکھتی ہیں:

”یہ واقعہ کئی پہلوؤں سے اہمیت رکھتا ہے، ایک تو یہ کہ سلیم کا
 شخص جس نے خدا جانے کتنے وزیروں کو قتل کرادیا، شیخ الاسلام کے
 آگے جو قانون اور شریعت کا نمائندہ ہے سر جھکا دیتا ہے، اس کے معنی یہ
 ہیں کہ اس وقت تک سلطنت عثمانی کا نظام اور اس کے اصول بڑے
 سے بڑے سلطان کی شخصیت سے زیادہ قوی تھے، اس سے یہ بھی ظاہر
 ہوتا ہے کہ جمالی آفندی اور تینوں بوزھے سپاہیوں میں عثمانی قومیت کا
 احساس اس حد تک موجود تھا کہ گو وہ دل سے چاہتے ہوں کہ سارا ملک
 مسلمان ہو جائے مگر انھوں نے اپنی سلطنت کے اصول کی حفاظت
 فرض سمجھی۔“ (۱)

نظام عدالت: قاضیوں کا حلقہ اختیار ادارہ حکومت سے زیادہ وسیع تھا، مثلاً آریسیا
 اور شہلی افریقہ کی ریاستیں اگرچہ انتظامی حیثیت سے مرکزی حکومت کے تابع نہ تھیں بلکہ
 محض وابستہ (Yassal) حکومتیں تھیں، مگر یہ بھی عثمانی نظام عدالت کے ماتحت تھیں،
 قاضیوں کے عدالت میں دیوانی اور فوجداری ہر قسم کے مقدمات فیصلہ ہوتے تھے، نین
 چند جماعتوں کے معاملات ان کے اختیار سماعت سے باہر تھے، مثلاً سلطان قلی، سادات
 اور غیر ملکی باشندوں کے معاملات جنھوں نے سلطنت عثمانیہ میں اپنی نوآبادیاں قائم کر لی
 تھیں خود ان کی عدالتوں میں پیش ہوتے تھے، عیسائی رعایا کے مقدمات بھی جن میں
 فریقین عیسائی ہوتے انہی کی کلیسائی عدالتوں کے سپرد تھے، ادارہ اسلامیہ کے جج یعنی
 قاضی ان تمام مقدمات کی سماعت کرتے تھے جو قانون شریعت سے متعلق ہوتے اور جن
 میں دونوں فریق مسلمان یا ایک مسلمان اور دوسرا عیسائی ہوتا، علاوہ اس صورت کے کہ
 مسلمان سلطان قلی یا سید ہوتا۔

قاضی: تقریباً تمام قاضی شہر کے قاضی ہوا کرتے تھے مگر ان کا حقہ اختیار گرد و نواح کے علاقوں کو بھی محیط ہوتا تھا، ججوں کے پانچ خاص طبقے تھے: بڑے درجہ کے ملا، چھوٹے درجہ کے ملا، مفتش، قاضی اور نائب، جج کے لیے عام نام قاضی تھا مگر احتراماً لوگ اسے ملا کے لقب سے پکارتے تھے، ایک دوسری تقسیم جغرافیائی بنیاد پر تھی یعنی یورپ اور ایشیا کے قاضی عسکر جو قاضی عسکر رومیلیا اور قاضی عسکر اناطولیہ کہے جاتے تھے، ہر قاضی عسکر کے ساتھ ایک بڑی جماعت ماتحت عہدہ داروں کی ہوتی تھی، سب سے اونچی عدالتیں قاضی عسکر صدر اعظم اور دیوان کی تھیں، علاوہ ان مقدمات کے جو دیوان میں ان کے سامنے پیش ہوتے تھے یا جن کی سماعت دیوان کے ختم ہو جانے پر وہ قصر شاہی کے باب پر کرتے قاضی عسکر دوسرے اوقات میں بھی اپنے گھروں پر عدالت کیا کرتے تھے جیسا کہ ان کے نام سے ظاہر ہے، ان کی اصلی حیثیت فوجی ججوں کی تھی مگر بعد میں ان کے اختیارات وسیع کر دئے گئے، یہاں تک کہ وہ اپنے حلقہ کے تمام ججوں کے افسر اعلیٰ بن گئے، دیوان میں ان کا درجہ وزرا کے بعد تھا، لیکن دیوان کے ختم ہونے پر انھیں سب سے پہلے سلطان کی خدمت میں باریابی کا حق حاصل تھا، سلیمان کے عہد تک انھیں جماعت علما پر وہ تمام اختیارات بھی حاصل تھے جو سلیمان نے مفتی اعظم کو تفویض کر دئے۔

صدر اعظم کی عدالت: سلطان کے نمائندے کی حیثیت سے صدر اعظم ادارہ اسلامیہ کا بھی حقیقی صدر تھا اور اس کی عدالت دیوانی کے تمام مقدمات کے لیے سب سے بڑی عدالت مرافعہ تھی، لیکن وہ صرف عدالت عالیہ ہی نہ تھی بلکہ سطنت کی دوسری عدالتوں کی طرح عدالت ابتدائی بھی تھی، جہاں امیر و غریب کے چھوٹے بڑے کثیر التعداد مقدمات فیصلہ ہوتے تھے، عدالت کا دروازہ ہر شخص کے لیے کھلا رہتا تھا یا تو صدر اعظم خود فیصلے صادر کرتا یا فرصت نہ ہونے کی صورت میں مقدمات کو کسی قاضی عسکر یا دوسرے جج کے سپرد کر دیتا کہ فیصلہ جلد کر دیا جائے، پروفیسر لی بار لکھتے ہیں کہ کم سے کم ایک حیثیت سے عثمانی عدالتیں بہت قابل تعریف تھیں، فریقین مقدمہ کو فیصلہ کے انتظار

کی زحمت بہت کم برداشت کرنی پڑتی تھی، مقدمات فوراً اور صاف و سادہ الفاظ میں فیصلہ کیے جاتے تھے (۱)، عدالتوں میں مذہب حنفی پر عمل درآمد تھا۔

ملتیں: ادارہ اسلامیہ کے علاوہ سلطنت میں مختلف ملتوں کا بھی جداگانہ نظام نہ تھا، یہ ملتیں کلیسائی فرائض کے علاوہ پیدائش، اموات، نکاح اور وصیت ناموں کا اندراج کرتیں اپنے مذہب والوں کے شخصی قانون کے معاملات خود اپنی عدالتوں میں فیصلہ کرتیں اور اگر فریقین مقدمہ اسی ملت کے ہوتے تو ان کے دیوانی کے مقدمات کا فیصلہ بھی ان ہی عدالتوں میں ہوتا، اس کے علاوہ یہ ملتیں اپنے حلقہ کے لوگوں سے ٹیکس بھی وصول کرتی تھیں یہ تمام فرائض جو حقیقتہً فرماں روائی کی خصوصیات میں داخل ہیں سلطنت عثمانیہ نے صراحت کے ساتھ ملتوں کو تقسیم کر دئے تھے اور ان کی انجام دہی میں خود اپنی فوجوں سے ملتوں کی مدد کرتی تھی، ان میں سب سے اہم ملت روم تھی، جس کے حلقہ میں وہ تمام عیسائی رعایا شامل تھی جو مشرقی یا یونانی کلیسا کی پیرو تھی، خواہ وہ سلطنت کے کسی حصہ میں آباد ہو اور اس کی درمی زبان کچھ بھی ہو، اس ملت کا قائد اعظم بطریق قسطنطنیہ تھا، جس کو سلطنت عثمانیہ کے عروج کے زمانہ میں اس سے زیادہ اقتدار حاصل تھا جتنا وہ سلطنت بازنطینی کے ایک عہدہ دار کی حیثیت سے رکھتا تھا، ملت روم کے علاوہ چند ملتیں اور بھی تھیں مثلاً ملت ارمنی جو قسطنطنیہ کے گریگوری بطریق کے ماتحت تھی، ملت یہود جس کا افسر ربی اعظم تھا اور رومن کیتھولک عیسائیوں کا فرقہ جو پوپ کے ایک نمائندہ کے ماتحت تھا۔

سلطنت میں ایسے بہت سے رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ آباد تھے، جو سلطان کی رعایانہ تھے بلکہ مغربی طاقتوں مثلاً وینس، فرانس، ہالینڈ اور انگلستان کی رعایا تھے، یہ تجارت کی غرض سے آئے تھے اور یہیں مقیم ہو گئے تھے، انھیں بھی حکومت عثمانیہ کی طرف سے ان کے سفیروں اور قصلوں کے ماتحت اسی قسم کے اختیارات دے دئے گئے تھے، جس قسم کے ملتوں کو حاصل تھے اور یہ غیر ملکی باشندے بھی عیسائی رعایا کی طرح اپنے معاملات کا انتظام

خود ہی کرتے تھے، عثمانی ترکوں نے تقریباً کل تجارت عیسائیوں کے ہاتھ میں چھوڑ رکھی تھی۔

انتظامی تبدیلیاں: ادارہ حکومت کے بنیادی نظام میں جب تک طاقت رہی ان حقوق و مراعات سے سلطنت کو کوئی نقصان نہ پہنچا، لیکن سولہویں صدی کے بعد جب اس ادارہ کے اصول سے بے اعتنائی برتی جانے لگی تو حکومت کے ہر شعبہ میں اختلال کے آثار ظاہر ہونا شروع ہوئے، سلیمان کے بعد جو شہزادے تخت پر آئے وہ بچپن سے محل میں نظر بند رہنے کے باعث ملکہ حکمرانی سے محروم ہو چکے تھے، ان میں سے بہت کم ایسے تھے جو اتنی بڑی سلطنت کا بار اٹھا سکتے، ان کی نااہلی سے امور مملکت میں حرم کا دخل شروع ہوا، سفارش گردیوں کا دور دورہ ہوا، ملکی اور فوجی عہدے فروخت ہونے لگے اور نظام حکومت کی تمام بنیادیں متزلزل ہو گئیں، یہ اندرونی کمزوریاں بیرونی حملوں کا پیش خیمہ تھیں، چنانچہ سترہویں صدی کے بعد دولت عثمانیہ اپنے مغربی حریفوں سے اکثر جگہوں میں شکست کھاتی رہی اور آسٹریا اور روس سے جو لڑائیاں ہوئیں ان میں متعدد صوبے اس کے ہاتھ سے نکل گئے، محمود ثانی نے یہ دیکھ کر کہ سلطنت پرانی بنیادوں پر جو بالکل کھوکھلی ہو چکی ہیں زیادہ دنوں قائم نہیں رہ سکتی، اس قدیم نظام کو توڑ دیا اور حکومت کے ہر شعبہ میں اصلاحات شروع کیں، ادھر عیسائی رعایا میں بھی ایک نئی تحریک پیدا ہو گئی تھی، سترہویں صدی کے آخر میں بہت سے یونانیوں نے تجارت کے ذریعہ مغرب سے ربط پیدا کر لیا تھا، مغربی زبانیں سیکھ لی تھیں اور مغربی علوم و فنون اور سیاسی خیالات سے آشنا ہو گئے تھے، دولت عثمانیہ کو جب یورپین طاقتوں کے مقابلہ میں شکستیں ہونے لگیں تو عیسائی صوبوں کی طرف سے حکومت خود اختیاری کا مطالبہ شروع ہوا اور دولِ عظمیٰ نے ان کی حمایت میں باب عالی پر دباؤ ڈالا کہ ان صوبوں میں اصلاحات جلد سے جلد جاری کر دی جائیں، چنانچہ ۱۸۳۹ء کے خط شریف اور ۱۸۵۶ء کے خط ہمایوں میں ان تمام اصلاحات کا اعلان کر دیا گیا، جن کا مطالبہ دولِ عظمیٰ نے کیا تھا مگر اس کے بعد بھی عیسائی صوبوں کا مطالبہ خود اختیاری بدستور قائم رہا اور دولِ عظمیٰ کو بھی یہ اصلاحات نا کافی معلوم

ہوئیں، اس کے بعد ان طاقتوں کی طرف سے عیسائی صوبوں کی خفیہ اور علانیہ امداد کا وہ سلسلہ شروع ہوا جس نے بالآخر ان کو دولت عثمانیہ سے آزاد کرنا چھوڑا، ان واقعات کی تفصیل گذشتہ صفحات میں پھیلی ہوئی ہے۔

غرض انیسویں صدی کی ان اصلاحات سے جو ”تنظیمات“ کے نام سے مشہور ہیں، سلطنت عثمانیہ کی تاریخ میں ایک نیا دور شروع ہوا، وہ نظام حکومت جو قدیم سلاطین نے قائم کیا تھا بالکل بدل دیا گیا اور اس کی جگہ مغربی طرز کا جدید نظام قائم کیا گیا، حکومت کے مختلف شعبوں کے لیے وزارتیں قائم ہوئیں اور ہر وزیر اپنے شعبہ کا ذمہ دار قرار دیا گیا، حکومت کے تمام عہدے مسلمانوں اور عیسائیوں کے لیے یکساں طور پر کھول دئے گئے، بڑے بڑے عہدوں یہاں تک کہ وزارتوں اور سفارتوں پر بھی عیسائیوں کا تقرر ہونے لگا، عدالتی نظام میں بھی تبدیلی ہوئی، پہلے صرف شرعی عدالتیں تھیں جن میں قانون شریعت کے مطابق تمام مقدمات کے فیصلے ہوتے تھے، یہ شیخ الاسلام کے ماتحت تھیں اور ان میں صرف ایک قاضی یا جج ہوتا تھا، ”تنظیمات“ کے بعد مغربی طرز کی عدالتیں قائم کی گئیں جو وزیر عدل کے زیر نگرانی تھیں، ان عدالتوں میں مختلف مذہبی فرقوں کے کئی جج ہوتے تھے قدیم شرعی عدالتیں بھی قائم رکھی گئیں، مگر اب ان میں وہی مقدمات پیش ہوتے جن کا تعلق وراثت، نکاح و طلاق یا مسلمانوں کے دوسرے شخصی معاملات سے ہوتا، جدید عدالتیں ان ضوابط کا نتیجہ تھیں جو مغربی یورپ کے قانونی ضوابط کے مطابق تیار کیے گئے تھے، چنانچہ ایک ضابطہ تجارت مرتب ہوا جس میں قرض روپیہ پر سود کی شرح تسلیم کی گئی، حالانکہ قرآن مجید سے اس کی صریح ممانعت ثابت ہے، اسی طرح ایک ضابطہ فوجداری بنایا گیا جس میں قانون شریعت کے تعزیری احکام کے بجائے جرائم کے لیے دوسری سزائیں مقرر کی گئیں، فرانس کے ضابطہ دیوانی کے نمونہ پر ایک ضابطہ دیوانی بھی مدون ہوا اور جدید نظام عدالت اسی کے مطابق قائم کیا گیا، اس ضابطہ کے رو سے عدالت ابتدائی اور عدالت مرافعہ الگ الگ قائم کی گئیں، ان عدالتوں میں عیسائی

اور یہودی حج مسلمان قاضیوں کے ساتھ بیٹھ کر فیصلے کرتے تھے، ان تمام معاملات میں جو صراحت کے ساتھ ضابطہ تجارت یا ضابطہ فوجداری میں مذکور نہ تھے، یہ جدید عدالتیں بھی قانون شریعت ہی کے مطابق فیصلے کرتی تھیں۔

ممالک محروسہ: سلطنت عثمانیہ مندرجہ ذیل اقسام کے ممالک محروسہ پر مشتمل تھی:

۱۔ آراضی کا وہ بڑا حصہ جس کا انتظام باب عالی کی طرف سے براہ راست ہوتا تھا

۲۔ وہ متعدد علاقے جن کا انتظام خاص ضوابط کے ماتحت ہوتا تھا۔

۳۔ متعدد باج گزار صوبے۔

۴۔ بعض وابستہ ریاستیں۔

ان کے علاوہ ایک خطہ نزاعی علاقہ کا تھا، جو دونوں فریق کے مسلسل حصوں کی وجہ سے عموماً ویران رہتا تھا، اس خطہ کی اہمیت سلطنت عثمانیہ کے باشندوں اور حکومت کے نزدیک اس وجہ سے تھی کہ یہیں سے سلطنت کے لیے قیدی غلام فراہم ہوتے تھے، اس خطہ کے باہر دار الحرب تھا۔

جو علاقے براہ راست زیر حکومت تھے، وہ ضلعوں یا سنجھوں میں تقسیم تھے اور ان میں سے ہر سنجھ کے محاصل کا ایک علاحدہ قانون نامہ تھا، جس کی بنیاد ان معاہدوں پر تھی جو فتح کے وقت کیے گئے تھے، البانیا اور کردستان کے بعض پہاڑی علاقے اور صحرائے عرب حقیقتاً خود مختار تھے، گونام کے لیے ان کا انتظام باب عالی کی طرف سے ہوتا تھا، ان ملکوں نے اپنی قبائلی تنظیم قائم رکھی تھی اور یہ اپنے موروثی سرداروں کے ماتحت تھے، جن کو فوجی خدمات کے معاوضہ میں عثمانی خطابات دئے گئے تھے، یہ جب چاہتے محصول ادا کرتے اور جب نہ چاہتے نہ ادا کرتے۔

سلطنت کے مرکزی حصہ کی زمینیں تین قسم کی تھیں: ارض عشریہ، ارض خراجیہ اور ارض مملکت۔ ارض عشریہ، مسلمانوں کو فتح کے وقت اس شرط پر دی گئی تھی کہ حکومت کو عشر ادا کرتے رہیں گے، ارض خراجیہ فتح کے وقت عیسائیوں کو دی گئی تھی یا ان کے پاس چھوڑ

دی گئی تھی، اس شرط پر کہ دو میں سے کوئی ایک ٹیکس ادا کریں گے یا تو زمین کے معاوضہ میں ایک معین رقم دیتے رہیں یا پیداوار کا ایک حصہ دیں جس کی مقدار زمین کی نوعیت کے لحاظ سے عشر سے نصف تک ہوتی تھی، ارض مملکت میں وہ زمینیں شامل تھیں جو کسی کو بطور ملک نہیں دی گئی تھیں بلکہ ان کا مالک خود سلطان تھا، لیکن وہ ان کو صرف ایک جز سے متفع ہوتا تھا کیونکہ ان کا بڑا حصہ مسجدوں پر وقف کر دیا گیا تھا اور ان مسجدوں سے متعلق جو مدرسے، ہسپتال یا دوسری عمارتیں تھیں ان کے اخراجات بھی اسی وقف سے ادا کیے جاتے تھے، اس کے علاوہ ارض مملکت کی بہت سی زمینیں مسلمان ’’سپاہیوں‘‘ کو جاگیر میں دی گئی تھیں، جو اس کے معاوضہ میں فوجی خدمت کے لیے سوار فراہم کرتے تھے، ان حصوں کے نکالنے کے بعد نسبتاً تھوڑی سی زمین جو بیچ جاتی تھی وہی سلطان کی ذاتی ملک سمجھی جاتی تھی اور اس کا انتظام سلطان بحیثیت مالک کے ایک خاص طریقہ پر کرتا تھا، ارض مملکت کے کاشتکار صرف پٹہ پر زمینیں حاصل کرتے تھے اور مال گزاری نقد یا جنس کی شکل میں مسجد، جاگیر دار یا سلطان کو دیتے تھے، یورپ کے تمام مقبوضات ارض مملکت خیال کیے جاتے تھے ایشیائے کوچک کا بھی اکثر حصہ ارض مملکت تھا، لیکن شام، مسوپوٹامیا اور مصر قدیم انتظامات کے تحت تھے اور زیادہ تر ارض خراجیہ تھے، عرب اور بصرہ تقریباً تمام تر ارض عشریہ تھے، کریمیا جارجیا، منگولیا اور عرب کے بعض حصے وابستہ (Yassal) علاقے تھے، جو باضابطہ خراج نہیں ادا کرتے تھے، جزیرہ قبرص، ہنگری کے علاقے، رگوسا، ٹرانسلوینیا، مولڈوینا اور واپچیا باقاعدہ خراج ادا کرتے تھے اور انھیں اپنا انتظام خود کرنے کی اجازت حاصل تھی، مصر ایک خاص انتظام کے ماتحت تھا، جو مملوکوں کے نظام حکومت سے تھوڑے سے تغیر کے ساتھ ماخوذ تھا، وہاں کا حاکم ایک پاشا ہوتا تھا، جو تین سال کے لیے باب عالی سے بھیجا جاتا تھا اور وہاں کے سالانہ محاصل کا بڑا حصہ شاہی خزانہ میں جاتا تھا، حرمین شریفین سے بجائے اس کے کہ کوئی خراج لیا جائے، مصر کے محاصل سے ایک بڑی رقم خود وہاں بھیجی جاتی تھی، شالی افریقہ کے مقبوضات سے زیادہ ترقی یافتہ اور بحری مدد حاصل تھی۔ (لی بائر)

تعلیم

جارج لارپنٹ اپنی تاریخ ترکی میں لکھتا ہے:

”اسلام کے متعلق اکثر یہ بیان کیا گیا ہے کہ وہ علم کی روشنی پھیلانے کا مخالف ہے اور خصوصاً آل عثمان کی نسبت یہ کہا جاتا ہے کہ یہ قوم منظم جہالت کی دمدادہ ہے، دونوں قول مساوی طور پر بے بنیاد ہیں، قرآن کا بغور مطالعہ خلفائے بغداد کے علمی کارناموں کی آب و تاب جب کہ مغرب ہنوز قعر جہالت میں ڈوبا ہوا تھا اور وہ حیرت انگیز تصانیف جن سے عربوں نے استین کو مالامال کر دیا، پہلے قول کی ناانصافی ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں، دوسرے قول کا جھوٹ بھی اس شخص کے لیے اس سے کم واضح نہیں ہے جس نے ترکی کی حالت غور سے دیکھی ہے، کسی ملک میں تعلیم کی عزت ترکی سے زیادہ نہیں ہے، کسی ملک میں ان لوگوں کا احترام جن کے سپرد تعلیم پھیلانے کی خدمت ہے ترکی سے زیادہ نہیں کیا جاتا، خواجہ (استاد) کا لقب ایک ایسا لقب ہے جو کبھی فراموش نہیں کیا جاتا، خواجہ کی ظاہری حیثیت کیسی ہی حقیر ہو، اس کا شاگرد کتنے ہی بلند مرتبہ پر پہنچ جائے یہاں تک کہ صدراعظم بھی ہو جائے تاہم وہ مجمع عام میں بھی اپنے قدیم استاد کے ساتھ ہمیشہ ملاحظت اور احترام کے ساتھ پیش آتا ہے۔“ (۱)

(۱) ترکی از سر جارج لارپنٹ ج ۲ ص ۱۳۷ (Turkey by Sir George Larpent)

مطبوعہ ندان ۱۸۵۲ء

ترکی میں تعلیم کے تین دور نمایاں طور پر نظر آتے ہیں:

۱- دینی دور: آغاز سے تنظیمات یعنی ۱۸۳۹ء تک

۲- درمیانی دور: تنظیمات سے جمہوریہ کے اعلان تک یعنی ۱۸۳۹ء سے

۱۹۲۳ء تک۔

۳- اصلاحات کا دور: ۱۹۲۳ء سے ۱۹۳۷ء تک

۱- دینی دور: سلاطین عثمانیہ نے تعلیم کا نظام شروع ہی سے قائم کیا، چنانچہ اورخاں نے جو اس سلسلہ کا دوسرا فرماں روا تھا ازریق میں ایک مدرسہ قائم کیا جو سلطنت عثمانیہ کا پہلا مدرسہ تھا، اس کے بعد دوسرے سلاطین نے بھی تعلیم پر شاہانہ توجہ کی اور سیکڑوں مدرسے اور دارالعلوم قائم کیے، ان کی پوری تفصیل مولانا شبلی نعمانی نے اپنے رسالہ ”مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم“ میں بیان کی ہے، ارکھارٹ (Urquhart) جس نے مشرقی ممالک کے حالات ذاتی تحقیق سے لکھے ہیں بیان کرتا ہے کہ ”ترکی میں کوئی سلطان ایسا نہیں ہے جس نے اپنے پیچھے ایک کالج نہ چھوڑا ہو اور اس پر کچھ جائداد نہ وقف کر دی ہو (۱)“، جس سلسلہ کو اورخاں نے شروع کیا تھا وہ اس کے جانشینوں کے دور میں ترقی کر کے سلطان محمد فاتح کے عہد میں حد کمال کو پہنچ گیا، محمد فاتح کا علمی شوق اتنا بڑھا ہوا تھا کہ تخت سلطنت پر آنے کے بعد بھی اس نے تحصیل علم کا مشغہ جاری رکھا، ۸۶۵ھ (۱۴۶۰ء) میں اس نے قسطنطنیہ میں ایک یونیورسٹی کی بنیاد ڈالی، جس کے ماتحت آٹھ کالج تھے اور سب کے ساتھ جدا گانہ بورڈنگ ہاؤس تھے (۲)، کریسی لکھتا ہے:

”محمد ثانی کے پیشروؤں اور خصوصاً اورخاں کو اسکولوں اور

کالجوں کے قائم کرنے کا بہت شوق تھا، لیکن محمد ان سب سے بڑھ گیا،

اسی نے ”سلسلہ علما“ کو قائم کیا اور سلطنت کے مفتیوں اور قاضیوں کی

(۱) ”روح مشرق“ از ارکھارٹ (Spirit of the east by urquhart) بحوالہ لارہنٹ

(۲) مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم از مولانا شبلی نعمانی

تعلیم و ترقی کا ضابطہ مرتب کیا، فاتح قسطنطنیہ خوب جانتا تھا کہ ایک بڑی سلطنت کے پیدا کرنے اور اسے قائم رکھنے کے علاوہ شجاعت اور فوجی لیاقت کے کچھ اور بھی ضروری ہے، محمد نے جو علوم میں خود بھی ایک ممتاز حیثیت رکھتا تھا اپنی رعایا میں تعلیم پھیلانے کے لیے بڑی عالی حوصلگی سے کام لیا، وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ عدالت کا نظام درست رکھنے کے لیے قاضیوں کا احترام قائم کرنا ضروری ہے اور ان کا احترام قائم کرنے کے لیے اس بات کی ضرورت ہے کہ وہ نہ صرف علم و دیانت سے آراستہ ہوں بلکہ سلطنت کے اونچے اور معزز عہدوں پر بھی مامور کیے جائیں، نیز افلاس کی ہریشان خاطرگی سے محفوظ کر دئے جائیں، محمد نے علاوہ ابتدائی مدارس کے جو کتب کھلے جاتے ہیں اور ہر شہر کے ہر محلہ اور ترکی کے تقریباً تمام دیہاتوں میں پائے جاتے ہیں بہت سے بڑے بڑے مدرسے قائم کیے، ان مدرسوں میں دس مختلف مضامین کی تعلیم دی جاتی تھی، صرف، نحو، منطق، مابعد الطبیعیات، تاریخ، زبان، فصاحت و بلاغت، اقلیدس اور ہیئت، یہ ایک ایسا نصاب تعلیم ہے جس کا موازنہ یقیناً پندرہویں صدی کے پیرس اور آکسفرڈ کے نصاب تعلیم سے کیا جاسکتا ہے، جو طلبہ ان سب مضامین میں پوری دستگاہ حاصل کر لیتے تھے، ان کو ”دانشمند“ کا لقب دیا جاتا تھا اور اس حیثیت سے وہ چھوٹے چھوٹے طالب علموں کو پڑھاتے تھے، دانشمند بغیر مزید تعلیم حاصل کیے کسی ابتدائی مدرسہ کی اعلیٰ مدرسے کا حقدار ہو سکتا تھا، لیکن اس صورت میں وہ علما کی جماعت کا رکن نہیں بن سکتا تھا اور اسے تمام اعلیٰ تعلیمی عہدوں سے محروم ہو جانا پڑتا تھا، جماعت علما کا رکن بننے کے لیے فقہ کے ایک طویل نصاب کو مکمل کرنا پڑتا تھا اور یکے

-- بعد دیگرے مختلف انتخابات میں کامیابی حاصل کر کے متعدد اسناد لینے

پڑتے تھے۔“ (۱)

محمد کے جانشینوں نے اس کی قیام کی ہوئی مثال کے مطابق تعلیم کو خوب پھیلایا
ہر سلطان ایک مسجد ضرور تعمیر کرتا اور ہر مسجد کے ساتھ ایک مدرسہ کا قیام کرنا لازمی تھا،
یوں مسجدوں کی تعداد کے ساتھ مدرسوں کی تعداد بھی برابر بڑھتی گئی، لارہنٹ کا بیان ہے
کہ ۱۷۶۵ء، سلطان مصطفیٰ ثالث کے عہد حکومت میں صرف حدود قسطنطنیہ کے اندر دوسو
چھتر مدرسے موجود تھے اور انیسویں صدی کے وسط میں سلطان عبدالعجید خاں کے زمانہ
میں یہ تعداد تین سو سے اوپر پہنچ گئی تھی، عبدالعجید خاں کے عہد میں ہر شہر میں کم سے کم ایک
مدرسہ موجود تھا، بڑے شہروں مثلاً اور نہ، بغداد اور قاہرہ میں چالیس چالیس اور پچاس
پچاس مدرسے تھے۔ (۲)

ابتدائی مدارس یعنی مکتب سلطنت کے ہر حصہ میں قیام تھے، شہر کا کوئی محلہ یا
چھوٹے سے چھوٹا گاؤں بھی ان سے خالی نہ تھا، مکتبوں کی تعلیم تقریباً مفت تھی، فیس صرف
دو پیاسٹر (قرش) ماہانہ تھی جو گویا مفت کے برابر تھی، نصاب عقائد، اخلاق اور قرآن مجید
کی تعلیم پر مشتمل تھا، ان مکتبوں میں طلبہ کی تعداد بہت زیادہ ہوتی تھی، اعداد و شمار سے
ثابت ہوتا ہے کہ پچانوے فیصدی مسلمان بچے ابتدائی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ (۳)

سلطان محمد فاتح نے تعلیم کا جو نظام قیام کیا تھا، اس میں دونہاں خامیاں تھیں،
پہلی اور بڑی خامی تو یہ تھی کہ مکتب اور مدرسہ (دارالعلوم) کی تعلیم کے درمیان کوئی وسطی
نصاب نہ تھا، مکتبوں میں بہت ابتدائی تعلیم دی جاتی تھی اور مدرسوں میں بہت اعلیٰ،
جو بچے مکتبوں کی تعلیم سے فارغ ہو کر اوسط درجہ کی تعلیم حاصل کرنا چاہتے تھے، ان کے
لیے اس قسم کی کوئی درس گاہ نہ تھی، مدرسوں کا نصاب بہت اونچا تھا، جس کی تکمیل میں پچیس
سے تیس سال کی مدت صرف ہو جاتی تھی، یہی وجہ تھی کہ مکتبوں میں تو مسلمان طلبہ کا

(۱) کریسی ج ۱ ص ۷۱-۱۶۹ (۲) لارہنٹ ج ۳ ص ۱۳۳ (۳) ایضاً ص ۱۴۲

اوسط پنچانوے فیصدی تھ، لیکن مدرسوں میں ۱۸۵۳ء تک چار فیصدی سے زیادہ نہ ہو سکا تھا (۱) جو طلبہ اونچے طبقوں سے تعلق رکھتے تھے یا سول سروس (ملازمت دیوانی) کے لیے تیار ہونا چاہتے تھے وہ اپنے گھروں پر تعلیم حاصل کرتے، دوسری خامی یہ تھی کہ زیادہ تر وقت عربی زبان کے سیکھنے اور اس کی صرف و نحو اور اصلاحات وغیرہ کے یاد کرنے میں صرف ہو جاتا تھا اور ضرورت سے زیادہ زور معقولات اور منطقی موشگافیوں پر دیا جاتا تھا، قوموں کے باہمی تعلقات اور مختلف طرز کی حکومتوں سے طلبہ بالکل بے خبر رہتے، تاریخ اور جغرافیہ سے بھی تقریباً نا آشنا رہتے، ان علوم میں جو کچھ تھوڑی بہت واقفیت ہوتی وہ صرف اپنے ہی ملک تک محدود رہتی، تعلیم تمام تر مذہبی اور ادبی تھی اور اس کا نظام کلیہً علم کے ہاتھوں میں تھا، وہ اس میں کسی ترمیم یا اصلاح کو گوارا نہ کرتے اور نہ زمانہ کی ضروریات کو تسلیم کرتے تھے۔

۲- دورِ تحفیمات: یہ حالت آغازِ تنظیمات یعنی ۱۸۳۹ء تک قائم رہی اور دینی نظامِ تعلیم بغیر کسی اصلاح و ترمیم کے تمام سلطنت میں جاری رہا، لیکن جب سلطان عبدالجبار خان تخت پر آئے اور انھوں نے حکومت کے ہر شعبہ میں اصلاحات شروع کیں تو نظامِ تعلیم میں بھی بعض اہم اصلاحیں کی گئیں، ان کی ضرورت خاص طور پر اس وجہ سے محسوس کی جا رہی تھی کہ علما اور طلبہ کی جماعت ملکی اصلاحات کی مخالف تھی اور چونکہ عوام پر اس جماعت کا اثر بہت زیادہ تھا، اس لیے سلطنت کے ہر حصہ میں اصلاحات کے خلاف شورش برپا ہو رہی تھی، غرض مارچ ۱۸۴۵ء میں باب عالی نے ایک کمیشن مقرر کیا جس کا مقصد یہ تھا کہ تعلیم عامہ کی اصلاح اور ملک کی روز افزوں ضروریات کا لحاظ کر کے ایک جامع نصابِ تعلیم ترتیب دیا جائے، اس کمیشن کے ممبر وہی لوگ مقرر کیے گئے جو اپنی لیاقت اور اصلاحات کی حمایت کا قوی ثبوت دے چکے تھے، کمیشن نے اگست ۱۸۴۶ء میں اپنی رپورٹ پیش کی، اس رپورٹ کے مطابق تعلیم عامہ کی ایک مستقل مجلس مقرر کی

گئی اور اس کے ماتحت عثمانیہ یونیورسٹی بطور ایک سرکاری ادارہ کے قائم ہوئی، تعلیم کے تین درجے قرار دئے گئے: (۱) انی تعلیم جس کے خاص اجزاء وہی تھے جو مکتب کے نصاب میں شامل تھے (۲) ثانوی تعلیم جو ایک درمیانی اور نئی چیز تھی (۳) اعلیٰ تعلیم جس کے لیے یہ طے پایا کہ جدید اصول پر از سر نو ترتیب دی جائے، لیکن قدیم نظام تعلیم اور اس کے طلبہ کو جو حقوق و مراعات حاصل تھے، وہ برقرار رکھے گئے، یونیورسٹی کے لیے ایک نئی عمارت بننے کا حکم ہوا اور اباصوفیہ کے قریب جیب خانہ کے مقام پر جہاں پہلے نئی چری فرجوں کی بارکیں تھیں، اس کاسنگ بنیاد بڑی شان و شوکت کے ساتھ رکھا گیا۔ (۱)

ابتدائی تعلیم: تعلیمی مجلس نے سب سے پہلے انی مدارس کی اصلاح شروع کی اور پہلا کام یہ کیا کہ انی تعلیم کو مفت اور لازمی قرار دیا، اور پیاسٹر (۲) ماہانہ کی رقم جو پہلے استاد کو دی جاتی تھی، اس کے بجائے اساتذہ کی مستقل تنخواہیں مقرر کر دی گئیں جو مکتبوں کی موقوفہ جائیدادوں سے حاصل کی جاتی تھیں۔ جہاں ان جائیدادوں کی آمدنی کافی نہ ہوتی، وہاں حکومت کی طرف سے یہ کمی پوری کر دی جاتی تھی، اس کے بعد یہ قانون جاری کیا گیا کہ تمام مسلمان اپنے لڑکوں اور لڑکیوں کو لے کر جب ان کی عمر چھ سال کی ہو جائے ضلع کی میونسپلٹی کے صدر دفتر میں حاضر ہوں اور ان بچوں کے نام مکتب کے رجسٹر میں درج کرائیں، جو لوگ اپنے بچوں کو مکتب کی تعلیم دلانا نہ چاہتے ان کو یہ ثابت کرنا پڑتا تھا کہ انھوں نے گھر پر تعلیم کا معقول انتظام کر لیا ہے، اس حکم پر عمل درآمد کرانے کے لیے ایک قانون یہ بھی بنایا گیا کہ کسی فن کا استاد کسی لڑکے کو اپنے ہاں بطور شاگرد کے نہ رکھے، جب تک اس لڑکے نے مکتب کی سند حاصل نہ کر لی ہو، انی مدارس کا نصاب تعلیم تقریباً وہی قائم رکھا گیا جو قدیم طرز کے مکتبوں کا تھا، مولانا شبلی نے اپنے سفر نامہ میں لکھا ہے کہ انی مدارس میں قرآن مجید، ترکی زبان، عربی کا املا، خط اور حساب تقسیم

(۱) لارینٹ ج ۲ ص ۴۸-۱۳۷ (۲) پیاسٹر جسے ترکی میں قرش یا غرش کہتے ہیں دو آنے کے برابر ہوتا ہے۔

تبدیل سکھایا جاتا تھا، قدیم مکتبوں میں ترکی زبان کی ریڈریس رائج نہ تھیں، اب خاص طور پر بچوں کے لیے عام فہم ترکی ریڈریس تیار کی گئیں اور تعلیمی مجلس نے تمام ابتدائی مدارس میں انہیں پڑھانے کا حکم دیا، صرف قسطنطنیہ میں ان مدارس کی تعداد ۱۸۵۲ء میں (۳۹۶) تھی جن میں (۲۲۷۰۰) لڑکے اور لڑکیاں تعلیم پاتی تھیں (۱) مدت تعلیم زیادہ سے زیادہ پانچ سال تھی، لیکن ذہین طالب علم اس سے پہلے ہی نصاب ختم کر کے ترقی کر سکتا تھا۔

ثانوی تعلیم: مکاتب ابتدائیہ کے بعد مکاتب رشدیہ کا درجہ تھا، جن میں ثانوی تعلیم دی جاتی تھی، اس کی مدت بھی عموماً چار سال تھی، لارینٹ لکھتا ہے کہ ۱۸۵۱ء میں مکاتب رشدیہ کی تعداد چھ تھی جن میں (۸۷۰) طلبہ زیر تعلیم تھے، چونکہ ان ثانوی مدارس کے قیام کو ابھی بہت تھوڑی مدت گزری تھی، اس لیے طلبہ کی یہ تعداد کافی امید افزا تھی، ابتداء نصاب میں صرف یہ مضامین تھے: عربی صرف و نحو، املا، انشاء، اسلامی تاریخ، ترکی تاریخ، عام تاریخ، جغرافیہ، حساب اور علم ہندسہ (جیومیٹری) کے کچھ حصے، لیکن مولانا شبلی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ بعد میں کچھ مضامین بڑھادے گئے تھے اور کچھ بدل دئے گئے تھے، وہ لکھتے ہیں کہ رشدیہ کی مدت تعلیم تین برس تھی اور اس میں ترکی املا، مقررات زبان ترکی، نحو ترکی، عقائد اسلام، زبان ترکی، حساب چاروں حصے، فرنیچ زبان، عربی زبان، جغرافیہ، اقلیدس، کاغذات تجارت کے اصول اور نقشہ کشی کی تعلیم ہوتی تھی (۲)، رشدیہ میں بھی تعلیم بالکل مفت دی جاتی تھی، مدارس کے اخراجات، اساتذہ کی تنخواہیں، طلبہ کی کتابیں اور آلات، یہ سب چیزیں حکومت کی طرف سے ملتی تھیں۔ (۳)

مولانا شبلی نے ثانوی تعلیم کے دو درجے بیان کیے ہیں، رشدیہ اور اعدادیہ، رشدیہ کے متعلق لکھا ہے کہ وہ ہمارے یہاں کے مڈل کے برابر یا اس سے کچھ بڑھ کر ہے، رشدیہ کے بعد اعدادیہ کا درجہ بتایا ہے، جس کو انٹرنس کہا جاسکتا ہے، مولانا فرماتے ہیں: ”اس کلاس کے طالب علموں کی مجموعی تعداد ۱۸۹۲ء میں (۵۲۱۵) تھی، اس میں تمام

اصلاح اور خود پایہ تخت کے مدارس شامل ہیں۔“

اعلیٰ تعلیم: اعلیٰ تعلیم کی اصلاح تعلیمی مجلس کے لیے سب سے زیادہ دشوار تھی کیونکہ اس میں کسی تبدیلی کے لیے تیار نہ تھے اور مدرسوں کے نصاب کی اصلاح کے سخت مخالف تھے، بہر حال چونکہ ثانوی مدارس حال ہی میں قائم ہوئے تھے اور طلبہ کو وہاں سے فارغ ہو کر کالج کی تعلیم تک پہنچنے میں تین سال کی مدت درکار تھی، مجلس کو یہ فرصت غنیمت معلوم ہوئی اور اس نے اپنے ہی ارکان میں سے ایک رکن کمال آفندی کو جو اسکولوں کے انسپٹر جنرل تھے یورپ روانہ کیا تاکہ فرانس، جرمنی اور انگلستان کی یونیورسٹیوں کے نظام تعلیم کا مطالعہ کریں، چنانچہ کمال آفندی کئی مہینے پیرس میں مقیم رہے اور حکومت فرانس نے ان کے لیے تمام ضروری معلومات بہم پہنچائیں، اس درمیان میں تعلیمی مجلس نے خاص خاص مدرسوں کی اصلاح کی کوشش کی، جن میں سے بعض نہایت قدیم زمانہ سے قائم تھے، یہ مدرسے اعدادیہ سے اونچے درجہ کے تھے اور ان میں اعلیٰ تعلیم دی جاتی تھی۔

غرض سلطان عبدالحمید خاں کے دور حکومت میں منجملہ اور اصلاحات کے تعلیم کی اصلاح کا کام بھی نہایت سرگرمی سے شروع کیا گیا اور بہت سی مفید اصلاحیں کی گئیں، لیکن ۱۸۵۲ء کے بعد وہ جوش باقی نہیں رہا اور تحریک سست پڑ گئی، چنانچہ جدید یونیورسٹی کی تعمیر بھی ملتوی ہو گئی اور سلطنت کے خاص خاص شہروں میں ثانوی مدارس جو قائم کیے جانے والے تھے وہ بھی قائم نہ ہو سکے پھر بھی اس درمیان میں ایک علمی اور ادبی اکادمی قائم کر دی گئی تھی، جس کا مقصد بلند معیار کتبوں کی تالیف و ترجمہ کے ذریعہ زبان و ادب کی اصلاح اور تعلیم عامہ کی ترقی تھا۔

جب سلطان عبدالحمید خاں ثانی تخت پر آئے تو تعلیمی ترقی کی رفتار پھر تیز ہونے لگی، مولانا شبلی لکھتے ہیں:

”سلطان کی تخت نشینی کے وقت مدارس رشدیہ کی تعداد (۹۶)

تھی، لیکن اب (۱۸۹۲ء میں) ۴۰۵ ہے، ہر قسم کے نئے مدارس

جو سلطان کی شانزدہ سالہ حکومت میں قائم ہوئے ان کی تعداد دو ہزار ہے، اسی کے ساتھ اسکولوں اور کالجوں میں حاملہ علموں کی تعداد اس کثرت سے بڑھتی جاتی ہے کہ ترقی تعلیم کی سب ماقبل کی رپورٹ سال مابعد سے کچھ نسبت نہیں رکھتی، پروفیسر دیمیری نے اب سے چند برس پہلے ترکوں کی عام ترقی پر جو لکچر دیا، اس میں مکتب الحقوق (قانونی کالج) کے حاملہ علموں کی تعداد تین سو بیان کی ہے، لیکن میں جب قسطنطنیہ میں تھا تو اس کالج میں بارہ سو طالب العلم موجود تھے، میں نے زمانہ قیام مصر میں قاہرہ کے مشہور اخبار الموبید میں پڑھا تھا کہ سلطان خاں نے جب عمان حکومت اپنے ہاتھ میں لی تو مصارف تعلیم تین لاکھ پونڈ سالانہ تھے، لیکن اب آٹھ لاکھ پونڈ سالانہ ہیں، یہ رقم ہمارے یہاں کے ایک کروڑ میں لاکھ کے مساوی ہے۔“ (۱)

تعلیم کی اس ترقی کے باوجود سلطان عبدالحمید خاں کے عہد میں قبائل عرب اس کے فیض سے تقریباً بالکل محروم تھے، اس لیے سلطان نے خاص عربوں کی تعلیم کے لیے ایک کالج اور اس کے ساتھ ایک وسیع بورڈنگ ہاؤس قائم کرنے کا حکم دیا اور حکام و عمال کے نام فرمان صادر کیے کہ حجاز، یمن، دیاربکر، بغداد، طرابلس الغرب، حلب، موصل اور شام سے معزز عرب قبائل کے لڑکے انتخاب کر کے بھیجے جائیں، ان کے تمام مصارف سلطان نے حکومت کی طرف سے دینے منظور کیے، ۱۲ ربیع الاول ۱۳۱۰ھ (۱۸۹۲ء) کو اس کالج کی رسم افتتاح بڑی شان و شوکت کے ساتھ ادا کی گئی، کالج کا نام مکتب العشار رکھ گیا۔

اسی طرح خاص قبیہوں کے لیے بھی سلطان عبدالحمید خاں نے ایک مدرسہ قائم کیا، جس کا نام دارالشفقہ تھا، ۱۸۹۲ء میں جب مولانا شبلی نے قسطنطنیہ کا سفر کیا، اس

(۱) سفرنامہ

مدرسہ میں ایک ہزار یتیم لڑکے تعلیم پاتے تھے اور سب کے سب بورژنگ ہاؤس میں رہتے تھے، ان کی خوراک، لباس اور تمام ضروری مصارف کا بار سررشتہ تعلیم پر نہیں بلکہ خود سلطان کی جیب خاص پر تھا۔

تعلیم کی ترقی کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ ۱۸۹۲ء میں ہر قسم کے مدارس جو صرف قسطنطنیہ میں تھے ان کی مجموعی تعداد پانچ سو تھی، جن میں تیرہ بڑے بڑے کالج تھے (۱)، کالجوں اور اسکولوں میں مندرجہ ذیل زیادہ اہم تھے:

(۱) مکتب حربیہ شاہانہ، اس کو سلطان محمود ثانی نے فرانس کے فوجی کالج کے نمونہ پر ۱۸۳۰ء میں قائم کیا تھا، اس کے اساتذہ زیادہ تر فرانسیسی افسر تھے، تعلیم کی مدت پیدل فوج کے لیے چار سال اور سوار کے لیے پانچ سال تھی، لارپنٹ کا بیان ہے کہ ۱۸۵۳ء میں اس کے طالب علموں کی تعداد (۱۲۰) تھی، مکتب حربیہ کے علاوہ جو ایک بہت بڑا کالج تھا قسطنطنیہ، مناستر، بروصہ، دمشق اور بغداد میں فوجی اسکول بھی قائم تھے، جہاں مکتب حربیہ کے لیے طالب علم تیار کیے جاتے تھے ۱۸۹۲ء تک جب مولانا شبلی نے جا کر اسے دیکھا یہ کالج بہت زیادہ ترقی کر گیا تھا، وہ لکھتے ہیں کہ اس میں حربی علوم کے علاوہ طبیعیات، کیمیا، ریاضی اور بالخصوص طب کی تمام شاخوں کی تعلیم اس حد تک ہوتی ہے کہ اسے اصطلاحی تعلیم کے دائرہ سے باہر نہیں کہا جاسکتا، ۱۸۹۲ء میں اس کالج کے ماتحت جس قدر حربی مدارس تھے ان کی تعداد (۴۷) تھی، جن میں (۱۸) اعدادیہ اور (۲۹) رشدیہ تھے، ان میں (۹۲۲۴) طالب علم تعلیم پاتے تھے (۲)، اس کالج کے تفصیلی حالات مولانا شبلی نے اپنے سفرنامہ میں لکھے ہیں۔

(۲) مکتب سلطانی، یہ کالج مکتب حربیہ کے سوا تمام کالجوں سے ممتاز تھا، یہ غلطہ سراے میں واقع تھا، جہاں زیادہ تر یورپین تاجر آباد تھے، اس وجہ سے دوسرے کالجوں کی نسبت اس میں عیسائی لڑکوں کی تعداد زیادہ تھی، مولانا شبلی نے لکھا ہے کہ طالب علموں

کی مجموعی تعداد آٹھ سو تھی جن میں زیادہ تر بورڈر تھے، تمام بورڈروں کی خوراک، کپڑے، بچھونے، کتاب کاغذ وغیرہ کالج کی طرف سے مہیا کیے جاتے تھے، بورڈر سے چالیس پونڈ سالانہ (چھ سو روپیہ) فیس لی جاتی تھی، ایسے طالب علم بھی داخل ہو سکتے تھے جو دو ٹکٹ یا ایک ٹکٹ فیس ادا کر سکتے تھے یا بالکل نہیں ادا کر سکتے تھے، لیکن ان کی تعداد معین تھی، اس قسم کے طلبہ کی بقیہ فیس خود سلطان یا امرائے شہر ادا کرتے تھے، اس لیے خوراک اور لباس وغیرہ کے لحاظ سے ان میں اور ذی مقدور طالب علموں میں کوئی فرق نہیں محسوس ہوتا تھا، جو طلبہ بورڈر نہیں تھے، ان کی فیس دس پونڈ سالانہ تھی، تعلیمی حیثیت سے اس کالج کی خصوصیت یہ تھی کہ تمام علوم و فنون فرانسیسی زبان میں پڑھائے جاتے تھے اور اس وجہ سے اکثر پروفیسر فرانسیسی یا جرمن تھے، ترکی زبان کی تعلیم بھی اعلیٰ درجہ کی دی جاتی تھی، عربی و فارسی کی تعلیم بھی لازمی تھی مگر معیار بلند نہ تھا، یونانی، ارمنی، انگریزی، جرمن، اطالوی اور لاطینی زبانوں کی تعلیم اختیاری تھی، اس کالج کے نصاب تعلیم کے متعلق مولانا شبلی لکھتے ہیں:

”ترکی و عربی و فارسی میں علاوہ علم ادب اور قرآن مجید کے جن مضامین کی تعلیم ہوتی ہے وہ یہ ہیں: عقائد، فقہ، اخلاق، تاریخ دولت عثمانیہ، قرأت، تجوید، حدیث و تفسیر لیکن قرأت و حدیث و تفسیر کی تعلیم چوتھے درجہ سے شروع ہوتی ہے اور ہفتہ میں صرف ایک بار ہوتی ہے، فرنیچ زبان شروع ہی سے پڑھائی جاتی ہے اور اختتامِ تعلیم یعنی سات برس تک برابر جاری رہتی ہے۔ نحو، صرف، ادب کے ساتھ اصول انشا نگاری و فن بلاغت اعلیٰ درجہ تک پڑھایا جاتا ہے اور مضامین ذیل کی تعلیم بھی اسی زبان کے ذریعہ سے ہوتی ہے۔ حساب، جبر و مقابلہ، جغرافیہ، ہندسہ، کیمسٹری، علم الحیوانات، طبیعیات، الیکٹریسیٹی، علم الاصوات، علم طبقات الارض، رسم ہندی، رسم تقلیدی۔

(۳) مکتب ملکیہ، یہ سول سروس کالج سلطان عبدالحمید خاں ثانی کا قایم کردہ تھا، پہلے اس میں پانچ درجے تھے، تین ادنیٰ اور دو اعلیٰ اور مدت تعلیم کل پانچ سال تھی، لیکن بعد میں دو درجے اور بڑھادئے گئے، جس سے مدت تعلیم میں بھی دو سال کا اضافہ ہو گیا، اس کالج میں فرانسیسی زبان کے ساتھ یونانی اور ارمنی زبان کی تعلیم بھی لازمی تھی، عربی و فارسی بھی نصاب میں داخل تھی، لیکن لازمی نہ تھی، تاریخ، جغرافیہ، برقیات، طبیعیات، اقتصادیات، اصول قانون اور قوانین یورپ کی تعلیم اعلیٰ پیمانہ پر دی جاتی تھی، اس کالج کے تعلیم یافتہ بڑے بڑے ملکی عہدوں پر مقرر کیے جاتے تھے، ۱۸۹۲ء میں اس کے طلبہ کی تعداد چھ سو سے زیادہ تھی۔

مکتب ملکیہ تو سلطان عبدالحمید خاں کے عہد میں قائم ہوا، لیکن سول سروس یعنی ملازمت دیوانی کی تعلیم کے لیے سلطان محمود ثانی نے بھی دو مدرسے مسجد احمد اور مسجد سلیمان سے متعلق قایم کیے تھے، لارپنٹ کا بیان ہے کہ ۱۸۳۱ء میں ان کے طلبہ کی مجموعی تعداد (۳۷۰) تھی، جن میں سے (۲۵۰) پہلے مدرسہ میں تھے اور (۱۲۰) دوسرے میں نصاب تعلیم یہ تھا: عربی و فارسی صرف و نحو، جغرافیہ، تاریخ، خوشنویسی، اسی قسم کا مدرسہ سلطان محمود کی والدہ نے ۱۸۳۰ء میں قائم کیا تھا، جس کے اخراجات وہ اپنی جیب خاص سے ادا کرتی تھیں، اس مدرسہ کا خاص مقصد حکومت کے لیے اہل کار تیار کرنا تھا، مدت تعلیم چار سال تھی، اس میں بلا امتیاز مذہب ہر فرقہ کے لڑکے تعلیم پاتے تھے۔

(۴) مکتب الحقوق (قانونی کالج) اس میں مضامین ذیل پڑھائے جاتے تھے: فقہ، اصول فقہ، رومن لا، قانون تجارت، اصول محاکمہ، تعزیرات، قانون بحری، سیاست مدن، قوانین سلطنت ہائے یورپ، مختصر طور پر قانون کی ایجاد کی تاریخ اور اس کی عہد بعد کی ترقیات ۱۸۹۲ء میں طالب علموں کی مجموعی تعداد بارہ سو تھی جن میں چھ سو درڈر تھے، یہاں کے تعلیم یافتہ منصف اور صدر الصدور وغیرہ کے عہدوں پر مقرر کیے جاتے تھے، مدت تعلیم چار برس تھی۔

(۵) مکتب البندہ، مولانا شبلی نے لکھا ہے کہ یہ رزکی کالج کے مشابہ ہے، مدت تعلیم چھ برس تھی۔

(۶) مکتب اللسان، اس میں جرمن، فرانسیسی، یونانی، ارمنی، لاطینی، اطالوی اور روسی زبانیں سکھائی جاتی تھیں۔

(۷) مکتب الصنائہ یعنی ٹیکنیکل اسکول، اس میں حدادی، نجاری وغیرہ سکھائی جاتی تھی، ۱۸۹۲ء میں اس کے طالب العلوم کی تعداد (۲۴۰) تھی اور یہ کل یتیم لڑکے تھے، ان کے مصارف مدرسہ کے فنڈ سے ادا ہوتے تھے۔

(۸) مکتب نواب، اس کالج میں وہ طلبہ تعلیم پاتے تھے جو قاضی اور مفتی کے عہدوں کے امیدوار ہوتے، پہلے ان عہدوں کے لیے کسی خاص قسم کی تعلیم میں امتحان دینا مشروط نہ تھا مگر سلطان عبدالحمید خاں ثانی کے زمانہ میں یہ قاعدہ مقرر کیا گیا کہ جو شخص اس کالج کا تعلیم یافتہ نہ ہو وہ شرعی منصب پر مامور نہیں کیا جاسکتا، اس کالج میں فقہی تعلیم نہایت اعلیٰ معیار پر ہوتی تھی، علوم جدیدہ کی بعض چیزیں بھی نصاب میں داخل کر لی گئی تھیں۔

(۹) مکتب بحریہ، اس میں جہاز رانی کی تعلیم ہوتی تھی۔

(۱۰) مکتب الزراعة، یہ ۱۸۵۱ء میں قسطنطنیہ سے قریب سان اسٹیفانو کے مقام پر قائم کیا گیا تھا اور اس میں زراعت، نباتات اور جانوروں کے متعلق نظری اور عملی تعلیم دی جاتی تھی، ۱۸۵۳ء میں اس میں (۴۶) طالب علم تھے جن میں سے (۲۳) مسلمان تھے اور (۲۳) مختلف قوموں کے عیسائی۔

جانوروں کے متعلق ایک مخصوص مدرسہ بھی تھا جسے پرشاکے ایک ڈاکٹر نے ۱۸۴۴ء میں قائم کیا تھا۔

(۱۱) مکتب طبیہ، اسے سلطان محمود ثانی نے غلطہ سراے میں قائم کیا تھا اور اس میں عیسائی اور مسلمان طلبہ دونوں داخل کیے جاتے تھے، تعلیم کچھ فرانسیسی زبان میں دی

جاتی تھی کچھ ترکی زبان میں، اس مدرسہ میں ایک مطبع بھی تھا جہاں سے ایک ماہوار طبی گزٹ فرانسیسی زبان میں نکلتا تھا، ایک ہسپتال اور حیوانات، نباتات اور طبیعیات کا ایک ادارہ بھی اس سے متعلق تھا۔

(۱۲) فوجی انجینئروں کے لیے ایک کالج سلطان سلیم ثالث نے قائم کیا تھا، سلطان عبدالجید خان کے عہد میں اسے ازسرنو جدید طرز پر منظم کیا گیا اور فوجی انجینئروں کے علاوہ سول انجینئروں اور توہنجیوں کو بھی اس میں تعلیم دی جانے لگی، ۱۸۵۲ء میں اس کے طلبہ کی تعداد (۹۰) تھی۔

(۱۳) ایک ٹریننگ کالج اساتذہ کی تعلیم کے لیے بھی تھا، ۱۸۵۳ء میں اس میں ساٹھ طلبہ تھے جن میں سے نصف کو حکومت کی طرف سے وظیفہ ملتا تھا۔

چند خاص باتیں: نظام تعلیم کی نسبت چند باتیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں:

(۱) تقریباً تمام کالجوں اور اسکولوں میں فرانسیسی زبان کی تعلیم لازمی تھی جس کی وجہ سے تعلیم جدید کا ہر طالب علم اس زبان سے آشنا ہو جاتا تھا۔

(۲) تمام بڑے بڑے کالجوں میں صبیعیات، کیمیا اور ارضیات وغیرہ کی تعلیم بھی لازمی تھی اور ان علوم کی عملی مشق کرائی جاتی تھی۔

(۳) بحر مکتب سلطانیہ کے جس میں عیسائی طالب علموں کی تعداد زیادہ تھی اور تمام مدارس میں ہر قسم کے علوم و فنون ملکی زبان یعنی ترکی میں پڑھائے جاتے تھے۔

(۴) تمام بڑے بڑے کالجوں کے ساتھ بورڈنگ ہاؤس بھی تھے، جن میں کثرت سے طلبہ رہتے تھے، لیکن اس بات کا خاص اہتمام تھا کہ وضع، لباس، خوراک، فرنیچر وغیرہ تمام چیزیں ایک سی ہوں تاکہ طالب علموں میں بظاہر فرق مراتب نہ پایا جائے، بورڈنگ ہاؤس کی فیس کے ساتھ کپڑوں کے دام بھی لیے جاتے تھے اور طالب علموں کے کپڑے خود کالج کے اہتمام سے تیار ہوتے تھے۔

(۵) ہر کالج میں غریب طالب علموں کی تعداد بھی معتد بہ ہوتی تھی، لیکن

دولت مند ترکوں کی طرف سے انھیں کافی مدد دی جاتی تھی، مولانا شبلی کے زمانہ سفر (۱۸۹۲) میں کالجوں کی فیس پچاس پونڈ سالانہ سے کم نہ تھی، صرف مکتب سلطانیہ میں چالیس پونڈ سالانہ تھی، اس وقت اس کالج میں دو سو غریب طالب علم تھے، جن میں سے ڈیڑھ سو کی فیس امرا اور ارکانِ حکومت ادا کرتے تھے اور پچاس کی سلطان اپنی جیب خاص سے دیتے تھے، طلبہ کی ظاہری حالت سے کوئی شخص یہ تمیز نہیں کر سکتا تھا کہ ان میں سے کون غریب اور نادار ہے۔

بعض باتوں کی کمی: اس تعمیری ترقی کے باوجود بعض چیزوں کی کمی بھی نمایاں تھی، مولانا شبلی نے لکھا ہے کہ کسی کالج بلکہ تمام شہر میں کوئی علمی انجمن ایسی نہ تھی جہاں طالب علموں کو تقریر کرنے کی مشق کرائی جاتی، دوسری کمی یہ تھی کہ کالج اور بڑے بڑے اسکول سب قسطنطنیہ تک محدود تھے، اگرچہ سلطنت کے تمام بڑے بڑے شہروں میں کثرت سے مدرسے قائم ہو گئے تھے تاہم وہ عموماً ابتدائیہ اور رشدیہ یعنی اوسط درجے کے مدارس تھے، مولانا لکھتے ہیں کہ اس وقت بیروت، دمشق، حلب اور بیت المقدس میں کوئی مدرسہ ایسا نہ تھا جسے کالج کہا جاسکے، ایک قابلِ لحاظ بات یہ بھی تھی کہ قسطنطنیہ کے تمام کالج حکومت کی طرف سے تھے، ایک بھی قومی کالج نہ تھا، یہ کمی قابلِ افسوس ضرور تھی مگر اس سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ حکومت نے تعلیم کا جو انتظام کیا تھا وہ اس قدر کافی تھا کہ قوم نے اس میں اضافہ کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

نوجوان ترکوں کی تعلیمی اصلاحات: سلطان عبدالحمید خاں کی معزولی کے بعد جب حکومت نوجوان ترکوں کے ہاتھ میں آئی تو انھوں نے منجملہ دیگر امور کے تعلیم میں بھی اہم اصلاحات کیں، ترکی میں تعلیم عامہ کا جو نظام آج موجود ہے وہ انہی کا قائم کیا ہوا ہے، دورِ تنظیمات میں تعلیم کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا: قدیم اور جدید، قدیم یعنی مذہبی مدارس کا انتظام شیخ الاسلام کے ہاتھ میں تھا اور جدید مدارس کے لیے حکومت نے ایک نیا محکمہ معارف کے نام سے قائم کیا تھا، ان مدارس میں مغربی زبانوں اور جدید علوم و فنون

کی تعلیم بھی دی جاتی تھی، نوجوان ترکوں کے زمانہ میں شیخ الاسلام خیری آفندی نے قدیم مکاتب میں بھی جو مسجدوں سے متعلق تھے جدید طرز تعلیم کو رواج دیا اور جدید طرز کا ایک کالج بھی قائم کیا، جس میں سائنس اور تاریخ کی تعلیم کے لیے بہت قابل اساتذہ مقرر کیے گئے، لیکن یہ کالج زیادہ دنوں قیام نہ رہ سکا اور شیخ الاسلام کے مستعفی ہو جانے کے بعد توڑ دیا گیا، البتہ خیری آفندی نے مکتبوں میں جو اصلاح شروع کی تھی اس کی تکمیل یوں ہوئی کہ حکومت نے ان تمام مکتبوں کو محکمہ تعلیمات کے سپرد کر دیا اور مذہبی تعلیم کا انتظام بھی حکومت کے ہاتھ میں آ گیا، نوجوان ترکوں نے دس سال کی قلیل مدت میں تعلیم کو جو ترقی دی، اس کا اندازہ خالدہ ادیب خانم کے مندرجہ ذیل بیان سے ہوتا ہے:

”۱۹۰۸ء میں جب حکومت نوجوان ترکوں کے ہاتھ میں آئی تو دو کروڑ تین لاکھ آبادی میں پڑھے لکھے لوگوں کی تعداد ایک فی صدی تھی، ۱۹۱۸ء میں جب وہ حکومت سے علاحدہ ہوئے تو ایک کروڑ چالیس لاکھ کی آبادی میں پڑھے لکھے لوگوں کی تعداد بیس فی صدی تک پہنچ گئی تھی۔“ (۱)

اعلیٰ تعلیم کے متعلق خالدہ خانم لکھتی ہیں:

”قسطظنیہ کی یونیورسٹی و عہد تنظیمات کے نوجوان ترکوں نے قایم کی مگر عبدالعزیز نے اسے بند کر دیا، اس کی حکومت کے آخر زمانہ میں دینیات اور سائنس کے شعبے کھول دئے گئے مگر حقیقی معنوں میں یونیورسٹی اتحاد و ترقی کے نوجوان ترکوں نے قایم کی، جرمنی سے (۱۹) پروفیسر بلائے گئے جن میں سے بعض علمی دنیا میں شہرت رکھتے تھے، ان کے اسٹنٹ ترک تھے جنہوں نے جرمن یونیورسٹی میں تعلیم پائی تھی، نوجوان ترکوں کی دس سال کی حکومت میں

یونیورسٹی کہیں سے کہیں پہنچ گئی، اس کا سب سے زیادہ قابل قدر کام یہ تھا کہ اس نے بہت سی کتابیں شائع کیں جن میں سے اکثر سائنس، تاریخ اور ادب کی کتابوں کے ترجمے تھے، تالیف اور ترجمہ کے لیے ایک علاحدہ انجمن قائم تھی، جس نے بڑی مفید خدمت انجام دی، تاریخ اکاڈمی نے عثمانی تاریخ کے متعلق بہت قابل قدر تحقیقات کی۔“

جامعہ استنبول کی ترقی کا اندازہ اس کے مختلف شعبوں اور ان کے طلبہ کی تعداد سے کیا جاسکتا ہے، جو ۱۹۱۰ء سے متعلق میرز (E.G. Mears) نے اپنی کتاب ماڈرن ٹرکی میں درج کی ہے۔

شعبہ قانون (۲۵۰۰)	شعبہ سیاسیات (۳۰۰)
شعبہ دینیات (۱۴۰)	شعبہ ادب (۱۰۰)
شعبہ انجیئرل سائنس (۹۰)	شعبہ ریاضیات علمیہ (۸۰)
شعبہ انجینئرنگ (۵۰۰)	شعبہ طب (۸۵۰) (۱)

جنگ عظیم کے زمانہ میں بھی نوجوان ترکوں نے تعلیمی ترقی کی کوشش جاری رکھی، چنانچہ ۱۹۱۸ء میں جامعہ استنبول کی از سر نو تنظیم کی گئی اور طلبہ کے قیام وغیرہ کے متعلق مزید سہولتیں بہم پہنچائی گئیں، اسی زمانہ میں ایک نمایاں ترقی یہ ہوئی کہ لڑکیوں کے لیے بھی ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کا انتظام بڑے پیمانہ پر کیا گیا اور قسطنطنیہ میں پانچ ہائی اسکول لڑکیوں کی تعلیم کے لیے قائم کیے گئے، یہ اسکول جرمن اساتذہ کی نگرانی میں تھے اور ان میں دو ہزار سے زیادہ لڑکیاں پڑھتی تھیں (۲)، اب تک لڑکیوں کے لیے صرف ابتدائی مدارس تھے جن میں دس سال کی عمر تک وہ لڑکوں کے ساتھ تعلیم پاتی تھیں، ان کی ثانوی تعلیم کے لیے صرف چند ہائی اسکول تھے جن میں سے ایک قسطنطنیہ میں تھا اور ایک بیروت میں۔

(۱) ماڈرن ٹرکی از میرز ص ۱۲۵ مطبوعہ نیویارک ۱۹۲۴ء (۲) ایضاً ص ۱۲۶

نوجوان ترکوں نے جب سے زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لی، چند روز بھی امن و اطمینان کے میسر نہ آئے کہ پیش نظر اصلاحات کی تکمیل کر سکتے، بیرونی جنگوں کے علاوہ خود ملک کی اندرونی شورشیں اور مخالفتیں قدم قدم پر حائل ہوتی رہیں، تاہم اپنے مختصر دور حکومت میں انھوں نے تعلیم کو جس قدر ترقی دی وہ ہر لحاظ سے قابل ستائش ہے، اس سلسلہ میں ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ تمام ملک میں مغربی نظام تعلیم کو رائج کر دیا، اس وقت تک امریکن کالجوں سے جو ترکی میں تقریباً نصف صدی سے قائم تھے ہزاروں طلبہ فارغ ہو کر نکل چکے تھے، لیکن ان میں ترکوں کی تعداد تھوڑی تھی، یورپین نظام تعلیم کو اختیار کرنے کا پہلا اہم قدم اس وقت اٹھایا گیا جب ترکی جرمنی کے ساتھ جنگ عظیم میں شریک ہوا، دو ہزار سے زیادہ ترک لڑکے ہائی اسکول اور یونیورسٹی کی تعلیم کے لیے جرمنی بھیجے گئے جو آج جدید ترکی کے تعلیم یافتہ طبقہ کا ایک ممتاز جزو ہیں۔ (۱)

(۱) کمالی ترکی اور مشرق وسطیٰ از ڈاکٹر کروگر ص ۸۱ (Kemalist Turkey and the

عثمانی ترک

(۱)

ادبی، تمدنی اور سیاسی تحریکیں

انیسویں صدی تک دولت عثمانیہ کی تاریخ حقیقتاً اس کے بادشاہوں کی تاریخ تھی، سلطان کی حیثیت ایک راعی کی تھی جس کا فرض رعایا کی نگہداشت اور فلاح و بہبود تھا، قوم کو امور مملکت میں کوئی دخل نہ تھا، لیکن جب سلاطین کی کمزوری اور غفلت سے حکومت کے تمام شعبوں میں ابتری پھیلنے لگی اور سلطنت کے باشندے ان حالات سے تنگ آ گئے تو ان کے اندر اپنے حقوق کا احساس پیدا ہوا، جس نے رفتہ رفتہ مطالبات کی شکل اختیار کر لی، قدیم نظام حکومت فرسودہ ہو چکا تھا اور اس میں قومی بیداری کی اس بوہتی ہوئی رو کو روکنے کی طاقت نہ تھی، دوسری طرف فرانس میں انقلابی تحریک نے نہ صرف غیر مسلم رعایا بلکہ ترکوں میں بھی حریت کے خیالات پھیلا دئے تھے۔

عثمانی ترکوں میں مغربی تحریک اول اول فوجی اصلاحات سے شروع ہوئی، یہ تحریک یورپ سے تمدنی تعلقات کی بنا پر نہیں پیدا ہوئی بلکہ اس کا سبب وہ احساس کمتری تھا جو ”صلح نامہ کوچک کینارجی“ (۱۷۷۴ء) کے صدمہ سے عثمانی مدبروں میں پیدا ہو گیا تھا، انھوں نے دیکھا کہ روس نے جسے وہ اب تک ایک حقیر دشمن خیال کرتے تھے، محض مغربی طرز کے اصلاحات جاری کرنے سے میدان جنگ میں انھیں شکست دے دی اور انھوں نے اس شکست سے یہ نتیجہ نکالا کہ مغرب کا مقابلہ کامیابی کے ساتھ خود اسی کے

ہتھیاروں سے کیا جاسکتا ہے، لیکن یورپ کی فوجی طاقت اس کی مضبوط انتظامی اقتصادی اور مالیاتی بنیادوں پر قائم تھی اور سلطنت عثمانیہ میں یہ بنیادیں روز بروز زیادہ کمزور ہوتی جا رہی تھیں، پھر بھی انیسویں صدی کے نصف اول میں سلطان سلیم ثالث اور محمود ثانی نے سب سے زیادہ توجہ عثمانی فوج کو مغربی طرز پر مرتب کرنے میں صرف کی اور اس میں شبہ نہیں کہ جو توقعات اس فوج سے قائم کی گئی تھیں وہ بہت کچھ پوری ہوئیں، ان فوجی اصلاحات کا ایک اہم نتیجہ یہ ہوا کہ ترکی افسروں نے ترقی و اصلاح کی ہر مزید کوشش میں حصہ لینا شروع کیا، اس کا سبب یہ نہیں تھا کہ فوجی افسر دوسری جماعتوں کی بہ نسبت زیادہ روشن خیال تھے بلکہ وجہ یہ تھی کہ سلطنت عثمانیہ میں ایک صدی تک یہی ایک جماعت ایسی تھی جسے باقاعدہ مغربی تربیت دی گئی تھی اور اس لیے مغربی کلچر (تہذیب و تمدن) کا اثر اسی جماعت پر زیادہ پڑا تھا، سلطان عبدالحمید خاں ثانی کے دور استبداد میں بھی فوجی افسروں کی مغربی تعلیم بند نہیں کی گئی، لیکن یہ نوجوان افسر فن حرب کے اصول مغربی زبانوں کے سیکھے بغیر حاصل نہیں کر سکتے تھے اور ان زبانوں کے ذریعہ سے وہ مغربی خیالات سے بھی واقف ہو گئے۔

مغربی خیالات کی اشاعت بالواسطہ جدید نظام تعلیم سے بھی ہوئی، جو تنظیمات کے عہد میں قائم کیا گیا تھا، تنظیمات محض انتظامی، عدالتی اور مالیاتی اصلاحات تک محدود نہ تھیں بلکہ اس سلسلہ میں تعلیم کو ترقی دینے کے لیے جدید طرز کے ابتدائی اور ثانوی مدارس کھولے گئے اور ایک یونیورسٹی کی بنیاد ڈالی گئی، تعلیمی اصلاحات کا ذکر مفصل طور پر گذشتہ باب میں کیا جا چکا ہے، رفتہ رفتہ قدیم مدرسوں کے حلقہ کے باہر ایک جدید تعلیم یافتہ طبقہ پیدا ہو گیا، یورپین زبانوں خصوصاً فرانسیسی زبان سے بہت سی علمی اور ادبی کتابوں کا ترجمہ ترکی میں کیا گیا اور ترکی ادبی زبان جو مغلطی الفاظ، مقفی اور مسجع عبارت اور تشبیہات و استعارات سے گراں بار تھی آسان بنائی جانے لگی، یورپ میں وطنیت اور قومیت کی جو تحریک انیسویں صدی میں پیدا ہو گئی تھی اس نے اب سلطنت عثمانیہ کی طرف

بھی رخ کیا اور ادب و صحافت کے ذریعہ پوری قوم میں پھیل گئی۔

قدیم ادب: قدیم عثمانی ادب زبان و خیالات دونوں لحاظ سے جمہور سے الگ تھا، اس میں فارسی اور عربی الفاظ کی کثرت تھی اور عبارت آرائی اس کی زینت سمجھی جاتی تھی، یہ زیادہ تر ایرانی ادب کے زیر اثر تھا، حسن و عشق کی داستان، گل و بلبل کے افسانے، موسم بہار کی دل کشی اور عوامان سب کی تہ میں تصوف کی چاشنی، فارسی شاعری کی طرح قدیم عثمانی شاعری کی بھی تقریباً کل کائنات یہی تھی، بلند پایہ نثر میں پر تکلف عبارت آرائی اور پیچیدگی پائی جاتی تھی، البتہ واقعہ نگاری میں عثمانیوں کو خاص امتیاز حاصل تھا، خالدہ ادیب خاتم لکھتی ہیں:

”میرے خیال میں عثمانی ترکوں کے ادب کی بہترین صنف سوانح نگاری ہے، پندرہویں صدی سے درباری مورخ برابر ترکی تاریخ قلم بند کرتے رہے، گو ان کی زبان خصوصاً سولہویں صدی کے بعد سے ثقیل ہے مگر ان میں حقیقت پسندی اور واقعہ نگاری کا وصف ایسا ہے کہ ان کی تصنیفات تاریخ کے طالب علم اور آرٹ کے قدرواں دونوں کے لیے بہت بڑی قیمت رکھتی ہیں، وہ اس زمانہ کی زندگی کا ہو بہو مرقع دکھاتے ہیں، جس میں سلاطین، وزرا، امرا اور عوام سب کی تصویریں موجود ہیں، زمانہ انقلاب میں عوام کی جدوجہد کا جیسا مفصل اور مکمل بیان ان سوانح میں ہے میں نے آج تک کسی کتاب میں نہیں دیکھا، تنقید کا ان کے یہاں نام بھی نہیں ہے، خوش قسمتی سے یہ مورخ اور اس زمانہ کے عثمانی اس احساس کمتری سے پاک تھے، جس نے ہمارے ادب اور خیالات پر جھوٹ کا رنگ چڑھا دیا ہے، وہ جو کچھ دیکھتے تھے وہی لکھ دیتے تھے، انھیں اس کی فکر نہیں تھی کہ دوسرے ملکوں کے لوگ کیا کہیں گے۔“ (۱)

عثمانی ادب کے ذکر میں لارینٹ لکھتا ہے کہ شاعری کی طرح ابتدائی وقائع نگاری بھی فارسی میں کی جاتی تھی، لیکن بعد میں سلطنت کے حالات ترکی زبان میں لکھے جانے لگے اور درباری مورخوں نے سن وار، ترتیب کے ساتھ تمام واقعات آغاز سلطنت سے لے کر اپنے زمانہ تک تفصیل کے ساتھ قلم بند کیے، رنگین اور پر تکلف عبارت کے علاوہ عثمانی وقائع نگاروں کی ایک عام خصوصیت یہ ہے کہ ان کے یہاں تاریخی تنقید بالکل نہیں ہوتی، واقعات کیے بعد دیگرے تاریخ وار بیان کیے جاتے ہیں اور بظاہر ان میں کوئی ربط نہیں معلوم ہوتا لیکن یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ چھوٹے سے چھوٹے واقعات سے لے کر بڑے بڑے واقعات تک سب انتہائی احتیاط اور تاریخی ترتیب کے ساتھ درج کیے گئے ہیں اور مورخ کے لیے ترکی ادب کا یہ حصہ نہایت قیمتی ہے (۱) مورخوں کی دو قسمیں ہیں: وقائع نگار اور سوانح نگار، سوانح نگاروں نے مشرق کے تمام مشاہیر رجال مثلاً بادشاہوں، وزیروں، مفتیوں، عالموں، شاعروں، مغنیوں، مصوروں، طبیبوں وغیرہ کے حالات لکھے ہیں۔ (۲) قدیم ادب کے متعلق پروفیسر جولیس جرمانس کا بیان ہے:

’ یہ ادبیات ایک مصنوعی اور خود ساختہ طبقہ کے مذاق کی آئینہ دار تھی اور اس لیے خود بھی مصنوعی تھی، شعرا جمہور کے درمیان رہتے سہتے تھے، لیکن جمہور کو شعرا کے دیوانوں میں کوئی جگہ نہ ملتی تھی، ان کے پر شکوہ قصیدوں اور عاشقانہ غزلوں میں تمہیں عام انسانوں، کھیتوں میں کام کرنے والوں، کسی دور دراز میدان جنگ میں نہما کر مرنے والوں کے جذبات، ان کی انگلیں، ان کے صدمات، ان کی خوشیاں، ان کے غم و الم، ان کے حوصلے، ان میں سے کسی ایک کی بھی صدائے بازگشت نہ سنائی دے گی، اس ادبیات میں کسی قسم کی انفرادیت یا شخصیت تمہیں نظر نہ آئے گی، اس لیے کہ اس نے اپنے



—

—

—

—

—

—

سانچے روزمرہ کی معمولی زندگی سے نہیں لیے تھے بلکہ ایک سانچہ پسند کر لیا تھا اور اسی کو ہر موقع پر استعمال کیا جاتا تھا، تمام قدیم ترکی شاعروں کے معشوق ہو بہو ایک سے ہیں اور تمام شعرا کی مشنویوں میں جو جذبات رنج و الم بیان کیے گئے ہیں وہ سب کے سب ایک ہی فرضی اور خیالی شکستہ دل سے نکلے ہیں۔“ (۱)

فطرت پسندانہ شاعری: لیکن اٹھارہویں صدی کے آخر میں ایسی شاعری سے لوگوں کی طبیعت سیر ہو گئی اور زندگی کی واقعی اور اصلی تصویر کھینچنے کا شوق پیدا ہوا، اس شوق نے انیسویں صدی کی ابتدا میں فطرت پسندانہ شاعری کی بنیاد رکھی اور اس حقہ کے شاعروں نے اپنے کلام میں ترکی معاشرت کا صحیح نقشہ پیش کیا، بقول خالدہ خانم ”انھوں نے ادب کو زندگی کا آئینہ بنادیا اور انسانی فطرت کی مصوری کا حق ادا کر دیا۔“

عہد تنظیمات: فطرت پسندانہ شاعری کا دور بہت جلد ختم ہو گیا، انیسویں صدی میں ترکوں میں ایک ذہنی انقلاب رونما ہوا، جو نتیجہ تھا فرانسیسی افکار اور فرانسیسی مذاق شاعری کا چنانچہ ترکی ادب خصوصاً شاعری اپنے خیالات اور طرز ادا کے لحاظ سے فرانسیسی رنگ میں ڈوب گئی، ادب کے ذریعہ فرانس کے سیاسی خیالات بھی پھیلانے لگے، اس عہد کے اہل قلم نے سب سے پہلے ”وطن“، ”حریت“ اور ”مشروطیت“ (دستوری حکومت) کا اعلان کیا اور اپنی سیاسی اور ادبی تنقیدوں، ناولوں، فلسفیانہ اور عمرانی مقالوں اور مغرب کی ادبی کتابوں کے ترجموں سے ان خیالات کی اشاعت کی، ”عہد تنظیمات“ کی ممتاز شخصیتیں شناسی، نامق کمال، عبدالحق حامد اور ضیا پاشا ہیں۔

شناسی: شناسی (۱۸۲۶ء تا ۱۸۷۱ء) تنظیمات کے ادب کا بانی اور نو جوان ترکوں کا سیاسی لیڈر تھا، یہ حیرت انگیز قابلیت کا آدمی تھا، سولہ برس کی عمر میں اس نے عربی اور فارسی ادب پر عبور حاصل کر لیا تھا اور ”اسے اس عمر میں پوری ترکی لغت زبانی یاد تھی“ (۲)

(۱) ترکوں کی اسلامی خدمات مطبوعہ انجمن ترقی اردو ص ۵۷ (۲) ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش ص ۱۷۲

اس نے فرانسیسی زبان سیکھنے کے بعد فلسفہ اور سائنس کی کتابوں کا مطالعہ شروع کیا، اس کی استعداد دیکھ کر سلطان عبدالمجید خاں نے اسے مالیات میں مہارت حاصل کرنے کے لیے پیرس بھیج دیا، مگر وہاں بھی وہ اپنی فرصت کے اوقات فلسفہ، سائنس و ادب کے مطالعہ میں صرف کرتا رہا، اپنے ذوق ادب اور سیرت کی پاکیزگی کی بنا پر وہ تھوڑے ہی دنوں میں پیرس کے علمی حلقہ میں داخل ہو گیا، اور ارنسٹ رینان (Ernest Renan) لاہ رتی نے (Lamartine) اور ساسی (Sacy) سے اس کی دوستی ہو گئی، چند سال کے بعد جب وہ ترکی واپس آیا تو صدر اعظم رشید پاشا نے اسے انجمن دانش کارکن بنادیا جو ۱۸۵۳ء میں جدید اسکولوں کے لیے نصاب کی کتابیں تیار کرنے کی غرض سے قائم کی گئی تھی، اس کے علاوہ وہ مجلس مالیات کارکن بھی مقرر کیا گیا اور فوج کی مالیات کی نگرانی اس کے سپرد ہوئی، لیکن یہ عہدے اس کے سیاسی خیالات کو بدل نہ سکے، وہ استبداد کا شدید مخالف تھا اور ترکی میں دستوری حکومت قائم کرنا چاہتا تھا، کہا جاتا ہے کہ وہ سلطان عبدالمجید خاں کے خلاف ایک سازش میں بھی شریک تھا مگر سلطان نے اسے معاف کر دیا عبدالمجید خاں کے انتقال کے بعد نئے صدر اعظم عالی پاشا نے جو نو جوان ترکوں کی آئینی تحریک کا مخالف تھا، شناسی کو تمام عہدوں سے برطرف کر دیا۔

شناسی کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے ترکی میں جدید طرز کے اخبار کی بنیاد ڈالی اور ۱۸۶۰ء میں ”ترجمان احوال“ جاری کیا، اب تک جو چند اخبارات ترکی میں نکلتے تھے وہ سرکاری تھے، ترجمان احوال پہلا غیر سرکاری اخبار تھا، یہ نہ صرف پہلا غیر سرکاری اخبار تھا بلکہ ادب کے جدید اسکول کی پہلی آواز بھی تھا، اس کی اشاعت سے عثمانی ادب اور عثمانی زبان کا ایک نیا دور شروع ہوا، شناسی کا تعلق ترجمان احوال سے صرف چھ مہینے رہا، اس کے بعد وہ اپنے رفیق کار آغا آفندی سے علاحدہ ہو گیا اور اپنا ایک ذاتی اخبار تصویر افکار نکالا، ترجمان احوال کی طرح اس اخبار میں بھی اس کا مقصد یہ تھا کہ ترکوں کی ذہنی زندگی کو جس قدر زیادہ ممکن ہو اہل یورپ کی ذہنی زندگی سے ہم آہنگ

کردے، اس نے سیاسی جھگڑوں سے الگ رہنے کی کوشش کی اور اپنی توجہ زیادہ تر سائنٹفک مسائل اور سوشل معاملات پر رکھی اور خاص طور پر زبان کی اصلاح و ترقی اور اسے آسان بنانے کی سعی کرتا رہا (۱)، جدید ترکی کے خیالات کی تشکیل اور رائے عامہ کی تربیت میں تصویر افکار کا بڑا حصہ ہے، یہ اخبار سوائے عبدالحمید خاں ثانی کے عہد حکومت کے ۱۹۲۵ء تک برابر جاری رہا، تصویر افکار میں مشہور فرانسیسی مصنفین کی کتابوں کے ترجمے بھی شائع ہوتے تھے، شناسی نے ترکی صرف و نحو پر بھی ایک کتاب لکھی اور ایک ڈراما ”شاعر کی شادی“ کے عنوان سے تصنیف کیا جس میں شاعروں کا خاکہ اڑایا ہے مگر اس کی سب سے عظیم الشان تصنیف ترکی لغت ہے، جس میں اس نے ہر لفظ کا ماخذ اور ترکی ادب میں اس کا استعمال دکھایا ہے، وہ اس لغت کو ہزار ہزار صفحات کی چودہ جلدوں میں لکھنا چاہتا تھا مگر عمر نے وفانہ کی اور صرف بیس حرفوں تک لکھ سکا۔

ادب اور زبان کی اصلاح میں شناسی کی سرگرمیوں نے قدامت پرستوں کو اس کا مخالف بنادیا مگر وہ خلوص اور صداقت کے ساتھ آخر دم تک اپنے کام میں لگا رہا، چنانچہ یہ تحریک باوجود مخالفت کے روز بروز بڑھتی گئی اور ادب جدید کی بنیادیں مستحکم ہوتی گئیں۔

نامق کمال: شناسی کے بعد نئے ادب کی رہنمائی نامق کمال (۱۸۲۷ء تا ۱۸۸۸ء) کے ہاتھ میں آئی، وہ ایک زبردست آرٹسٹ، ایک سرگرم مجاہد، ایک کثیر التصانیف اہل قلم اور ایک پر جوش محب وطن تھا، اس کے نزدیک آرٹ ملک میں نشاۃ ثانیہ پیدا کرنے کا ایک ذریعہ تھا اور اس نے یہ مقصد حاصل کرنے کے لیے اپنے ڈراموں اور ناولوں، اپنی شاعری، اپنی تاریخی تصنیفوں اور تنقیدی مقالوں یہاں تک کہ اپنے خانگی خطبوں سے بھی کام لیا (۲)، وہ ایک معزز خاندان میں پیدا ہوا تھا اور اوائل عمر میں اس نے سلطنت عثمانیہ (۱) جدید ترکی کی ترقی اس کے پریس کے پیانہ سے از احمد امین پی ایچ ڈی مطبوعہ نیورک ۱۹۱۳ء

ص ۳۴-۳۵) The Development of modern Turkey as measured by its press

(۲) مقالہ کو پرولوز اور محمد فوادہ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام ج ۳ ص ۹۵۶ by ahmad amin Ph.D.)

کے تمام ممالک کی سیاحت کی تھی، رعایا کی غربت و فلاکت اور حکام کی نا انصافیوں اور بے عنوانیوں کے جو مناظر اس نے دیکھے ان کا اثر اس کے دل پر بہت گہرا پڑا اور اس نے اہل وطن کی خدمت اور ان کو موجودہ مصائب سے نجات دلانے کا عزم راسخ کر لیا، اس کی تمام سرگرمیوں کا مرکز وطن ہے، جیسا کہ ڈاکٹر احمد محی الدین نے لکھا ہے: ”عثمانی وطن کا تصور اسی سب سے بڑے ترک محب وطن کی تخلیق ہے۔“ اسی کی خدمت کے لیے اس نے اپنی زندگی وقف کر دی تھی، اس کا اعتقاد تھا کہ ”سچی حکومت قوم کی خدمت کا نام ہے۔“ فنون لطیفہ، زبان و ادب، سب اسی ایک مقصد کے حصول کا ذریعہ ہیں، وہ لکھتا ہے: ”اگر میں اپنی قوم کی اس بہار کو دیکھے بغیر مر جاؤں جس کی امید میں جیتا ہوں تو میرے لوح مزار پر یہ لکھ دینا:

”وطن سوگ میں ہے اور میں بھی سوگ میں ہوں“ (۱)

وہ نوجوان ترکوں کی جماعت میں شامل ہو گیا تھا اور دستوری حکومت کا حامی تھا، جب حکومت کی طرف سے سختی شروع ہوئی تو اسے بھی دوسرے مشہور وطن پرستوں کی طرح بھاگنا پڑا، چنانچہ وہ لندن پہنچا اور وہاں ضیا پاشا کی شرکت میں اخبار ”حریت“ کا تانتا رہا، چار سال کے بعد جب عام معافی کا اعلان ہوا تو وہ ترکی واپس آ گیا اور بدستور سابق وطن کی خدمت میں مشغول ہو گیا، لندن سے واپسی کے بعد اس نے اپنا ایک ذاتی اخبار ”عبرت“ نکالنا شروع کیا، جس کا اثر قومی تحریک کے پھیلاؤ میں خاص طور پر پڑا۔

”عبرت“ کی تقلید میں چند اخبارات اور بھی جاری ہوئے مگر ان میں سے بہت کم زیادہ دنوں تک چل سکے، پھر بھی حوصلہ مند نوجوان اخبار نگاروں نے باز نہ آئے، اخبارات کا معیار بلند تھا کیونکہ تعلیم یافتہ طبقہ کے بہترین افراد صحافت کا کام کرتے تھے اور یہ پیشہ حب الوطنی میں داخل تھا، لیکن حکومت کی طرف سے پریس پر پابندیاں بھی بڑھتی جاتی تھیں، اخبارات کا معطل کیا جانا روز کی بات ہو گئی تھی، چنانچہ ”عبرت“ بھی کئی (۱) ترکی میں جدید تمدنی تحریک اڈاکٹر احمد محی الدین پروفیسر زبان ترکی لاپازک یونیورسٹی بحوالہ

رسالہ جامعہ باہت ماہ جولائی ۱۹۲۷ء

بار بند کر دیا گیا تھا، اکثر ایسا بھی ہوتا تھا کہ اخبار نویس بغیر اس کے کہ ان پر باقاعدہ مقدمہ قائم کیا جائے یا انھیں جواب دہی کا موقع دیا جائے، جلاوطن کر دئے جاتے تھے، کبھی انعام و اکرام اور عہدوں کے ذریعہ سے انھیں قابو میں لانے کی کوشش کی جاتی تھی مثلاً نامق کمال کو گیلی پولی کا گورنر مقرر کر کے بھیج دیا گیا تھا مگر چند ہی مہینوں کے بعد وہ استعفا دے کر قسطنطنیہ واپس آ گیا اور پھر اپنا اخبار جاری کیا لیکن ۱۸۷۵ء میں جب اس کا ڈرامہ ”وطن“ اسٹیج پر لایا گیا اور اس سے عوام میں بے حد جوش پیدا ہوا تو نامق کمال کو قبرص (سائپرس) لے جا کر قید کر دیا گیا، کمال کے علاوہ اور تمام مشہور اہل قلم بھی جو عوام میں مقبول تھے قبرص بھیج دئے گئے، سلطان عبدالعزیز خاں کے معزول ہونے پر جب سلطان مراد کے مختصر عہد حکومت میں نوجوان ترکوں کو اختیار حاصل ہوا تو جلاوطن اخبار نویس سب واپس بلا لیے گئے اور ترکی پولیس میں ایک نئی سرگرمی شروع ہوئی۔

وطن کی طرح نامق کمال کو اپنے مذہب اور تمدن سے بھی بے حد محبت تھی، وہ سلطنت عثمانیہ کو پھر ایک عظیم الشان اسلامی طاقت دیکھنا چاہتا تھا، اسلام ہی کا نام لے کر وہ اس ذہنیت کے خلاف جہاد کرتا تھا، جس نے ترکی قوم میں دنیا سے بیزاری اور دنیا سے نفرت کا زہر پھیلا کر اس کے قوائے عمل کو مفلوج کر دیا تھا، اس نے اپنی قوم کو کارزار حیات میں عمل اور جدوجہد کی دعوت دی اور اپنے زور قلم اور جوش کلام سے اس میں ایک نئی روح پھونک دی، وہ مغرب کے علوم و فنون سے بیگانہ نہ تھا، لیکن خود اس کی قوم نے علم و حکمت کے جو خزانے صدیوں میں جمع کیے تھے ان کی قدر و قیمت کو خوب سمجھتا تھا اور ان پر فخر کرتا تھا، اس کے تمام خیالات اسلامی اصولوں اور عثمانی روایتوں سے ماخوذ ہیں، نامق کمال کی تصنیفوں کے دو بنیادی اصول ”حب وطن“ اور ”حقوق انسانی“ کے نظریے ہیں، خالدہ خانم اپنے خطبات میں لکھتی ہیں:

”حب وطن اس معنی میں جو آج کل سمجھے جاتے ہیں، اس کا

خاص موضوع ہے، اس نے جا بجا اپنے ملک کے حالیہ زار کا دلد و زمر قلع

دکھایا ہے، خصوصاً ایک نثر کی کتاب میں جس کا نام ”خواب“ ہے اور ایک نظم میں جس کا عنوان ”واویلا“ ہے، اس نے ان خیالات کے اظہار میں انتہائی جوش و خروش سے کام لیا ہے، خواب میں اسے مادر وطن کی تصویر یہ نظر آئی کہ ایک عظیم الشان ہستی زخموں سے چور کفن میں لپٹی ہوئی چلی جا رہی ہے، وہ درد سے بیتاب ہے مگر اپنے بچوں کو سینے سے چمٹائے ہوئے ہے، ”واویلا“ میں وہ اپنے مادر وطن سے التجا کرتا ہے کہ اپنے سفید کفن پر سیاہ چادر ڈال لے، ایک ہاتھ کر بلا کی طرف اور دوسرا روضہ رسول ﷺ کی طرف پھیلا کر کھڑی ہو جائے اور بارگاہ الہی میں ان لڑائیوں کی فریاد کرے جو ترکی زمین پر لڑی گئیں اور جن میں سے ایک ایک لڑائی بدرہ جنین کے معرکے سے کم نہ تھی، اس نے دکھایا ہے کہ سلطنت کی تاریخ میں ترکوں کا خون کس کس طرح بہایا گیا اور کن کن شہیدوں نے اپنے وطن کی زمین کو اپنے خون سے سینچا۔“ (۱)

حقوق انسانی کے نظریہ کی حمایت بھی نامق کمال اسی جوش سے کرتا ہے، اس کا عقیدہ ہے کہ جو حکومت محکوموں کی رضامندی پر قائم نہ ہو استبدادی حکومت ہے، جس کے خلاف جدوجہد کرنا ہر شخص کا فرض ہے، حقوق انسانی کی حفاظت کے لیے وہ جنگ اور ہر قسم کی قربانی کرنے کی تبلیغ کرتا ہے، اس نے اپنے عمل سے اپنے عقیدہ کی سچائی کا ثبوت دیا، اس کی ساری زندگی وطن اور حقوق انسانی کے تحفظ کی سعی میں گزری اور اس راہ میں اس نے بارہا جلاوطنی اور قید کی صعوبتیں اٹھائیں، چنانچہ اس کا انتقال بھی جلاوطنی کی حالت میں ایک جزیرے میں ہوا، اگر وہ چاہتا تو آسانی سے وزیراعظم ہو سکتا تھا مگر وہ آخر دم تک اپنے عقیدہ پر قائم رہا اور سلطنت کے بڑے سے بڑے عہدہ کی ترغیب بھی اسے اپنے اصول سے منحرف نہ کر سکی، حقوق انسانی کے خیال کو اس نے ایک نظم میں

جو ”قصیدہ حریت“ کے نام سے مشہور ہے پیش کیا ہے، اس کا خلاصہ خالدہ خانم کے الفاظ میں حسب ذیل ہے:

”یہ دیکھ کر کہ زمانہ کی روش حق اور ایمان سے منحرف ہو گئی ہے ہم نے عزت اور عظمت کے ساتھ منصب حکومت سے ہاتھ اٹھایا، وہ انسان جو انسانیت کے لقب کا مستحق ہے کبھی خلق خدا کی خدمت سے نہیں تھکتا، وہ ہمیشہ ستم کشوں اور مظلوموں کی دست گیری کرتا ہے، ظالموں کا حامی وہی ہوتا ہے، جس کا دل و دماغ شقاوت سے معمور ہو، کتوں کو اسی میں مزہ آتا ہے کہ خونخوار شکاری کے آگے آگے دوڑیں، میرے لیے یہی کافی ہے کہ لوگ کہیں کہ یہ وہ شخص ہے جو اپنے مقصد کی خاطر تکلیف اٹھانے کو وزیر کے منصب بلکہ وزیراعظم کے مرتبہ سے زیادہ عزت اور مسرت کا باعث سمجھتا ہے۔“

پھانسی کی رسی جو موت کا اڑدہا ہے، اس زندگی سے بدرجہا بہتر ہے جس میں انسان کو غلامی کا طوق گلے میں ڈال پڑے، خواہ آزادی کا میدان جہنم کا طبقہ ہو، انسان اسے چھوڑنا گوارا نہ کرے گا، تقدیر کے پاس ظلم و جور کے جتنے ہتھیار ہیں وہ لے کر آجائے اور مجھ پر حملہ کرے، اگر میں خدمت کی راہ اور جنگ کے میدان سے ہٹ جاؤں تو مجھ سے بڑھ کر بزدل دنیا میں کوئی نہ ہوگا، آہ اے آزادی تجھ میں کیا جادو ہے کہ ہم نے سب زنجیروں کو توڑ پھینکا مگر تیری غلامی کا طوق خوشی سے گلے میں ڈال لیا۔“ (۱)

عبدالحق حامد: وطن پرستی کے جذبہ کی ترجمانی نامق کمال کے بعد اس کے دوست اور شاگرد عبدالحق حامد نے کی، وہ ایک ممتاز شاعر اور ڈراما نویس تھا، خالدہ خانم فرماتی ہیں کہ

(۱) ترکی میں شرق و مغرب کی کشمکش ص ۸۰-۱۷۹

”اس کی تصانیف نے ادب جدید کا معیار بہت بلند کر دیا

اور ان کا ترجمہ دوسری زبانوں میں ہو جائے تو وہ یقیناً بین الاقوامی

شہرت حاصل کر لیں۔“

حامد نے بھی نامق کمال کی طرح ظلم و نا انصافی کے خلاف شدت سے احتجاج کیا، باوجود اس کے کہ اس کی زندگی کا بڑا حصہ سرکاری ملازمت میں گزرا اور وہ بمبئی، میڈرڈ اور لندن میں مدت تک ترکی سفیر کی حیثیت سے رہا، تاہم اپنی کتابوں میں اس نے ”سلطان عبدالحمید خاں کے استبداد پر خوب خوب چوٹیں کی ہیں۔“ (۱)

ضیا پاشا: وطنی تحریک کا ایک اور زبردست حامی ضیا پاشا تھا، اس پر فرانسیسی ادب کا بہت اثر تھا اور اس نے روسو اور مولیر کی کتابوں کا ترجمہ کر کے نیز اپنی ادبی اور سیاسی تنقیدوں سے اس تحریک کو بہت مدد پہنچائی، اس نے جلاوطنی کے کئی سال پیرس اور لندن میں گزارے تھے، لندن ہی سے اس نے اخبار ”حریت“ نکالا تھا، جس کی ادارت میں نامق کمال بھی شریک ہو گیا تھا، ضیا پاشا قدیم ادب کا ماہر تھا لیکن وہ سمجھتا تھا کہ اس ادب کو ترکوں کی حقیقی زندگی سے کوئی تعلق نہیں، اس کا نظریہ یہ تھا کہ ادب کو عوام کی زبان اور خیالات کا آئینہ ہونا چاہیے۔ (۲)

ادبیات جدیدہ: سلطان عبدالحمید خاں کے عہد سے ترکی ادبیات کا ایک نیا دور شروع ہوا، سلطان نے تنظیمات کے ادب کو منادینے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا اور بظاہر اسے کامیابی ہوئی، شناسی اور نامق کمال وغیرہ کی کتابوں کی اشاعت بند ہو گئی اور جن الفاظ سے جذبہ وطن پرستی کا اظہار ہوتا تھا وہ لغت سے خارج کر دئے گئے، ”دستور آزادی اور وطن“ کے الفاظ استعمال کرنے کی اجازت صرف سرکاری اخباروں کو تھی، دوسروں کے لیے ان الفاظ کا زبان پر لانا بھی جرم تھا اور ممنوع الاشاعت کتابوں کا ایک صفحہ چوری سے پڑھنا بھی بغاوت میں داخل تھا، جس کی پاداش میں لوگ اکثر تمام عمر کے لیے

جلاوطن کر دئے جاتے تھے۔ (۱)

لیکن ان سختیوں کے باوجود بلکہ شاید انہی کی وجہ سے اس عہد میں ایک جدید ادبی حلقہ پیدا ہوا، جس نے اپنے زور قلم سے نہ صرف جمیدی استبداد کی بنیادیں ہلا دیں بلکہ مذہب اور ماضی کی روایات پر بھی یہ سمجھ کر کہ وہ استبداد کی حامی ہیں، شدید حملے کیے، اس حلقہ کی نمایاں خصوصیت اس کی مغرب پسندی تھی، یہ لوگ مغربی سائنس، مغربی عقلیت اور مغربی مادیت کے دلدادہ تھے، مذہب اور قدیم روایات ان کے نزدیک تہذیب و تمدن کی راہ میں حائل تھیں، اس لیے وہ ان دونوں کے مخالف تھے، انھوں نے ناول اور شاعری کے ذریعہ اپنے خیالات کی اشاعت کی، خالد ضیا اس حلقہ کا ناول نویس تھا، اس کے ناول مغرب کے جدید ناولوں کے طرز پر لکھے جاتے تھے، توفیق فکریت اس جماعت کا سب سے مشہور شاعر تھا، وہ غیر معمولی خصوصیات کا حامل تھا، خالدہ خانم لکھتی ہیں کہ ”اس میں اولیاء اللہ کا ساز ہد اور ضبط نفس پایا جاتا تھا“ مگر باوجود اس کے اسے مذہب میں کوئی خوبی نظر نہیں آئی، اس کا دماغ وسعت نظر اور جنگی ذہن کا ایک عجیب و غریب مجموعہ ہے، اخلاق اور سیرت پر مذہب کے پاکیزہ اثرات اسے دکھائی نہیں دیتے، مغرب کے مادی تمدن کی چمک نے اس کی آنکھوں کو خیرہ کر دیا ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ مذہب اور قدیم روایات ترقی کی راہ میں دوسب سے بڑے پتھر ہیں، اس نے ان خیالات کا اظہار اپنی مشہور نظم ”تاریخ قدیم“ میں کیا ہے، خالدہ خانم اس پر تبصرہ کرتی ہیں:

”اس میں عموماً قدیم روایات اور خصوصاً مذہب پر جنھیں وہ

ترقی میں حائل سمجھتا ہے بے پناہ حملہ کیا گیا ہے، اس کا اثر اچھا اور برا

دونوں طرح کا پڑا، سب سے بڑی خرابی اس میں یہی ہے کہ مذہب

کے ہر پہلو کی بلا تفریق مخالفت کی گئی ہے اور اسے نوع انسانی کے لیے

ایک لعنت قرار دیا گیا ہے، توفیق فکریت کے لیے لوگ بغیر مذہب کے

بھی پاکیزہ اور بلند سیرت کے مالک ہو سکتے تھے مگر ہر ملک اور ہر قوم میں لوگوں کی اخلاقی تعلیم کی حقیقی بنیاد مذہب ہی پر قائم ہے، اس میں جتنا حصہ ضعیف الاعتقادی اور جہالت کا ہے اس کو جتنا جی چاہئے برا کہہ لیجیے مگر مجموعی حیثیت سے مذہب کی عزت اور احترام کرنا چاہیے اور اسی پر نوجوانوں کی اخلاقی تعلیم کی بنیاد رکھنی چاہیے، اس کے اس طرح مذہب پر اندھا دھند حملہ کرنے سے بد اعتقادی پیدا ہو گئی، اس کے علاوہ لوگ اپنے ماضی سے قطعاً نفرت کرنے لگے۔

اس سے قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو اس نظم میں بڑے پاکیزہ اور پاک اند خیالات ہیں، جو پرزور انداز میں بیان کیے گئے ہیں، یہاں توفیق فکرت جنگ و جدل کا مخالف، بین الاقوامی اتحاد و عمل کا علم بردار، عالمگیر برادری کا حامی اور عقل انسانی کی فضیلت اور خوبی کا دل سے معتقد نظر آتا ہے، نظم کا آغاز اس طرح ہوتا ہے کہ ماضی کی روح مجسم ہو کر ظاہر ہوتی ہے، یہ ایک ہڈیوں کا ڈھانچا ہے جس کے دانتوں سے خون ٹپک رہا ہے، اس کے آنے سے رات کی مدت بڑھ جاتی ہے اور صبح جس کی نوع انسانی منتظر ہے اور دور ہو جاتی ہے، تشدد کے خلاف اس سے زیادہ شدید حملہ شاید ہی کسی زبان کے ادب میں کیا گیا ہے۔

ہماری آرزو ہے کہ صبح ہو جائے، ان لوگوں کو جنہوں نے پہاڑی اندھیری راتیں خواب غفلت میں گزاری ہیں، صبح کا مبارک جلوہ دیکھنا نصیب ہو، اے مہیب پیکر جو اندھیرے میں قدم اٹھائے چلا آ رہا ہے تو کون ہے؟ تیرے چہرے سے خونخواری ٹپک رہی ہے تو ہی ہے جس نے میری قوم کو برہاد کر دیا ہے۔

کیا کہا؟ شجاعت؟ جس کی بنا خونریزی اور وحشت پر ہے،

فتح؟ یعنی شہر کے شہر روند ڈالنا فوجیں کی فوجیں کاٹ کر رکھ دینا، قتل و خون، گیر و دار، تباہی، بربادی، پامان، آتش زنی، غارت گری، رحم کانام نہیں، آہوں اور آنسوؤں کا اثر نہیں، جہاں تیرا قدم پہنچا آفت آئی، مصیبت آئی، فصلیں برباد، گھاس اور کائی تک معدوم، خاندان تباہ ہو گئے، بستیاں اجڑ گئیں، ہر گھر قبر بنا دیا گیا، ہر چھت معصوم بچوں کے سر پر گرا دی گئی۔“ (۱)

توفیق فکرت کا اسلوب بیان تمثیلی ہے، اس کی نظمیں جن میں ظلم و استبداد پر در پردہ چوٹیں ہوتی تھیں، ہفتہ وار اخبار ثروت فنون میں شائع ہوا کرتی تھیں جس کا مدیر خود توفیق فکرت تھا، یہ نظمیں نوجوان ترکوں میں بے حد مقبول ہوئیں، چنانچہ جب ۱۸۹۶ء میں ان کا مجموعہ ”رباب شکستہ“ کے عنوان سے شائع ہوا تو اس کے تمام نسخے ایک سال کے اندر فروخت ہو گئے، پروفیسر جرمانس لکھتے ہیں کہ ”ترکی نظم کی کسی تصنیف کو وہ مقبولیت نصیب نہ ہوئی جو اس مجموعہ کو ہوئی“ (۲)؛ لیکن کتاب کی مقبولیت مصنف کے حق میں مضرت ثابت ہوئی، توفیق فکرت گرفتار کر لیا گیا اور ثروت فنون بند کر دیا گیا، رہائی کے بعد اسے امریکی مشن کے رابرٹ کالج میں پروفیسری کی جگہ مل گئی، جہاں وہ بظاہر قومی خدمت سے کنارہ کش ہو کر درس و تدریس میں اپنا وقت گزارنے لگا؛ ”رباب شکستہ“ کے بعد اس کی کوئی نظم شائع نہیں ہوئی، لیکن وہ اپنے خیالات کے اظہار سے باز نہ آیا اور اپنے خاص انداز میں متعدد پر جوش نظمیں لکھیں جو شائع تو نہیں ہو سکتی تھیں مگر لوگ ہاتھ سے لکھ کر ان کو زبانی یاد کر لیتے تھے، اس نے نوجوان ترک پارٹی کے لیے ایک ”قومی گیت“ لکھا، جو حق اور ملت پرستی کے جذبات سے لبریز ہے، اس کی دو بیتوں کا ترجمہ یہ ہے:

”ہمارا راستہ حق اور ملت کا راستہ ہے..... مبارک ہے حق،

مبارک ہے ہماری پیاری ملت، ظلم کے پاس تو ہیں ہیں، گولیاں ہیں، قلعے

ہیں، حق کے پس خم نہ کھانے والا بازو، ہر نہ نئے والا ایمان ہے۔“ (۱)

ادبیات جدیدہ کا دوسرا نہایت ممتاز شاعر محمد عارف ہے، وہ بھی فکرت کی طرح استبداد کا دشمن اور عدل و انصاف کا حامی ہے، لیکن مذہب اور ماضی کا مخالف نہیں، برخلاف اس کے وہ مذہب کو انسان کی اصلاح کے لیے ضروری خیال کرتا ہے اور ماضی کو کھودینے سے مستقبل کی تعمیر کو ناممکن سمجھتا ہے، اس کا دل اسلام کی محبت اور دنیا سے اسدم کی زیوں حالی کے درد سے لبریز ہے، اپنی طویل نظم ”مشرق“ میں لکھتا ہے:

”لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ تم نے مشرق کی اتنے عرصہ تک سیاحت کی، آخر تم نے کیا دیکھا؟ میں کیا بتاؤں کیا دیکھا، میں نے اس سرے سے اس سرے تک ایران بستیاں، بے سری قومیں، ٹوٹے پھوٹے پل، بند نہریں، سمنان سڑکیں دیکھیں، میں نے جھریاں پڑے چہرے، جھکی ہوئی کمریں، خالی دماغ، بے حس دل، اٹلی عقلیں دیکھیں، میں نے ظلم، غلامی، خستہ حالی، ریہ کاری، قہر، نفرت برائیاں، طرح طرح کی بیہریاں، جلے ہوئے جنگل، ٹھنڈے چولہے، بنجر کھیت، میلی عورتیں، ننگے ہاتھ پاؤں دیکھے، میں نے بے جماعت کے امام دیکھے، بھائی کو بھائی کا دشمن دیکھا، دن دیکھے جن کا کوئی مقصد نہیں، راتیں دیکھیں جن کی کوئی صبح نہیں۔“ (۲)

حیات و کائنات کا ایک نیا تصور: ترکی میں جو ادبی تحریک انیسویں صدی میں شروع ہوئی وہ حقیقتاً ایک تمدنی تحریک تھی، جس نے حیات و کائنات کا ایک نیا تصور پیش کیا، عثمانی ترکوں کا تصور کائنات اسلامی تھا مگر امتداد زمانہ سے اس کی اصلی ہیئت میں بہت کچھ فرق پیدا ہو گیا تھا، اسلام نے انسان کو جو منصب کائنات میں عطا کیا تھا، اس پر مستبد حکمرانوں نے قبضہ کر لیا تھا اور یہ قبضہ صدیوں تک قائم رہا، انسان کے لیے صبر و رضا

(۱) ترکوں کی اسلامی خدمات ص ۹۲ (۲) ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش ص ۱۹۳

کے ساتھ اسے تسلیم کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا، ترکی میں بھی صورتِ حالات یہی تھی، لیکن جب داخلی اور خارجی اسباب کی بنا پر استبداد کی گرفت ڈھیلی ہوئی تو جمہور کے دلوں میں اس منصب کے دوبارہ حاصل کرنے کا حوصلہ پیدا ہوا جسے سلاطین نے اس سے چھین لیا تھا، قدیم نظام حکومت کی بنیادیں متزلزل ہو چکی تھیں، یورپ کے تمدنی تعلقات اور تعلیم جدید نے ایک نئی ذہنیت پیدا کر دی تھی، جو ادب کے ذریعہ ظاہر ہوئی، لیکن گونیا ادب فرانسیسی رنگ میں ڈوبا نظر آتا ہے، اس کے بنیادی اصول خاص اسلامی ہیں، انسان نے کائنات میں اپنی حیثیت کا پھر احساس کیا، قرآن کریم کے وہ مقامات پھر یاد آنے لگے جہاں انسان کی عظمت کا ذکر کیا گیا ہے، محمد عاکف اپنی ایک نظم میں جس کا عنوان ”انسان“ ہے، لکھتا ہے:

”انسان اپنی قدر نہیں پہچانتا، وہ تو فرشتوں تک سے بلند تر ہے، اس کے سینہ میں عجم پنہاں ہے، اس کے قلب پر وجود باری اپنا پر توڑا ہوا ہے، جسمانی حیثیت سے دیکھو تو ایک ذرا سی چیز ہے، لیکن کار سازی لہی کا مقصود یہی ہے اور اسی لیے ابدی ہے اور بے قیود، قدرت اس کی خادمہ ہے، عالم اشیاء اس کا باج گزار ہے، دنیا اس کی مرضی اور اس کے آئین کی فرماں بردار ہے، یہ کائنات کا تاج ہے۔“ (۱)

انسان کی اس بلند حیثیت کا احساس اس کی عقل کی قدر افزائی کا باعث ہوا، مغربی فلسفہ نے تعلیم یافتہ طبقہ پر اثر ڈالا اور ترکی کی جدید ادبی تحریک میں عقلیت کی رو نمایاں طور پر نظر آنے لگی، عثمانی مفکرین نے شروع میں یہاں بھی اسلام ہی کا دامن پکڑا اور بتایا کہ اسلام میں عقل کا درجہ کس قدر بلند ہے مگر بعد میں وہ یورپ کی عقلیت کا شکار ہو گئے، ان کی عقل پرستی یہاں تک بڑھی کہ ان میں سے بعض خود مذہب کی مخالفت کرنے لگے، تو فتنہ فکرت اسی جماعت کا نمایندہ ہے۔

عثمانی ترک جب شروع شروع اسلام لائے تو ان میں وہی جوش اور جذبہ عمل پایا جاتا تھا جو ایک نئی قوم میں ہوتا ہے، یہ جذبہ سلطنت کی ابتدائی صدیوں میں قائم رہا، لیکن رفتہ رفتہ تمدن کے قیضات میں گرفتار ہو کر ان کی سپاہیانہ سرگرمی سرد پڑتی گئی، دوسری طرف عجمی فلسفہ اور تصوف نے دنیا سے نفرت اور بیزاری کا سبق پڑھایا، میدان جنگ میں جب یورپ کے مقابلہ میں شکستوں کا سلسلہ شروع ہوا اور سلطنت کے صوبے یکے بعد دیگرے نکلتے گئے تو یہ بیزاری اور بڑھی، اپنی کمزوریوں پر نظر کرنے کے بجائے انھوں نے سارا الزام تقدیر کے سر رکھا، استبدادی حکومت میں جمہور کی بے دست و پائی نے عقیدہ تقدیر کو مزید تقویت پہنچائی، کیونکہ ان کے حالات کا بننا بگڑنا حکمرانوں کے رحم و کرم پر موقوف تھا، جدید تمدنی تحریک نے اس غلط قسم کی تقدیر پرستی اور دنیا سے نفرت اور بیزاری کے عقیدہ کے خلاف شدت سے آواز بلند کی اور اثبات زندگی کا تصور نہایت بلند آہنگی کے ساتھ پیش کیا، اس تصور کے پیش کرنے میں نامق کمال سب سے آگے ہے، اس کی تمام تصنیفیں اثبات زندگی کے جذبہ اور ولولہ سے پر ہیں، اس نے اپنی قوم کو اسلام کے نام پر عمل کی دعوت دی، اس نے بتایا کہ اسلام ترک دنیا کی تعلیم نہیں دیتا اور کائنات کی تسخیر جو انسان کو دیگر مخلوقات پر فضیلت بخشی ہے، بغیر عمل اور جدوجہد کے ممکن نہیں۔

لَبَسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ كَالْهَلِيِّ قَانُونِ اِسى حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

ڈاکٹر احمد محمدی الدین لکھتے ہیں:

”اس سلسلہ میں بھی ترکی شاعری نے اپنے مقصد کو صحیح طور پر سمجھا اور اس کو پورا کرنے کی کوشش کی، اس نے تقدیر پرستی اور غلط معنوں میں خدا پر بھروسہ کرنے کی مخالفت کو اپنا سب سے پہلا مقصد قرار دیا اور دوسرا مقصد مایوسی اور کمالی کے خلاف جہد، یہاں بھی ہمیں سر لشکر وہی نامق کمال دکھائی دیتا ہے، وہ مضبوط ارادوں والا عملی آدمی جس نے اپنے خیالات کی تمام قوت اس کمالی اور خدا پر اس غلط بھروسہ

کے خلاف صرف کردی اور محنت و عمل کے پیغام کی تبلیغ کی، حامد، فکر، امین اور عہد جدید کے تقریباً سب شعرا نے اس کی پیروی کی، لیکن اس ضمن میں شاعری کا سب سے عظیم الشان کارنامہ عاکف کا ہے۔ وہ سر تا پا مسلمان ہے، اس کا ایمان نہایت مضبوط اور پختہ ہے اور اس کے عقیدہ میں ایک عجیب سادگی اور صفائی ہے، لیکن اس پر بھی اسلامی دنیا کے مصائب اور ترکوں کے تکلیف دہ حالات کا اثر ہے اور باوجود اپنے عقیدہ کے یہ محسوس کرتا ہے کہ خود اسے اور اس کی اسلامی دنیا کو خدا نے چھوڑ دیا ہے اس تکلیف دہ خیال سے اس کے دل میں جو کیفیت پیدا ہوتی ہے اس کا علاج یہ اس علم میں ڈھونڈھتا ہے جس کا ہم نے ذکر کیا ہے یعنی تیسرے باب کی پہلی نظم میں محنت و سعی کا نیا قانون پیش کرتا ہے، نظم کے شروع میں تو تسلیم اور رضا الہی پر قناعت کے جذبات کا اظہار ہے، لیکن آگے چل کر یہ اسلامی اور ترکی دنیا کے تکلیف دہ حالات کا ذکر کرتا ہے اور خدا سے شکوہ کرتا ہے کہ تیری مدد کہاں ہے، اس پر اس کو یہ الفاظ سنائی دیتے ہیں جنہیں سن کر یہ خاموش ہو جاتا ہے: ”اے نادان! خاموش، دنیا کی گردش کبھی نہیں رکتی، تو کیا سمجھتا ہے، کیا تو انین عالم شکوہ اور شکایت سے معطل ہو سکتے ہیں؟ مدد چاہتا ہے تو اپنے آپ سے مدد کر، جا اور خود اپنی کوشش سے ظلم اور نا انصافی کو دور کر اور دیکھ دنیا کس قدر عزت کے ساتھ اس قانون سعی کی اطاعت کرتی ہے۔“ (۱)

پریس کی سرگرمی: ۱۹۰۸ء کے انقلاب کے بعد جب دستوری حکومت قائم ہوئی اور پریس کا احتساب منسوخ کر دیا گیا تو عثمانی ادب و صحافت میں لامحدود جوش پیدا ہوا، دفعۃً سیکڑوں کتابیں منظر عام پر آ گئیں، تمام ممنوع الاشاعت کتابوں کے تازہ ایڈیشن فوراً تیار

کیے جانے لگے، کمال اور حامد کے ڈرامے پھر اسٹیج پر آئے اور مغرب کی بہت سی عمرانی، فلسفیانہ اور تاریخی کتابوں کے ترجمے ترکی زبان میں کیے گئے، اخباروں اور رسالوں کی تعداد میں بھی حیرت انگیز اضافہ ہونے لگا، چند ہفتوں کے اندر ترکی روزانہ اخباروں کی تعداد تین سے پندرہ تک پہنچ گئی، بعض پر جوش اشخاص نے بغیر اس خیال کے کہ ملک میں مانگ ہے بھی یا نہیں، محض یورپ کی تقلید میں ہفتہ وار اخبار اور ماہوار رسالے جاری کر دئے، چنانچہ ”اشتراک“ کے نام سے بھی ایک اشتراکی ہفتہ وار اخبار جاری کیا گیا، حالانکہ ترکوں کو اشتراکی خیالات سے کوئی دلچسپی نہ تھی اور نہ اس وقت ترکی میں اس اخبار کی مانگ تھی، ہر جماعت اپنا خاص اخبار نکالنا چاہتی تھی، تقریباً ایک ہی وقت میں معماروں، کیمیا سازوں، مویشی کے ڈاکٹروں، طبیبوں، وکیلوں، ایکٹروں، کاریگروں، سرکاری عہدہ داروں، سابق سیاسی جلاوطنوں، سول سروس اسکول اور یونیورسٹی کے طالب علموں کی جماعتوں سے علاحدہ علاحدہ ہفتہ وار یا ماہوار رسالے جاری ہو گئے (۱)، ان میں سے اکثر جلد ہی بند بھی ہو گئے، کچھ تو اخبار نکالنے والوں کی ناقص کاروباری وجہ سے اور کچھ اس وجہ سے کہ اخبارات نے اپنے لب و لہجہ میں ایسی شدت اور بے باکی اختیار کر لی تھی کہ دستوری حکومت کو بھی ان کی روک تھام کے لیے از سر نو پابندیاں عاید کرنا پڑیں۔

رسم الخط کا مسئلہ: نوجوان ترکوں نے اپنے مختصر عہد حکومت میں تعلیم کی اصلاح و ترقی میں جو سرگرمی دکھائی اس کا ذکر ہو چکا ہے، اس دور میں ”ادبیات جدیدہ“ کے حلقہ کا رجحان یہ تھا کہ ترکی کو بالکل مغربی تمدن کے رنگ میں رنگ دیا جائے، چنانچہ عربی فارسی اور علوم مشرقیہ کی بجائے مغربی زبانوں اور مغربی علوم و فنون کی تحصیل پر زور دیا جانے لگا، اعلیٰ طبقہ کے لوگوں نے فرانسیسی تہذیب اختیار کر لی، یورپ سے تمدنی تعلقات تیزی کے ساتھ بڑھنے لگے، اسی سلسلہ میں حسین عابد نے جو توفیق فکرت کے حلقہ کا اخبار نویس اور انشا پرداز تھا لاطینی رسم الخط اختیار کرنے کی تحریک شروع کی اور اس مسئلہ پر اخباروں میں

بحث ہونے لگی، اس تجویز کی مخالفت عوام کے علاوہ بعض اہم تعلیم یافتہ جماعتوں نے بھی کی، اتحاد اسلامی کے حامی اس بنا پر مخالف تھے کہ اس سے ترکوں کا تعلق دنیا کے اسلام سے منقطع ہو جائے گا، اتحاد تورانی کے حامی یہ کہتے تھے کہ ایسا کرنے سے دوسرے ملکوں کے ترکوں سے بھی جو ترکی زبان بولتے ہیں اور عربی حروف میں لکھتے ہیں اور جن کا تمدن کم و بیش ہمارا ہی جیسا ہے تمدنی اتحاد باقی نہ رہ سکے گا، قوم پرور جماعت کی مخالفت کی وجہ یہ تھی کہ قدیم عثمانی علوم و فنون کا کل سرمایہ عربی اور فارسی زبان میں ہے جسے ترک نہیں کیا جاسکتا، وہ عربی رسم الخط میں بعض تبدیلیوں اور اصلاحات کو مناسب سمجھتے تھے مگر اسے بالکل چھوڑ کر لاطینی رسم الخط اختیار کرنے کے سخت مخالف تھے۔

تحریک اتحاد عثمانی: نوجوان ترکوں کی سرگرمیوں کے تین خاص رخ تھے: اتحاد عثمانی، اتحاد اسلامی اور اتحاد تورانی، انیسویں صدی میں قومیت کا جو سیلاب یورپ سے چلا تھا وہ نہایت سرعت کے ساتھ بڑھتا ہوا سلطنت عثمانیہ کے حدود میں بھی داخل ہو گیا تھا اور مختلف عیسائی قوموں نے حکومت خود اختیاری کے مطالبات شروع کر دیے تھے، مغربی سلطنتیں ان کی حمایت کے لیے کھڑی ہو گئیں، سب سے پہلے یونان نے بغاوت کا اعلان کیا، اس کے بعد دوسرے عیسائی صوبے دول عظمیٰ کی مدد سے یکے بعد دیگرے آزاد ہوتے گئے، یہ صورت حال بہت کچھ نظام حکومت کی ابتری کا نتیجہ تھی، چنانچہ نوجوان ترکوں نے مدحت پاشا کی سرکردگی میں اسی کی اصلاح کی کوشش شروع کی اور سلطان کے استبداد اور مطلقیت کو دور کر کے جو دراصل تمام خرابیوں کی جڑ تھی دستوری حکومت قائم کرنی چاہی، قومیت کی تحریک سے وہ بھی متاثر تھے مگر انھوں نے اپنا نصب العین عثمانی قومیت کو بنایا یعنی وہ سلطنت عثمانیہ کے تمام باشندوں کو خواہ وہ کسی نسل یا مذہب سے تعلق رکھتے ہوں اس قومیت کے رشتہ میں منسلک کر دینا چاہتے تھے اور پیش نظر دستوری حکومت میں سب کو مساوی حقوق دینا چاہتے تھے، تیس چالیس سال کی جدوجہد کے بعد ۱۹۰۸ء کے انقلاب نے بالآخر استبداد کو ختم کر کے ملک میں دستوری حکومت قائم کر دی

اور سلطنت کے تمام باشندوں نے بے انتہا جوش مسرت کے ساتھ اس کا استقبال کیا، اس انقلاب میں ترکوں کے علاوہ سلطنت کی تمام دوسری قوموں نے بھی حصہ لیا تھا اور اس کی کامیابی ان سب کی متحدہ کوششوں کا نتیجہ تھی، نو جوان ترک سمجھتے تھے کہ عثمانی قومیت کا یہ مضبوط حصار سلطنت کی بقا اور سالمیت کا ضامن ہوگا مگر چند ہی دنوں کے بعد جو سیاسی واقعات رونما ہوئے ان سے صاف ظاہر ہو گیا کہ یہ خیال خواب سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا، جنگ بلقان کی ضرب نے انھیں اس خواب سے ہمیشہ کے لیے بیدار کر دیا۔

تحریک اتحاد اسلامی: لیکن اس جنگ سے اتحاد اسلامی کی تحریک کو مدد پہنچی اور ترکوں کے ساتھ جو چھ سو برس سے یورپ میں اسلام کی شمع کو روشن کیے ہوئے تھے اور اسے بجھانے کے لیے مسیحی طاقتیں اب آخری کوشش کر رہی تھیں، تمام دنیا کے مسلمانوں کو ہمدردی ہو گئی، بالخصوص ہندوستان کے مسلمانوں نے ان مجاہدین ملت کی بڑی مدد کی اور نقد کے علاوہ ضروریات زندگی کی دیگر اشیا بکثرت روانہ کیں، وہ خود ترکی فوج میں شریک تو نہ ہو سکے مگر ان کے طبی مشن نے ڈاکٹر انصاری مرحوم کی قیامت میں ترکی جا کر غازیوں کی خدمت کا کوئی دقیقہ اٹھانہ رکھا۔

اتحاد اسلامی کی تحریک حقیقتاً انیسویں صدی کے وسط سے شروع ہوئی تھی، اس کے بانی سید جمال الدین افغانی تھے، وہ پہلے مسلمان تھے جنہوں نے مغربی تسلط اور غلبہ کو پوری طرح محسوس کیا اور دنیاے اسلام کو اس خطرہ سے آگاہ کر کے دفاع و تحفظ کی تدبیریں اختیار کرنا اپنی زندگی کا مقصد قرار دیا، اسٹاڈرڈ (Stoddard) نے اپنی مشہور و معروف کتاب ”جدید دنیاے اسلام“ میں سید موصوف کے جو خیالات نقل کیے ہیں ان کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

عیسائی دنیا نسل و قومیت کے اندرونی اختلافات کے باوجود مشرق اور خصوصاً اسلام کے مقابلہ میں متحد ہے اور تمام اسلامی حکومتوں کو برباد کر دینا چاہتی ہے، صلیبی لڑائیاں اب بھی جاری ہیں اور پیٹر راہب (Peter the Hermit) کی روح آج بھی

کارفرما ہے، عیسائی دنیا اب بھی اسلام کے متعلق متعصبانہ نفرت اور حقارت کے جذبات اپنے دل میں رکھتی ہے، اس کا اظہار مختلف طریقوں سے ہوتا ہے، مثلاً بین الاقوامی قوانین میں مسلمان قومیں عیسائی قوموں کے برابر نہیں سمجھی جاتیں اور نہ ان کے ساتھ مساویانہ برتاؤ کیا جاتا، اسلامی حکومتوں پر جرحے کیے جاتے ہیں اور ان کی جو ذلتیں ہوتی ہیں ان کا عذر عیسائی حکومتیں یہ پیش کر دیتی ہیں کہ اسلامی حکومتیں ابھی پستی اور جہالت کی حالت میں ہیں لیکن یہی عیسائی حکومتیں اسلامی ممالک کی ہر اصلاحی کوشش کو ہزاروں طریقوں سے روکتی ہیں، یہاں تک کہ اس کے لیے جنگ بھی چھیڑ دیتی ہیں، اسلام سے نفرت کا جذبہ تمام عیسائی قوموں میں موجود ہے اور اس جذبہ کا اثر یہ ہے کہ اسلام کی تباہی کے لیے سب کوشاں ہیں، عیسائی دنیا مسلمانوں کے ہر جذبہ اور حوصلہ کا مضحکہ اڑاتی ہے اور انھیں بہتان و افواہ کا نشانہ بناتی ہے، اہل یورپ جس چیز کو اپنے ہاں قوم پروری اور وطن دوستی سے تعبیر کرتے ہیں، اسی کو مشرق میں تعصب کا نام دیتے ہیں اور جسے مغرب میں خودداری، آن بان اور قومی عزت کہتے ہیں اسے مشرق میں جنگ جو یا نہ وطن پرستی سے موسوم کرتے ہیں، یہ تمام باتیں اسلامی دنیا کے لیے ایک زبردست مدافعتیہ اتحاد کی ضرورت کو واضح کرتی ہیں اور اگر اپنے کو تباہی سے بچانا ہے تو یہ بھی ضروری ہے کہ مغربی ترقی کے طریقہ کار سیکھے اور یورپ کے طریق کار کے اسرار معلوم کیے جائیں۔ (۱)

سید جمال الدین کا مقصد یہ تھا کہ تمام دنیا کے مسلمان ایک مرکز پر متحد ہو جائیں ان کو اس سے زیادہ بحث نہ تھی کہ یہ مرکز ترکی میں ہو یا اسلامی دنیا کے کسی اور حصہ میں، لیکن چونکہ ترکی ہی سب سے بڑی اسلامی سلطنت تھی اور مرکز خلافت بھی صدیوں سے وہیں تھا اسی لیے اسی کو تحریک اتحاد اسلامی کا مرکز بنانا مناسب معلوم ہوا، دولی یورپ کے حملوں سے سلطنت کے بقیہ حصوں کو محفوظ رکھنے کے لیے سلطان عبدالحمید خاں

(۱) 'جدید دنیا' اسلام از اسٹاڈرڈ، مطبوعہ لندن ۱۹۲۲ء، ص ۵۳-۵۴ (The new world of)

نے بھی اس تحریک کو خاص اہمیت دی اور دوسرے اسلامی ممالک میں اسے پھیلانے کی غرض سے سید جمال الدین کو اپنا حامی بنانا چاہا، چنانچہ ان کے پیہم اصرار پر سید مصوف ۱۸۹۲ء میں قسطنطنیہ آئے اور سلطان نے اس تحریک کا سرشتہ ان کے ہاتھ میں دے دیا، قاضی عبدالغفار صاحب اپنی گراں قدر تالیف ”آثار جمال الدین افغانی“ میں لکھتے ہیں ”شیخ خوب جانتے تھے کہ عبدالحمید نے خلافت کی تحریک کو

اپنی بساط کا ایک مہرہ بنایا ہے اور عبدالحمید کے خیالات اور ارادوں سے نا آشنا نہ تھے، لیکن جس طرح عبدالحمید ان کی ذات سے اپنے مقاصد پورے کرنا چاہتے تھے، اسی طرح شیخ عبدالحمید کے نام اور وقار سے تحریک اتحاد اسلام کو تقویت پہنچانے کی فکر میں تھے۔“ (۱)

بہر حال اتحاد اسلامی کے سفر قسطنطنیہ سے روس، وسط ایشیا، افغانستان، ہندوستان، جاوا، چین اور افریقہ روانہ کیے گئے، دول عظمیٰ میں جو سلطان عبدالحمید خاں کی سیاست کا تجربہ رکھتی تھیں، خصوصاً برطانیہ، روس اور فرانس میں جس کے فیوض و برکات سے کروڑوں مسلمان مستفید ہو رہے تھے، اس تحریک نے خاصی بے چینی پیدا کر دی، لیکن چند ہی سالوں کے بعد سید جمال الدین کا جو اس تحریک کے روح رواں تھے انتقال ہو گیا اور محض سلطان کا اقتدار اتحاد اسلامی کے لیے ایک جسم بے جان سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا تھا۔

دستوری حکومت کے قائم ہونے کے بعد انجمن اتحاد و ترقی کے ارکان نے ۱۹۱۱ء میں ایک کانگریس سالونیکا میں منعقد کی اور اس میں طے کیا گیا کہ تمام ممالک اسلامیہ کے مندوبین ہر سال قسطنطنیہ میں مجتمع ہو کر ان مسائل پر بحث کریں جن کا تعلق تمام مسلمانوں سے ہے، اتحاد اسلامی کے سفر پھر ان سب ملکوں میں بھیجے گئے جہاں کے مسلمان یورپین حکومتوں کے ماتحت تھے، نیز ان ملکوں میں جہاں مسلمان مغربی تسلط

سے ابھی آزاد تھے، سنی اور شیعہ کے اختلافات کو دور کرنے کی بھی کوشش کی گئی، چنانچہ ۱۹۱۱ء میں متعدد عثمانی اور ایرانی علما نجف میں جمع ہوئے اور اپنے دستخط سے اس مضمون کا ایک بیان شائع کیا کہ دونوں فرقوں میں کوئی اختلاف نہیں اور دونوں سلطنتوں کے باہمی تعاون اور اشتراک عمل پر زور دیا، اس کے بعد ہی ستمبر ۱۹۱۱ء میں جنگ طرابلس اور اکتوبر ۱۹۱۲ء میں جنگ بلقان شروع ہو گئی، ترکی جو خلافت اور تحریک اتحاد اسلامی کا مرکز تھی اب تمام دنیا سے اسلام کی ہمدردی کا مرکز بن گئی، پورا اسلامی پریس اتحاد اسلامی کی ضرورت اور اہمیت کے اعلان میں متفق اللفظ تھا۔

لیکن جس طرح جنگ بلقان سے اتحاد اسلامی خواب پریشان ہو گیا، اسی طرح جنگ عظیم نے اتحاد اسلامی کے تخیل کو درہم برہم کر ڈالا، انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کا مقالہ نگار کس قدر اطمینان قلب کے ساتھ لکھتا ہے:

”۱۹۱۴ء میں جنگ عظیم کے چھڑ جانے سے اتحاد اسلامی کی کمزوری ظاہر ہو گئی اور قوم پروری کے جذبہ کے زیادہ قوی اثر نے اتحاد اسلامی کے تخیل کو پس پشت ڈال دیا، دول یورپ جن کے مقابلہ میں یہ تحریک جاری کی گئی تھی یعنی انگلستان، فرانس، روس اور بعد میں اطالیہ، ان کو دوران جنگ میں اپنی مسلمان رعایا کی طرف سے وفاداری اور محبت کے بڑے بڑے ثبوت ملے۔“ (۱)

لیکن جس خنجر نے اتحاد اسلامی کی تحریک کا خاتمہ کیا وہ پیر حرم کا خنجر تھا، عربوں کی بغاوت برطانوی سیاست کا وہ شاہکار ہے جو تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا، اس کے بعد ہندوستان کے مسلمانوں سے ترک کیوں کر شکایت کر سکتے تھے، ان کی ”وفاداری“ اور ”محبت“ کا تقاضا ہی یہ تھا کہ آقا کی خوشنودی کے لیے ایمان کو بھی قربان کر دیں اور جن بھائیوں کی خدمت کرنا دو سال قبل دین و دنیا کی سعادت خیال کرتے تھے، انہی کے

سینوں کو انگریزی گولیوں سے چھنی کر دیں۔

ترکی میں 'اتحاد اسلامی' کی تحریک سیاسی حیثیت کے علاوہ تمدنی حیثیت بھی رکھتی تھی، اس کا نصب العین یہ تھا کہ ابتدائی عہد اسلام کی خالص اسلامی زندگی اختیار کی جائے اور مغربی تہذیب و معاشرت سے اجتناب کیا جائے، اس تحریک کا سب سے بڑا حامی محمد ع کف شاعر تھا، اس حقہ سے ایک ہفتہ دار اخبار 'سبیل الرشاد' نکلتا تھا جس میں ان خیالات کی اشاعت کی جاتی تھی، انجمن اتحاد و ترقی کے ارکان کے حلقہ والوں کو ان کی قدامت پرستی کی وجہ سے شبہہ کی نظر سے دیکھتے تھے، انھوں نے اس رسالہ کے جواب میں حکومت کی طرف سے 'اسلامک ریویو' نکالا جس کا مدیر انجمن کا ممتاز رکن اور ترکی کا مشہور فاضل قوق الپ ضیا تھا، 'اسلامک ریویو' کے مقصد سے متعلق خالدہ خانم لکھتی ہیں۔

”یہ رسالہ بڑی اہمیت رکھتا ہے، اس لیے کہ اس کے ذریعہ

سے ایک حد تک یہ کوشش کی گئی کہ اسلام کی موجودہ حالت میں اصلاح

ہو، خصوصاً مذہب کو علم اور معاشرت سے جو تعلق ہے اس کا تنقیدی

مطالعہ کیا جائے، اس میں قرآن کا ترکی ترجمہ بھی شائع ہوا کرتا تھا،

خود قوق الپ ضیا اسے نہایت ضروری سمجھتا تھا کہ اسلام پر تنقیدی نظر

ڈالی جائے اور اس کی حقیقی روح کو پیش نظر رکھ کر مکمل اصلاح و تجدید عمل

میں لائی جائے۔“ (۱)

اسلام پر ”تنقیدی نظر“ ڈالنے اور اس کی ”حقیقی روح کو پیش نظر رکھ کر مکمل

اصلاح و تجدید“ عمل میں لانے کا اگر یہی نتیجہ ہے جو ترکی جمہوریہ میں دیکھا جا رہا ہے

تو شاید ”تنقیدی نظر“، ”حقیقی روح“ اور ”مکمل اصلاح“ ہر ایک کا مفہوم بدل دینا پڑے گا۔

تحریک اتحاد تورانی: اتحاد تورانی کی تحریک ترکی میں دستوری انقلاب کے بعد قوق

الپ ضیا کی سرکردگی میں تمدنی حیثیت سے شروع ہوئی، چنانچہ ۲۸ دسمبر ۱۹۰۸ء کو

انجمن ”تورک دریہ“ قائم کی گئی، جس کا مقصد یہ تھا کہ ترکی قوموں کے ماضی اور حال کا مطالعہ کیا جائے اور ترکی زبان کو آسان اور ایک علمی زبان بنایا جائے (۱)، جہاں تک زبان کا تعلق تھا اس کے علمبرداروں نے نہایت سرگرمی سے کام شروع کر دیا اور غیر زبانوں کے تمام الفاظ خارج کیے جانے لگے، الپ ضیا نے جو ایک نہایت ممتاز شاعر بھی تھا، اپنی نظموں میں قدیم ترکی الفاظ جو عہد عثمانی سے پہلے وسط ایشیا کے ترکی قبیلوں میں بولے جاتے تھے اور جن کو اس کے ہم عصر ترک بالکل نہیں سمجھتے تھے، کثرت سے بھر دئے، اس سے زبان بجائے آسان ہونے کے حد درجہ مشکل ہو گئی، لیکن آخر الپ ضیا اور اس کے پیروں کو یہ روش ترک کر دینی پڑی اور رفتہ رفتہ اعتدال پیدا ہو گیا۔

اتحاد تورانی کی تحریک حقیقتاً ایک نہایت وسیع تحریک تھی، یہ صرف چند ترک مجاہد وطن تک محدود نہ تھی بلکہ اس کے علمبرداروں میں دوسرے ملکوں کے ترک و تاتار بھی شامل تھے، اس کا سب سے بڑا لیڈر احمد بے آغائف تھا، جو والگا کا تاتاری اور ایک نہایت قابل اخبار نویس تھا، اس کا اخبار ”تورک یوردو“ ترکی تاتاری دنیا کے ہر گوشہ میں پہنچتا تھا اور اسے عامہ کی تشکیل میں بڑا اثر رکھتا تھا (۲)، اشارڈ لکھتا ہے کہ احمد بے آغائف جیسے لیڈروں کے پیش نظر پوری تورانی دنیا تھی جو فن لینڈ سے منچوریا تک پھیلی ہوئی تھی۔

لیکن ابتداءً ان کی عملی کوششیں ترکی تاتاری ٹکڑے تک محدود تھیں یعنی ترکی کے عثمانی، روس کے تاتار اور وسط ایشیا اور ایران کے ترکمان، چونکہ یہ تمام قومیں مسلمان تھیں اس لیے اس تحریک میں نسلی اور مذہبی دونوں رنگ شامل ہو گئے تھے، انجمن اتحاد و ترقی کے اکثر لیڈر جو تحریک اتحاد اسلامی کے علمبردار تھے ”اتحاد تورانی“ کے بھی حامی تھے، وہ دونوں تحریکوں کو ساتھ چلانا چاہتے تھے۔

جنگ بلقان کے بعد اس تحریک کی نسلی حیثیت زیادہ نمایاں ہوئی، نہ صرف یہ کہ ترکوں نے بلقان سے نکل کر اب اپنے قدیم وطن کی طرف نظر ڈالنی شروع کی بلکہ جیسا

(۱) کوپرلوزادہ محمد فواد، انسائیکلو پیڈیا آف اسلام ص ۹۵۷ (۲) جدید دنیا، اسلام ص ۱۶۵

کہ اتنا رڈ نے لکھا ہے اہل ہنگری اور اہل بلغاریا کے دلوں میں فاتح سرویوں کے خلاف نفرت کا اتنا شدید جذبہ پیدا ہوا کہ ان دونوں قوموں نے اپنے تورانی الاصل ہونے کا اعلان کر دیا اور سرویا اور روس کے سلاونی اتحاد کے مقابلہ میں یہ تورانی اتحاد کے تخیل سے دل بہلانے لگے تھے۔ (۱)

توق الپ ضیا نے ترکوں کے ملک و ملت کی یہ تعریف کی تھی ”ہمارا وطن نہ ترکی ہے نہ ترکستان وہ ایک فضا ہے روحانی ہے یعنی توران“ (۲)، تورانی تہذیب کا یہ دلفریب تخیل یورپ کے دو مستشرقین ویمری (Yambery) اور کاہون (Cahun) کا پیدا کیا ہوا تھا، نامق کمال اور عبدالحق حامد اپنی شدید قوم پروری کے باوجود ”دارالاسلام“ یعنی اسلامی ترکی ہی کو اپنا وطن سمجھتے رہے، لیکن ”اتحاد تورانی“ کے حلقہ والوں نے اپنی قبل اسلام کی تاریخ پر فخر کرنا شروع کیا، وہ عثمانی عہد کی تہذیب کے سخت مخالف تھے اور اپنے رسالوں میں اس عہد کے عقاید اور خیالات پر آزادی کے ساتھ تنقیدیں کرتے تھے۔

جنگ عظیم کے بعد ترکوں نے اتحاد تورانی کی وسعت کو جو توران کی ”فضا ہے روحانی“ میں پھیلی ہوئی تھی بہت کچھ محدود کر دیا اور وہی قومیں اس دائرہ میں داخل کی گئیں جو ترکی زبان بولتی ہیں، اب اس تحریک میں نسلی تصور کے بجائے لسانی اور قومی تصور کا رفرما ہے اور یہ بھی یورپ کی موجودہ قومی تحریکوں کے نقش قدم پر چل رہی ہے۔

عثمانی ترک

(۲)

معاشرت، اخلاق و عادات

عثمانی ترکوں کی ابتدائی معاشرت نہایت سادہ تھی، آزادی، مساوات اور سادگی اس کی خاص خصوصیات تھیں جو شاہی محل سے لے کر غریبوں کے چھوٹے گھروں تک ہر جگہ نظر آتی تھیں، چودہویں صدی کا عرب سیاح ابن بطوطہ سلطان سے ملنے کی غرض سے بروصہ گیا تھا، سلطان کہیں باہر گیا ہوا تھا مگر سلطانہ نے اس سے ملاقات کی اور ملکی معاملات پر اس سے گفتگو کرتی رہی، ابن بطوطہ نے دیکھا کہ ترکی عورتیں آزادی کے ساتھ سڑکوں پر چلتی پھرتی اور خرید و فروخت کرتی ہیں (۱)، مگر جوں جوں فتوحات کا اثر وسیع ہوتا گیا اور مختلف قومیں حدود سلطنت میں شامل ہوتی گئیں ترکوں کے تمدن و معاشرت میں بھی تبدیلیاں نظر آنے لگیں، مفتوحہ قوموں نے اپنا اثر ڈالنا شروع کیا، خالدہ خاتم لکھتی ہیں:

”استنبول کے فتح ہونے کے بعد ترکی سوسائٹی صاف طور پر دوطبقوں میں تقسیم ہو گئی، سلطان اور ارکان سلطنت نے باطنی طریقے اختیار کیے مثلاً پردہ، عورتوں کے لیے علاحدہ مکان، خواہسر، نہ صرف تعداد و اوج بلکہ دشتہ رکھنے کی قیج رسم بھی رائج ہو گئی، اب تک سلطان

(۱) ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش ص ۴۳۶

غیر ملکی شہزادیوں سے شادی کیا کرتے تھے اب وہ صرف لونڈیوں سے کرنے لگے، ان کے ہاں کی عورتیں صرف ان کے عیش و آرام کے لیے تھیں، سوسائٹی سے انھیں کوئی تعلق نہ تھا۔

مگر متوسط طبقے اور ادنیٰ طبقے میں بعض پرانی رسمیں اب تک باقی تھیں، ان کی عورتیں نقاب ڈال کر بے تکلف باہر آتی جاتی تھیں، البتہ انھیں بجز خاص صورتوں کے خاندان کے باہر کے لوگوں سے ملنے کی ممانعت ہو گئی، ان طبقوں کے لوگ لونڈیاں رکھتے تھے مگر دستہ رکھنے کی یا تعداد ازدواج کی مثالیں بہت کم پائی جاتی تھیں، اگر متوسط درجہ کی کسی ترکی عورت کا شوہر دوسری شادی کر لے تو وہ اس کی زندگی دشوار کر دیتی تھی، کبھی کبھی تو ایسا ہوتا تھا کہ دونوں بیویاں مل کر اس کی خبر لیتی تھیں، یہ چیزیں بہت تکلیف دہ تھیں اور ان کا اثر بچوں پر بہت برا پڑتا تھا۔

البتہ ماؤں کے حقوق ان سب تغیرات کے باوجود قائم رہے، ماں کی محبت اور عزت دنیا میں عام ہے، مگر ترکوں میں یہ جذبہ بہت ہی گہرا ہوتا ہے، اس کی وجہ سے اکثر بہوؤں کے لیے بڑی مشکل ہوتی تھی کہ بڑی بی کے انتقال سے پہلے ان کی استبدادی حکومت سے

نجات پانا ناممکن تھا۔“ (۱)

معاشرت کی سادگی: ارکان سلطنت کے علاوہ جنھوں نے بازنطینی تکلفات اختیار کر لیے تھے، عام طور پر ترکوں میں معاشرت کی سادگی کئی سو برس تک قائم رہی، شہنشاہ آسٹریا کا سفیر بسک (Busbecq) جو سلیمان اعظم کے دربار میں ۱۵۵۴ء سے ۱۵۶۲ء تک تھا، اپنے خطوط میں ترکوں کے بعض چشم دید حالات بیان کرتا ہے، چنانچہ ان کے مکانات کی سادگی کے متعلق وہ لکھتا ہے:

(۱) ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش ص ۳۸-۲۳۷

”ترکوں کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اپنی عورتوں میں وہ شان و شوکت سے پرہیز کرتے ہیں، باتوں پر توجہ کرنا ان کے خیال میں غرور اور خود بینی کی علامت ہے، گویا انسان دنیا میں ہمیشہ رہنے کی توقع کرتا ہے، وہ اپنے مکانوں کو ویسا ہی سمجھتے ہیں جیسا کہ ایک مسافر سرے کو سمجھتا ہے، اگر وہ چوروں سے محفوظ ہوں اور گرمی، سردی اور بارش سے بچ رہیں تو انھیں زیادہ تکلفات کی ضرورت نہیں، یہی وجہ ہے کہ پوری ترکی میں تم کو کوئی دولت مند آدمی بھی مشکل سے ایسا ملے گا جس کا مکان عالی شان ہو، عوام جھونپڑوں میں رہتے ہیں، امرا باغوں اور حماموں کے شائق ہیں اور ان کے مکانات وسیع ہوتے ہیں، جن میں انتظام خانہ داری کے لیے کافی گنجائش ہوتی ہے مگر ان مکانوں میں بھی خوب روشن پورٹیکو (برساتی) یا بال قائل دید نہیں ہوتے اور نہ ان میں کوئی ایسی چیز ہوتی ہے جو عالی شان یا جاذب نظر ہو۔“ (۱)

سلیمان اعظم کا عہد سلطنت عثمانیہ کے اوج کمال کا عہد تھا، اس زمانہ میں ترکوں کی یہ سادگی تعجب خیز ہے، مکانات کے علاوہ غذا کی سادگی کا بھی یہی حال تھا، بسبک لکھتا ہے:

”ترک کھانے پینے میں اتنے کفایت شعار ہیں اور انھیں مزید اچیزوں کا اس قدر کم شوق ہے کہ اگر روٹی، نمک اور لہسن یا پیاز مل جائے اور ایک قسم کا ترکش دودھ جسے وہ برغورت کہتے ہیں تو پھر ان کو اور کسی چیز کی ضرورت نہیں ہوتی، وہ اس دودھ کو بہت ٹھنڈے پانی میں ملا کر روٹی کے ٹکڑے اس میں ڈال دیتے ہیں اور بہت گرمی اور پیاس کی حالت میں اسے کھاتے ہیں، ہم نے بھی اکثر شدید گرمی میں اس

(۱) بسبک کے ترکی خطوط مطبوعہ لندن ص ۱۱ (Busbecqs Turkish letters)

سے بہت فائدہ محسوس کیا، یہ غذا نہ صرف خوش ذائقہ اور قابل ہضم ہوتی ہے بلکہ اس میں پیاس بجھانے کی بھی ایک غیر معمولی خاصیت ہوتی ہے، تمام کارواں سراؤں میں جو ترکی سرائیں ہیں جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں، ترش دودھ اور دوسری قسم کی مزیدار چیزیں کثرت سے فروخت ہوتی ہیں، کیونکہ ترک سفر کی حالت میں گرم کھانے اور گوشت کی ضرورت نہیں محسوس کرتے، ان کے ذائقہ کی چیزیں ترش دودھ، خشک آلو بخارا، شفتالو، سفرجل، انجیر، منقہ اور شاہ دانہ ہوتی ہیں، یہ سب چیزیں صاف پانی میں ابال کر مٹی کی بڑی بڑی کشتیوں میں رکھ دی جاتی ہیں، ہر شخص اپنی پسند کی چیز خریدتا ہے اور اس پھل کو روٹی کے ساتھ بطور چاٹ اور چٹنی کے کھا لیتا ہے اور کھانے کے بعد بچا ہوا عرق پی جاتا ہے، اس طرح ان کی غذا میں بہت کم صرف ہوتا ہے، اتنا کم کہ شاید ہمارے ملک میں ایک آدمی اپنے کھانے پر جتنا ایک روز میں خرچ کرے گا اس سے کم میں ایک ترک بارہ روز تک کھالے گا، ان کی پر تکلف دعوتوں میں بھی عموماً صرف کیک، میٹھ کچہ اور دوسری قسم کی مٹھ نیاں ہوتی ہیں اور ان کے علاوہ مختلف قسم کے چاول اور بھیر، بکری اور چوزے کا گوشت ہوتا ہے۔“ (۱)

ایک انگریز خاتون لوسی گارنٹ (Lucy m.j. Garnett) نے ترکوں کی شہری اور دیہاتی زندگی پر ایک نہایت دلچسپ کتاب لکھی ہے، وہ سلطان عبدالحمید خان ثانی کے عہد میں ترکی گئی تھی، اس نے ترکوں کی معاشرت کے جو حالات لکھے ہیں وہ ایک طویل قیام کے ذاتی مشاہدات پر مبنی ہیں، ترکی مکانوں کے متعلق اس کے بیان کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

(۱) بسک کے ترکی خطوط مطبوعہ لندن ص ۵۲-۵۳ (Busbecq Turkish letters)

عثمانیوں کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ مکانوں کے لیے فطرۃ خوبصورت مقامات پسند کرتے ہیں جہاں درختوں کا سایہ ہو، ٹھنڈے چشمے ہوں اور وسیع میدان ہوں، اس حسن ذوق کی بنا پر انھوں نے اپنے مکانات ایسی جگہوں پر بنوائے ہیں جو عظمت، شان اور خوبصورتی کے لحاظ سے بے مثل ہیں، ان سات پہاڑیوں کے علاوہ جن پر استنبول مثل رومہ کے آباد ہے، ترکوں نے باسفورس اور بحیرہ تکین کے بہت سے دلکش ساحلی مقامات پر مکان بنوا لیے ہیں، ہر نامی ان کی آبادی کوہ پیکس (Pagus) کے دامن میں واقع ہے اور بروصہ میں کوہ بٹھینیون الیمپس (Bithynioun Olympus) کے ڈھلوان بازوؤں پر، یہی وجہ ہے کہ ترکی آبادی کی سڑکیں اکثر ڈھلوان ہوتی ہیں اور حد درجہ ناموار بھی، عموماً ان پر پتھر نہیں ہوتے، خشک موسم میں ٹخنوں تک گرد جمی رہتی ہے اور بارش کے زمانہ میں پانی تیزی کے ساتھ بہتا رہتا ہے، لیکن وہ عیسائی اور یہودی حصہ آبادی سے زیادہ صاف ستھری ہوتی ہیں، جس کی ایک وجہ یہ ہے کہ کھنوں اور باغیچوں میں کوڑا کرٹ پھینکنے کے لیے زیادہ جگہ ہوتی ہے، کیوں کہ صوبہ کے شہروں کے ہر مکان میں خواہ وہ غریب سے غریب آدمی کا ہو، اگر باغچہ نہیں تو ایک صحن ضرور ہوتا ہے ورنہ اس میں شہتوت اور چنار وغیرہ کے درخت لگے ہوتے ہیں، ہر مکان دوسرے مکان سے بالکل الگ ہوتا ہے، چنانچہ زمین کا ایک بڑا قصبہ چھدری آبادی سے بھر جاتا ہے، ترک کاریگروں اور مزدور پیشہ جماعت کے مکانوں اور اسی پیشہ کے دوسری قوم والوں کے مکانوں میں عموماً یہ فرق ہوتا ہے کہ اول الذکر کے مکانات میں سڑک کی طرف کی کھڑکیوں میں جھلملیاں لگی ہوتی ہیں، متوسط طبقہ کے مکانات زیادہ وسیع ہوتے ہیں، ان کے تین طرف صحن اور چمن ہوتا ہے اور سڑک کی طرف دو منزلہ حصہ دو فٹ آگے نکلا رہتا ہے، دیواریں عموماً گہرے سرخ رنگ کی ہوتی ہیں، چمن میں اونچے اونچے سرو اور شہتوت کے درخت ہوتے ہیں اور چمن میں مختلف قسم کے پھل کے درختوں کے علاوہ طرح طرح کے پھول اور ترکاریاں ہوتی ہیں، متوسط طبقہ کے مکانوں میں نیچے کے دو کمرے جو سلا ملق یا

مردانہ حصہ سے تعلق رکھتے ہیں، صاحب خانہ کے لیے ہوتے ہیں، جہاں وہ لوگوں سے ملاقات کرتا ہے، مردانہ کے باقی حصہ میں دفتر اور بادورچی خانہ وغیرہ ہوتا ہے، اوپر کا حصہ مستورات کے لیے مخصوص ہوتا ہے اور اس میں کوئی مرد نہیں جاسکتا، متول آدمیوں کے مکانات جو قوتق کہے جاتے ہیں، شہر اور دیہات دونوں جگہ عموماً جداگانہ قطععات پر مشتمل ہوتے ہیں، مردانہ حصہ کو سلا ملق اور زنانہ کو حرم لقی یا حرم کہتے ہیں، دونوں کے درمیان ایک غلام گردش ہوتی ہے جسے مابین کہتے ہیں، باسفورس کے ساحل پر بعض قدیم قوتق بالکل لکڑی کے بنے ہوئے ہیں۔ (۱)

ترکوں کی معاشرت اور مکانات کی وضع اور ترتیب کی نسبت مولانا شبلی مرحوم اپنے سفرنامہ میں لکھتے ہیں:

”ترکوں کی معاشرت کا طریقہ نہایت پسندیدہ اور قابل تہقید ہے، امر اور معزز عہدے دار ایک طرف معمولی حیثیت کا آدمی بھی جس صفائی اور خوش سلیقگی سے بسر کرتا ہے، ہمارے ملک میں بڑے بڑے امیروں کو وہ بات نصیب نہیں، میں نے دس ہزار کے تنخواہ سے لے کر بیس روپیہ کی آمدنی والوں تک کے مکانات دیکھے ہیں، اگرچہ دونوں حالتوں میں نہایت تفاوت تھا اور ہونا چاہیے تھا، تاہم خوش سلیقگی اور ترتیب و صفائی میں برابر تھے۔

ڈرائنگ روم کا قدیم طریقہ یہ تھا اور متوسط حیثیت والوں میں اب بھی جاری ہے کہ دیوار سے متصل قریباً دو ہاتھ چوڑے اور دیوار کے طول کے برابر لمبے چبوترے بنے ہوتے ہیں اور ان پر گدا بچھا ہوتا ہے، اب اگرچہ میز و کرسی کا زیادہ رواج ہے، تاہم چونکہ معزز

(۱) شہر اور دیہات کی زندگی، از لوسی گارنٹ مطبوعہ لندن ۱۶-۱۷ (Turkish life in town)

ترکوں کے ہاں علما اور درویشوں کی اکثر آمد و رفت رہتی ہے، ایک آدھ کمرہ اس طریقہ پر بھی ضرور مرتب رہتا ہے، میں نے عثمان پاشا اور درویش پاشا کے عالی شان مکانوں میں بھی اس وضع کے متعدد کمرے دیکھے، زمانہ حال میں یورپین طریقہ زیادہ مروج ہے، ترکوں نے اس میں اپنی طرف سے کچھ اصلاحیں کر لی ہیں اور وہ درحقیقت قابل تعریف اصلاحیں ہیں، ڈرائنگ روم میں جو اکثر عمدہ ٹرکش قالین سے آراستہ ہوتا ہے، اس سرے سے اس سرے تک سڑک کے طور پر کارپٹ وغیرہ کی باتھ باتھ بھر چوڑی پٹیاں پکھی ہوتی ہیں، کمرے میں جو لوگ آتے جاتے ہیں اسی پر سے گذرتے ہیں، ادھر ادھر پاؤں نہیں رکھ سکتے، ترکوں کا بوٹ اگرچہ خاک آلودہ نہیں ہوتا لیکن اس طریقہ سے فرش اور بھی صاف و پاک رہتا ہے۔“

فتح قسطنطنیہ کے بعد اگرچہ ترکوں کی معاشرت میں بہت سے تکلفات داخل ہو گئے تھے، تاہم ان کی فطری سادگی ہر زمانہ میں نمایاں رہی، مولانا فرماتے ہیں:

”ترکوں کی معاشرت میں مجھ کو جو چیز سب سے زیادہ پسند ہے وہ یہ ہے کہ باوجود نفست پسندی اور عالی دماغی کے فضول شان و شوکت کا نام نہیں، بڑے بڑے وزرا و امرا بازار میں نکلتے ہیں تو معمولی حیثیت سے نکلتے ہیں، میں نے بارہا وزیر اعظم کی سواری دیکھی ہے، صرف دو تین سوار ساتھ ہوتے ہیں، سپہ سالار کل علی رضا پاشا کے ساتھ پانچ سوار سے زیادہ نہیں ہوتے، مکانات اور تمام معاشرت کی چیزوں میں بھی سادگی پائی جاتی ہے، عثمان پاشا، درویش پاشا، زکی پاشا جس حیثیت اور رتبہ کے لوگ ہیں اس لحاظ سے ان کے مکانات کو کم از کم حیدرآباد کا فلک نما و ریشیر باغ ہونا چاہیے تھا، لیکن وہ ہمارے مولوی

مہدی علی صاحب کی کوٹھی کے برابر بھی نہیں، نوکر چاکر بھی کثرت سے نہیں ہوتے، جیسا ہمارے ہاں کے نوب اور فرضی شاہزادوں کے ہاں دستور ہے، حق یہ ہے کہ ترک اس بات پر جہاں تک فکر کریں بجا ہے کہ انھوں نے چھ سو برس تک سلطنت کے سایہ میں پل کر سپاہیانہ پن نہیں چھوڑا، ورنہ عباسی، فاطمی، اموی (اندلس والے) تیموری تو سو ہی دو سو برس میں اچھے خاصے رنگیل بن گئے تھے۔“ (۱)

حمام: ہر مکان کے ساتھ جو تھوڑی بہت حیثیت بھی رکھتا ہے، حمام کا ہونا ضروری ہے، نام حمام جن میں ہر طبقہ کے لوگ جاتے ہیں تمام بڑے بڑے شہروں اور خصوصاً قسطنطنیہ میں بہت کثرت سے بنے ہوئے ہیں، ان کی فیس نہایت معتدل ہوتی ہے، غریبوں کے لیے مسجدوں اور دوسری رفاہی عمارتوں میں حمام بنے ہوئے ہیں، جہاں وہ مفت غسل کر سکتے ہیں۔ جمہوریہ سے پہلے شہروں میں حمام لوگوں کے ملاقات کرنے کی خاص جگہ ہوتے تھے، عورتیں بھی زنانہ حماموں میں ایک دوسرے سے ملتی جلتی تھیں، مردوں کے حمام دن کے علاوہ شام کو بھی کھلے رہتے تھے، حمام کے ذکر میں لوسی گارنٹ لکھتی ہے:

”مسلمانوں کے نزدیک جسم کی صفائی کا درجہ یقیناً خدا پرستی

کے بعد ہی ہے، کیونکہ اس کی تاکید شرع شریف میں آئی ہے، جن امراض میں ان کے عیسائی اور یہودی ہمسایے مبتلا رہتے ہیں، ان میں سے اکثر سے ان کے نسبتاً محفوظ رہنے کا سبب غالباً یہ ہے کہ وہ باقاعدہ پابندی سے غسل کرتے ہیں اور شراب سے عادت پرہیز کرتے ہیں۔“ (۲)

ترکوں کی پرہیزگاری اور طہارت جسمانی کے متعلق سر ایڈوین پیرس (Sir Edwin Pears) جو اخبار ڈیلی نیوز کے نامہ نگار کی حیثیت سے مدتوں ترکی میں رہ چکا ہے اپنی کتاب ”ترکی اور اس کے باشندے“ میں لکھتا ہے:

اس کا دعویٰ بجا طور پر کیا جاسکتا ہے کہ اسلام نے ان طولیہ کے ترکوں کو ایک پرہیزگار قوم بنادیا ہے، میں اس کا ذکر شروع ہی میں اس کی اہمیت کی وجہ سے نہیں کرتا بلکہ اس وجہ سے کرتا ہوں کہ ان کا شراب سے پرہیز کرنا منجملہ ان خصوصیات کے ہے جو فوراً یورپین سیاحوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہیں، ترکی میں مسلمانوں کی بڑی اکثریت ہر قسم کی شراب سے کامل اجتناب کرتی ہے، اسلام نے انھیں جسمانی حیثیت سے بھی ایک صاف ستھری قوم بنادیا ہے، ان دنوں میں کم سے کم پانچ مرتبہ نماز پڑھنی پڑتی ہے، اور ہر نماز سے پہلے دونوں ہاتھ، چہرہ، کہنیوں تک بائیں اور پیر دھونا ضروری ہے، اس قاعدہ کی پابندی اتنی سختی سے کی جاتی ہے کہ اگر پانی میسر نہ آئے جیسے ریگستان میں تو اس وقت بجائے وضو کے تیمم کرنا پڑتا ہے، نماز کی جگہ کا خواہ گھر میں ہو یا مسجد میں پاک اور طہر ہونا ضروری ہے، بعض حالتوں میں نجاست سے پاک کرنے کے لیے پورے جسم کو دھونے کی تعلیم، کھانے سے پہلے ہاتھ دھونا، ہمیشہ اپنے گھروں اور جسموں کو صاف ستھرا رکھنا، ان چیزوں نے ان میں صفائی کی عادت پیدا کر دی ہے، اندرون ملک میں سفر کرتے ہوئے؟ اتنے یورپین اثرات مشکل سے داخل ہوئے ہیں، غریب سے غریب ترکی گھر کی غیر معمولی صفائی دیکھ کر حیرت ہوتی ہے، ان کی مثال کا کچھ اثر ان کے عیسائی ہم یوں پر بھی ہوا ہے، اگرچہ سیاح اکثر و بیشتر یہ دیکھتا ہے کہ عیسائی اپنے مکانات کے قریب غلاظت اور گندگی ڈال دیتے ہیں جسے کوئی ترک اپنے مکان کے قریب گوارا نہ کرے گا، جسمانی صفائی کے معاملہ میں بھی دونوں میں یہی فرق، ایک دیہاتی قبوہ خانہ میں جب ایک عیسائی کسان سے

یہ پوچھا گیا کہ سفر پر روانہ ہونے سے پہلے کیا وہ پسند نہیں کرتا کہ ہاتھ منھ دھو ڈالے تو اس نے جواب دیا کہ ”میں کوئی ترک ہوں کہ ہمیشہ اپنے کو دھوتا رہوں؟“، انجمن اتحاد و ترقی کے ایک ممتاز رکن نے دعوے کے ساتھ یہ کہا کہ میرے مذہب کی خاص خوبی یہ ہے کہ وہ لازمی طور پر مفید صحت ہے، اس کا دعویٰ مضبوط بنیاد پر قائم ہے، معمولی ترک کسان کی صحت بہتر ہوتی ہے، کیونکہ وہ صاف ستھرا رہتا ہے، شراب سے پرہیز کرتا ہے، کفایت شعاری سے زندگی بسر کرتا ہے اور زیادہ تر کھلی ہوا میں رہتا ہے۔“ (۱)

قبوہ خانے: حمام کے علاوہ قبوہ خانے بھی ترقی معاشرت کی ایک خاص چیز ہیں، کوئی شہر یا گاؤں ان سے خالی نہیں، شہروں میں ان کی وہی کثرت ہے جو ہمارے ملک میں پان کی دوکانوں کی، مگر پان کی دوکانیں لوگوں کے ملنے جلنے کی جگہیں نہیں ہوتیں، برخلاف اس کے قبوہ خانوں میں ترک ملاقات کی غرض سے بھی جاتے ہیں، وہاں خانگی معاملات سے لے کر ملکی اور غیر ملکی سیاست تک ہر قسم کی باتیں ہوتی ہیں، عوام کو تبادلۂ خیالات کا موقع قبوہ خانوں سے بہتر کہیں نہیں ملتا۔

جس طرح ہمارے یہاں خاطر تواضع کے لیے پان ایک ضروری چیز ہے، اسی طرح ترکوں کے یہاں قبوہ اور سگریٹ کا پیش کرنا آداب معاشرت کے لوازم میں داخل ہے، ہوسی گارنٹ لکھتی ہے کہ اگر آپ کسی دوکان پر کچھ خریدنے جائیں تو وہاں بھی دوکاندار نہایت اخلاق کے ساتھ آپ کے سامنے قبوہ کی پیلی ضرور پیش کرے گا، سوشل اور آفیشل ملاقاتوں کے علاوہ کاروباری معاملات پر گفتگو کرنے کے لیے بھی جب نوٹ ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو قبوہ اور سگریٹ کا پیش کیا جانا یقینی ہوتا ہے۔ (۲)

(۱) ترکی اور اس کے باشندے از سر ایڈوین پیرس مطبوعہ لندن ۱۹۱۲ء، ص ۳۲-۳۳ (Turkish)

(۲) لوسی گارنٹ ص ۳۹ (and its people by Sir Edwin peris)

شہری زندگی کی ایک خصوصیت: ترکوں کی معاشرت کے متعلق لوسی گارنٹ کا مندرجہ ذیل بیان دلچسپی سے خالی نہیں:

”ترکی شہری زندگی کی ایک اور قابل ذکر خصوصیت اس کی انتہائی سنجیدگی اور شائستگی ہے، مختلف قوموں کی آمیزش اور پولیس کے سپاہیوں کی کمی کے باوجود سڑکوں پر جھگڑے فساد یا ہنگامے شاذ و نادر ہوتے ہیں جو ہوتے بھی ہیں ان کے ذمہ دار عموماً یونانی، یہودی یا غیر ملکی ملاح ہیں، پیدل چلنے والے تنگ سڑکوں میں ایک دوسرے کے لیے نہایت خوش اخلاقی کے ساتھ راستہ خالی کر دیتے ہیں اور آپس میں سلام کرتے جاتے ہیں، حمل اپنی پیٹھ پر بھاری بوجھ لادے ہوئے یا گاڑی ہانکنے والا برابر وارد (ہنو بچو) کی صدا لگا تا رہتا ہے اور یہاں وہ اجڑ پن اور حشیانہ پن بہت کم ملتا ہے جو مغرب کے شہروں میں عام طور پر پایا جاتا ہے، البتہ امن عامہ کے حالات میں مختلف جگہوں کے لحاظ سے بہت کچھ اختلاف ہے، مثلاً سرنامیں جو ایشیا میں واقع ہے اور کسی حد تک قسطنطنیہ میں بھی غیر ملکی خواتین کا مل حفاظت کے ساتھ سڑک کے ایک طرف سے دوسری طرف جاسکتی ہیں یا باسفورس کے اسٹیروں پر سفر کر سکتی ہیں، لیکن سالونیکا میں جو یورپ میں واقع ہے، معمولی حالات میں بھی کوئی خاتون بغیر کسی شریف آدمی یا ملازم کو ساتھ لیے ہوئے باہر نکلنے کی جرأت نہیں کرتی، عداوہ فرینک محلہ کی ایک یا دو سڑکوں کے، وجہ یہ ہے کہ ایک طرف البانیوں اور مقدونیا کے دوسرے بے لگام باشندوں کا خطرہ رہتا ہے اور دوسری طرف بڑی بڑی سیٹگوں والے بھیمنوں اور بار برداری کے دوسرے جانوروں کی قطاروں کا جن کو یہودی ہانکتے ہیں اور جن پر بھاری اور بے ڈول بوجھ

لدے ہوتے ہیں، رات کے وقت امن عامہ کا تحفظ بیگی کے سپرد کر دیا جاتا ہے، جو ہمارے قدیم چوکیدار کا جواب ہے، وہ لائین ہاتھ میں لیے ہوئے آفتاب کے بعد سے صبح تک گشت کرتا رہتا ہے اور بدکاروں کو متنبہ کرنے کی غرض سے اپنے لوہے کی شام لگے ہوئے ڈنڈے سے تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد سڑک کی پٹری کو کھٹکھٹاتا جاتا ہے، نقب زنی کا جرم ترکی میں تقریباً نامعلوم ہے، کیوں کہ اس ملک میں اپنے طویل زمانہ قیام کے دوران میں اس قسم کے جرم کی ایک مثال بھی مجھے یاد نہیں آتی، بہر حال غروب آفتاب کے بعد جو شخص بھی باہر نکلے اس کے لیے ضروری ہے کہ ایک جلتی ہوئی لائین لے کے نکلے، اگر کوئی شخص راست بازی کی اس علامت کے بغیر باہر نکلے اور اس وقت پولیس کے گشتی سپاہی کا سامنا ہو جائے یا وہ پولیس کی چوکی کی طرف سے گذرے تو دشوار یوں میں گرفتار ہو جانے سے بمشکل بچ سکے گا۔ (۱)

ترکوں کی شایستگی کی شہادت مغرب کے دوسرے مستند اشخاص نے بھی دی ہے، لارینٹ جس نے ترکی کی تاریخ انیسویں صدی کے وسط میں شائع کی ہے اور جس کی کتاب کی بنیاد سر جیمس پورٹر (Sir James Porter) سفیر برطانیہ متعینہ باب عالی (۱۷۷۱ء لغایہ ۱۷۷۲ء) کے فراہم کردہ مواد پر ہے، لکھتا ہے:

ڈاکہ، نقب زنی، یہاں تک کہ چھوٹی چھوٹی اور معمولی چیزوں کی چوری بھی ان (ترکوں) کے ہاں مطلق نہیں ہے، امن اور جنگ دونوں زمانوں میں سڑکیں ویسے ہی محفوظ و مامون رہتی ہیں جیسے ان کے مکانات، تمام سلطنت میں خصوصاً شاہراہوں اور بڑی سڑکوں پر ہمیشہ پوری حفاظت اور سلامتی کے ساتھ سفر کیا جاسکتا ہے اور مسافروں

کی کثرت کو دیکھتے ہوئے حیرت ہوتی ہے کہ حادثات اتنے کم کیسے ہوتے ہیں، شاید کئی سال میں بھی ایک حادثہ کی نوبت نہیں آتی۔“

”ترک خواہ چوری کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اسے ایک ایسا ذلیل فعل سمجھتے ہیں جو فطرت انسانی کے سزاوار نہیں، خواہ وہ حقیقتاً قانون سے ڈرتے ہیں جو بہت سخت نہیں ہے، ان سے نقب زنی یا چوری کی واردات قسطنطنیہ میں شاید ہی کبھی ہوتی ہو اس شہر میں لوگ سب سے زیادہ یلغار یوں سے ڈرتے ہیں، عموماً چورو ہی ہوتے ہیں، تاہم آپ وہاں حفاظت کے ساتھ رہ سکتے ہیں اور آپ کے دروازے ہمیشہ کھلے رہتے ہیں۔“ (۱)

پروفیسر میکس ملر قسطنطنیہ کے متعلق لکھتے ہیں:

”شہر کی سڑکیں بہت خراب ہیں، کیا گاڑی، کیا ٹرام اور کیا حمال، کسی میں باسانی سہولت اور روانی نہیں، سڑکوں پر بہت شور ہوتا ہے، لوگ عموماً زور سے باتیں کرتے ہیں مگر اس سب کے ساتھ سڑکوں پر جھگڑا فساد شاذ و نادر ہوتا ہے، مگر جو چیز سیاح کے دل سے کبھی محو نہیں ہو سکتی، وہ سڑکوں پر بدست عورتوں اور بدست مردوں کا نہ ہونا ہے اور اگر کہیں کوئی مخمور دیکھا بھی جائے گا تو وہ یقینی ترک نہ ہوگا، اس صفت کی قدر اس وقت بڑھ جاتی ہے جس وقت ہم خیال کرتے ہیں کہ ہمارے شہروں میں ہر ایک جھگڑا فساد اور نیز ہر ایک ارتکاب جرم کا سبب اگر غور سے دریافت کیا جائے تو یہی شراب خواری ہوگی۔“ (۲)

یہاں عام سڑکوں پر ایک اور حیرت انگیز چیز جس سے ایک

(۱) لارینٹ جلد اول ص ۳۱۵-۳۱۶ (۲) 'سیاحت قسطنطنیہ' مولفہ: مسز جیارجینا میکس مر

یورپین سیاح کو استعجاب ہوتا ہے، وہ علانیہ بد اخلاقیوں کا نہ پیا جان

ہے، بالخصوص ترکی عورت اس صفت سے زیادہ متصف ہیں۔“ (۱)

حرم کی زندگی: ترکی حرم اور اس کی زندگی کے متعلق موجودہ صدی کے آغاز تک عجیب و غریب غلط فہمیاں پھیلی ہوئی تھیں، اہل یورپ کے نزدیک حرم وہ حصہ مکان تھا جس میں بے شمار عورتیں رہتی تھیں اور وہ سب مالک مکان کی بیویاں، داشتائیں یا لونڈیاں تھیں، ان کا کام صرف کھانا پینا اور اپنے آق کو خوش رکھنا تھا، چہار دیواری سے باہر نکلنے کی انھیں اجازت نہ تھی، اور نہ وہ کسی سے ملاقات کر سکتی تھیں، ان کی حالت قیدیوں سے بہتر نہ تھی۔

لیکن جب ۱۹۰۳ء میں خالد خلیل نے ترکی معاشرت پر اپنی کتاب ’ایک ترک کی ڈائری‘ (The Diary of a Turk) شائع کی تو یہ غلط فہمیاں بہت کچھ دور ہو گئیں، اس کے بعد لوسی گارنٹ کی کتاب شائع ہوئی، یہ چونکہ ایک انگریز خاتون کی لکھی ہوئی تھی جو مدتوں ترکی میں رہ چکی تھی اور حرم کی زندگی سے ذاتی واقفیت رکھتی تھی، اس لیے اس کی روشنی میں اہل مغرب کو اصلی حالات زیادہ وضاحت کے ساتھ معلوم ہوئے، اس میں شبہ نہیں کہ ترکی معاشرت کے بعض پہلوؤں پر لوسی گارنٹ نے خالد خلیل سے زیادہ روشنی ڈالی ہے، خالد خلیل کی کتاب کا ترجمہ محمد حسین خاں صاحب نے اسی زمانہ میں ’ترکوں کی معاشرت‘ کے عنوان سے کر دیا تھا، جو ۱۹۰۵ء میں مطبع مفید عام آگرہ سے شائع ہوا، حرم اور اس کی زندگی کے متعلق ہم اس کے اقتباسات ذیل میں درج کرتے ہیں:

”ترکی میں وہ حصہ مکان جہاں مستورات رہتی ہیں حرم

کہلاتا ہے اور مردوں کے حصہ مکان کو سلاطین کہتے ہیں، جو کہ عام

ملاقات کے لیے مخصوص ہوتا ہے، گو مکان کی تمام مستورات کو مجموعی طور

پر حرم ہی کہتے ہیں، تاہم اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ سب صاحب

خانہ کی بیبیاں ہیں، ہر شخص کی زوجہ، والدہ، ہمشیرہ، دختر اور نیز وہ عورتیں

(۱) ’سیاحت قسطنطنیہ‘ مؤلفہ مسز جیارجینا میکس لمر ترجمہ سید رشید الدین، مطبوعہ مفید عام آگرہ ص ۲۶

جو شرعاً بلاتشاب اس کے سامنے ہو سکتی ہوں اس کے حرم میں داخل ہیں، ہر خاندان میں مفصلہ ذیل اشخاص کو حرم سرا میں داخل ہونے کی اجازت ہے، صاحب خانہ، اس کے بیٹے، والد، خسر اور نسبتی بھائی بڑے بڑے شہروں مثل قسطنطنیہ، سمرنا اور ایڈریانوپل میں روشن دماغ طبقہ کے لوگ اپنے دور کے رشتہ داروں کو بھی اندر جانے کی اجازت دے سکتے ہیں اور جو کہ یوروپین رسم و رواج اختیار کرتے ہیں اپنے گہرے دوستوں کو بھی دخل کر سکتے ہیں، لیکن پرانی وضع کے خاندانوں میں جو کہ آبادی کا سب سے بڑا حصہ ہیں، صاحب خانہ کا کوئی مرد رشتہ دار تیرہ یا چودہ برس کی عمر کے بعد حرم سرا میں نہیں جاتا، اگر اس سے اور دختر صاحب خانہ یا دوسری قابل نکاح لڑکیوں سے شادی ہونا ممکن ہو، یہ پابندیاں متمول اشخاص میں زیادہ تر ہیں، ایسے خاندانوں میں حرم سرا اور مردانہ خانہ میں ایک گھومنے والی الماری کے ذریعہ سے کاروبار عمل میں آتا ہے اور پارسل اور کھانے کے برتن منگائے یا بھیجے جاتے ہیں، یہ الماری اس دیوار میں سوراخ کر کے لگائی جاتی ہے، جو کہ مردانخانہ کو حرام سرا سے جدا کرتی ہے، عورتوں کو مردوں کی نظر سے بچانے کے لیے ایک اور ترکیب یہ کی جاتی ہے کہ حرم سرا کی کھڑکیوں میں جالی لگاتے ہیں، جس کا یہ منشا ہوتا ہے کہ عورتیں تو باہر کی ہر شے اس جالی کے پیچھے سے دیکھ سکتی ہیں لیکن کوئی مرد قریب کی سڑکوں، باغوں اور مکانات سے انھیں نہیں دیکھ سکتا، جس طرح کہ لڑکوں کو تیرہ چودہ برس کی عمر کے بعد سوائے اپنے ان نہایت ہی قریبہ رشتہ داروں کے جن کی میں نے تصریح کی ہے دوسری مستورات کو دیکھنے کی اجازت نہیں، اسی طرح اتنی ہی عمر سے متجاوز ہونے پر لڑکیاں بھی سوائے اپنے

نہایت ہی قریب عزیزوں کے مردوں کے سامنے بلا نقاب کے ہرگز نہیں آسکتیں اور اگر وہ ایسے مدرسوں میں تعلیم پاتی رہی ہیں جہاں کہ لڑکے اور لڑکیاں دونوں شریک ہوں تو وہاں سے علاحدہ کر لی جائیں گی اور اگر زنانہ مدرسوں میں جاتی ہوں تو وہاں جس طرح کہ اور کہیں بھی احتیاط سے منہ چھپا کر جانا لازم ہے، یہ ہرگز نہیں خیال کرنا چاہیے کہ انگلستان کی لیڈیوں کی طرح چہروں پر ہلکی نقائیں ڈال کر جاتی ہیں بلکہ عورت کو اس طرح جانا لازم ہے کہ ازسرتا پائیک لانی فرغل میں جو کہ کسی قدر چادر سے مشابہ ہے، لپٹی ہو۔“

حرم کی زندگی کے متعلق ضلیل خالد لکھتے ہیں:

”بہت سے ترکی حرم سراؤں میں زندگی نہایت سادگی سے بسر کی جاتی ہے اور اگر ان خاندانوں کو خارج کردیں جن میں اب تک ایک سے زائد بیبیاں ہیں تو نہایت آرام اور خوشی کے ساتھ شوہر کو جو کامل اختیار و حکومت حاصل ہے وہ زوجہ کے مسلمہ حقوق میں کسی طرح ہارج نہیں ہوتی، دوسری جانب زوجہ کی اطاعت شعاری جسے مغربی یورپ کی ترقی یافتہ مستورات اس قدر حقارت سے دیکھتی ہیں، اکثر شوہر کے دل میں اس کے لیے محبت اور عزت زیادہ تر مستحکم کر دیتی ہیں جیسا کہ انگلستان میں بعض لوگوں کا خیال ہے، بیبیاں شوہروں کی باندیاں نہیں ہوتیں، حرم سرا کی رہنے والیاں زیادہ تر مکانوں ہی میں رہتی ہیں لیکن کلیۃً متعین نہیں ہوتیں، دودو تین تین یا زیادہ کی جماعت دوسرے حرم سراؤں میں ملاقات کے لیے جاتی ہیں اور اسی طرح احباب و اعزہ کے حرم سراؤں میں عورتیں ملنے کے لیے آتی جاتی ہیں، ہاں یہ ضرور ہے کہ اس قسم کے مجموعوں میں عورتیں ہی عورتیں ہوتی ہیں،

مرد شریک نہیں ہوتے لیکن دوسرے ملکوں کی مستورات کی طرح ان میں سے بعض گاتی بیاتی اور ساتھیوں کو محظوظ کرتی ہیں، نہ چنا بھی حال میں شروع کیا گیا ہے لیکن ابھی تک نہایت اعلیٰ موجودہ تہذیب یافتہ خاندانوں تک محدود ہے، پرانی وضع کے لوگوں میں نوجوان مستورات کا دوسروں کے سامنے نہ چن نہایت کریمہ و معیوب سمجھا جاتا ہے، شادیوں اور اسی قسم کے دوسرے خوشی کے موقعوں پر صرف ایسی عورتیں ناچ کر مہمانوں کو خوش کرتی ہیں جن کا پیشہ ہی ناچنا گانا ہوتا ہے اور وہ شریف اور ذی عزت نہیں شمار کی جاتی ہیں، میرے ابتدائی زمانہ میں بلند آواز سے پڑھنا حرم سراؤں میں دل بہانے کے لیے نہایت مرغوب خاطر تھا، تعلیم یافتہ عورتوں کی تعداد آج کل کی بہ نسبت بہت کم تھی، اس وقت کی بہت زیادہ پڑھی لکھی مستورات متبرک روایات و داستان یا مذہبی رسالے و اشعار اپنی ساتھیوں کو پڑھ کر سناتی تھیں اور وہ گھنٹوں نہایت توجہ کے ساتھ نہیں سنتی تھیں، مجھے یقین ہے کہ صوبہ جت میں یہ طریقہ تلقین اب تک پند آیا جاتا ہے۔

ترکی مستورات کو اپنے رتبہ و درجہ کے مطابق مختلف کام کرنے اور فرائض ادا کرنے پڑتے ہیں، ایک اوسط درجہ کی خاتون میں جو شادی کی عمر کو پہنچ چکی ہو، امور خانہ داری کے انصاف کی قابلیت سے بڑھ کر اور کوئی اوصاف اور خوبیاں نہیں تلاش کی جاتیں، صوبہ جت میں دہقانہ عورتوں کو ملاوہ اپنے حسب حال انتظام خانہ داری کے کھیتوں میں بھی کام کرنا پڑتا ہے، خصوصاً اس وقت جب ان کے بھائی اور شوہر سرکاری احکام کے مطابق فوجی ملازمت پر ہوتے ہیں، خوش حال اشخاص کی لڑکیاں اپنے گھروں کے کاروبار دیکھنے کے علاوہ سینے

پرونے میں ان تھک محنت کرتی ہیں اور ہمیشہ کشیدہ کاٹھنے اور سوئی کے دوسرے کاموں میں مشغول رہتی ہیں، بڑے بڑے معززین کی بیٹیوں کو علاوہ دیگر کاموں کے وہ سب چیزیں بھی سیکھنا ہوتی ہیں جن کی کہ ان کی استانی یا معلّمہ انھیں تعلیم دیں۔“ (۱)

عورتوں کی بیرونی تفریحیں: موجودہ صدی کے اوائل میں جب لوسی گارنٹ نے اپنی کتاب لکھی ہے، حرم کی عورتوں کو اتنی آزادی حاصل ہو گئی تھی کہ وہ سیر و تفریح کے لیے پیدل یا سواری پر باہر جاتی تھیں، دوکانوں پر جا کر خرید و فروخت کرتی تھیں اور غسل کے لیے زمانہ حماموں میں جایا کرتی تھیں، شادی بیاہ اور خاندان کی دوسری تقریبوں کے علاوہ بھی ان کی بیرونی تفریح کے سامان تھے، خصوصاً حمام ایک نہایت دلچسپ چیز تھی، یہ گویا ترکی عورتوں کا کلب تھا، یہیں وہ اپنی دوستوں سے ملتی تھیں، نئی ملاقاتیوں سے تعارف پیدا کرتی تھیں اور وقت کی تمام خبریں سنتی تھیں، یہیں وہ شادیوں کے سلسلہ کے غسل اور دوسری خاندانی تقریبات کے غسل کے لیے اپنی لڑکیوں، چھوٹے بچوں اور کنیزوں کو لے کر آتی تھیں، ان کے ساتھ ہر قسم کے پھل اور ناشتہ کی چیزیں ہوتیں اور دن کا بڑا حصہ کھانے پینے اور ہنسی مذاق کی باتوں میں گزار دیتیں، عثمانی عورتیں کھلی ہوا کی بے حد شائق ہیں، قسطنطنیہ کے قریب متعدد دولکش تفریح گاہیں ہیں جہاں عورتوں کو اپنے اس ذوق کی تسکین کے لیے ہر قسم کی سہولت حاصل تھی، اسی طرح صوبوں کے ہر شہر اور قصبہ کے نواح میں بھی ایسے مقامات موجود ہیں جن کے مناظر نہایت خوبصورت ہیں، لوسی گارنٹ لکھتی ہے کہ ناممکن ہے کہ ان مقامات پر جائیے اور عثمانی عورتوں کی ٹولیاں تفریح کرتی ہوئی نظر نہ آئیں، اس سلسلہ میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ شریف ترک کبھی اپنے گھر کی عورتوں کے ساتھ باہر نہیں نکلتے تھے، قدیم خیال کے بعض اعلیٰ عہدہ داروں کے گھروں میں حبشی خولجہ سرا بیرونی دنیا اور خواتین حرم کے درمیان متوسط کا کام

دیتے تھے اور جب کبھی یہ خواتین سیر کے لیے باہر نکلتی تھیں تو ان کے ساتھ جاتے تھے، گھر میں یہی نوجوان سرائیچوں کی دیکھ بھال اور کنیزوں کی نگرانی کرتے تھے۔ (۱)
 پروفیسر میکس ملر پل غلطہ کے ذکر میں لکھتے ہیں:

”یہاں عورتیں امید سے زیادہ سڑکوں پر ملتی ہیں جو بلا خوف و خطر پل پر آدمیوں کے جامع کثیرہ سے مل جل کر چلتی ہیں، ہم ان کے چمکدار سرخ و سفید، نیلے، سبز، قرمزی رنگ کے گونا گوں لباسوں کو بخوبی دیکھ سکتے ہیں، لیکن ان کی سیاہ آنکھوں کے سوا باریک اور چھنے والی نقاب کی تہوں کے اندر سے ان کے چہروں کی کیفیت بہت کم معلوم ہو سکتی ہے، مشرقی چہروں میں سیاہ آنکھ ایک سب سے اعلیٰ ترین چیز ہے اور اگر ان کے باریک نقابوں کے اندر کوئی شخص ان کے چہروں کو اچھی طرح جانچ کرنا چاہے تو اس کو مایوسی کے سوا کچھ نہیں حاصل ہو سکتا۔“ (۲)

پروفیسر میکس ملر ۱۸۹۶ء میں قسطنطنیہ گئے تھے، یہ سلطان عبدالحمید خاں کا عہد تھا، جو سیاسی استبداد کے علاوہ معاشرت کی سخت پابندیوں کا بھی زمانہ تھا، اس کے باوجود عورتوں کی یہ آزادی قابل لحاظ ہے لیکن اس آزادی کے بھی معین حدود تھے جن سے تجاوز نہیں کیا جاسکتا تھا مثلاً کوئی خاتون بغیر یشمک (نقاب) کے اپنے مکان کے نیچے کی سڑک پر بھی نہیں جاسکتی تھی (۳)، ہر عورت امیر ہو یا غریب اور کیسی ہی نیک چلن ہو غروب آفتاب کے ساتھ ہی اپنے مکان واپس چلی جانے پر مجبور تھی (۴)، سلطان عبدالحمید خاں عورتوں کے پردہ کے سخت موید تھے، ہر سال وہ یشمک کے زیادہ دیز اور فریج (برقع) کے زیادہ ڈھیلے ہونے کی نسبت فرمان جاری کرتے تھے، کوئی ترک سڑک پر اپنی عورتوں سے بھی بات نہیں کر سکتا تھا، ایسا کرنا خلاف قانون تھا اور پولیس فوراً

(۱) لوی گارنٹ ص ۶۳-۶۶ (۲) سیاحت قسطنطنیہ ص ۱۹ (۳) ایضاً ص ۱۹ (۴) ایضاً ص ۲۰۱

مداخلت کرتی تھی۔ (۱)

تعداد از دواج: ترکوں میں تعداد از دواج کے متعلق لوسی گارنٹ کا بیان ہے کہ مزدور پیشہ طبقہ میں صرف ایک ہی بیوی ہوتی تھی اور دولت مند طبقوں میں بھی ایک سے زیادہ کی مثال شاذ و نادر ملتی تھی، راے عامہ کی مخالفت کے علاوہ جو ایک سے زیادہ شادی کرنے کو روا نہیں رکھتی، اخراجات کا مسئلہ بھی بہت اہم ہوتا تھا، دوسری شادی کے معنی یہ تھے کہ نئی بیوی کے لیے ایک قطعہ مکان بھی علاحدہ ہونا چاہیے تھا اور کنیزوں کے علاوہ پانڈان کا خرچ بھی علاحدہ دینا پڑتا تھا، لونڈیوں کی کثرت کے باوجود ملک میں عورتوں کی بہت فراوانی بھی نہیں تھی اور ہر ماں کی یہ خواہش ہوتی تھی کہ اس کی لڑکی پہلی بیوی بنے، کیونکہ اس کا رتبہ دوسری بیویوں سے مقدم سمجھا جاتا تھا، دوسری شادی کی نوبت عموماً اسی وقت آتی تھی جب پہلی بیوی سے کوئی اولاد نہ ہوتی، لیکن ایسا کرنے سے اخراجات بڑھ جاتے تھے اور گھر کی پرسکون فضا اور ہم برہم ہو جاتی تھی، گارنٹ لکھتی ہے کہ

”آج کل زیادہ سے زیادہ دو بیویاں ہوتی ہیں اور اپنے طویل زمانہ قیام میں جو میں نے ملک کے مختلف حصوں میں بسر کیا، صرف ایک بار مجھے ایسے حرم میں جانے کا اتفاق ہوا جس میں ایک سے زیادہ بیویاں تھیں۔“ (۲)

غلام اور کنیزیں: جب سے سلطنت عثمانیہ میں زوال شروع ہوا اور اسے یورپین طاقتوں کے مقابلہ میں شکستیں ہونے لگیں، ان غلاموں اور کنیزوں کی تعداد بھی روز بروز کم ہوتی گئی، جو میدان جنگ سے راکھی جاتی تھی، یہ کمی بردہ فروشی کے بازار سے پوری کی جانے لگی مگر انیسویں صدی میں باب علی نے بردہ فروشی کو باضابطہ ممنوع قرار دے دیا، جہاں تک غلاموں کا تعلق ہے ان کی خرید و فروخت تو بہت کم ہو گئی اور ان کی جگہ تنخواہ دار ملازم کام کرنے لگے، لیکن کنیزوں کی خریداری موجودہ صدی کی ابتدا تک جاری تھی،

(۱) سیاحت قسطنطنیہ ص ۲۰۲ (۲) لوسی گارنٹ ص ۹

کیونکہ حرم کی خدمت کے لیے کنیزوں کا ہونا نہایت ضروری تھا، کوئی آزاد عورت بغیر نقاب ڈالے ہوئے غیر مردوں کے سامنے نہیں جاسکتی تھی، کنیزوں کو اس قسم کی کوئی پابندی نہ تھی، خلاف قانون ہونے کی وجہ سے ان کی خرید و فروخت خفیہ طور پر ہوتی تھی، چھ سے دس برس تک کی لڑکیوں کی مانگ زیادہ رہتی تھی، کیونکہ تعلیم و تربیت دینے کے بعد جب وہ سولہ سترہ سال کی عمر میں پھر فروخت کی جاتی تھیں تو قریباً دس گنی قیمتیں وصول ہو جاتی تھیں، کنیزوں کو ستار اور دف وغیرہ بجانے، رقص کرنے اور کشیدہ کاڑھنے کی تعلیم دی جاتی تھی اور پھر رفتہ رفتہ عثمانی آداب و رسوم سے آشنا کی جاتی تھیں، بڑی ہونے کے بعد گھر کے چھوٹے بڑے کام بھی ان کو سپرد کر دئے جاتے تھے، یہ لڑکیاں حرم میں بہت خوش و خرم رہتی تھیں، انھیں وہ کھانا ملتا تھا جو مالکہ خود کھاتی تھی اور خواہ وہ کوئی قصور بھی کریں انھیں گھر سے باہر نہیں ڈالا جاتا تھا، مالکہ ان کی غور و پرداخت اور تمام ضروریات زندگی کی ذمہ دار ہوتی تھی، سات سال کی مدت کے بعد کنیز آزادی کی مستحق ہو جاتی تھی اور عموماً اس وقت مالکہ اسے آزاد کر کے اور کسی بھلے آدمی سے اس کی شادی کر کے رخصت کر دیتی تھی، بڑے بڑے عہدہ داروں کے ہاں کنیزوں کے لیے ماتحت عہدہ داروں میں سے کوئی برفتنب کیا جاتا تھا اور یہ ماتحت اس نسبت کو خوشی کے ساتھ قبول کر لیتا تھا، کیونکہ اس طرح آقا کے گھر کے ساتھ اس کے تعلقات اور بھی قریبی ہو جاتے تھے۔

بہت سے ترک بہ نسبت آزاد عورتوں کے ان عورتوں سے شادی کرنے کو ترجیح دیتے تھے جو کنیز رہ چکی تھیں، کسی آزاد عورت سے شادی کرنا نوشہ اور اس کے والدین کے لیے بہت مہنگا پڑتا تھا کیونکہ ایسے موقعوں پر تحفہ تحائف اور دعوت مدارات میں حسب رواج بڑے پیمانہ پر خرچ کرنا پڑتا تھا، ترک بالعموم نوعمری میں شادی کرتے ہیں، اس لیے اگر کوئی باپ اپنے رتبہ کی کسی دوشیزہ کے ساتھ اپنے لڑکے کا بیاہ کرنے کی قدرت نہیں رکھتا تھا تو وہ اس کے لیے کوئی ایسی کنیز خرید لیتا تھا جس کی پرورش اور تربیت کسی بڑی خاتون کی حرم سرا میں ہوئی ہو اور اس صورت میں اس کو زرقین کے علاوہ اور کچھ دینا

نہیں پڑتا تھا، چونکہ کنیز کی خود کو کوئی ذاتی حیثیت نہیں ہوتی تھی، اس لیے توقع کی جاتی تھی کہ وہ اپنے آقا اور اس کے والدین کی مطیع رہے گی اور انھیں خوش رکھنے کی کوشش کرے گی، ایسی شادیوں میں دوسرا فائدہ یہ ہوتا تھا کہ بیوی کے اعزہ شوہر کے مقابلہ میں اس کی طرف داری کرنے کے لیے موجود نہیں ہوتے تھے، برخلاف اس کے آزاد عورت اپنے حقوق سے پوری صرح باخبر ہوتی تھی اور انھیں برتنا چاہتی تھی اگر کسی کنیز کے لطن سے آقا کی کوئی اولاد ہو جائے تو پھر وہ فروخت نہیں کی جاسکتی تھی اور اسے گھر میں رہنے اور بچہ کی پرورش کرنے کا حق ہو جاتا تھا، یہ بچہ جائز اولاد سمجھا جاتا تھا ورنہ اس کے باپ کے کوئی اور بیوی بھی ہوتی تھی جو آزاد عورت ہوتی تو اس کی اولاد کے ساتھ ترکہ میں وہ برابر کا شریک ہوتا تھا، اکثر ایسی کنیز کا مالک اسے آزاد کر کے اس سے نکاح کر لیتا تھا تو پھر اسے سوسائٹی میں وہ حیثیت اور وہ تمام حقوق و مراعات جو ایک آزاد عثمانی عورت کو حاصل ہوتے مل جاتے تھے۔

لوسی گارنٹ لکھتی ہے کہ ترکی میں کنیزیں بہت سی حیثیتوں سے مغرب کی خانگی ملازماؤں سے بہتر حالت میں ہوتی تھیں، ان کے فرائض کبھی بھی سخت نہ تھے اور فرصت کے اوقات کافی ملتے تھے، خاندان کی عورتیں جب سیر و تفریح یا خرید و فروخت کے لیے باہر نکلتی تھیں یا حمام جاتی تھیں تو متعدد کنیزیں بھی ان کے ساتھ جاتیں اور تفریح میں شریک ہوتیں، ان تفریحات میں کنیزوں کو شریک کرنے ہی کی وجہ سے زیادہ تر غیر ملک کے لوگوں میں ترکوں کے تعدد از دواج کے متعلق غلط فہمیاں پیدا ہو گئیں اور وہ یہ سمجھنے لگے کہ ترک بالعموم کئی کئی شادیاں کرتے ہیں۔

غلاموں کو آزاد کر دینا ایک بہت نیک کام خیال کیا جاتا تھا اور اکثر ترک مرد اور عورتیں اپنے وصیت ناموں میں یا بستر مرگ پر اپنے غلاموں اور کنیزوں کو آزاد کر دیتی تھیں، جہاں تک ملکی حقوق کا تعلق ہے، غلام آزاد ہو کر فوراً اپنے سابق آقا کے برابر ہو جاتا تھا اور سلطنت کے بڑے سے بڑے عہدہ کا امیدوار ہو سکتا تھا، اسی طرح ایک کنیز

آزاد ہو کر خواہ اس کی شادی کسی عثمانی سے ہوئی ہو یا اسی کے طبقہ کے کسی آزاد شدہ غلام سے، خانم کا لقب حاصل کر لیتی تھی اور ایک آزاد عورت کے تمام حقوق اسے مل جاتے تھے، یہ بھی عام دستور تھا کہ جن میں بی بی کے اولاد نہیں ہوتی تھی یا جو یہ لاولد ہوتی وہ اپنے خریدے ہوئے غلام بچوں اور کنیزوں کو آزاد کر کے متہنی کر لیتی تھی اور انھیں اپنا وارث قرار دیتی تھی۔ (۱)

ترکی میں غلاموں کے ساتھ جیسی نرمی کا سلوک کیا جاتا تھا، اس کا ذکر کرتے ہوئے لارپنٹ لکھتا ہے:

”اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ غلام آزاد ہونے سے انکار کر دیتا ہے، یہ آزادی اس کی خدمات کے صلہ میں دی جاتی ہے، پھر وہ اسی گھر میں مستقل طور پر قیام اختیار کر لیتا ہے، جب وہ بوڑھا ہو جاتا ہے تو اس سے کوئی محنت کا کام نہیں لیا جاتا، وہ خاندان کا ایک رکن سمجھا جانے لگتا ہے اور اب اس کا کام صرف یہ رہ جاتا ہے کہ بچوں کو سیر کرانے کے لیے باہر لے جایا کرے یا ان کے ساتھ کھیلا کرے، بچے اسے ”بابا“ کہتے ہیں۔“ (۲)

اخلاق و عادات: ترکوں کے اخلاق و عادات کی سب نے تعریف کی ہے، مولانا شبلی فرماتے ہیں:

”کچھ شبہ نہیں کہ ترکوں کے اخلاق نہایت وسیع اور فیاضانہ ہیں، غرور و نخوت، ترفع اور کم بینی، ان میں نام کو نہیں، امیر و غریب، مزدور و عہدہ دار، وضع و شریف، جاہل و عالم، ہر درجہ کے لوگوں سے مجھ کو سابقہ پڑا، لیکن خوش اخلاقی اور فیاض طبعی میں گویا سب ایک ہی مکتب کے شاگرد اور ایک ہی سانچے کے ڈھلے تھے، غازی عثمان پاشا

جن کو پلوٹا کے واقعہ نے تمام دنیا میں روشناس کر دیا ہے اور ورولش پاشا جن کا پوتا سلطان کی دامادی کا شرف رکھتا ہے، اس مرتبہ کے لوگ ہیں جیسے ہندوستان میں گورنر جنرل یا کمانڈر انچیف، میں دونوں سے ملا ہوں اور وہ جس تواضع و رنجوش اخلاقی سے پیش آئے، اس کا اثر اب تک میرے دل میں ہے۔

ایک عام بات ہے کہ بازار میں چلتے چلتے تم جس شخص سے گو وہ کسی رتبہ کا آدمی ہو راستہ پوچھو وہ نہایت مہربانی سے تمہاری طرف متوجہ ہوگا اور تم کو راستہ بتائے گا، بعض موقعوں پر مجھ کو نہایت تنگ اور پیچدار گلیوں سے گزرنے کا اتفاق ہوا اور راستہ کے بھول جانے کی وجہ سے دیر تک حیران رہا، اتفاقاً کوئی ترک آٹکا تو اس نے راستہ بتانے پر اکتفا نہیں کی بلکہ ساتھ ہولیا اور جہاں مجھ کو جانا تھا وہاں تک پہنچا کرواپس آیا۔

فیاضی اور مہمان نوازی ترکوں کی عاصفت ہے اور نہایت ادنیٰ درجہ کے لوگ بھی نہایت سیر چشم اور فیاض ہیں، یہ عام طریقہ ہے کہ دو پار چشم آشنا کسی ہوٹل یا قہوہ خانہ میں اتفاق سے مل گئے تو قہوہ وغیرہ میں جو چھ خرچ ہوگا ایک شخص سب کی طرف سے دے دے گا، گویا تمام لوگ اس شخص کے مہمان ہوتے ہیں اور وہ میزبان ہوتا ہے۔“ (منرو ۱۹۰۸ء میں لکھتا ہے:

”اس کی (ترک کی) دیر کی، راست بازی، فرماں برداری اور پرہیزگاری نے ترکی کے عیسائیوں سے بہت زیادہ تعریف حاصل کی ہے، مجھ سے قسطنطنیہ میں کاروباری آدمیوں نے بار بار کہا کہ جب ہم کو کوئی ایسا کام سپرد کرتا ہوتا ہے، جس میں کامل ایمانداری کی

() سفرنامہ

ضرورت ہوتی ہے تو ہمیشہ ہم بجائے کسی یونانی، آرمینی یا یہودی کے کسی

ترک کو وہ کام سپرد کر دیتے ہیں۔“ (۱)

ترکی عورتوں کے ذکر میں منرو بیان کرتا ہے:

”ترکی عورتیں طلوع آفتاب سے لے کر غروب آفتاب تک

جہاں چاہتی ہیں آتی جاتی ہیں، اعلیٰ طبقہ کی عورتوں کے ساتھ خواہجہ سرا

ہوتے ہیں، متوسط طبقہ کی عورتوں کے ساتھ غلام ہوتے ہیں اور کسان

عورتیں تنہا آتی جاتی ہیں، کوئی انھیں چھیڑتا نہیں کیونکہ ترک، عورتوں

سے سڑک پر کبھی بات نہیں کرتے یہاں تک کہ خود اپنی بیویوں سے بھی

نہیں اور کوئی شخص کسی عورت کو گھورتا نہیں، یہ رواج یورپ کے عیسائی ملکوں

تک محدود ہے، عورتیں ایک بار یک کپڑے کی نقاب چہرے پر ڈالے

رہتی ہیں اور سڑک پر ایک ہلکی سی چھتری لے کر چلتی ہیں تاکہ بدتمیز گھورنے

والے فرانسیسی اور دوسرے عیسائیوں کی نظر سے محفوظ رہیں۔“ (۲)

مشہور فرانسیسی مصنف ایسیے ریکلوس (Elisee Reclus) لکھتا ہے:

”ترک جسے اقتدار نے خراب اور جوہر و ظلم نے لیل نہیں

کیا ہے یقیناً ان لوگوں میں ہے جو اپنے اوصاف حمیدہ - مناسب

امتزاج سے نہایت محفوظ کرتے ہیں، وہ تمہیں کبھی دھوکا نہیں دیتا،

متدین اور ایماندار اور اپنے لوگوں کے ساتھ فولا دکی طرح سچا اور کھرا،

نہایت مہمان نواز، باادب لیکن خوشامدی ہرگز نہیں محتاط، روادار، کریم

انفص اور جانوروں پر بہت مہربان۔“

ریکلوس کی مندرجہ بالا رائے نقل کرنے کے بعد منرو کہتا ہے کہ ”اس فرانسیسی

(۱) ”ترکی اور ترک“ از منرو مطبوعہ لندن ۱۹۰۸ء ص ۶۲ (w.s. Turkey and the Turks by)

(۲) (manroe) ایضاً ص ۶۵

جغرافیہ داں کی رائے کی تصدیق مجھ سے بارہا ان امریکنوں اور انگریزوں نے کی جو قسطنطنیہ میں ساہا سال رہ چکے تھے، لیکن مجھ سے یہ بھی کہا گیا کہ اگر میں ترک کی بہترین خوبیاں معلوم کرنا چاہتا ہوں تو ضروری ہے کہ بڑے بڑے شہروں میں نہیں بلکہ صوبہ جات میں بھی جا کر اسے دیکھوں۔“ (۱)

ترکوں کے اخلاق و عادات کے ذیل میں لارپنٹ بیان کرتا ہے:

”اگر کوئی شخص سڑک پر کسی عورت سے ملتا ہے تو اس کی طرف سے منہ پھیر لیتا ہے، گویا اس کی طرف دیکھنا ممنوع ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ بے شرم عورتوں سے بے حد نفرت کرتے ہیں اور ان سے بچتے ہیں، اس لیے اگر عیسائیوں میں سے کسی سے ترکوں سے جھگڑا ہو جاتا ہے اور اس عیسائی کی بیوی لڑاکا ہوتی ہے تو وہ اسے ترکوں سے جھگڑنے اور بدزبانی کرنے کے لیے کھڑا کر دیتا ہے اور اس طرح اکثر اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا ہے۔“

کسی ترک کے لیے سب سے بڑی ذلت اور شرم کی بات یہ ہے کہ وہ عورت پر ہاتھ اٹھائے، زیادہ سے زیادہ جرأت جو وہ کر سکتا ہے یہ ہے کہ اس کے لیے سخت اور اہانت آمیز الفاظ استعمال کرے یا پھر وہاں سے چلا جائے۔“

”جوئے کے کھیل سے وہ بے حد نفرت کرتے ہیں اور قمار باز کو جو روپیہ کے لیے کھیلتا ہے چور سے بھی برا سمجھتے ہیں، کوئی شخص ان کے نزدیک اس سے زیادہ قابل نفرت نہیں ہے، اسی وجہ سے وہ کبھی شطرنج یا ڈرافٹ کی بساط کے قریب بھی نہیں جاتے مگر یہ کہ صرف تفریح کے لیے۔“

اونچے بلکہ متوسط طبقہ کے لوگ بھی رقص کو جہاں تک ان کا تعلق ہے، انسانی وقار کے خلاف سمجھتے ہیں اور اس فن کو نوع انسانی کے نہایت ادنیٰ افراد کے لیے موزوں خیال کرتے ہیں، ان کا قول ہے کہ کوئی بھی نہیں ناچتا جب تک وہ بدست یا مجنون نہ ہو۔“

عام طور پر ترک شراب خواری کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور افیون کھانے کی عادت کو بہت ہی ذلیل سمجھتے ہیں، جب وہ کسی بڑے آدمی کی سیرت کی تحقیر کرنا چاہتے ہیں جس کے متعلق یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ افیون کھاتا ہے تو اسے ”تریاکی“ کہتے ہیں، اس سے ان کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک ایسا شخص ہے جس کا دماغی توازن درست نہیں۔“ (۱)

ترکوں پر اسلام کا اثر بیان کرتے ہوئے ایڈوین پیرس لکھتا ہے کہ اناطولیہ کے ترکوں میں مذہبی جذبہ بہت گہرا ہوتا ہے اور اس کا مشاہدہ سیاح اور مورخ دونوں نے کیا ہے، ترک کسان نماز کا سختی سے پابند ہوتا ہے، جس کی وجہ سے خدا کے حاضر و ناظر ہونے کا احساس اس کے دل میں پوری طرح پیدا ہو جاتا ہے، وہ اپنا دن نماز سے شروع کرتا ہے، چاہے وہ پانچویں وقتوں کی نماز پابندی سے پڑھے نہ پڑھے، لیکن نماز کے الفاظ کی تکرار اس کی سیرت پر ضرور اثر ڈالتی ہے اور یہ اثر رمضان شریف کے روزوں اور دوسرے مذہبی ارکان کی بجا آوری سے اور بھی قوی ہو جاتا ہے۔ (۲)

LIBRARY	
Maharaja	Book No.
Mohamied	2125
University	
Book No. 1 Town, Lahore	

(۱) رپٹ جلد اول ص ۳۵-۳۹ (۲) ترکی اور اس کے باشندے ص ۴۹

DAULAT-E-USMANIA

VOL. II

Dr. Mohammad Uzair

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

Darul Musannefin Shibli Academy,
Azamgarh, U.P.

ISBN : 978-93-80104-32-4